بسم اللہ

جامعہ

زیر ادارت :۔ ڈاکٹر سید عابد حسین ایم ،اے ۔ پی ایچ ، ڈی

جلد ۲۹	جنوری سنہ ۱۹۳۸ء	نمبر ۱

فہرست مضامین

قیمت سالانہ صہ فی پرچہ عہ

(پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن)، محبوب المطابع برقی پریس دہلی)

سنہ ۱۹۳۷ء

ہندوستان

جمہوریت کا تجربہ

ایک سال اور گذر گیا۔ اس سے پہلے بھی بہتیرے سال گذرے، اس کے بعد بھی نہ جانے کب تک زمانہ بیتتا رہے گا۔ لیکن اس پچھلے سال کو ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ہمیشہ اس وجہ سے یاد رکھا جائے گا کہ ذمہ دار حکومت کا ایک عظیم الشان تجربہ، چاہے کتنی ہی ادھوری شکل میں سہی، بہرحال اس سال شروع ہوا تھا۔ ممکن ہے کہ دنیا کی تاریخ میں بھی یہ واقعہ اس سال کو اہم بنا دے، اس لئے کہ باہم مل جل کر رہنے سہنے سے جو سماجی مسائل پیدا ہوتے ہیں ان کے حل کرنے کے طریقوں میں آج دنیا جس اختلاف کا میدان کارزار بنی ہوئی ہے وہ اگر یوں طے نہ ہوا کہ گنتی کے چند آدمیوں کے پیچھے، جو چاہے اپنی مستعدی اور قابلیت سے یا اپنی مکاری اور سفاکی سے اگوے بن گئے ہوں باقی ساری انسانیت بھیڑوں کے ایک گلے کی طرح آنکھ بند کر کے چلے اور اگر اس میں ذرا تامل کرے تو سر دے، بلکہ یوں طے ہوا کہ لوگ باہمی مشورہ اور بات چیت سے، ایک دوسرے کو سمجھا کر اپنی سماجی زندگی کے معاملات کا تصفیہ کر لیا کریں، ضرور اپنے فیصلوں کے نافذ کرنے کے لئے سردار مقرر کر لیں اور سمجھ داروں کی سمجھ بوجھ سے فیصلہ کرنے میں ضرور مدد لیں، لیکن فیصلہ کا اصل اختیار اور اس کی اصل ذمہ داری خود قوم کے سر ہو یعنی اگر شخصی اطاعتِ مطلق کی جگہ جمہوری تعاون سے انسانیت نے اپنی سماجی زندگی کو سنوارنے کا فیصلہ کیا تو شاید سنہ ۳۷ء دنیا کی تاریخ میں اس لئے یادگار ہو جائے گا کہ ہندوستان جیسے براعظم میں بڑی حد تک اس طریقہ کا تجربہ اس سال شروع ہوا تھا۔

انتخابات

کئی سال کے بحث مباحثہ سے، صبر و تشدد، سادگی و پرکاری، بے خودی اور ہشیاری کے معرکوں کے بعد ہندوستان کی حکومت کا جو نیا دستور سنہ ۳۵ء میں بنا اس کے

ماتحت پہلے انتخابات اس ۱۹۳۷ء کے جنوری، فروری میں عمل میں آئے۔ صوبوں میں جو عام اسمبلیاں منتخب ہوئی تھیں ان میں ۳ کروڑ آدمیوں کو رائے دینے کا حق تھا۔ قوم کو ۱۵۸۵ نمائندے منتخب کرنے تھے۔ ۲۰۶ انتخابی حلقوں میں تو ایک ہی ایک آدمی اُمیدوار تھا اس لئے انتخاب کی ضرورت نہیں پڑی۔ ۱۳۷۹ نشستوں کے لئے انتخاب ہوئے، جن کے لئے ۳۷۵۷ امیدوار تھے۔ اُن میں سے کوئی ۲۰ فیصدی کے قریب تو شاید اپنی اہمیت کا بہت غلط اندازہ کرکے امیدوار بن بیٹھے تھے۔ اس لئے کہ ۷۷۶ اُمیدوار ایسے تھے جو اتنی رائیں بھی نہ لا سکے کہ ان کا زرِ ضمانت ضبط ہونے سے بچ جاتا۔ جن حلقوں میں انتخاب ہوئے وہاں کے رائے دینے والوں کی مجموعی تعداد ۲ کروڑ ۸۵ لاکھ تھی، اُن میں سے ایک کروڑ ۵۵ لاکھ نے اپنی رائے دی تھی یعنی کوئی ۵۴½ فیصد نے۔

مدراس، بمبئی، بنگال، صوبجات متحدہ، بہار اور اُڑیسہ کے چھ صوبوں میں ایک ایک ایوان اعلیٰ کا انتخاب بھی ہوا ہے۔ کل ۱۸۶ آدمی منتخب کرنے تھے، ۲۸ بلا مقابلہ منتخب ہوگئے۔ باقی ۱۵۸ نشستوں کے لئے ۴۱۰ امیدوار تھے، جن میں سے ۴۱ بے چاروں کی تو ضمانت بھی ضبط ہوگئی۔ یہاں بہت زیادہ غلط اندازہ کرنے والوں کی نسبت ۱۰ فی صد رہی! جن حلقوں میں انتخاب ہوا وہاں کے ۷۰ ہزار دو سو چالیس رائے دینے والوں میں سے پچاس ہزار ایک سو نے رائے دی یعنی سو میں سے کوئی اکہتّر نے۔

اسمبلی کے انتخابات میں رائے دینے والوں میں سب سے زیادہ تعداد نے اپنے حق کو صوبہ سرحدی میں استعمال کیا۔ پھر آسام میں، اس کے بعد بالترتیب پنجاب، بہار، صوبجات متحدہ، بمبئی اور مدراس کے لوگوں نے۔ ایوانِ اعلیٰ کے انتخاب میں سب سے زیادہ مستعدی آسام نے دکھائی، اس کے بعد بالترتیب مدراس، بمبئی، صوبجات متحدہ اور بہار نے۔ تعجب ہے کہ بنگال میں اسمبلی اور ایوانِ اعلیٰ کے انتخاب میں نسبتاً سب سے کم رائیں پڑیں، یعنی بالترتیب کوئی ۴۶ اور ۴۰ فی صدی۔ عورتوں نے اس حق کو ذرا کم برتا۔ اسمبلیوں کے لئے کوئی ۴۲½ لاکھ عورتیں رائے دینے والی تھیں۔ جن حلقوں میں انتخاب ہوا اُن میں ۴۰ لاکھ عورتیں رائے کا حق رکھتی تھیں مگر کل ۱۰ لاکھ عورتوں نے بھی تو رائے نہ دی

البتہ عام طبقہائے انتخاب سے ۸ عورتیں منتخب ضرور ہوں۔

مسلمان سیاست کے میدان میں اور جماعتوں کے بعد آئے ہیں اور عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ اس میدان میں دلچسپی اور انہماک کے اعتبار سے یہ دوسروں سے پیچھے ہیں۔ مگر انتخابات کے جو اعداد و شمار شائع ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مجموعی حیثیت سے مسلمانوں نے اوروں سے زیادہ انتخاب میں حصہ لیا اور رائے دینے کے حق کو اوروں سے زیادہ تعداد میں استعمال کیا۔ یعنی الیکشن ہائے اعلیٰ کے انتخابات میں جہاں کل رائے دینے والوں میں سے سَو میں سے اکثر نے رائے دی وہاں مسلمانوں کا اوسط ۲۶ ۲۷ ہے، اور ایوانہائے عام کے انتخابوں میں ۶۲ فی صد کے عام اوسط کے مقابلہ میں ان کا اوسط ۵ ۶۲ ہے۔

غرض ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اس بڑے پیمانے پر سیاسی انتخابات ہوئے۔ انتخابوں کی بدتمیزی اور بیہودگی جو ہر جگہ ہوتی ہے یہاں بھی ہوئی، روپیہ ضائع ہوا، بے جا اور غیر ضروری مخالفتیں پیدا ہوئیں مگر بحیثیت مجموعی قوم کے عوام کی سیاسی تعلیم بڑے وسیع پیمانے پر ہوئی جس کی قیمت میں یہ بے عنوانیاں بہرحال برداشت ہی کرنی پڑتی ہیں۔

حکومت یا نکتہ چینی؟

انتخاب نے جو بات سب سے زیادہ وضاحت سے ظاہر کی وہ یہ تھی کہ آزادی خواہ جماعت کا اثر ملک میں اس سے بہت زیادہ ہے جتنا بعض لوگ بتاتے تھے۔ چنانچہ آج ۱۱ صوبوں میں ۷ میں کانگریسی حکومت ہے، اور چار میں غیر کانگریسی۔ البتہ کانگریس کو خالص مخالفت سے وزارتوں کی منزل تک پہنچنے میں بہت سی عملی اور زیادہ تر ذہنی اور جذباتی دشواریاں تھیں۔ وزارت قبول کرنے نہ کرنے کا مسئلہ ایک مدت تک معرض بحث میں رہا۔ اعتدال پسند شروع ہی سے چاہتے تھے کہ وزارتیں قبول کی جائیں، ورنہ انتخابات کا ڈھونگ رچانے سے کیا فائدہ تھا، انتہا پسند وزارت سے کوسوں دور رہنا چاہتے تھے۔ یہ بُری صحبت کے اثر سے ڈرتے تھے حکومت اور طاقت کے قرب میں ڈر تھا کہ آزادی کی طلب سست نہ پڑ جائے۔ آخر کو مہاتما گاندھی کے اثر سے وزارتیں قبول کرنے کا فیصلہ ہوا۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ گورنر اپنے مخصوص اختیارات سے کام نہ لیں گے۔ اس شرط پر مہینوں بحثیں رہیں۔ کانگریس اس کو کام شروع کرنے کے لئے ناگزیر جانتی تھی

گورنر اسے آئینِ وقت کے سراسر خلاف بتاتے تھے۔ آخر کو کانگریس کو لفظوں میں تو وہ بات نہ حاصل ہوئی جو وہ چاہتی تھی مگر باہمی گفتگو میں یہ بات صاف ہو گئی کہ انگریز واقعی نئے دستور کو پوری طرح آزمانے کو تیار ہیں اور بیچ میں کھنڈت نہیں ڈالنا چاہتے، اُدھر انگریزوں پر یہ صاف ہو گیا کہ کانگریس بھی وزارت سے اتنی نہیں بھاگتی جتنی اس کے انتہا پسند ظاہر کرتے ہیں۔ اس آئینی اور سیاسی گتھی کو سلجھانے میں مہاتما گاندھی، لارڈ زٹلن تھگو اور لارڈ لوتھیں کا بڑا حصہ رہا، لیکن اصل چیز تو سیاست عالم کا موجودہ رنگ ہے۔ جس کی وجہ سے انگریز ہندوستان میں کسی قسم کی بے چینی اور سیاسی حرکت نہیں چاہتے اور جیسے تیسے یہاں کی سیاسی جماعتوں کو خوش رکھنے کا تصفیہ کر چکے ہیں۔ غرض اس وقت سات صوبوں میں کانگریس کی وزارتیں ہیں جو نئے دستور کو "ختم" کرنے کے لئے گئی ہیں مگر جن سے پچھلے ۶ مہینے میں ایک دفعہ بھی کسی گورنر سے کوئی ان بن نہیں ہوئی۔

وزارتوں کے کام

نئے آئینِ ہند ۱۹۳۵ء کے نقائص جو بھی ہوں (اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس میں قدم قدم پر تنگ دلی اور شبہ کا اثر نمایاں نہیں ہے) پھر بھی نئی جمہوری وزارتیں صاف دیکھتی ہیں کہ اس کی حدود میں رہ کر بہت کچھ کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کر بھی رہی ہیں۔ جمہور میں یہ احساس عام ہے کہ اب حکومت ہماری ہمدرد ہے نہیں کم و بیش ہماری ہے۔ سیاسی زندگی میں پژمردگی کی جگہ امید اور امنگ ہے، محض تخریبی تنقید کی جگہ تعمیری کام پر ذہن اور ارادہ کی قوتیں کام کرنے لگی ہیں۔ ابھی اتنا زمانہ نہیں گذرا کہ نئی وزارتوں کی کارگذاریوں پر حکم لگایا جا سکے لیکن کانگریس ہی کے صوبوں میں، کیا سارے ملک میں نئی وزارتوں نے اپنے کام سے لوگوں کو مایوس نہیں کیا ہے۔ سیاسی قیدی ہر جگہ چھوڑے گئے، اخبارات کی ضبط شدہ ضمانتیں واپس ہوئیں، آزادی خواہ سیاسی جماعتوں پر جو پابندیاں تھیں وہ ہٹا دی گئیں، ترک موالات کے سلسلے میں جو جائدادیں ضبط ہوئی تھیں اُن کی واپسی کی کارروائی بھی شروع ہو چکی ہے۔ کانگریس نے شراب نوشی کے روکنے کی کوشش ہمیشہ کی ہے اور اپنی سیاسی تحریک کے سلسلہ میں بعض موقعوں پر جو اثر اس نے اس سلسلہ میں پیدا کیا وہ ہندوستان کی اصلاحی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ اب اختیار پانے کے بعد

اس چیز کو کیسے چھوڑا جا سکتا تھا۔ اگرچہ شراب کے استعمال کو بالکل بند کر دیا جائے تو سب صوبوں کو مجموعی طور پر کوئی ۱۴ کروڑ روپیہ کا نقصان ہوگا اور اُن کی کل آمدنی اس وقت کوئی ۸۵ کروڑ ہے۔ یہ نقصان آمدنی کو دیکھتے ہوئے بہت ہے۔ مگر انسان کی طرح حکومت بھی خالی روپئے کی کمی بیشی کا خیال کر کے ترقی نہیں کر سکتی۔ چنانچہ کانگریسی حکومتوں نے ٹھان لی ہے کہ یہ اصلاح کر کے چھوڑیں گے۔ اگرچہ مالی اور انتظامی دشواریوں کے باعث ذرا پھونک پھونک کر قدم اُٹھائیں گے۔ بنگال کی حکومت نے بھی اس پالیسی کی تائید کی ہے اور تعجب ہوتا اگر یہ مسلمان اکثریت والا صوبہ ایسا نہ کرتا۔ یقین ہے کہ دوسرے غیر کانگریسی صوبے بھی اس اخلاقی مطالبہ کے سامنے اپنے کینۂ زر کو ہلکا کرنے تک پر بھی آمادہ ہو جائیں گے۔ مدراس کے صوبے نے یکم اکتوبر سے سالم کے ضلع میں یہ تجربہ شروع بھی کر دیا ہے اور اب تک کے نتائج آئندہ کوششوں کی کامیابی کی بڑی امید پیدا کر رہے ہیں۔

دیہی مسئلہ

سب سے اہم مسئلہ جس سے حکومتیں دوچار ہیں دیہی آبادی کی حالت کا مسئلہ ہے۔ یہی در اصل ہندوستان کی اکثریت کا مسئلہ ہے۔ یہ ملک جس کی زرخیزی کے افسانوں سے دنیا کا ادب بھرا پڑا ہے اپنے باشندوں کی اکثریت کو پیٹ بھر روٹی بھی نہیں دیتا۔ ان گنت آدمی پیدا ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں اور شاید یہ اس سفر حیات میں ایک دفعہ بھی سیر ہو کر نہیں کھاتے۔ اس مسئلہ کو حل کرنا کھیل نہیں، ایسے مسئلے حل ہو جائیں تو قوموں اور ملکوں کی قسمت بدل جاتی ہے۔ اس وقت جو کیا جا رہا ہے وہ بھی غنیمت ہے اس لئے کہ پہلے اتنا بھی نہیں کیا جاتا تھا مگر غالباً جلد معلوم ہوگا کہ جو کچھ کیا جا رہا ہے بہت ناکافی ہے۔ کانگریسی صوبوں میں ہر جگہ حسب وعدہ کسانوں کی دشواریوں کو دفع یا ملتوی کرنے کی تدبیریں کی گئی ہیں اور نئے قانون زیر غور ہیں، اُن کی غرض یہ ہے کہ لگان کا بوجھ کم کیا جائے۔ قرض کے دباؤ سے جہاں تک ہو سکے کسان کو نجات دی جائے، قرض کے جھگڑوں کو چکانے کے لئے سہولتیں پیدا کی جائیں، کام چلانے کے لئے اُدھار دینے کا انتظام حکومت کی طرف سے کیا جائے۔ یہ سب تدبیریں اچھی ہیں اور ان کی امید ہی سے کسان خوش ہے اور سمجھتا ہے کہ اب میری پوچھ ہے، میرے لئے کچھ ہوگا۔ ضرور ہوگا اور اس سے حالت کو سدھارنے کا ولولہ اور تیز ہوگا، کیا عجب ہے کہ

جمہور کے اس ولولہ کا ساتھ قوم کا دماغ بھی دے اور واقعی سُدھار کی کوئی صورت نکل ہی آئے۔ اس لئے کہ محض لگان کم کرنے اور قرض معاف کرانے سے زیادہ دن کام نہیں چلے گا۔ بڑھتی ہوئی آبادی کا سیلاب ان جزوی اصلاحوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا دے گا۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ ایک مردم شماری سے دوسری مردم شماری تک دس برس کی مدت میں ہندوستان کی آبادی میں کوئی ۳½ کروڑ کا اضافہ ہوا تھا اور یہ اضافہ ہی اضافہ فرانس کی پوری آبادی کے برابر ہے! لگان کم کرکے اُن کے پیٹ پالنے کی تدبیر کیسے نکل آئے گی۔ اس کے لئے ہندوستان کی ساری معیشت کو منظم کرنا ہوگا۔ صنعت اور زراعت میں صحیح تعلق قائم کرنا ہوگا، آبادی کو بے تک بڑھنے سے روکنے کی تدبیر کرنی ہوگی، زراعت کی دولت آفریں قوت کو بڑھانا ہوگا۔ اس میں دنیا کے دوسرے ملکوں کے تجربے سے سبق لینا ہوگا، جو ٹھوکریں اوروں نے کھائی ہیں اُن سے بچنا ہوگا، علوم صحیحہ اور علوم اجتماعی کی تحقیق سے مشعل راہ کا کام لینا ہوگا۔ معاشی دولت آفرینی اور جماعتی تنظیم کے لئے بہتر امکانات کو آزمانا ہوگا۔ اس عظیم الشان کام کے کرنے میں شاید ابھی کچھ دیر ہو مگر اس کی ذہنی تیاری ازبس ضروری ہے اور اندیشہ یہ ہے کہ اس ذہنی تیاری کو بس جوش دلانے اور نفرت پھیلانے تک محدود کیا جا رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہمارے بہترین دماغ ان مسائل پر غور و فکر میں اپنے دن رات ایک کر دیں تاکہ جب تدبیر کرنے کا موقع اور اختیار ہاتھ میں آئے تو ہم اندھوں کی طرح اٹکل سے آگے قدم نہ بڑھائیں۔ بلکہ کچھ تو جانتے ہوں کہ کرنا کیا ہے۔

لیکن یہ تو دور کی بات تھی، اس وقت تو صوبوں کی حکومتیں کسان کے فلاح کے لئے جو کچھ کر رہی ہیں وہی لوگوں کو "انقلاب" معلوم ہوتا ہے۔ زمیندار خصوصاً صوبہ متحدہ اور بہار میں بہت ناخوش ہیں اور رائج الوقت اصطلاح سے استفادہ کرکے "ستیاگرہ" کی دھمکی دے رہے ہیں۔ انھیں اگر اپنی تاریخ معلوم ہو اور جسم اجتماعی میں اپنے تعطل کا احساس ہو تو وہ بجائے بیکار دھمکیاں دینے کے زرعی پیداوار بڑھانے، دیہات کی حالت سدھارنے، کسانوں کی صحیح نمائندگی کرنے اور ان کے بھلے میں اپنا بھلا دیکھنے کی کوشش کریں۔ ورنہ ایک معطل عضو کو جسم اجتماعی کب تک گھسیٹے پھرے گا۔ اچھا موسم پاکر کسی معتبر سرجن کے مشورہ سے اسے کاٹ ہی پھینکے گا۔

دیہات سدھار کا کام جو کانگریس کے جواب میں پچھلی حکومتوں نے ہی برائے نام شروع کیا تھا اسے اب خلوص سے انجام دینے کی تدبیریں کی جا رہی ہیں، دیہی صفائی، پینے کے پانی کا انتظام، طبی امداد دیہی شفاخانے ان سب پر پہلے سے زیادہ توجہ ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عنقریب دیہات کی شکل اور اس کی آسائشوں میں معتد بہ فرق ہو جائے گا۔

مزدور اور اشتراکی

صنعتی مزدوروں کا مسئلہ ہندوستان میں ابھی اتنا اہم نہیں ہے جتنا کہ کسانوں کا۔ مگر کانگریس حکومتیں ہر جگہ اپنے وعدہ کے مطابق مزدوروں کی حالت بہتر کرنے کی تدابیر بھی نکال رہی ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں کانگریس حکومتوں کو ایک سخت دشواری کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا ہے۔ یہ تو بالکل معلوم ہے کہ کانگریس کی اشتراکی جماعت وزارتیں قبول کرنے کی مخالف تھی۔ اب کانگریس نے وزارتیں قبول کر لی ہیں اس جماعت کے غیر ذمہ دار لوگ مزدوروں کو اکسا کر وزارتوں کے لئے دشواریاں پیدا کر رہے ہیں۔ جتایا یہ جاتا ہے کہ سیاں کو توال ہوئے اب ڈر کاہے کا ہے۔ پھر جب حکومت امن قائم رکھنے کے لئے کچھ کرتی ہے تو کہتے ہیں دیکھو یہ کانگریس والے بھی سرمایہ داروں کے ساتھی ہیں، اٹھو، "انقلاب زندہ باد" ذمہ دار اشتراکی اس ہنگامہ کے مخالف ہیں اسے روکنا بھی چاہتے ہیں مگر اشتراکی جماعت کا ایک خاصا بڑا حصہ اُن کے قابو سے باہر معلوم ہوتا ہے۔ اُدھر کانگریس والے بھی اہنسا کی وجہ سے خون اور انقلاب کے نام تک سے ذرا ضرورت سے زیادہ پریشان ہو جاتے ہیں۔ پہلے سے جو لوگ ذرا اس عدم تشدد کے معاملے میں پوری طرح ساتھ نہ تھے پکے اہنسا والوں کو ان کی ہر بات کھٹکتی ہے اشتبہ کی وجہ سے بے اعتباری ہے، اور جب اس بے اعتمادی کا اظہار بھی ہو جاتا ہے تو جی دکھتے ہیں۔ بمبئی کے وزیر کے۔ ایم منشی پر مہاراشٹرا والے اسی وجہ سے خفا ہیں۔ پھر یہ بھی عجیب نہیں کہ تشدد کے زبانی، علانات پر جو کچھ کانگریسی حکومتوں کی طرف سے ہو رہا ہے اس میں گورنروں کا تھوڑا بہت دخل ہو اور وزرا بھی چونکہ تشدد کے حامی تو ہیں نہیں اس راز کو فاش نہ کرنا چاہتے ہوں۔ غرض کئی صوبوں میں مزدوروں کی بے چینی کے آثار سامنے آتے رہے ہیں۔ کانگریس نے امن قائم رکھنے اور تشدد کی ترغیب سے روکنے کے لئے جو انھیں قانونوں سے کام لیا جو چند مہینے پہلے تک خود اُن کے خلاف

برتے جاتے تھے تو یہ ہر شخص کو کچھ نرالی سی بات لگتی ہے اور انتہا پسند تو اس کو خوب اچھال رہے ہیں
صنعتی مزدوروں کے علاوہ بہار میں کسانوں کی تحریک نے خاصی قوت پکڑلی ہے اور اس کے جلد کانگریس
سے ٹکرا جانے اور انقلابی تحریک بن جانے کے امکانات صاف نظر آتے ہیں۔ کانگریس کے اندر پرانے
تجربہ کار کانگریسیوں اور نئے اشتراکی تجربہ کرنے والوں کا اختلاف بڑھ رہا ہے۔ گاندھی جی کی بزرگی اور
پنڈت جواہر لال کی سعادت مندی ان مختلف الخیال گروہوں کو ملائے ہوئے ہیں۔ مگر کب تک؟

کانگریس اور مسلم لیگ

اس اختلاف سے بھی کچھ زیادہ شدید اور فی الحال ملکی سیاست کے لئے انتشار کا باعث کانگریس اور مسلم لیگ کا اختلاف ہے۔
یہ اختلاف یوں تو کسی نہ کسی شکل میں مدت سے چل رہا ہے مگر جدید دستور کے نفاذ کے بعد سے یہ اس
نے سیاسی فضا کو یکسر مکدر کر رکھا ہے۔ مسلمانوں کی سیاسی جماعت لیگ ہی۔ یہ انتخابات سے پہلے تعطل
میں تھی۔ مگر جب انتخابات کا وقت آیا تو اس کے روح رواں مسٹر جناح نے مسلمانوں کے ترقی دوست عناصر
کو اس کے پرچم تلے جمع کرنا چاہا۔ بعض جگہ مثلاً صوبجات متحدہ میں بہت سے وہ لوگ جو ہندوستان کی
آزادی چاہتے تھے اور آزادی کی تحریک میں پہلے پورا پورا حصہ بھی لے چکے تھے اس میں شامل ہوگئے۔
وہ عناصر جن پر خود غرضی یا وطن دشمنی کا شبہ ہوتا تھا اس سے جدا ہوگئے۔ مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہر صوبے
میں یہی ہوا۔ بہت جگہ ان لوگوں نے جو آزادی کی تحریک کے سخت مخالف رہ چکے تھے لیگ کے نظام
پر قبضہ پالیا۔ انتخابات ہوئے۔ ان صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے مسلم لیگ کو کامیابی
نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ مسلمانوں کی اکثریت کسی دوسری جماعت میں شریک تھی، کہیں کانگریس میں
کہیں پرجا پارٹی میں، کہیں یونینسٹ جماعت میں۔ جس صوبوں میں مسلمانوں کی اقلیت ہے وہاں لیگ
کو بڑی کامیابی ہوئی۔ انتخابات میں کانگریس کو توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی تو ان کی طرف سے اعلان
ہوا کہ ہم خالص کانگریسی وزارت بنائیں گے۔ کسی اور جماعت کو شامل نہ کریں گے حالانکہ کم از کم صوبہ متحدہ
میں انتخابات کے زمانے میں ہر شخص سمجھتا تھا کہ کانگریس اور لیگ مل کر وزارت بنائیں گے۔ انتخابات میں
کانگریس کے ممتاز لوگوں نے لیگ کے امیدواروں کے لئے اور لیگ کے ممتاز کام کرنے والوں نے کانگریس کے

امیدواروں کے لئے کوشش کی تھی۔ جب کانگریس نے اپنی غیر متوقع کامیابی کے بعد لیگ کو ساتھ لینے سے انکار کیا تو ظاہر ہے اچنبھا ہوا۔ گمان ہونے لگا کہ کامیابی کے نشے میں جب لیگ کی ضرورت نہیں رہی تو یہ رویہ اختیار کیا گیا ہے، آگے کے متعلق شبہات قوی ہونے لگے۔ اسی زمانے میں پنڈت جواہر لال اور مسٹر جناح میں ایک تحریری مباحثہ چھڑ گیا۔ پنڈت جی نے کہا کہ ملک میں بس دو جماعتیں ہیں سامراج کے حامی اور اس کے مخالف، انگریزی حکومت اور کانگریس۔ مسٹر جناح نے مسلمانوں کے جداگانہ وجود پر اصرار کیا۔ کئی مرتبہ اُن کی طرف سے بھی بیانات شائع ہوئے۔ اِن کی طرف سے بھی جن سے عام ہیجان اور بدگمانی میں کچھ اضافہ ہی ہوا۔ کانگریس نے جواہر لال جی کی ہدایت کے مطابق براہ راست مسلمانوں کو کانگریس میں شرکت کی دعوت دینی شروع کی، مسٹر جناح نے مسلم لیگ کو منظم کرنا شروع کیا۔ دونوں کو کامیابی ہوئی۔ کچھ مسلمان خاصی تعداد میں کانگریس میں بھی شریک ہوئے، اور لیگ کا جو اجلاس لکھنؤ میں ہوا وہ بھی لیگ کے کامیاب ترین جلسوں میں سے تھا۔ اس اجلاس میں مسلمان اقلیت والے صوبوں کے علاوہ بنگال اور پنجاب کے وزیر اعظم بھی موجود تھے، انھوں نے لیگ سے اپنا تعلق پھر استوار کیا تو لیگ کی قوت میں پہلے سے بہت زیادہ اضافہ ہوگیا۔ ادھر صوبجات متحدہ میں اتفاق سے پانچ حلقوں میں دوبارہ انتخاب کی نوعیت بھی آئی۔ اس میں ایک جگہ یعنی بجنور میں تو حافظ محمد ابراہیم صاحب کو لیگ کے مقابلہ میں کامیابی ہوئی۔ باقی چار جگہ لیگ جیتی۔ ان انتخابات میں دونوں طرف سے اس قدر زور لگا کہ تعلقات اور بھی کشیدہ ہوگئے۔ اور کانگریس اور لیگ کے تعلقات سے زیادہ خود مسلمانوں کے دو گروہ بن گئے جو نہایت شدت سے ایک دوسرے کی مخالفت کر رہے ہیں اور جن میں محترم سے محترم ہستی بھی مخالفوں کی گالیوں اور دشنام سے محفوظ نہیں۔ ملت کو متحد کرنے کے لئے پگڑیاں اچھل رہی ہیں!

لیکن تمام ہنگامہ میں، کہ قومی بدنصیبی کی داستان کا ایک ورق ہے، ایک بات کام کی یہ ہوئی کہ لیگ نے اپنے لکھنؤ کے اجلاس میں آزادی کامل کو اپنا مقصود قرار دیا۔ ملک کی فلاح کے لئے ایک معاشی پروگرام بھی مرتب کیا جسے کہتے ہیں کہ مشہور اشتراکی ایم، این رائے نے کانگریس کے پروگرام

سے بہتر بنا یا ہے ۔ کیا یہ دونوں جماعتیں لیگ اور کانگریس جو یوں متحد المقصد ہیں برابر لڑتی ہی رہیں گی اور ہمارا ملک تدبر سے اتنا خالی ثابت ہوگا کہ اس قضیہ کو کہ کچھ شخصیتوں کا ، کچھ جذبات کا ۔ کچھ اکثریت میں اس احساس کے پیدا کرنے کا معاملہ ہے کہ اقلیتوں کا اعتماد حاصل کئے بغیر آگے چلنا دشوار ہے ۔ کچھ اقلیتوں میں اس احساس کا کہ معاملاتِ انسانی میں جمہوری نظام کے ماتحت بھی صرف سر ہنیں گنے جاتے ۔ سر کے اندر مغز ہو تو تھوڑے بھی بہتوں پر بھاری پڑتے ہیں' نہ چکا سکے گا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس تفریق کے وجود سے انکار کر دینا کافی ہے یہ مٹ جائے گی ۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ چیز نفسِ جماعت میں راسخ ہوگئی ہے ، یہ ایک ذہنی گتھی ہے ، جب تک حل نہ ہوگی طرح طرح سے اپنا اثر ظاہر کرے گی ۔ یہی ہماری سیاست اور تدبر کا پہلا امتحان ہے ۔ سنہ ۳۷ء میں تو ہم حل سے کچھ دور ہی ہوئے ، دیکھئے سنہ ۳۸ء میں کیا ہوتا ہے ۔

فیڈریشن

ہم نے سنہ ۳۸ء ارادۃً لکھا ہے ۔ اس لئے کہ علاوہ اس عام مفاد قومی کے جوان جماعتوں کے سمجھوتہ سے وابستہ ہے اگلے سال فیڈریشن کے قیام کا جو مسئلہ غالباً سامنے آئے گا اس میں اس کے تصفیہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے' اس وقت تو کانگریس بھی فیڈریشن کی مخالف ہے اور لیگ بھی ۔ تفصیلات سے قطع نظر ہمارا خیال ہے کہ فیڈریشن کی یہ مخالفت عقلی ہے جذباتی نہیں اس لئے غالباً کوئی صورت اس کے حل کی نکل آئے گی ۔ ممکن ہے ریاستوں کے نمائندے نامزد نہ ہوں منتخب ہو کر آئیں اور اس سے کانگریس کو امید ہو جائے کہ وہ ہمیشہ مرکزی اسمبلی میں اقلیت میں نہ رہے گی ۔ اور وہ فیڈریشن کو اس طرح قبول کرے جس طرح صوبوں میں نئے دستور کو قبول کیا ہے ۔ یا اگر ریاستوں کو یہ تبدیلی' جس کے سلسلہ جنبانی قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ شروع کردی گئی ہے، منظور نہ ہو اور وہ فیڈریشن میں شامل ہونے سے انکار کریں تو صرف برطانوی صوبوں کا وفاق بن جائے تو اسے تو کانگریس شاید بخوشی قبول کرلے گی ۔ جب کانگریس قبول کرے گی تو ظاہر ہے کہ لیگ بھی کر ہی لے گی ۔ اور اسی لئے ترقی دوست اور آزادی خواہ کانگریس اور لیگ کی مفاہمت اور بھی ضروری ہے ۔

معاشی زندگی

سیاست کی یہ ساری گرماگرمی جس کا ذکر اوپر ہوا سرد پڑ جائے اگر معیشت اس کا ساتھ نہ دے سکے۔ صوبوں میں سارے تعمیری کاموں کے لئے روپیہ درکار ہے۔ شراب نوشی کے انسداد سے حکومتوں کی آمدنی کچھ گھٹے گی ہی۔ لگان کم کرنے سے بھی۔ نئے ٹیکس لگائے جائیں گے لیکن نئی نئی جمہوریت جس کے قدم ابھی اچھی طرح جمے نہ ہوں ٹیکس لگانے سے ہمیشہ ڈرتی ہے۔ اگر تجارت کو فروغ ہوا اور کاروبار اچھا رہا تو شاید کام چلے۔ اس لئے ذرا اس سال میں کاروبار کی حالت پر بھی ایک نظر ڈال لینی چاہیئے۔

کساد بازاری کا ڈر

اس سال کے آخری حصے میں دنیا کے دوسرے ملکوں میں یہ اندیشہ ظاہر کیا جانے لگا ہے کہ ۲۹ سنہ کی کساد بازاری کے بعد اب جو بازاروں کی حالت سنبھلی ہے وہ زیادہ قائم بھی رہے گی یا نہیں، کہیں پھر بازار مندے نہ پڑیں۔ ہندی معیشت دنیا کی معیشت کے ساتھ کچھ ایسی گتھی ہوئی ہے کہ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو اس کا اثر ہندوستان پر بہت سخت پڑ سکتا ہے۔ بلکہ عام کساد بازاری میں اسے تو اوروں سے بھی کچھ زیادہ نقصان ہوتا ہے۔ اس کی زرعی پیداوار کی مانگ بند ہو جاتی ہے اور ملک کی آبادی کے بہت بڑے حصے یعنی کسانوں کی جان پر بن جاتی ہے۔ اگر اس وقت جبکہ جمہوریت کا نیا تجربہ شروع ہوا ہے اور قومی تعمیری کاموں کے لئے حکومتوں کو ہر جگہ وسائل کی شدید ضرورت ہے۔ یہ صورت پیدا ہوئی تو مصیبت ہو جائے گی۔ پیشین گوئی کرنا تو مشکل بھی ہے اور غلط بھی، مگر کچھ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ یہ اندیشہ شاید صحیح ثابت نہ ہوگا دنیا کی موجودہ معاشی حالت سے یہ امکان ضرور معلوم ہوتا ہے کہ چڑھتے ہوئے بازار ذرا رک جائیں، مانگ ذرا دھیمی پڑے مگر اس کا خطرہ زیادہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ عام اور شدید کساد بازاری کی شکل اختیار کرے۔ لیکن احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ ہندوستانی مرکزی اور صوبجاتی حکومتیں ان دشواریوں کو سامنے رکھیں جو کساد بازاری سے ان کے لئے پیدا ہو سکتی ہیں تاکہ اگر یہ آئے تو وہ بے خبر نہ ہوں۔ یہ احتیاط اس لئے اور ضروری ہے کہ ہندوستان میں اجناس زرعی و صنعتی کی پیداوار پچھلے دنوں خاصی بڑھی ہے اور قیمتوں میں کچھ اتنا اضافہ نہیں ہوا ہے۔ ڈر ہے کہ

طلب اور رسد کا توازن بگڑنے نہ جائے۔

دولت آفرینی ہندوستان کی دولت آفرینی کے اعداد پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوتا ہے کہ پچھلی عام کساد بازاری کے بعد سے ملک نے معتد بہ ترقی کی ہے۔ شکر کی صنعت تو تقریباً ساری کی ساری اس زمانہ میں وجود میں آئی ہے۔ اب تک یہ بس درآمدہ شکر کی جگہ پردیسی شکر پیدا کرتی تھی اب موجودہ ملکی کھپت سے خاصی مقدار زیادہ تیار کر سکے گی۔ پچھلے اپریل ۳۶ء کے مقابلے میں ۶۱ فیصدی اور مئی میں مئی ۳۶ء سے کوئی ۲۰۰ فیصدی زیادہ شکر ملک میں بنی! ۲۹-۳۶ء کے مقابلے میں سوتی کپڑے کے کارخانوں نے ۳۶-۳۷ء میں کوئی ۵۰ فیصدی زیادہ کپڑا پیدا کیا اور ۳۷-۳۸ء کے شروع کے چار مہینوں میں پچھلے سال کے مقابلے میں تقریباً اور ۷ فیصدی زیادہ سیمنٹ اور لوہے کی صنعت میں بھی پیداوار بہت بڑھی ہے۔ سیمنٹ کی پیداوار بھی پچھلے سال سے زیادہ رہی ہے۔ شکر کی پیداوار تو ۳۶-۳۷ء میں پہلے سے دوگنی ہو گئی۔

قیمتیں دولت آفرینی کے اس اضافہ کے ساتھ مانگ بھی ضرور بڑھی ہے۔ کپڑا بنا زیادہ تو باہر سے درآمد بھی کم ہوئی ہے اور اب چین و جاپان کی جنگ کی وجہ سے زیادتی پیداوار سے قیمت کے کم ہو جانے کا اندیشہ اور کم ہو گیا ہے۔ لوہے اور فولاد کی صنعت کو باہر کی مانگ نے خوب سہارا دیا ہے۔ سیمنٹ کی مانگ بھی خود ملک میں خاصی بڑھ رہی ہے۔ لیکن پھر بھی اگر قیمتوں پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اتنا اضافہ نہیں ہوا ہے جتنا کہ اکثر دوسرے ممالک میں۔ ذیل کے نقشے میں چھ ملکوں کی مجموعی قیمتوں کے انڈکس نمبر درج ہیں۔ اگر ۲۹ء کی قیمت کو ۱۰۰ فرض کیا جائے تو عام قیمت کی سطح یہ رہی ہے

	ہندوستان	برطانیہ	ریاستہائے متحدہ امریکہ	جاپان	فرانس	جرمنی
۳۶ء	۸۲٫۳	۸۴	۹۰٫۷	۸۲٫۴	۸۸٫۴	۹۰٫۸
۳۷ء	۶۴٫۵	۷۷٫۷	۶۸	۷۳٫۳	۶۸٫۲	۷۰٫۳

سنہ						
سنہ ۳۶ء	۶۶٫۷	۸۵٫۸	۸۸٫۴	۹۶٫۸	۸۲٫۸	۸۶٫۵
سنہ ۳۷ء	۷۳٫۸	۸۹	۹۱٫۲	۱۰۸٫۴	۱۰۰٫۳	۷۷٫۳
	(ستمبر)		(جون)	(جون)	(ستمبر)	(جون)

یعنی ہندوستانی قیمتیں دوسرے ملکوں سے بھی کم بڑھی ہیں۔ اس لئے اگر مانگ میں برابر اضافہ نہ ہوتا گیا تو ڈر ہے کہ کہیں پیداوار مانگ سے زیادہ ہو کر بازار کو یکایک پست نہ کر دے۔

تجارت خارجہ

اسی سلسلہ میں ہندوستان کی تجارت خارجہ کے کچھ اعداد بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے۔ سنہ ۳۷-۱۹۳۶ء کی ہندوستان کی تجارت کا جو ریویو اس سال حکومت کی طرف سے شائع ہوا ہے وہ پچھلی اطلاعات سے کئی حیثیتوں میں بہتر ہے۔ محض تجارت خارجہ کے اعداد یکجا کر دینے کی جگہ اس مرتبہ یہ پوری ہندی معیشت پر ایک تبصرہ سا ہے۔

اس سال کی تجارت میں ہندوستان کا برطانیہ پر ۱۸ کروڑ روپیہ آتا ہے۔ سنہ ۳۴ء اور سنہ ۳۵ء میں برطانیہ اور ہندوستان کی درآمد و برآمد برابر برابر رہی تھی، اور سنہ ۳۲ء میں تو ۵ کروڑ ہمارے ذمہ نکلتا تھا۔ سنہ ۱۴-۱۹۱۳ء میں یعنی جنگ سے پہلے تو برطانیہ اور ہند کی تجارت میں ہمارے ذمہ ۵۹ کروڑ نکلا تھا۔ اب جو اس سال ہمارے ۱۸ کروڑ ان پر آتے ہیں اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ برطانیہ نے ہندی مال کی خریداری کی طرف خاص توجہ کی ہے بلکہ ہماری تجارت خارجہ کا رخ کچھ بدل گیا ہے۔ اسی سنہ ۱۴ء میں برطانیہ کے علاوہ دوسرے ملکوں سے جو تجارت ہماری تھی اس میں ہمیں کوئی ۱۰۰ کروڑ یافتنی تھا اور سنہ ۳۷-۳۶ء میں کل ۴۶ کروڑ ہے۔ خود سلطنت برطانیہ کے دوسرے ملکوں کو ہم نے سنہ ۱۴ء میں ۲۵ کروڑ کا زیادہ مال دیا تھا اور اس سال کل ۱۳ کروڑ کا۔ جاپان کے ذمہ سنہ ۱۴ء میں ہمارے ۱۸ کروڑ نکلتے تھے اور اس سال ۹ کروڑ ہیں۔ برطانیہ نے بالواسطہ خریداری کی جگہ براہ راست خریداری شروع کر دی ہے اور اس طرح ہماری تجارت کا تعلق اس سے اور زیادہ گہرا ہوتا جاتا ہے۔ دوسرے ملکوں سے اس تعلق کی کمی زیادتی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کل تجارت کا کتنا حصہ کس ملک سے ہے۔ اس سال ہماری کل تجارت کا ۳۸ فیصدی کے قریب برطانیہ سے ہے، ۱۷ فیصدی جاپان سے۔ صرف برآمد کی تجارت کو لیجئے تو ضمناً مال

ہم باہر بھیجتے ہیں اس کا تقریباً ۴۲ فیصدی برطانیہ کو جاتا ہے اور ۱۵ فیصدی جاپان کو۔ برطانیہ اور جاپان سے تجارتی معاہدوں کے باعث دوسرے ممالک سے ہماری تجارت گھٹتی جاتی ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ ہماری تجارت خارجہ بس دو ملکوں برطانیہ اور جاپان پر منحصر ہو جائے گی۔

ہندوستان اور برطانیہ کا تجارتی معاہدہ

ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان تجارتی معاہدہ کی بات چیت اس سال کے واقعات میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ سر ظفر اللہ خان جو ہندوستانی حکومت کے نمائندے تھے اور ان کے غیر سرکاری مشیر برطانوی محکمہ تجارت سے کوئی معاہدہ نہ کر سکے۔ سنا ہے کہ محکمہ تجارت برطانیہ کے شرائط ایسے تھے کہ ہندوستانی نمائندے انھیں کسی حالت میں بھی نہیں مان سکتے تھے اور ہمیں ان کا شکر گذار ہونا چاہئے کہ انھوں نے کوئی ایسا معاہدہ کرنے سے انکار کیا جس میں اُن کے ملک کے مفاد کو نقصان پہنچا۔ یہ جرأت اور دیانت آیندہ سیاسی کاموں کے لئے فال نیک ہے۔ البتہ اس وقت معاملہ کے یکسو نہ ہونے کی وجہ سے ہندوستان کا نقصان ہو رہا ہے۔ اوٹاوا کا معاہدہ گھٹے جاتا ہے۔ پھر حکومت نے دوسرے ملکوں سے تجارتی گفتگو کو اس وقت تک کے لئے ملتوی کر رکھا ہے جب تک برطانیہ سے معاملہ نہ ہو جائے۔ لیکن ہمارے انتظار میں دنیا ٹھہری تو نہیں رہے گی۔ اس نفسی نفسی کے زمانے میں خصوصاً آزاد تجارت کے خاتمہ کی وجہ سے ہر ملک اس فکر میں ہے کہ اور جتنوں سے ہو سکے الگ اپنا معاہدہ کرے۔ ہر ملک اپنے مفاد کا خیال کرکے ایسے معاہدے کر رہا ہے اور ہم منہ تکتے ہیں۔ کہیں اس انتظار میں دنیا ہمارے لئے تنگ نہ ہو جائے۔ کیا ہندوستان سے معاہدے کے انتظار نے برطانیہ نے بھی اپنے تجارتی سفیروں کو چھٹی دے دی ہے؟!

اس تبصرہ میں مرکزی اسمبلی کا ذکر نہیں آیا۔ صوبوں میں نئے دستور کے نافذ ہونے سے اس کا تماشہ بہت پھیکا پڑ گیا ہے۔ پھر بھی جگہ ہوتی تو بیمہ کے قانون اور ریلوے کے متعلق مباحثہ کا ذکر کیا جاتا۔ جگہ کی کمی کے باعث ووڈ ایبٹ رپورٹ اور وردھا تعلیمی کانفرنس کے متعلق بھی کچھ نہیں لکھا گیا جو ممکن ہے کہ اس سال کے اہم واقعات ثابت ہوں۔ ان پر رسالہ جامعہ میں غالباً علیحدہ بحث ہوگی۔

ممالکِ غیر

دنیا کی سیاست کا نقشہ اس بستی کا سا ہے جہاں ڈاکے اور آتش زدگی کی وارداتیں ہوا کرتی ہوں، ہر آدمی دوسرے کا پیٹ کاٹتا ہو، کسی کے پاس حلال کی کمائی یا دھوکے اور زبردستی سے حاصل کیا ہوا اتنا مال ہو کہ وہ ہر وقت اسے محفوظ رکھنے کی تدبیریں سوچتا رہے، کسی کی حالت ایسی ہو کہ وہ اپنی ترقی کے فراق میں دوسروں کو پریشان کرتا رہے اور بہت سے بیچارے ایسے مجبور ہوں کہ سارے پڑوسی اُن کی محنت اور استعداد سے فائدہ اُٹھانا اپنا حق سمجھیں۔ سنہ ۳۶ء کی طرح اس سال بھی دنیا میں دولت اور اثر کی نئی تقسیم، یعنی عالم گیر جنگ کی بلا تو ٹل گئی، لیکن ہسپانیہ کی خانہ جنگی، جو جولائی سنہ ۳۶ء میں شروع ہوئی تھی اس سال بھر جاری رہی، اور ۸ جولائی سے چین اور جاپان کی جنگ شروع ہوئی۔ یہ دونوں فلیتے ممکن ہے جل کر رہ جائیں، ممکن ہے شعلے کو کسی بارود خانے تک پہنچا دیں اور ایسا دھماکا ہو کہ ساری دنیا ہل جائے۔

آج کل کی جنگ میں شکست ہی کا نہیں بلکہ صفحۂ ہستی سے مٹ جانے کا خطرہ ہے، اور یہ خطرہ قوموں کے غرور اور غصّے پر عاقبت اندیشی کا ٹھنڈا پانی چھڑکتا رہتا ہے۔ پھر بھی عالم گیر جنگ کی آگ سے کھیلنے والے موجود ہیں، جنھوں نے اس کا اندازہ کر کے کہ دوسرے اُن کے خاص مقصد کے اس قدر خلاف ہوں گے یا نہیں کہ عالم گیر جنگ کی بے پناہ مصیبتیں گوارا کریں اپنا مطلب زبردستی پورا کیا ہے۔ جاپان نے مانچوکو پر، اٹلی نے حبش پر اسی طرح قبضہ کیا، ہسپانیہ کی خانہ جنگی سے برطانیہ، فرانس، جرمنی، اٹلی، سب اپنا اپنا مطلب نکالنا چاہتے ہیں، اور سنہ ۳۷ء کی خاص یادگار جاپان کی یہ کوشش ہے کہ وہ چین پر مسلط ہو جائے۔ جاپان اور اٹلی نے غریب اور لاوارث کا جھونپڑا گرا کر اپنا احاطہ بڑھایا ہے، جرمنی چار برس سے کہانی کے دیو کی طرح "مانس گن" کہہ رہا ہے، اور اس کے پڑوسی سب سہمے جا رہے ہیں۔ بین الاقوامی اتحاد مانچوکو اور حبش، ہسپانیہ اور چین کے معاملے میں نرا ڈھونگ ثابت ہوا ہے۔ اگرچہ کہنے والے کہتے ہیں کہ وہ ذوالقرنین کی دیوار ہے جو دنیا کو یاجوج و ماجوج سے بچائے ہوئے ہے۔

برطانیہ | ان قوموں میں جو دنیا کو عالم گیر جنگ سے محفوظ رکھنے کا دعویٰ کرتی ہیں۔ سب سے پیش پیش

انگریز ہیں، کیوں کہ برطانوی سامراج دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا ہوا ہے، اور اس کی مورچہ بندی کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ دنیا کہتی ہے کہ حبش کے معاملے میں اٹلی سے دب کر، صلح نامۂ ورسائی کی جو خلاف ورزیاں جرمنی نے علانیہ کیں ان سے چشم پوشی کرکے اور فاشسٹ قوتوں، یعنی اٹلی اور جرمنی کو ڈھیل دے کر انگلستان نے اپنی آبرو کھو دی ہے لیکن دوسری طرف انگلستان نے سنہ ۳۵ء سے بڑے اہتمام کے ساتھ اپنی جنگی قوت بڑھانا شروع کیا ہے، بحر روم اور سنگاپور میں بحری مرکز قائم کئے ہیں، کینڈا جنوبی افریقہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور ہندوستان کی معاشی زندگی کو اپنے کاروبار سے وابستہ کیا ہے مصر کو آزاد اور ہندوستان کو ایک نئے دستور میں الجھا کر اس طرف سے اطمینان حاصل کیا ہے اور یہ سب قوت کے آثار ہیں۔ ورنہ یہ تو انگلستان کی پرانی حکمت عملی ہے کہ لڑائی میں تبھی شریک ہو جب اسے اپنی طرف سے لڑنے والے مل جائیں جن کے لئے لڑائی کے سوا کوئی چارہ نہ رہ گیا ہو، جن کی نسبت یقین ہو کہ دشمن کا غصہ انھیں پر اُترے گا۔ اور لڑائی کی مصیبتیں بھی زیادہ تر وہی جھیلیں گے۔ انگلستان اس وقت دنیا کی مطمئن قوموں میں سے ہے، لڑائی سے اس کو فائدے کی امید نہیں، نقصان کا خاصہ اندیشہ ہے اور اسی اندیشے کو چھپا کر اس نے جنگ کی تیاری شروع کر دی ہے۔ اس کے لئے مصلحت بس اسی میں ہے کہ تیاری کی دھوم مچائی جائے۔ اس کے مخالف سمجھ گئے ہیں کہ انگلستان بات کا جواب نہ دے تو لات کا دے سکتا ہے ملک کی عام رائے مدبروں کو سہارا دے رہی ہے، بے روزگاری کم ہو گئی ہے، سرمایہ داروں کی جیبیں بھر رہی ہیں اور معاشی زندگی میں رونق نہیں تو ایسی چہل پہل ضرور پیدا ہو گئی ہے جو کئی سال سے دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔

امریکہ

امریکہ بھی انگلستان کی طرح اطمینان چاہتا ہے۔ جنگ عظیم کے بعد سے دنیا کی معیشت میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں انھوں نے امریکہ کو کساد بازاری کے الجھاؤ میں ڈال دیا ہے، اور اب اس کی ضرورت ہے کہ وہاں کی معاشی زندگی کو ایک نئی تنظیم دی جائے۔ مسٹر روزولٹ کئی سال سے کوشش کر رہے ہیں کہ سرمایہ داروں کو اس پر راضی کر لیں کہ وہ حکومت کی ہدایتوں پر عمل کریں اور تنظیمی تجویزوں کو کامیاب بنانے میں حکومت کی مدد کریں۔ اسی سلسلے میں جنوبی امریکہ میں پچھلے سال وہ کانفرنس ہوئی تھی

جس میں مسٹر روزولٹ خود گئے تھے اور جس کا مقصد یہ تھا کہ ریاست ہائے متحدہ اور جنوبی امریکہ کو ایک معاشی واحدہ مان کر دونوں براعظموں کی تجارتی تنظیم باہمی مشورے کے بعد اور خاص اصولوں اور قاعدہ کے مطابق کی جاتی ہے۔ مسٹر روزولٹ کی کوششیں ابھی پورے طور پر بارآور نہیں ہوئی ہیں، لیکن امریکہ کی حالت بے شک سدھر رہی ہے، اور لڑائی تنظیم کا سارا کام بگاڑ دے گی۔ امریکہ والوں کی خودداری اور اخلاقی حس، اور اُن سے کہیں زیادہ ان کے وسیع تجارتی اور صنعتی تعلقات اس کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ دنیا کے معاملات سے بالکل بے رخی برتیں، اور حبش ہو یا ہسپانیہ، مانچوکو یا چین، امریکہ کو اپنی اغراض کی وجہ سے واقعات پر نظر رکھنا اور اس کا اعلان کرتے رہنا پڑتا ہی ہے کہ اس کی غیر جانب داری کیا صورت اختیار کرے گی اور کس حد تک برتی جائے گی۔ غیر جانب داری برتنا کوئی آسان کام نہیں، کیونکہ اس سے تاجروں کو جو منافع لڑنے والی قوموں کے ہاتھ بیچنے میں ہو سکتا ہے نہیں ہوتا، بے روزگاری کم کرنے کا موقع ہاتھ سے جاتا ہے، سرمایہ دار حاجت مند قوموں کو قرضہ نہیں دے سکتے۔ غرض دوسروں کی ضرورت سے جائز ناجائز کسی قسم کا فائدہ حاصل کرنے کی صورت نہیں رہتی۔ دوسری طرف احتیاط نہ برتی جائے تو امریکہ خود بخود جنگ کی لپیٹ میں آسکتا ہے، اور امریکی مدبر ہی نہیں بلکہ ہر طبقے کے لوگ کسی بات پر متفق ہیں تو یہ کہ لڑائی سے بہر صورت بچنا چاہیے۔ ۳۷ء کے شروع میں امریکہ والوں کو غیر جانب داری پر مجبور کرنے کے لئے جو قانون موجود تھا اس میں ترمیم کی گئی اور امریکہ والے اپنے مسلک پر قائم رہیں گے جب تک کہ وہ اسے چھوڑنے پر بالکل مجبور نہ ہوئے۔

روس انگلستان اور امریکہ سے بھی زیادہ روس امن کا خواہش مند ہے۔ معاشی زندگی کی تعمیر کے جن منصوبوں پر وہاں ۲۸ء سے عمل در آمد شروع ہوا تھا وہ اب اپنا پھل لا رہے ہیں۔ اشتراکی تنظیم نے اب ضروریات پوری کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور اب بھی اگر وہاں زندگی اور آسائش کا معیار یورپ اور امریکہ کے مقابلے میں بہت گرا ہوا ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ تنظیم کافی نہیں ہوئی ہے اور ملک میں جو قدرتی ذخیرے موجود ہیں اُن سے فائدہ نہیں اُٹھایا جا سکا ہے۔ روسی فوجیں تعداد میں شاید تمام یورپی ملکوں سے زیادہ ہیں، ہوائی جنگ کے لئے وہاں سے بہتر کہیں سامان ہے اور نہ شاید استعداد

لیکن اشتراکی نظام کے لئے اس وقت جنگ سے بڑھ کر کوئی خطرہ نہیں۔ سٹالن نے اس سال "ٹروٹسکی کے پیرووں" کا جو صفایا کیا ہے اس کا بھید بھی، جیسا کہ "جامعہ" کے پچھلے نمبر میں بتایا گیا تھا غالباً یہ ہے کہ وہ حاکم جماعت سے ان تمام لوگوں کو نکال دینا چاہتا تھا جن کے اصول یا حوصلے یا طبیعتیں قومی پالیسی میں جنگجوئی کا میلان پیدا کر سکتی تھیں۔ اب ہر روسی کا قومی، اخلاقی، دینی فرض یہ ہے کہ اپنے ملک سے محبت کرے اور اس پر اپنی جان نثار کرنے کو تیار رہے، اشتراکی تنظیم کو زیادہ پختہ اور زیادہ کامیاب کرنے کے حوصلے کو زندگی کا مقصد سمجھے اور خیال اور عمل میں اپنے "رب" سٹالن کی فرماں برداری کرے۔ روسی قوم کا "رب" قومی جوش سے تعمیر کا کام لینا چاہتا ہے۔ لڑائی سے روسی قوم ہی کو نہیں، اس کے رب کی ربانیت کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہے، اسی وجہ سے ۱۹۳۵ء میں مانچوکو کی ریلیں جاپان کے ہاتھ بیچ دی گئیں، اور جون میں جب روسی جاپانی مسلح کشتیوں میں جھڑپ ہوگئی تو معاملہ بہت جلد رفع کر دیا گیا۔ منجملہ اور باتوں کے روس کے اس رویّے نے جاپان کو یقین دلا دیا کہ چین پر حملہ کرکے جتنی جلدی قصہ ختم کر دے اتنا ہی کم دوسروں کی دخل اندازی کا امکان ہوگا۔

اس وقت اگر انگلستان، امریکہ اور روس سیر اور مطمئن ہیں تو اٹلی، جرمنی اور جاپان بھوکے ہیں اور ہر طرف منہ مار رہے ہیں۔ دنیا کی سیاسی کشتی انھیں تینوں کی بیتابیوں کے سبب سے ڈگمگاتی رہتی ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ یہی اسے کسی نہ کسی دن ڈبوئیں گے۔

سیاسی رسّہ کشی کا دوسرا فریق

جنگ عظیم سے پہلے یورپی سیاست کا رنگ قریب قریب وہی تھا جو اس وقت ہے، جرمنی انگلستان اور فرانس سے ان کی تجارت اور سیاسی حیثیت چھین رہا تھا، اُن کی بعض نوآبادیوں پر حاوی ہونا چاہتا تھا، اور خاص بحر روم میں اٹلی کی یہ چال تھی کہ جرمنی کے زور پر اس محاذ کو توڑ دے جو انگلستان اور فرانس نے ہسپانیہ کی نیازمندی سے فائدہ اٹھا کر قائم کیا تھا۔ جب لڑائی چھڑ گئی تو اٹلی نے جرمنی کو دغا دی۔ جرمنی نے شکست کھائی مگر اٹلی نے بھی دھوکا کھایا، اور اٹلی کو صلح نامہ ورسائی سے جا اور بے جا اتنی ہی شکایتیں ہوگئیں جتنی کہ جرمنی کو آج کل ہیں۔ چنانچہ اٹلی نے ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۰ء تک فرانس، چکوسلواکیا اور رومانیہ کے اتحاد کو توڑ کر ایسی

ترتیب قائم کرنا چاہی جس میں اس کی حیثیت کم ازکم فرانس کے برابر ہو ، اور جب وہ اس میں کامیاب نہیں ہوا تو اس نے ہسپانیہ ، البانیہ ، ہنگری ، یونان ، ترکی ، آسٹریا سے دوستانہ تعلقات پیدا کئے ، اور اپنے آپ کو ان ریاستوں کا طرفدار ظاہر کیا جو صلح نامہ ورسائی پر نظر ثانی کرانا چاہتے تھے ۔ جرمنی نے صلح نامہ ورسائی کی مخالفت شروع کی تو اٹلی نے اُسے بھی سہارا دیا ۔ لیکن جرمنی کی نازی تحریک نے آسٹریا کی طرف پھیلنے کی کوشش کی تو موسولینی نے فوراً اپنے تیور بدلے ، آسٹریا کو جرمنی سے الگ رکھنے کے بارے میں فروری ۱۹۳۴ء میں انگلستان اور فرانس سے مل کر ایک مشترک اعلان شائع کیا ۔ اور ادھر آسٹریا اور ہنگری سے بھی باہمی تحفظ کا معاہدہ کیا جو روم پروٹوکول کہلاتا ہے ۔ اسی سال جون میں ہٹلر موسولینی سے ملنے آیا مگر اکتوبر میں پھر نازیوں نے آسٹریا کی حکومت پر قبضہ کرنا چاہا اور اس کے جواب میں موسولینی نے فرانس سے گفتگو شروع کی جس کا نتیجہ روم کا معاہدہ تھا (جنوری ۱۹۳۵ء) پھر جب مارچ میں ہٹلر نے اعلان کردیا کہ جرمنی صلح نامہ ورسائی کی پابندیوں کو تسلیم نہیں کرتا تو اٹلی ، فرانس اور انگلستان نے ایک مشترک رویہ اختیار کرنے کا ارادہ کیا جو سٹریزا کا محاذ کہلاتا ہے ۔

یہ موسولینی کی سیاست کا ایک پہلو ہے ۔ دوسرا پہلو اس وقت دیکھنے میں آیا جب اس نے حبش پر حملہ کیا ، اور انگلستان اور فرانس کے مشوروں کو ٹھکرانے اور ان کی عظمت اور طاقت کا منہ چڑھانے لگا ۔ موسولینی نے اس طرح پینترا بدلا تھا کہ انگلستان اور فرانس دونوں اچنبھے میں رہ گئے ، وہ لڑائی کے لئے تیار نہ تھے اور ان کی مخالفت شروع ہوئی تب بھی بہت ڈرتے ڈرتے ، مگر آخر میں انھوں نے اٹلی کو نیک چلن ، قوموں کی برادری سے خارج کردیا ۔ اس وقت جرمنی نے اٹلی کو سہارا دیا ۔ ہٹلر نے اٹلی کا تجارتی بائیکاٹ کرنے سے پہلے ہی انکار کردیا تھا ، اٹلی نے حبش فتح کیا تو اس نے سب سے پہلے اس کے قبضے کو تسلیم کیا ، اور اس کے معاوضے میں موسولینی نے جرمنی اور آسٹریا کے درمیان سمجھوتے کی جو کوشش ہو رہی تھی اس کی مخالفت نہیں کی ۔ ۱۹۳۶ء کے شروع سے اس وقت تک جرمنی اور اٹلی کے تعلقات بڑھتے رہے ہیں ، اور ہسپانیہ کی خانہ جنگی نے ان کی سیاست کو گویا ایک رنگ میں رنگ دیا ہے

جرمنی کی سیاست کا نیا دور ہٹلر کے برسرِ اقتدار ہونے سے شروع ہوتا ہے ۔ یہ سیاست غالباً

اندر سے کھوکھلی ہے، مگر ظاہری ہنگامہ آرائیوں میں سب سے آگے ہے۔ ہٹلر اکتوبر ۱۹۳۳ء میں لیگ سے علیحدہ ہوگیا، مارچ ۱۹۳۵ء میں اس نے صلح نامہ درسائی کو بیچ بازار میں، پھاڑ کر پھینکا اور اس کی قائم کی ہوئی فوجی پابندیوں کو ماننے سے ڈنکے کی چوٹ پر انکار کیا۔ ٹھیک ایک سال بعد اس نے مغربی جرمنی کے اُن علاقوں میں اپنی فوجیں بھیج دیں۔ جہاں صلح نامہ کی رو سے وہ نہیں رکھی جا سکتی تھیں، اور اب جو ایسی کوئی پابندی نہیں رہ گئی ہے جسے توڑ کر وہ اپنی قوت اور آزادی کا مظاہرہ کرے تو وہ نوآبادیوں کا مطالبہ کر رہا ہے۔ ہٹلر کی باتیں اس کے عمل سے بھی زیادہ ہنگامہ خیز ہیں۔ وہ دنیا کو یہودیوں اور بولشویکوں سے پاک کرنا چاہتا ہے۔ یہودیوں کو اس نے جرمنی سے نکال دیا ہے اور اب وہ اپنا سارا غصہ بولشویکوں پر اتارا کرتا ہے۔ اسی غصہ کی آڑ لے کر اس نے نومبر ۱۹۳۶ء میں جاپان سے ایک معاہدہ کیا جس کا مقصد بظاہر یہ تھا کہ کمیونسٹ اصولوں اور اُن کی تبلیغ کی مخالفت کی جائے، اور اسی غصے کی بنا پر وہ ہسپانی خانہ جنگی میں باغیوں کا ساتھ دے رہا ہے۔

ہسپانیہ کی خانہ جنگی میں "عدم مداخلت"

ہسپانیہ کی خانہ جنگی کو ڈیڑھ سال کے قریب ہوگیا ہے اور ابھی تک اس کے ختم ہونے کے کوئی آثار نہیں ۱۹۳۷ء کا پورا سال "عدم مداخلت" کی کوششوں میں گذرا اور کوئی کامیابی نہیں ہوئی، سوا اس کے کہ ابھی تک گفتگو کے لئے موقع باقی ہے۔ فروری تک بس "غیر جانب دار" ریاستوں کے لئے ایک دستور العمل تیار کیا گیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ ہسپانیہ کی خانہ جنگی کو ایک خالص ملکی مسئلہ بنا دیا جائے۔ غیر ملکوں کے رضاکار ہسپانیہ کے اندر داخل ہونے نہ پائیں اور باہر کے غیر قوموں کے جہاز سامان جنگ نہ پہنچانے پائیں۔ طریق عمل پر اتفاق اور مجموعی حیثیت سے تجویز پر عمل درآمد ہوتے ہوتے دو مہینے گذر گئے، اور اس دوران میں فرنیکو اور ہسپانی حکومت کو برابر باہر سے مدد پہنچتی رہی۔ چنانچہ مارچ میں جب میڈرڈ پر حملہ ہوا تو فرنیکو کی طرف سے چار اٹیلین دستے لڑ رہے تھے، اور جب "عدم مداخلت" کمیٹی کے ایک اجلاس میں غیر ملکوں کے رضاکاروں کو واپس بھجوانے کا مسئلہ پیش کیا گیا تو اٹلی کے نمائندے کاؤنٹ گراندی نے صاف صاف کہہ دیا کہ اٹلی کی فوجیں ہسپانیہ سے اس وقت تک واپس نہ بلائی جائیں گی جب تک

کہ کومیونسٹوں کا صفایا نہ ہوجائے گا۔ خدا خدا کرکے عدم مداخلت کے پروگرام پر عمل درآمد شروع ہوا۔ مگر اس کو ڈیڑھ مہینہ نہیں ہوا تھا کہ جرمنی کے ایک پہرہ دینے والے جہاز پر ہسپانی حکومت کے ہوائی جہازوں نے گولہ باری کی۔ جس کے بدلے میں جرمن جہاز نے ایک ہسپانی بندرگاہ پر گولے برسائے۔ پھر وسط جون میں ایک جرمن جہاز پر آب دوزوں نے حملہ کیا۔ اور اس واقعہ کے بعد جرمنی اور اس کے ساتھ اٹلی نے اعلان کر دیا کہ وہ عدم مداخلت کے مجوزہ پروگرام پر عمل کرنا مناسب نہیں سمجھتے عدم مداخلت کمیٹی نے برطانیہ سے درخواست کی کہ وہ سمجھوتہ کرا دے، اور برطانیہ کی طرف سے ایک لمبی چوڑی تجویز پیش ہوئی جس کا لب لباب یہ تھا کہ غیر ملکوں کے رضاکار ہسپانیہ سے بلائے جائیں اور سمندر پر فرنیکو اور ہسپانی حکومت دونوں کو وہ حقوق دے جائیں جو دو لڑنے والی ریاستوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن جب تجویز پر گفتگو شروع ہوئی تو اٹلی اور جرمنی کا اصرار تھا کہ فرنیکو کو حقوق پہلے دے جائیں اور رضاکاروں کے مسئلے پر بعد کو غور کیا جائے، باقی تمام اراکین اس کے خلاف تھے۔ اور پہلے رضاکاروں کے معاملے کو چکانا چاہتے تھے۔ یہ سوال زیرِ بحث تھا اور ایک طرف اٹلی اور جرمنی، دوسری طرف روس کی خوشامد کی جا رہی تھی کہ اچانک فرانسیسی اور برطانوی جہازوں پر گمنام ہوائی جہازوں اور آب دوزوں نے حملے شروع کئے اور پہرہ دینے والے جہازوں کی نوعیت اور اختیارات بدلنے کی ضرورت ہوئی۔ یہ مسئلہ ایسا نہیں تھا کہ عدم مداخلت کمیٹی کے اوپر چھوڑ دیا جائے، یونوں میں انگلستان اور فرانس نے ایک کانفرنس کی جس میں بلغاریہ، یونان، رومانیہ، ترکی، یوگوسلاویا، روس، مصر، اٹلی اور جرمنی کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی، مگر اٹلی اور جرمنی نے شریک ہونے سے انکار کیا تو اس کے باوجود انگلستان اور فرانس نے مشرقی اٹلانٹک کے زیرِ بحث حصوں اور بحرِ روم کو اپنے اور دوسری ریاستوں کے درمیان تقسیم کر دیا اور برطانوی اور فرانسیسی جنگی جہاز آب دوزوں کا سراغ لگانے میں مشغول ہوگئے۔ اٹلی کو برطانیہ اور فرانس کی تجویزوں پر یہ اعتراض تھا کہ انھوں نے اٹلی کو وہ حیثیت نہیں دی جو اسے اس کی طاقت کو دیکھتے ہوئے ملنا چاہئے، اور جرمنی نے اٹلی کی ہاں میں ہاں ملائی۔ لیکن جب بعد کو اٹلی کے سپرد بحرِ روم کا زیادہ حصہ کیا گیا تو وہ بھی راضی ہوگیا اور اس طرح ایک بڑا خطرہ دور ہوگیا۔

یہ خطرہ عدم مداخلت کے مسئلے سے بہت بڑا تھا اور ظاہر ہے کہ جب تک اس طرف سے اطمینان نہیں ہوا، عدم مداخلت پر گفت گو ملتوی رہی لیکن نیون کانفرنس کے فیصلوں میں اٹلی کو شریک کرکے اور اٹلی کی بحری قوت کو تسلیم کرکے بھی برطانیہ اور فرانس ہسپانیہ میں اپنا مطلب حاصل نہ کرسکے۔ اٹلی نے پہلے تو یہ منوالیا کہ ہر معاملے میں اس کے ساتھ جرمنی سے مشورہ کرنا اور اس کی رضامندی حاصل کرنا ضروری سمجھا جائے اور پھر کہا کہ عدم مداخلت کی کمیٹی جو کچھ طے کرے اس پر وہ عمل کرنے نہ کرنے کا حق محفوظ رکھے گا۔ فرانس اور انگلستان اس بات سے گھبرائے ہوئے ہیں کہ اٹلی نے میجورکا کے جزیرے پر قریب قریب قبضہ کرلیا ہے اور منورکا کی طرف ہاتھ بڑھا رہا ہے، اور فرانس کی تشویش اس وجہ سے اور بھی بڑھ گئی کہ اکتوبر میں اٹلی نے لبیا کو فوج اور سامان بھیجنا شروع کردیا۔ عدم مداخلت کی کمیٹی نے ۴ نومبر کو چند ریزولیوشن پاس کئے جن پر عمل کیا جائے تو عدم مداخلت کا معاملہ بہت کچھ سلجھ جائے گا لیکن اب روس عدم مداخلت کمیٹی سے علیحدہ ہوگیا ہے اور اٹلی اور جرمنی نے بھی اتحاد عمل کے بہت ہی مشروط اور کچے وعدے کئے ہیں۔

دراصل عدم مداخلت کی کمیٹی قائم صرف اس لئے ہوئی ہے کہ مداخلت کے لئے ایک آڑ مل جائے ہسپانی حکومت کے صدر سینور آزانا نے ۱۸ جولائی کو ایک تقریر کی جس میں انھوں نے کہا کہ ہسپانیہ برسوں سے اپنے پڑوسیوں کے ساتھ صلح اور دوستی برت رہا ہے۔ لیکن اب وہ" ہمارے کانوں، ہمارے خام مال، ہماری بندرگاہوں، ہماری آبناؤں، ہمارے بحری مرکزوں کے فراق میں آتے ہیں۔ اس نیت سے نہیں کہ ہمیں ستائیں بلکہ ان سیاسی قوتوں کو جن سے ہمارے دوستانہ تعلقات رہے ہیں۔" یعنی اٹلی کا مقصد یہ ہے کہ وہ ہسپانیہ، فرانس اور برطانیہ کے اس اتحاد کو توڑ دے جس کی بدولت انگریز اور فرانسیسی بحرروم کے مغربی حصے پر حاوی رہے ہیں اور چونکہ ہسپانی حکومت کو وہ کسی سازش میں اپنا شریک نہیں بنا سکتا اس لئے وہ خانہ جنگی میں مداخلت کرکے قوت کے پرانے توازن کو بگاڑنا چاہتا ہے۔ جرمنی نے جنگ عظیم سے پہلے ہسپانیہ اور فرانس کی افریقی نوآبادیوں میں اپنی تجارت کے قدم جمانا شروع کیا تھا اور وہ مغربی بحرۂ روم کے معاملات کو برطانیہ، فرانس اور ہسپانیہ کے نجی معاہدوں کی تحت سے نکال کر بین الاقوامی

معاملات کی حیثیت دینے کی فکر میں تھا۔ اب جرمنی پھر اسی فکر میں ہے، ہسپانی خانہ جنگی میں باغی کامیاب ہو جائیں تو غالباً ہسپانیہ، ہسپانی اور فرانسیسی مراکش اور افریقہ کے شمالی اور مغربی ساحل کی تجارت کا بہت بڑا حصہ جرمنی کو مل سکے گا۔ ظاہر ہے برطانیہ اور فرانس کو یہ منظور نہیں ہو سکتا، لیکن وہ کھل کر نہ کچھ کہہ سکتے ہیں اور نہ کر سکتے ہیں، وہ خانہ جنگی میں کسی فریق کی پوری پوری حمایت نہیں کر سکتے، کیونکہ حکومت کی کھلم کھلا مدد کرنے میں خوف ہے کہ پھر اٹلی اور جرمنی علانیہ باغیوں کے ساتھ مل جائیں گے اور فرنیکو پر اب بھی اگر احسان کرنے کی گنجائش ہے تو اس میں شک نہیں کہ اس کی کامیابی مغربی بحر روم میں قوت اور اثر کا ایک نیا توازن قائم کرے گی۔ لُطف تو یہ ہے کہ انگریز اور فرانسیسی ایمان داری سے عدم مداخلت پر بھی اصرار نہیں کر سکتے، اس لئے کہ اس میں اٹلی اور جرمنی کے بگڑ جانے ہی کا اندیشہ نہیں ہے بلکہ خود ان کو اس کی آزادی نہیں رہتی کہ جیسا موقع ہو ویسی ہی اپنے فائدے اور اپنے اثر اور اقتدار کے تحفظ کی تدبیریں کریں۔ پھر کیا تعجب ہے کہ عدم مداخلت کا ڈھونگ بنایا گیا ہے، اٹلی اور جرمنی کی نازبرداری کی جاتی ہے، اور انگریز اُن کے سامنے گویا ہاتھ جوڑے کھڑے رہتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک ادا ہے اور اسے بدلنے میں کچھ دیر نہ لگے گی۔

روم برلن کا محور عدم مداخلت کے مسائل نے یورپی سیاست میں وہ نیا منظر پیدا کیا جو روم برلن کا محور کہلاتا ہے، اور جس سے مراد یہ ہے کہ اٹلی اور جرمنی کے ارادے اور خواہشیں در اصل وہ محور ہیں جس پر یورپی سیاست گھومتی ہے۔ یہ محور سنہ ۳۶ء میں قائم ہوا اور یورپی سیاست نے سنہ ۳۷ء میں اس کے گرد چکر لگاتے لگاتے اس کو اور بھی مستقل اور مضبوط کر دیا ہے۔ اٹلی اور جرمنی کی حکومتیں ان دو برسوں میں ایک دوسرے کے نمائندوں کی خاطر تواضع کرتی رہی ہیں اور ستمبر سنہ ۳۷ء میں موسولینی کے جرمنی جانے سے بغیر کسی باضابطہ عہد و پیمان کے دونوں کی دوستی پر مہر لگ گئی۔ ملاقات کے سلسلے میں ہٹلر اور موسولینی کی جو تقریریں ہوئیں اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب تک عدم مداخلت کے مقابلے میں اٹلی اور جرمنی کے درمیان جو اتفاق رہا ہے وہ قائم رہے گا، جرمنی اٹلی کو بحر روم میں سہارا دے گا، اٹلی جرمنی کے اس مطالبے کی تائید کرتا رہے گا کہ اسے خام مال کے ذخیروں پر

وست رس ہونا چاہیئے اور نوآبادیاں ملنا چاہئیں، اور فرانس اور انگلستان کے مقابلے میں دونوں اپنا اتفاق اور اتحاد عمل جتائیں گے۔ روس اور کومیونزم کو برا بھلا کہتے کہتے فاشسٹ اور نازی عقائد کے مبلغوں نے ایک دوسرے سے مشابہت بھی محسوس کی ہے، اور ورسائی کے صلح نامہ کی مخالفت اور اس کے ڈگری داروں سے رقابت بھی اٹلی اور جرمنی کے اتحاد کو بڑھائے گی۔ لیکن اس کے ساتھ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ اٹلی کی سیاست ایک حد تک گیدڑ بھبکی ہے اور موسولینی کے جرمنی جانے کا ایک سبب شاید یہ بھی تھا کہ انگلستان اور فرانس کی نیازمندی میں کچھ فرق آ رہا تھا، اور آپ دونوں کے حملوں کا جواب انھوں نے اس قدر جلد اور ایسے قطعی طور پر دیا تھا کہ اٹلی کی جرمنی سے اپنی دوستی جتانے کی ضرورت پڑ گئی۔ دوسری طرف جرمنی فرینکو کے معاملے میں کچھ ٹھنڈا پڑ گیا تھا، اس لئے کہ فرینکو کے جلد کامیاب ہونے کی امید پوری نہیں ہوئی ہے اور نہ پوری نظر ہوتی آتی ہے، جرمنی اگر مایوس ہو گیا تو اٹلی کے منصوبے بھی رہ جائیں گے۔ بسمارک کا مقولہ ہے کہ ہر اتحاد گھوڑے اور سوار کا اتحاد ہوتا ہے۔ اور سمجھدار آدمی وہ ہے جو سوار بنے گھوڑا نہ بنے۔ اٹلی اور جرمنی کا اتحاد بھی اسی قسم کا ہے۔ لیکن ابھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دونوں میں گھوڑا کون ہے سوار کون۔

جاپانی سیاست

انگلستان اور فرانس اٹلی اور جرمنی کی چالوں کے جواب سوچنے میں مصروف ہیں۔ روس اور امریکہ اندرونی تنظیم میں، اور سب کی دشواریاں اور ذمہ داریاں اتنی ہیں کہ جب تک جان پر نہ بن آئے وہ کسی دور افتادہ محاذ پر لڑنے سے بچیں گے۔ جاپان نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر چین پر حملہ کر دیا۔ اٹلی جرمنی کی طرح بین الاقوامی مصالحت اور امن جاپان کے دل کو بھی لگا ہے، لیکن جیسے موسولینی اور ہٹلر اس کو ناممکن سمجھتے ہیں جب تک کہ ان کی قوت اور اقتدار کو سیاسی اور معاشی دنیا میں تسلیم نہ کیا جائے اور انھیں اتنی نوآبادیاں نہ مل جائیں کہ وہ اپنی تمام معاشی ضروریات پوری کر سکیں، ویسے ہی جاپان نے بھی بین الاقوامی امن کی خاطر اپنے آپ کو اس پر مجبور پایا کہ چین کو فتح کر لے

جاپان نے ۱۹۳۱ء میں مانچوریا پر قبضہ کیا اور اپنے قبضہ کو چین سے تسلیم کرا لیا۔ اس کے بعد اس نے آگے بڑھنے کی کوشش کی، اور مشرق میں چاہار۔ اور جنوب میں ہوپئی کے صوبے ہضم کرنا چاہے۔

اس میں وہ کامیاب نہیں ہوا۔ اگرچہ صوبوں کی حکومت میں اس کا خاصا اثر ہو گیا، اور نومبر سنہ ۱۹۳۶ء میں اس کے اشارے پر اور اس کی مدد سے مانچوکو اور اندرونی منگولیا کی فوجوں نے صوبہ سوئی یوآن پر حملہ کیا تو وہ بھی پسپا کر دی گئیں جب یہ حملہ ہوا تو چینی جاپانی حکومتوں میں گفتگو ہو رہی تھی اور جاپانی چاہتے تھے کہ چینی حکومت چاہار اور ہوپیئی کے مالی انتظامات سے اور بنکوں کو مرکز سے الگ کر دے، ان میں اور ریلیں بنوائے اور وہاں کے قدرتی ذخیروں، خاص طور پر لوہے کی کانوں سے فائدہ اٹھانے کی تدبیروں میں جاپان کی مدد کرے لیکن سوئی یوآن پر حملہ ہوا تو چینیوں نے مزید گفتگو سے انکار کر دیا۔ اس سے جاپان کے مطالبوں میں کوئی فرق نہیں ہوا۔ ستمبر سنہ ۱۹۳۶ء میں جاپان نے چند حادثوں کی آڑ لے کر جس میں جاپانیوں کو جان اور مال کا کچھ نقصان ہوا تھا چینی حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ اس کے خلاف ایجی ٹیشن بند کرنے کے لئے اخباروں کی نگرانی کی جائے، درسی کتابوں پر نظر ثانی کر کے جاپان کے خلاف ان میں جو کچھ ہو نکال دیا جائے۔ اس کو اسکولوں میں اپنے انسپکٹر بھیجنے کا حق دیا جائے۔ اس کے علاوہ چین سے یہ بھی کہا گیا تھا کہ وہ کوریا کے انقلابیوں کے سر کچلنے میں جاپان کی مدد کرے۔ یہ سب باتیں مان لی جائیں تو چین پر جاپان کی حکومت "مفت" میں قائم ہو جاتی، لیکن کہا جاتا ہے کہ جاپانی اس سے بھی زیادہ چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنا پرانا مطالبہ دہرایا تھا) کہ "کومینٹانگ" کی بیخ کنی میں چین ان کا ساتھ دے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ مطالبہ تھا کہ شمالی چین کے پانچ صوبے ایک خود مختار واحدہ بنا دیے جائیں

جاپان کے مطالبوں نے حد سے گذر کر دوا کا کام کیا، اور ستمبر اور دسمبر سنہ ۱۹۳۶ء میں مارشل چیانگ کائی شک کا ایک طرف اس پارٹی سے جو کانٹون اور جنوبی چین پر حاوی تھی اور دوسری طرف وسط چین کے صوبے شن سی کے سپہ سالار سے سمجھوتا ہو گیا۔ اسی کے ساتھ چین کے اور صوبہ داروں اور سپہ سالاروں نے چیانگ کائی شک کی ماتحتی کا اقرار اور ہر طرح کی امداد کا وعدہ کیا، اور سارے چین میں باہمی ارتباط اور ہم آہنگی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ جاپانی سیاست کے لئے یہ علامت بہت خطرناک تھی، اور اسی کا علاج کرنے کے لئے اس نے جنگ چھیڑ دی جبکہ چینیوں میں پس اتحاد کی صورت نظر آئی تھی، جاپان کے پاس لشکر کشی کی تفصیلات تک تیار تھیں اور اس نے اس کا بھی انتظام کر لیا تھا کہ کوئی غیر قوت چین کی مدد کو پہنچ

کہ اس کی مجوزہ فوجی کارروائیوں میں گڑبڑ نہ کر دے

جاپان ۱۹۳۳ء میں لیگ سے علیحدہ ہو گیا پھر اس نے اعلان کر دیا کہ وہ واشنگٹن کے معاہدہ پر جو ۱۹۲۲ء میں ہوا تھا اور جس کے مطابق وہ چین کے کسی معاملے میں ان نو ریاستوں سے مشورہ لئے بغیر جو اس معاہدے میں شریک تھیں کوئی کارروائی نہیں کر سکتا تھا، آیندہ عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے یہ بھی جتا دیا ہے کہ وہ ان مصلحتوں کو تسلیم نہیں کر سکتا جن کے خیال سے ۱۹۲۲ء کی واشنگٹن کانفرنس نے انگلستان، امریکہ اور جاپان کے جنگی جہازوں کی تعداد میں ۵ : ۵ : ۳ کا تناسب قائم کیا تھا۔ ۱۹۳۱ء میں جب اس نے مانچوریا پر حملہ کیا تو تو کسی غیر قوت نے اس کی روک ٹوک نہیں کی، لیگ نے اسے حملہ آور قوم ٹھہرایا۔ مگر انگلستان نے اس سے نجی معاملہ کر کے اسے مطمئن کر دیا اور فرانس نے اس کا کھلم کھلا ساتھ دیا۔ اس کے ڈپلومیٹک اعلانات کا بھی کسی نے جواب نہیں دیا، اگرچہ ان سے یہ نتیجہ نکلا تھا کہ اب تک جاپان نے جو وعدے کئے ہیں ان پر اعتبار کرنے والا احمق بنے گا۔ صرف ریاستہائے متحدہ نے فلپائن جزیروں کو آزاد کر دیا اور ہوائی جزیروں میں ایک بحری اور ہوائی مرکز قائم کیا جس کی تعمیر ابھی ختم نہیں ہوئی ہے اور برطانیہ نے سنگاپور میں ایک بحری مرکز بنایا۔ پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ جاپان مشرقی ایشیا کی سیاست کو ایک بالکل خانگی معاملہ نہ سمجھے، اپنی مصلحت کے مطابق ایشیا کے سیاسی استحکام کی تدبیریں نہ کرے۔ اور سب کے منہ پر یہ نہ کہے کہ مشرقی ایشیا میں انھیں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔

جاپان اور چین کی لڑائی کو شروع ہوئے ایک مہینہ گذر چکا تھا جب لیگ کو اس واقعے کی خبر ہوئی اور اسے یہ طے کرنے میں ایک مہینہ اور لگ گیا کہ جاپان کی کارروائی "مدافعانہ" جنگ نہیں مانی جا سکتی، جاپان کا بستیوں اور غیر مسلح آبادیوں پر بم برسانا قابل اعتراض ہے اور دونوں فریق صلح کر لیں تو بہت اچھا ہوگا۔ دوسری طرف انگلستان اور امریکہ اسی بمباری کے خلاف احتجاج کر کے رہ گئے۔ ۱۴ ستمبر کو پریزیڈنٹ روزولٹ نے قانون غیر جانب داری کے مطابق سرکاری جہازوں کو حکم دیا کہ چین یا جاپان کو سامان جنگ نہ پہنچائیں، لیکن غیر سرکاری جہاز چاہتے تو ایسا کر سکتے تھے۔ اس سے چین کے ہاتھ اور بند

گئے ، اور جاپان انگلستان اور امریکہ سے خریدے ہوئے ہوائی جہازوں اور ڈچ مشرقی ہند سے خریدے ہوئے پٹرول کی بدولت چینی بستیوں کو ویران کرتا رہا ۔ انگلستان نے اسی وقت سانس لیا جب شروع اکتوبر میں پریزیڈنٹ روز ولٹ نے ایک تقریر میں جاپان پر زیادتیاں کرنے کا الزام لگایا اور امریکہ والوں سے کہا کہ اگر انھوں نے دنیا کے حالات سے بے رخی برتی تو امن قائم رکھنا مشکل ہو جائے۔ انگلستان کے وزیر اعظم نے اس تقریر کی بہت تعریف کی اور جھٹ سے برسلز میں ایک کانفرنس کا انتظام کیا گیا لیکن جاپان نے کانفرنس میں شریک ہونے سے انکار کر دیا ۔ اٹلی نے صاف ظاہر کر دیا کہ وہ جاپان کے خلاف کسی کارروائی میں شریک نہ ہوگا اور جرمنی نے اس کی تائید کی۔ انگلستان کی کوشش تھی کہ کانفرنس کے فیصلوں کی ذمہ داری امریکہ کے نمائندے پر ڈالی جائے ۔ مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی اور انگریز اس راز کو بھی نہ چھپا سکے کہ انھیں چین کو مدد پہنچانے کا خیال نہیں ہے بلکہ ایسی کارروائی سے بچنے کی فکر ہے جس سے جاپان کے بگڑ جانے کا اندیشہ ہو ، کیوں کہ جاپان سے اُن کا سارا معاملہ نجی طور پر ہوا ہے اور جاپان کی وعدہ خلافی سارا کام بگاڑ دے گی ۔

برسلز کانفرنس خود غرضی اور پست ہمتی کا مظاہرہ بن کر رہ گئی ، مگر دوسری طرف ۶ نومبر کو اٹلی ، جرمنی اور جاپان کے درمیان معاہدہ ہوا جس کے رو سے اٹلی اس معاہدے میں شریک مانا گیا جو ۲۵ نومبر ۱۹۳۶ء کو جرمنی اور جاپان کے درمیان ہوا تھا اور جس کا مقصد بولشوک پروپگنڈا کی مخالفت تھی ۔ واقف کار لوگوں کا خیال ہے کہ اس معاہدے میں کچھ بھید بھی ہے ، اور ۸ نومبر ۳۷ء کو ہٹلر نے ایک تقریر بھی کی جس میں روم برلن کا محور یورپی سیاست کا اور روم برلن ٹوکیو کا مثلث عالم گیر سیاست کا مرکز بنایا گیا اور اس کا اعلان بھی کیا گیا کہ یہ مثلث ایسی ریاستوں کا اتحاد ہے جنھوں نے اپنے حقوق اور اہم اغراض کے تحفظ کا تہیہ کر لیا ہے ۔

اب بے چارے چین کی مدد کرنے والا کوئی نہیں ہے ۔ لیکن انسانی اخلاق سے اس طرح بے رخی برتنا جیسے کہ ریاستیں آج کل کر رہی ہیں آخر میں سب کے لئے مضر ہی ثابت ہوگا ۔ جاپان کے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہے کہ مانچوکو سے پورا فائدہ اُٹھا سکے ۔ چین فتح بھی ہو گیا تو اس پر قبضہ رکھنے میں بڑی

دشواریاں پیش آئیں گی اور سرمائے کی کمی یقیناً جاپان کو دوسری قوموں کے لئے چین میں گنجائش نکالنے پر مجبور کرے گی۔

چین پر حملہ جاپان کی فوجی پارٹی کے اصرار پر کیا گیا ہے۔ یہ پارٹی سیاسی اور معاشی مصلحتوں کو نہیں سمجھتی اور سیاسی آداب کیا انسانیت کو بھی نہیں مانتی ، اور بہت ممکن ہے اس پارٹی کا شیطانی غرور جاپان کو ایسی مہموں میں الجھا دے جن کا بار ملک کے موجودہ معاشی نظام سے نہ اُٹھایا جا سکے امریکہ اور یورپ کی ریاستیں یہ سمجھے بیٹھی ہیں کہ جاپان کا پیٹ اتنا بڑا نہیں ہے کہ وہ سارے چین کو ہضم کر جائے۔ اور انھیں بھی خاصا حصہ ضرور ملے گا۔ لیکن جاپان کو پیٹ ہی بھرنے کی ضرورت ہوتی تو اس کے لئے مانچوکو بہت کافی تھا۔ اس کی نیت بھرنے کے لئے ممکن ہے پورا چین بھی کافی نہ ہو اور وہ چین کا بٹوارہ کرنے کی جگہ اور کچھ مانگ بیٹھے۔ ادھر یورپ میں دیکھئے تو انگلستان اور فرانس اپنی پونجی محفوظ رکھنے کی خاطر فاضلات ایک ایک کرکے فاشسٹ قوتوں کے حوالے کر رہی ہیں مگر وہ وقت بھی دور نہیں ہے جب انھیں اپنی پونجی خطرے میں نظر آئے گی۔ انگلستان جمہوریت کی پشت پناہ ہوتے ہوئے فاشزم کی درپردہ امداد کر رہا ہے اور عالمگیر جنگ سے بچنے کا بہانہ کرکے اٹلی کی گستاخیاں برداشت کر رہا ہے۔ اس رویے سے برطانیہ کی بین الاقوامی حیثیت کو صدمے پہنچ رہے ہیں اور بہت جلد ایسی صورت پیدا ہو سکتی ہے کہ انگلستان کی اتنی حیثیت بھی نہ رہنے کا خطرہ ہو جو اس کے سامراج اور تجارت کی سلامتی کے لئے لازمی ہے۔ ابھی تو فاشسٹ اور جمہوری، کومیونسٹ اور سرمایہ دار سب قسمیں کھاتے ہیں کہ اس عالم کا ہم سے بڑھ کر کوئی دلدادہ نہیں لیکن دنیا کی سیاست اور معیشت اس قدر پیچیدہ ہو گئی ہے کہ اغراض اور مقاصد کا اچانک ایسا تصادم ہو جانا بہت ممکن ہے جو جھوٹ اور دھوکے پر قائم کئے ہوئے نظام کو درہم برہم کر دے۔ اور اس ساری کمائی کو گنوا دے جس کی خاطر یہ طومار باندھا گیا ہے۔

اِسلامی دنیا

یوں تو دنیا جب سے بنی ہے بدل ہی رہی ہے لیکن ادھر چند برسوں سے اس کے بدلنے کے ڈھنگ اور ہو گئے ہیں، پہلے غیروں کو تو چھوڑئیے اپنوں کو ایک دوسرے کی بپتا کی خبر نہ ہوتی تھی، اب یہ حال ہے کہ کہیں اسپین میں جنگ کی چنگاری چمکتی ہے تو اس کے شعلے اُٹھ اُٹھ کر پورب پچھم کے خرمنوں کو تکنے لگتے ہیں۔ فلسطین میں گولی چلتی ہے تو اس کی آواز بٹاویا سے طنجہ تک کی فضا کو گونجا دیتی ہے، دوسری بات اس زمانہ کی انوکھی یہ ہے کہ اگلے وقتوں میں زمانہ چیونٹی کی چال چلتا تھا، پر اب تو وہ اپنی تیز رفتاری میں بجلی کو پیچھے چھوڑ رہا ہے۔ دسمبر ۳۶ء کی دنیا کا مقابلہ دسمبر ۳۷ء سے کیجئے، آپ کو دوسرا ہی عالم نظر آئے گا، خاص طور پر اسلامی ممالک میں نئے زمانے کی انقلابی روح اپنے پورے شباب پر ہے، نتیجہ! ایک ہمہ گیر انقلاب اور وہ بھی برق پا، ایک برس میں جو مسافت قطع ہوتی ہے پہلے کئی برسوں میں اس کا طے کرنا ناممکن دکھائی دیتا تھا۔ دنیا کے کسی سیاسی سمندر میں کہیں جوار بھاٹا اُٹھتا ہے تو اس کی موجیں دنیائے اسلام کو ضرور ہچکولے دے رہی ہیں، یورپی سلطنتوں کی رقابتیں، عربوں کی کھیتی کو پروان چڑھانے میں دنوں میں وہ کام کر رہی ہیں جس کے لئے ان کو برسوں تک خون پسینہ ایک کرنا پڑتا۔

شمالی افریقہ

مراکش، الجزائر اور ٹیونس کے متعلق کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ یہاں کے باشندے اپنے آپ کو فرانسیسی رنگ میں رنگنے سے بچا سکیں گے، جاہل تو جاہل تھے ہی، پڑھے لکھے اور بھی گئے گذرے تھے۔ عربی سے نابلد اور مذہب سے بیزار، اسلام کی صورت کم نظر علماء اور خرقہ فروش صوفیوں نے اتنی گھناؤنی بنا دی تھی کہ نوجوان اس کے نام سے بدکتے تھے، بدیسی حکومت چاہتی تھی کہ اُن کو اپنے حسب و نسب سے بیگانہ اور ملک و ملت سے متنفر کر کے انھیں فرانسیسی بنا دیا جائے، اور مراکشی عربوں کی اپنے وطن میں وہی حیثیت ہو جو کالے حبشیوں کی سرزمینِ امریکہ میں ہے۔ فرانس نے اپنے تمدن کو خوش رنگ بنانے اور اسلام کو بدنما

کرنے میں اپنا تمام زور صرف کر دیا، امید تو تھی کہ پرانی نسل کے مٹتے ہی مراکش سے اسلام، عربی تمدن اور عربی زبان مٹ جائے گی لیکن ہوا اس کے بالکل برعکس۔

اسلامی مشرق سے نئے خیالات کی گھٹا اٹھی جو ٹیونس، الجزائر اور مراکش کی تمام بستیوں پر برستی چلی گئی ساتھ ہی عام اقتصادی بدحالی، دیہی آبادی کی بے اطمینانی اور اہل حرفہ کی تباہی نے ملک میں ایک سیلاب پیدا کر دیا جس کے سامنے فرانسیسیوں کے تمام تمدنی کارنامے اور علمی کوششیں خس و خاشاک ثابت ہوئیں، فرانس سے دشمنی اور فرانسیسی تمدن سے نفرت نئی نسل کا شعار بنی۔

اس سال اسپین کی خانہ جنگی اور فرانس سے اٹلی اور جرمنی کی رقابت نے مراکشیوں کے دل میں سلگتی ہوئی آگ کو اور ہوا دی چنانچہ قوم پرست نوجوانوں نے کھلم کھلا حکومت کی مخالفت کی ٹھانی اب معاملہ احتجاج سے گذر چکا ہے۔ مراکشی کچھ اتنے ہیٹے بھی نہیں کہ فرانس کی فوج اور پولیس کا مقابلہ نہ کر سکیں ظاہر ہے ان حالات میں قتل و خون ہوگا، اب فرانس ایک طرف صلح و صفائی کی تدبیریں کر رہا ہے اور اپنی سابقہ حکمت عملی میں تبدیلی کا وعدہ کرتا ہے، اور دوسری طرف اپنی ہوائی قوت بڑھا رہا ہے۔ بہرحال وہ مراکشی جو چند برس پہلے ایک فرانسیسی فوجی افسر کے قول کے مطابق خنزیر کھاتے اور ساتھ ساتھ شراب پیتے تھے، اب ایک نئی روح سے سرشار ہیں، بے شک فرانس کا مقابلہ کرنا آسان نہیں لیکن قوموں کی کھیتیاں خون سے ہی سینچ کر پھل پھول لاتی ہیں، اور افریقہ کے عرب اور بربر خون بہانے میں کچھ زیادہ بخیل بھی نہیں۔

طرابلس طرابلس سے اٹلی کو سونا اور تیل تو ملنے سے رہا البتہ ساحلی علاقوں میں انگور اور زیتون کی کاشت کے لئے کچھ زمینیں ہاتھ آگئیں، اب مسولینی کو سوجھی کہ طرابلس کے چند لاکھ عربوں سے کچھ اور کام لے۔ قتل کے بعد جفا سے تو یہ کر لینا کچھ اتنا مشکل تو ہے نہیں اور اس قسم کی پشیمانی کو دنیا "زود پشیمانی" کہا کرے لیکن سچ یہ ہے کہ کچھ زیادہ بے اثر نہیں رہتی۔ اہل طرابلس کے نصیب جاگے، مسولینی طرابلس تشریف لے گئے نیوز ایجنسیوں کے قول کے مطابق جو ظاہر ہے اطالوی تھیں موصوف کا شاندار استقبال ہوا آپ نے عربوں کو یقین دلایا کہ ان کے ساتھ پورا پورا انصاف ہوگا، اور حکومت کی طرف سے کسی قسم کی زیادتی

نہ ہو گی اُلٹے ہاتھ آپ نے "محافظ اسلام" ہونے کا اعلان کر دیا، اور دنیا جہاں نے صور اسرافیل کی طرح یہ سُن لیا کہ آج سے اٹلی اسلام کا دوست ہے۔

میسولینی کی "اسلام دوستی" کا مسلمانوں کو کیا یقین آتا، اور طرابلسی پناہ گزیں جو ہزاروں کی تعداد میں مصر میں زندگی گذار رہے ہیں۔ کیسے مان لیتے کہ کل کے بھیڑیے آج صلح پسند انسان بن گئے لیکن اس کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ اہل طرابلس کو کچھ قدرے آرام ملا۔ اور فرانس کے کان کھڑے ہوگئے ٹیونس الجزائر اور مراکش کے عربوں نے دیکھا کہ اُن کے بھائی جو اٹلی کے ماتحت ہیں اُن تمام مظالم سے بچ گئے ہیں جن کا وہ شکار ہو رہے ہیں۔ فرانس سے بیزاری تو تھی ہی اب میسولینی کی اس چال نے انھیں اور بھی بیزار کر دیا ہے۔ ساتھ ہی طرابلس میں اٹلی کی فوجیں پہنچ رہی ہیں۔ معلوم نہیں فوجوں کی اس نقل و حرکت سے میسولینی کا مقصد کیا ہے۔ انگریزوں کو دھمکانا یا فرانس سے ٹیونس کا ہتھیانا۔

طرابلس کی آزادی تو ابھی بہت دور کی چیز ہے۔ البتہ سیاسی دنیا کی ہماہمی نے ان صحرا نشینوں کو اپنی اہمیت کا یقین دلا دیا ہے اور اپنی اہمیت کا یقین وہی ہے جو آگے چل کر قوموں کی قسمت بدل دیتا ہے۔

مصر

اٹلی اور حبش کی جنگ سے مصر نے پورا پورا فائدہ اُٹھایا، نومبر ۱۹۳۵ء میں طلبہ کے ہنگامے شروع ہوئے۔ ۱۹۳۶ء کے آخر تک کافی خوں خرابہ کے بعد مصری برطانی معاہدہ طے پا سکا اس سال کی ابتدا ہی میں معاہدہ کا نفاذ ہوا، برطانی ہائی کمشنر نے سفیر کا نام پایا، انگریزی فوجی افسر رخصت ہو گئے۔ اور اُن کی جگہ برطانی فوجی مشن آن موجود ہوا، اجنبی مراعات کے متعلق مونترو کے مقام پر یورپی حکومتوں سے سمجھوتہ ہوا۔ وفد کے صدر نحاس پاشا مونترو سے لوٹے تو جمعیت اقوام میں داخلہ کے لئے جینوا پہنچے، بہر حال مصر آزاد ہو گیا۔ نحاس پاشا فاتحانہ شان و شوکت سے وطن آئے تو ملک میں مخالفین نے کافی ہوا باندھ لی تھی۔ معاہدہ پر اعتراضات تھے اور وہ تھے برمحل، مونترو میں مصری وفد نے دب کر اجنبی حکومتوں سے سمجھوتہ کیا، اعتراضات سننے کی یہاں کسے تاب تھی، ہوا یہ کہ سیاسی پارٹیاں باہم دست گریباں ہونے لگیں، وفد پارٹی کی اکثریت ہے اس لئے وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے،

مخالفین کو اپنے حق بجانب ہونے کا یقین ہے اس لئے وہ مخالفت سے باز نہیں آتے ، نہ حکومت میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ وطن کے مفاد کے لئے اقلیت کی بات مان لے ۔ اور نہ اقلیت اصول سیاست پر عامل ہے کہ رائے عامہ کو ہم نوا کرنے کے لئے شریفانہ طرز عمل اختیار کرتی ، گالی گلوچ سے نوبت مار پیٹ تک پہنچی اور ایک سرپھرے نے نوحاس پاشا کو ٹھکانے لگانے تک کی جرأت کرلی ، مصر کی سیاسی زندگی کا یہ گھناؤنا پہلو اس سال کا سب سے بڑا افسوسناک سانحہ ہے ، اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کیا ہوسکتا ہے کہ مصر کی موجودہ نام نہاد آزادی بھی بے معنی ہوکر رہ جائے ، اور آخر انگریزوں کو ثالث بن کر تمام نظم ونسق کو اپنے ہاتھ میں لینا پڑے ہے ۔ جس طرح وہ گذشتہ پچاس برس کے عرصے میں بارہا کر چکے ہیں ۔

مصر کی سیاسی زندگی تو ہمارے لئے صرف ایک سرمایہ عبرت ہی ہے ، لیکن وہاں کی اجتماعی اور دینی تحریک ہندوستانی مسلمانوں کے لئے مشعل راہ کا حکم رکھتی ہے ۔ وادی نیل کی سرزمین میں سب سے پہلے مشرقی یعنی اسلامی اور مغربی تمدن کی ٹکر ہوئی ۔ مشرق بے بس تھا اور زار ونزار اور مغرب جوان ، چوکس اور چوبند ، نتیجہ اول الذکر کی شکست اور سرافگندگی اور موخر الذکر کے غلبہ اور اقتدار کے اور کیا ہوسکتا تھا ۔ ایک صدی اسی بے بسی میں گذری ، جنگِ عظیم نے پہلی بار مشرق کو سر اٹھانے کی ہمت دلائی ۔ مغربی اقتدار بالفعل تو باقی رہا لیکن اس کا طلسم ٹوٹ گیا ، اور اس کے ساتھ مغربی تمدن کی برتری کا پول بھی کھل گیا ۔ نوجوان اپنی پرانی لکیر چھوڑکر ایک عرصے سے مغربی بتوں کے پجاری بن چکے تھے اب جو وہ بت ٹوٹے تو نئی راہ کی تلاش ہوئی ، آج ہر نوجوان کے دل میں نئی راہ پانے کا ولولہ ہے ، اور ان کا اضطراب ، الحاد اور سرکشی ، نتیجہ یہ ہے اسی ولولہ ہی کا ، خوش قسمتی سے اس نئی راہ کو ڈھونڈھ نکالنے کے لئے مصر کی فضا اور اسلامی ملکوں سے زیادہ سازگار ہے ۔ مصر ہی میں جمال الدین افغانی نے درسِ حکمت کی مسند بچھائی ، شیخ محمد عبدہٗ نے جمود اور تنگ دلی کے طلسموں کو توڑا ، ازہر نے جہاں تک ہوسکا اہل مصر کو مذہب سے بیگانہ نہ ہونے دیا ۔ مصر میں نہ ترکی کی سی انتہا پسندی ہے اور نہ ہندوستان کا سا جمود ۔ اگر شیخ مصطفےٰ مراغی مصر میں نہ پیدا ہوتا تو اور کہاں

موصوف صحیح معنوں میں مجدد بن سکتے ہیں، اور اس نازک دور میں تجدید کے بغیر اسلام کے بقا کی اور کیا صورت ہو سکتی ہے۔

ازھر کی اصلاح کا اثر صرف دینی عقائد اور مذہبی مسائل تک محدود نہ رہے گا بلکہ اگر موجودہ شیخ الازہر مصطفےٰ مراغی اپنے مبارک ارادوں میں کامیاب ہو گئے تو اصلاح شدہ ازھر دنیائے اسلام کا دینی اور اجتماعی مرشد بنے گا اور اسی کے طفیل سرزمین حجاز سے مدتوں بھٹکا ہوا راہی پھر اسی ارض مقدس کو اپنا قبلہ بنائے گا۔ ضرورت ہے کہ ہم ترکی کے انقلاب کے ساتھ مصر کے تدریجی ارتقا کو بھی اپنے سامنے رکھیں۔

سوڈان اور حبش

انگریزوں نے ۱۸۸۲ء میں مصر پر قبضہ کیا۔ قبضہ غاصبانہ تھا، اور خود اپنی زبان سے اُسے وقتی اور عارضی کہتے تھے۔ اسے دائمی بنانے کے لئے انھوں نے سوڈان پر ہاتھ بڑھایا، مصری چیختے ہی رہے لیکن سوڈان پر برطانی نظم ونسق کا جال بچھ گیا۔ تقریباً پچاس برس تک برطانیہ سوڈان والوں کو یہ تعلیم دیتا رہا کہ تم ایک ملت ہو، مصریوں سے تمھارا کوئی تعلق نہیں یہاں تک کہ مصر والوں کا سوڈان جانا بند کر دیا۔ جب حبش پر اٹلی نے اقتدار جمایا تو برطانیہ کو سوڈان کی فکر ہوئی۔ اب برطانی نقار خانے سے یہ صدا بلند ہوئی کہ مصری اور سوڈانی دونوں ایک ملت ہیں، دونوں کا مذہب ایک، زبان ایک اور قومیت (عربی) ایک۔ چنانچہ برطانی مصری معاہدہ کے بعد سوڈان میں مصری اثر بڑھنے لگا ہے، ازھر کے علمار تبلیغ و تدریس کے لئے سوڈان بھیجے جا رہے ہیں۔ برطانی مصلحت کا تقاضا ہے کہ سوڈان اور مصر دونوں ایک ہو کر مضبوط بن جائیں تاکہ وہ اٹلی کے سامراج کے لئے تر نوالہ نہ بن سکیں۔

اخبارات کا بیان ہے کہ حبش کے مسلمانوں پر مسولینی کی خاص نظر عنایت ہے۔ بعض لوگوں کا تو خیال ہے کہ وہاں مسلمان پوری آبادی میں آدھے سے زیادہ ہیں، بہرحال یہ یقینی ہے کہ وہ تیس چالیس فیصدی ضرور ہیں، اگر افریقہ میں مسلمانوں کو سنبھلنے اور اپنی حالت درست کرنے کے مواقع ملتے رہے، اور یورپی سلطنتوں کی حریفانہ کش مکشوں نے انھیں اطمینان کا سانس لینے

دیا تو مشرقِ قریب کی طرح وسطا فریقہ بھی اسلامی بن جائے گا۔

یمن اور حجاز و نجد

یمن گمنامی کی زندگی سے باہر آتا نظر نہیں دیتا، امام یمن حمیدالدین پکے قدامت پرست ہیں۔ کہتے ہیں اُن کا طرز حکومت پرانے زمانے کے بادشاہوں کی پوری نقل ہے۔ ملک میں صرف ایک اخبار ہے اور وہ بھی ماہوار اور کل چار صفحے کا، روپیہ جمع کرنے کا بہت شوق ہے، نہ تعلیم کا خیال ہے اور نہ زمانے کی نزاکت کا احساس۔ اٹلی برسوں سے یمن پر نظر جمائے بیٹھا ہے۔ دونوں میں دوستانہ عہد نامہ بھی ہو چکا ہے لیکن انگریز کی جان کو دعا دیجئے کہ میسولینی اب تک یمن کو ہضم نہیں کر سکا۔

نجد و حجاز کی حالت یمن سے تو بہتر ہی ہے لیکن اصلاح و ترقی کے راستے پر اس کے قدم بھی کچھ سست ہی پڑ رہے ہیں خاندانی استبدادی حکومت کی وجہ سے وہاں قومی حکومت کا خیال عام نہیں ہوا اور عرب قومیت کا وہ جنون جو عراق، شام اور فلسطین کے باشندوں پر سوار ہے یہاں اس کی افسوسناک حد تک کمی ہے۔ استبدادی خاندانی حکومتیں کسی زمانے میں موزوں ہوتی ہوں گی لیکن سچ یہ ہے کہ اب تو ان کا دور دورہ قومی زندگی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گیا ہے

شام

۱۹۳۶ء کے شروع ہی میں شام اور فرانس کا معاہدہ طے پا گیا۔ نئے انتخابات میں قوم پرستوں کو غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ اور معاہدہ کی رو سے شام ۱۹۳۹ء میں کہیں جا کر آزاد ہوگا اور یہ آزادی عراق اور مصر کی سی ہوگی بلکہ اگر سچ پوچھئے تو شام کی آزادی اپنے اِن دو ہمسائیوں سے بھی گئی گذری ہوگی۔ عراق کو موصل کے چشموں نے مالا مال کر دیا ہے اور مصر کے لئے نیل دھن دولت ہے لیکن بے چارا شام ان دونوں نعمتوں سے محروم ہے، اور ان کے بدلے میں اسے اگر ملا ہے تو نصف درجن اسلامی فرقے اور تقریباً نصف درجن ہی عیسائی فرقے جو ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں۔ اور ان میں پائدار اتحاد ہونا کافی محنت طلب ہے۔

شام کو کچھ تو فرانس نے ان سترہ برسوں میں لوٹا ہے، اور رہا سہا قومی تحریک کے خونریز ہنگاموں کی نذر ہوا۔ لبنان کا صوبہ ہرا بھرا ہے، لیکن فرانس نے اُسے علیحدہ جمہوریت بنا دیا ہے۔

شامیوں کے سر پر فرانس کا یہ بھی بڑا احسان ہے کہ اس نے ازراہِ کرم باقی تین جمہوریتوں کو شام کے ساتھ ملحق کردیا ہے۔ اچنبھے کی بات یہ ہے کہ شام ذرا سا تو ملک ہے لیکن فرانس نے اس کو چار پانچ جمہوریتوں میں تقسیم کردیا، نتیجہ یہ ہے کہ اب ان کو یک جا کر کے شامی ملت کا بنانا قوم پرستوں کے لئے مشکل ہو گیا ہے۔ ذاتی کدورتیں مذہبی عناد کی شکل اختیار کرلیتی ہیں اور شیعہ اور سنی، اور مسلمان اور عیسائی کی دشمنی ملی شیرازہ کو منتشر کردیتی ہے۔

شامی قوم پرستوں کی راہ بڑی کٹھن ہے، عربی سربلندی کا جنون اور قومی عزت کا غرور اگرچہ مصیبتوں میں ہراساں نہیں ہونے دیتا لیکن اجڑے ہوئے باغ کو نئے سرے سے ہرا بھرا کرنا بڑی محنت اور قربانی چاہتا ہے۔ شامی محنت میں تو مشہور ہیں ہی اب رہنماؤں کے ایثار اور جذبہ ملی کا امتحان ہے۔

عراق اکتوبر ۱۹۳۶ء میں بکر صدقی نے عراق میں فوجی انقلاب کردیا، وزرا سہم گئے، جس کے جہاں سینگ سمائے چھپ کر جان بچائے گیا۔ سلیمان حکمت نئی وزارت کے صدر بنے، بکر صدقی فوجی آدمی تھا، زبان اور قلم کی بجائے بندوق اور پستول سے کام لیا، مخالفین موت کے گھاٹ اترے اور پھر کسی کو مخالفت کرنے کی جرأت نہ رہی۔ بکر صدقی کا رجحان ترکوں کی طرف زیادہ تھا اور وہ اتحادِ عرب تحریک کا زیادہ حامی نہ تھا۔ بظاہر حالات نئی وزارت کے لئے ساز گار نظر آتے تھے، اور ہر طرف امن تھا لیکن یکبارگی یہ اطلاع ملی کہ ۱۱ اگست کو موصل کے ہوائی اسٹیشن میں بکر صدقی ایک سپاہی کی گولی کا نشانہ بنا۔ پانچ دن بعد سلیمان حکمت کی وزارت بھی ٹوٹ گئی اور جمیل المدفعی وزیر اعظم ہوئے، ابھی حال میں پارلیمنٹ کے نئے انتخابات ہوئے، جن میں حکومت کے حامیوں کی جیت ہوئی، عراق کا مشہور مدبر یٰسین نوری اور جمیل المدفعی میں اتحاد ہو گیا ہے۔ اور اب یہی اعتدال پسند گروہ کافی عرصے تک برسرِ اقتدار رہے گا۔

فلسطین کے ہنگامہ سے عراقی رائے عامہ بہت متاثر ہے، اور برطانی حکمت عملی کے خلاف نہایت سخت احتجاج کیا جارہا ہے، گذشتہ ستمبر دمشق کے قریب بلودان کے مقام پر عرب رہنماؤں کا

ایک اجتماع ہوا جس کے صدر عراق کے ہی ایک سابق وزیراعظم تھے۔ اس اجتماع میں عرب ملکوں کے چار سو نمائندے شریک ہوئے، فلسطین کا معاملہ زیرغور تھا، کانفرنس نے برطانیہ کی عرب دشمن پالیسی کی مذمت کی، اور برطانی سیاست دانوں کو متنبہ کر دیا کہ وہ فلسطین میں عربوں پر مظالم توڑ کر مشرق قریب کے ممالک میں اپنے وقار کو ختم کر رہے ہیں۔

عراق کے شیعہ اور سنی وطن پروری کی رو میں آپس کے جھگڑے اور پرانے کینہ بھول رہے ہیں اب نہ شیعوں کا غلو سنیوں کے خلاف باقی ہے اور نہ سنی اپنے بھائیوں کو نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ مفادِ وطن نے سب کو بھائی بھائی بنا دیا ہے، سب عرب ہیں اور عراقی۔ اس لئے آپس میں لغض و حسد کیوں ہو۔ عراق میں مزدور تحریک کا بھی چرچا ہے اور اشتراکی خیالات بھی عام ہیں۔ لیکن یہ تحریک ابھی انقلابی نہیں ہوئی

ترکی جنگ حبش کے دوران میں ترکی حکومت نے برطانیہ کی ہمنوائی کی تھی اور اٹلی کے خلاف اقتصادی قیود عائد کرنے میں ترکی بھی شریک ہوا تھا۔ گذشتہ سال درہ دانیال کو مسلح کرنے کا حق بھی اس نے یورپی سلطنتوں سے منوا لیا اور اس سال سنجق اسکندرونہ کا جھگڑا بھی ترکی کے حسبِ منشا رطے ہو گیا۔

سنجق اسکندرونہ کی جنگی اہمیت کا تقاضا ہے کہ ترک اس کو نہ فرانس کے ہاتھ میں چھوڑ سکتا ہے اور نہ اس پر شام کا قبضہ ہی برداشت کر سکتا ہے، اس علاقہ کا رقبہ ۴ ہزار کیلومیٹر ہے اور کل آبادی میں سے تقریباً ۱۸۰۰۰۰ ہے ترک ۸۵۰۰۰ سے زیادہ نہیں یہاں پر حلب، استنبول اور بغداد سے آنے والی ریلوے کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور آگے چل کر ایران کو باہر کی دنیا سے تجارت کرنے کے لئے بھی اس بندرگاہ سے کام لینا پڑے گا۔ ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۶ء کے معاہدوں میں ترک اس علاقے سے دستبردار ہو چکے تھے۔ لیکن فرانس نے یہ منظور کر لیا تھا کہ اسکندرونہ کے ترکوں کو تمدنی آزادی حاصل ہوگی، اور جہاں اُن کی اکثریت ہے وہاں کا تمام نظم و نسق ان ہی کا ہوگا۔ اب ۱۹۳۶ء میں شام سے فرانسیسی حکم برداری ختم کرنے کی تجویز ہوئی تو ترکی نے اسکندرونہ کے معاملے کو اٹھایا۔ ترکی کا کہنا یہ ہے کہ

شام کے ماتحت اسکندرونہ کے ترکوں کا تمدن اور ملکی نظم ونسق میں ان کی آزادی باقی نہ رہ سکے گی۔ اُن کا مطالبہ یہ ہے۔

(۱) سنجق اسکندرونہ کو خود اختیاری حکومت دی جائے۔ (۲) اسے غیر مسلح رہنے دیا جائے (۳) علاقے کی سرکاری زبان ترکی ہو (۴) لبنان اور شام کی طرح اس کی آزادی تسلیم کرلی جائے اور ان تینوں کی ایک فیڈریشن بن جائے۔

سنہ ۳۶ء کے آخر میں یہ جھگڑا شروع ہوا، ابتدا میں تو فرانس نے ترکوں کی بات سُنی اَن سُنی کردی اس پر ترکی رائے عامہ میں جوش پیدا ہو۔ مصطفےٰ کمال جھلاکر انگورہ سے جنوب کو قونیہ کیطرف روانہ ہوگئے اسی شہر میں وزرار بھی پہنچ گئے اور باہم صلح ومشورے کے بعد مصطفےٰ کمال تو واپس انگورہ چلے گئے لیکن حکومت نے فرانس کو یہ جتلادیا کہ اسکندرونہ کے معاملے میں ترک خاموش نہیں رہیں گے، اسی اثنا میں ترکی وزیر خارجہ اٹلی پہنچے اور اطالوی وزیر خارجہ سے ملاقات کی۔ فرانس ڈرا کہ کہیں ترکی اٹلی کا ساتھی نہ بن جائے۔ آخر اسکندرونہ کے لئے وہ ترکوں سے کیوں بگاڑتا۔ مقدمہ جمعیت اقوام کے روبرو پیش ہوا، اور ترکی مطالبات قبول کرلئے۔

اسکندرونہ کھوکر شام بھلا کیسے چپ رہ سکتا تھا، وہاں بڑے زور کا ہنگامہ شروع ہو اور ترکوں کے خلاف عربوں کا غصہ بے قابو ہورہا ہے۔ خود اسکندرونہ کی سنجق میں عرب اور ترک باہم گتھم گتھا ہورہے ہیں اور ارمنی جو کافی تعداد میں وہاں موجود ہیں۔ عربوں کے حامی ہیں، اسکندرونہ کے جھگڑے نے "عرب ترک دشمنی" کی آگ بھڑکادی ہے اور اگر صلح صفائی کی کوشش نہ کی گئی تو دونوں قوموں کا بگاڑ ہر دو کے لئے بُرا ہوگا۔

بحر روم کا شرقی حصہ ترکی مقبوضات سے ملا ہوا ہے۔ اس میں جزیرہ قبرص کو برطانیہ دبائے بیٹھا ہے اور روڈس پر اٹلی قابض ہے اب اگر اسکندرونہ کا ساحلی علاقہ ترکی اثر سے باہر رہتا تو جس طرح درہ دانیال کے غیر مسلح ہونے سے ترکی کے یورپی اور ایشیائی صوبوں کی حفاظت مشکل ہوگئی تھی، اسی طرح اناطولیہ بھی دشمنوں کے رحم وکرم پر ہوتا،

ترک کو دنیا اب تک سپاہی کی حیثیت سے جانتی ہے اور صدیوں سے اسے لڑنے کے سوا اور کام بھی کوئی نہیں رہا۔ لیکن اب ترک تلوار اور بندوق کی بجائے ہل اور مشین چاہتا ہے۔ اناطولیہ کے بنجر علاقوں کو آباد کرنے میں ابھی ترکوں کو بڑی مدت چاہیئے اور اگر انھیں اپنی جان کی حفاظت میں لڑنا نہ پڑا تو وہ ایک سو سال تک اپنے ملک کی اصلاح و ترقی میں اتنے مصروف رہ سکتے ہیں کہ انھیں اردگرد کے ملکوں پر نظر ڈالنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس وقت اُن کی آبادی ڈیڑھ کروڑ ہے اور اناطولیہ کے میدان اسی قدر اور انسانوں کو نان و نفقہ دے سکتے ہیں۔ ان حالات میں ترکی کی خارجی حکمت عملی سوائے صلح و دوستی کے اور کیا ہو سکتی ہے۔

ترکوں کی خارجی سیاست کے یہ تین اہم پہلو ہیں۔ اول روس سے اتحاد لیکن اس طرح نہ کہ ترکی اس کا دلیو بن کر رہ جائے اور خود روس کو بھی ترکوں کی دوستی کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ان کی وجہ سے اسے اپنے مغربی علاقوں کی طرف سے اطمینان ہے۔ برطانیہ سے دوستی، اور تیسرے بلقان کی ریاستوں اور وسط ایشیا کے اسلامی ملکوں سے دوستانہ تعلقات، چنانچہ اس سال ترکی، عراق، ایران اور افغانستان کا معاہدہ اس بات کی دلیل ہے کہ ترکی ان ملکوں کی دوستی سے نہ صرف برطانیہ اور روس کی نظروں میں اپنی ساکھ بنا سکتا ہے بلکہ اسے اس کی وجہ سے بلقان میں خاص منزلت حاصل ہو جاتی ہے۔ ترکی امن خواہ ملکوں کی صف میں ہے اور اگر پھر کبھی عالم گیر جنگ کے شعلے بھڑکے تو ترکی غیر جانب دار رہنے کی پوری کوشش کرے گا۔

ترک گو امن خواہ سہی لیکن وہ کیل کانٹے سے بھی لیس ہو رہے ہیں۔ اس سال کے بجٹ میں ۵۶ لاکھ پونڈ فوجی مصرف میں منظور ہوئے اور ۵۴ لاکھ پونڈ بجٹ کے علاوہ اسلحہ کی تیاری کے لئے نکالے گئے۔

اکتوبر میں عصمت پاشا کی وزارت ختم ہوئی اور اُن کی جگہ جلال بیار وزیر اعظم بنے۔ وزیروں کے بدلنے سے ترکی کی داخلی اور خارجی حکمت عملی میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ ترکوں کا ایک نصب العین ہے اور مصطفے کمال سے لیکر معمولی سپاہی تک ہر ایک اسی نصب العین تک پہنچنے کے لئے کوشاں ہے ملک کے

اندر اصلاح و ترقی چاہتے ہیں، اور باہر عزت اور امن

فلسطین برطانی شاہی کمیشن کے فیصلہ نے فلسطین میں ایک آگ لگا دی ہے۔ قتل و غارت کا بازار گرم ہے۔ نہ انگریز کی جان محفوظ ہے اور نہ یہودی امن میں ہے۔ انتہا پسند نوجوان اپنے اعتدال پسند بھائیوں کو بھی نہیں چھوڑتے۔

یوں تو جنوری ہی سے اکّے دُکّے قتل کی وارداتیں ہو رہی ہیں اور کئی ایک عرب جو یا تو پولیس کے افسر اور سپاہی تھے یا دولت مند تاجر اور زمیندار اپنے انتہا پسند نوجوانوں کی گولیوں کا نشانہ بنے۔ لیکن ستمبر میں جوں ہی جمعیت اقوام کی مجلس حکمبرداری کے فیصلہ کی خبریں جینوا سے القدس پہنچیں۔ دہشت پسند میدان میں آگئے۔ ۲۶ ستمبر کو شمالی فلسطین کے ضلع گلیلو کا انگریزی ڈپٹی کمشنر اور اس کا محافظ مار دئے گئے۔ اس پر حکومت اپنے پورے جلال میں آگئی عرب مجلس اعلیٰ توڑ دی گئی اور اس کے رہنما قید ہوئے، مفتی برخاست اور سینکڑوں شبہ میں گرفتار برطانی ہائی کمشنر مستعفی ہوگئے، اور سر چارلس جونیگال کے دہشت پسندوں کو دبانے میں کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں پولیس کے افسر اعلیٰ بنا دئے گئے۔ اب برطانی فوج اور پولیس کا راج ہے۔ راستے بند۔ سڑکوں پر پہرے اور دہشت پسندوں سے معرکے گرم ہیں۔ مار دھاڑ شروع ہے اور بظاہر حالات سدھرنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی

اتحاد عرب، اتحاد شرق اسلامی دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، عربی اسلامی دنیا اور غیر عربی اسلامی دنیا۔ عربی اسلامی دنیا میں اتحاد عرب کا بڑا زور ہے۔ اس تحریک کی ابتدا فرانس اور برطانیہ کی شہ سے ہوئی تھی۔ جنگ عظیم میں اس کے نام سے عرب ترکوں کے خلاف اُٹھے۔ اور اب "ریاستہائے متحدہ عربیہ" کا تخیل ہر نوجوان عرب کا نصب العین بن گیا ہے

مغربی سامراج نے عربوں کو ابھی اتنی فرصت نہیں لینے دی کہ وہ "ریاستہائے متحدہ عربیہ" کی تصویر میں رنگ بھر پائیں۔ لیکن ڈر یہ ہے کہ اتحاد عرب کے حامیوں کا جوش و خروش کہیں آزاد شرقی ممالک کی سیاست کا توازن نہ بگاڑ دے، شامی اس تحریک کے علمبردار ہیں اور ان کی ترکوں سے دشمنی قومی ورثہ بن گئی ہے۔ سنجق اسکندرونہ کے واقعہ نے اس دشمنی کو اور محکم کر دیا ہے۔ اور اگر

آپس کے بغض و حسد کا یہی حال رہا تو اتحادِ عرب تحریک کا ترک دشمن ہونا یقینی ہو جائے گا۔

عراق اتحادِ عرب کا موید ضرور ہے لیکن شامیوں کی طرح اتنا پرجوش نہیں۔ بکر صدقی اور سلیمان حکمت تو اس کو محض ایک بے معنی ہائے وہو سے تعبیر کرتے تھے اور کہتے ہیں کہ اسی بے حسی کی بنا پر بکر صدقی کو جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ یمن اور جزیرہ عرب میں تو رائے عامہ ہے ہی نہیں، بادشاہوں نے جو کہہ دیا وہی ملک کی آواز سمجھی گئی البتہ فلسطین میں یہ تحریک پورے شباب پر ہے۔ طلبہ کے جلسے ہوں یا گانے کی محفل علماء کی مجلس ہو یا ادباء کی کانفرنس، اتحادِ عرب کی تان ہر جگہ چھیڑی جاتی ہے، اور یہی نعرہ ہے جو ہر شخص کو بھاتا ہے۔

مصر زبان و ادب میں اتحاد کا حامی اور سیاست میں اس سے بے تعلق ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کافی عرصے تک سیاسی اتحادِ عرب کا قدردان نہیں بنے گا، ہاں ٹیونس، الجزائر اور مراکش میں اس تحریک کو پورا غلبہ حاصل ہے۔

ترک اپنے پڑوس میں اس قسم کی تحریک کو پھلتے پھولتے نہیں دیکھنا چاہتا۔ ریاستہائے متحدہ عربیہ کا مخالف کون ہو سکتا ہے لیکن شامی عرب جس نہج پر یہ تحریک چلا رہے ہیں اس کا بارآور ہونا ترکوں کے لئے مشکلات پیدا کر دے گا۔ اب ترک اس جوڑ توڑ میں لگے ہوئے ہیں کہ اتحادِ عرب کی تحریک کی قیادت شامی عربوں کے ہاتھ سے نکل جائے۔ گذشتہ برس عراق کے فوجی انقلاب میں ترک دوست نوجوانوں کا بڑا ہاتھ تھا جو شامیوں کے اقتدار کے خلاف ہیں۔ اور عراق کو شام کی قسمت سے وابستہ کر کے اپنے آپ کو شامی لیڈروں کا خوشہ چین بنانا نہیں چاہتے۔ بکر صدقی اور سلیمان حکمت اتحادِ شرق کے حامی تھے اور جذباتی تحریک کے مقابلے میں وہ ٹھوس مفاد کے لئے باہم اتحاد کو ناگزیر سمجھتے تھے، افغانستان، عراق، ایران اور افغانستان کا دوستانہ معاہدہ اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

ایران اور عراق میں ایک عرصے سے سرحد کے معاملات پر جھگڑا چل رہا تھا، اور آپس کے تعلقات بہت حد تک خراب ہو چکے تھے۔ ترکی بیچ میں پڑا۔ اور معاملہ بخیر و خوبی طے ہو گیا، اس کے بعد پیمان اسد آباد ہوا جس میں ان چاروں سلطنتوں نے آپس میں مل جل کر رہنے کا عہد کیا۔

تحریک اتحاد عرب کا جوش و خروش ترکوں کو عربوں سے دور رکھے گا۔ ضرورت ہے کہ جذبات کی بجائے ٹھوس حقائق پر سیاسیات کی عمارت اُٹھائی جائے۔ مشرق قریب میں امن و امان کا قیام اوران ملکوں کا بھلا صرف اس میں ہے کہ عرب اور ترک صلح و آشتی کو اپنا دستور بنائیں۔ پُرانے مردے تو دفن ہو ہی چکے ان کو اکھیڑنا اپنی زندگی کو تلخ بنانا ہے۔ عربوں اور ترکوں کی دوستی دونوں کو سرافراز اور عزت مند کرسکتی ہے اور دونوں کی لڑائی میں نہ اسلام کا فائدہ ہے اور نہ مشرق کی بھلائی

اتحاد عرب اور اتحاد شرق کی تحریک کا صحیح امتزاج ہی اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کو روشن کرسکتا ہے ورنہ اگر اتحادِ عرب والوں کا بس چلا تو وہ ابوجہل اور ابولہب کو پجوائیں گے اور اس کی ضد میں ترکوں کی ہلاکو اور چنگیز کو سراہنا تو یقینی ہو جائے گا وطن پرستی اور قوم پرستی کا یہ انجام نہ اسلام کے لئے اچھا ہوگا اور نہ انسانیت اس سے آرام پائے گی۔

سیاسیاتِ عالم پر چند مفید کتابیں

رسالہ جامعہ میں سیاستِ خارجہ پر جو نوٹ نکلتے ہیں ان میں ناظرین کی دلچسپی کا اندازہ ہمیں اُن خطوط سے ہوتا ہے جو دفتر کو وصول ہوتے رہے۔ اکثر صاحبان مزید مطالعے کے لئے کتابیں دریافت کرتے ہیں۔ ان خطوں کا جواب تو انفرادی طور پر دے دیا جاتا ہے۔ لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سالانہ تبصرہ کے ساتھ مختلف اہم مسائل سے متعلق کچھ کتابوں کے نام درج کر دئے جائیں جو زیادہ تر اسی سال شائع ہوئی ہیں۔

چین اور جاپان کے متعلق ذیل کی کتابوں کا مطالعہ مفید ہوگا :-

China at the Crossreads. By Peng-Chun Chang

ایک چینی عالم کی اس کتاب سے چینی قوم کی دشواریاں اور آرزوئیں سامنے آتی ہیں اور اس مہیب ڈراما پر جو آج اس مہذب ملک کی سرزمین پر کھیلا جارہا ہے ایک اداس سی روشنی ڈالتی ہیں۔

The Political Thoughts of Sun yat Son. By Paul Linsbarger

مفید اور دلچسپ کتاب ہے۔ چینی قومی تحریک کے سمجھنے میں اس سے بڑی مدد ملتی ہے۔ مصنف ایک زمانے میں چینی قائد سن یات سن کا مشیرِ قانونی تھا۔ اُن کے بنیادی اصولوں کی اچھی تشریح اس کتاب سے ہوتی ہے۔

The North China Problem. By Shuhsi-hsu.

یہ کتاب نانکنگ کی جمعیتہ امور بین الملل نے شنگھائی سے شائع کی ہے۔ چین اور جاپان کے تعلقات سمجھنے میں اس سے بہت مدد ملتی ہے۔ حجم ۱۱۲ صفحے۔ چینی نقطۂ نظر کو خوبی اور وضاحت سے پیش کیا گیا ہے۔

کتاب کے نام سے خیال ہوتا ہے کہ صرف شمالی چین کے مقامی مسائل پیش نظر ہوں گے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ چین جاپان کی موجودہ کشاکش کے مختلف پہلو اس سے واضح ہوتے ہیں۔

Far East in Ferment. By Gunther Stein.

مطبوعہ لندن۔ واقعاتِ موجودہ کا پس منظر سمجھنے کے لئے کارآمد کتاب ہے۔

Japanese Trade & Industry: Present and Future.
(Compiled by Mitsubishi Economic Research Bureau
Pub. New York)

جاپان کی معاشی حالت اور ترقی کے متعلق صحیح معلومات کا نہایت کارآمد ذخیرہ ہے۔ معتبر اعداد و شمار یک جا جمع کر دئے گئے ہیں۔ ۶۶۳ صفحے

Population Pressure and Economic Life in Japan.
By Ryoichi Ishii.

مطبوعہ لندن حجم ۲۵۹ صفحات۔ قیمت ۱۲ شلنگ ۶ پنس

جاپان کے سامراجی اقدام کو سمجھنے کے لئے اس کے مسئلہ آبادی کا سمجھنا بہت ضروری ہے۔ اس پر متعدد کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ یہ کتاب اچھی ہے اور مسئلہ کے اکثر پہلوؤں پر اس سے مفید روشنی پڑتی ہے۔

Japan's Feet of Clay. By Freda Utley.

جاپانی فوجی کامیابیوں کے سیلاب میں تنقیدی نظر اکثر ملک کی اندرونی کمزوریوں پر نہیں پڑتی

اخباروں کی جزوی تفصیلات کے ساتھ اس کتاب کا مطالعہ توازن ذہنی کے لئے مفید ہے - یہ کتاب جاپانی ہیئت معاشی و سیاسی کی بہت سی بنیادی کمزوریوں کو ظاہر کرتی ہے - بڑی تفصیلی معلومات فراہم کرکے مصنف نے بتایا ہے کہ عجب نہیں جاپانی اقتدار کا بلبلا جلد ٹوٹ جائے۔

برطانوی سلطنت کے متعلق ذیل کی دو کتابیں اچھی ہیں :-

The British Empire:

A Report by a Study Group of Members of the Royal Institute of International Affairs

مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس - حجم ۳۶۶ صفحات - قیمت ۱۵ شلنگ۔

برطانوی سلطنت کی ساخت ، اس کے مختلف اراکین کے دستور اساسی ، اور سلطنت کے مسائل پر نہایت جامع تبصرہ ہے - ایک حصہ میں مختلف اجزار سلطنت کی کیفیت اور اُن کے دستور اساسی سے بحث کی گئی ہے ، دوسرے حصہ میں اُن اجزار کے باہمی تعلقات اور اس سے متعلق دستور اور آئین کا ذکر ہے ، تیسرے حصہ میں اس تعلق سے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں ان پر بحث ہے "نو آبادیات کے مسئلہ" پر جس نے جرمن مطالبہ کی وجہ سے خاص اہمیت اختیار کر رکھی ہے ایک مفید باب شامل ہے۔

برطانوی سلطنت کی ساخت اور اس کے مخصوص مسائل کے متعلق ایک اور مفید کتاب ایک جرمن مصنف کی بھی انگریزی میں ترجمہ ہوکر شائع ہوئی - جس سے انگریزوں کی قومی سیرت اور ان کی سیاسی جبلت پر بڑی اچھی روشنی پڑتی ہے - اور اس وجہ سے مختلف مسائل کے فہم میں بڑی مدد مل سکتی ہے - یہ کتاب ہے :-

The British Empire: Its Structure and its Problems.

By Johannes Stoyé

مطبوعہ لندن - حجم ۴۴۴ صفحات - قیمت ۱۲ شلنگ ۶ پنیس

یورپ کی سیاست میں روس کے اندرونی اختلافات کے متعلق بہت کچھ نکلتا رہا ہے۔ مگر بعض سابق انقلابیوں کے خلاف مقدمہ کی کارروائی سے بہت سی وہ باتیں معلوم ہوتی ہیں جو معمولاً سامنے نہیں آتیں - یہ کارروائی چھپ گئی ہے۔ حکومتِ وقت کے خلاف لیون تروتسکی سے زیادہ اور کوئی کیا لکھ سکتا ہے۔ اس لئے روس کے اندرونی حالات کے سمجھنے کے لئے ذیل کی کتابیں مناسب ہوں گی:-

The Revolution Betrayed. By Leon Trotsky.

ترجمہ مطبوعہ لندن ، حجم ۳۱۲ صفحات ، قیمت ۱۲ شلنگ ۶ پنیس۔

اس کتاب میں ایک بے پناہ مناظر نے اپنے سیاسی مخالفوں کے کام اور ان کی نیت کو بے نقاب کیا ہے۔ لیکن غالباً تعصب اور مبالغہ کے ساتھ۔ بہرحال روس میں اس وقت جس اندرونی سیاسی تضاد کے مظاہر روز سامنے آتے ہیں اُن کے سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔

Report of Court Proceedings in the Case of the Anti-Soviet Trotskyite Centre

روس کے محکمہ عدالت نے ماسکو میں اور بعد کو (**Collet's Bookshop.**) نے لندن میں شائع کی۔ اس عدالتی کارروائی کی لفظ بہ لفظ روئداد درج ہے۔ بہت مفصل اور اکثر باریک گوشوں پر روشنی ڈالنے والی۔ یہ کتاب ۵۸۰ صفحے کی کتاب ہے ، اور قیمت ہے صرف ۲ شلنگ ۶ پنیس۔ اس کا ایک خلاصہ **The Moscow Trial** کے نام سے

Anglo-Russian Parliamentary Committee.

نے ایک شلنگ کی قیمت پر بھی شائع کیا ہے۔

مغربی سیاست کے دوسرے مسائل پر کتابوں کی کثرت معلوم - ذیل کی کتابوں کا مطالعہ بہت سے مسائل کے فہم میں مدد دے گا۔

The Colonial Problem:

A Report by a Study Group of Members of the Royal Institute of International Affairs.

مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس صفحات ۴۴۸ ، قیمت ۲۱ شلنگ۔

نوآبادیوں کے مسئلہ کے سمجھنے کے لئے تقریباً تمام ضروری معلومات اس مفید کتاب میں یک جا مل سکتی ہے۔ ضروری مسائل پر حاوی ہے اور صحیح معلومات کا ذخیرہ ہے۔

The Dangerous Sea: The Mediterranean and its Future.

By George Solocombe.

مطبوعہ لندن - حجم ۲۸۰ صفحات - قیمت ۱۲ شلنگ ۶ پنیں۔

بحیرہ روم پر پچھلے دنوں ساری دنیا کی نگاہیں لگی رہی ہیں - یہاں کی قوتوں میں ایک نیا توازن رونما ہو رہا ہے، اور جب تک وہ قائم نہ ہو جائے حالت ڈانوا ڈول ہے۔ اس کتاب میں بحیرہ روم کی ساحلی قوتوں کے اسلحہ ، اُن کے مقاصد ، اور اُن کی تدابیر کی ایک اچھی تصویر سامنے آجاتی ہے - سیاسی اور فوجی تاریخ کا ایک خاکہ بھی اس میں مل جاتا ہے ۔

جرمنی اور اٹلی کے تعلقات کے سلسلہ میں دراصل وسطی یورپ کے معاشی اور سیاسی مسائل کے سمجھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے لئے ایک جرمن کتاب کا ترجمہ انگریزی میں لندن سے شائع ہوا ہے جو کارآمد ہے یعنی :-

Central Europe and the Western World. By G. Schacher

حجم ۲۴۴ صفحات، قیمت ۱۰ شلنگ۔

یورپ کے کئی ممالک میں خصوصاً جرمنی اور اسپین میں مذہب اور ریاست میں جو ٹکر ہو رہی ہے اس کے سمجھنے کے لئے ذیل کی کتابیں مفید ہیں۔

Religion and the European Mind. By Adolf Keller.

Church and State on the European Continent.

By Adolf Keller.

مطبوعہ لندن اور

Things that are Caesars: the Genesis of the German Church Conflict. By Paul Means.

مطبوعہ نیویارک۔

عام حوالہ کی کتابوں میں ایک امریکی کتاب بہت کار آمد ہے۔

The Political Handbook of the world, 1937.

(Council of Foreign Relations, New York.)

مختلف ممالک کی حکومتوں اور، سیاسی جماعتوں کی کیفیت اور اُن کے پروگرام تفصیل سے دیئے ہیں۔ مشہور اخبارات کے رجحانات بتائے ہیں، بین الاقوامی اداروں مثلاً جمعیتِ اقوام، عدالت عالمی، بین الاقوامی لیبر آفس، وغیرہ کے حالات شامل کئے ہیں۔ معلومات صحیح ہے اور مفید۔

مزدور

مولوی محمود علی خاں صاحب بی اے - بھوپال

دل ضبط سے معذور و زباں نطق سے مجبور
اس کش مکش و ضیق میں ہے بندۂ مزدور

نرمی کرے مزدور پہ کیوں خواجۂ بے رحم
کیوں موردِ الطاف ہو قاہر کا یہ مقہور

کب زندگیِ عیش کو سختی کا تصور
مغلوب پہ رحمت کرے کیوں فاتح و منصور

احساس مروت ہے، نہ احساس جفا ہے
سرمایہ پرستی نے کیا قلب کو مسحور

مزدور کو مشکل سے ملے سدِ رمق بھی
دولتکدۂ خواجہ ہو الوان سے معمور

فردوسِ زمیں منعم ناکارہ کا مسکن
آرام گہِ عیش و طرب جلوہ گہِ حور

مزدور کا گھر فاقہ و ذلت کا نشیمن
آرام سے، صحت سے، تنعم سے بہت دور

تقسیم غلط محنت و دولت کی سراسر
صدیوں کے مظالم سے حقیقت ہوئی مستور

شاعر نہیں، مزدور ہوں، مزدور کا ہمدرد
ہنگامۂ دل کرتا ہوں قرطاس پہ مسطور

نے عشق سے مطلب ہے، نہ الفت سے سروکار
نے ہجر سے مغموم ہوں، نے وصل سے مسرور

نے ناقہ و محمل سے، نہ لیلیٰ سے غرض ہے
نے داخل موضوعِ سخن "برقِ سرِ طور"

نے تیشہ و فرہاد، نہ شیریں سے ہے مطلب
مزدور کا حامی ہے فقط شاعر مزدور

زمینداروں کا ماضی اور حال

زمیندار کا لفظ آج کل کہ جمہوریت کا زمانہ ہے، ہندوستان کے علاوہ کسی دوسرے ملک یا قوم میں مشکل ہی سے سنا جاتا ہوگا۔ انگلستان میں تو یقیناً ڈیوک۔ مارکوئس، ارل اور کاؤنٹ کے الفاظ کم و بیش انھیں معنوں میں سننے میں آتے ہیں جن معنوں میں ہندوستان میں نواب، راجا، مہاراجا، بابو وغیرہ کے الفاظ بولے جاتے ہیں۔ دوسرے ممالک مثلاً فرانس، جرمنی، روس، آسٹریا، اٹلی میں بھی ایک زمانہ تھا جب جاگیردار ہوتے تھے۔ اور انگلستان میں آج جو ڈیوک وغیرہ نظر آتے ہیں، وہ اسی زمانے کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ یہ لوگ بادشاہ کے جو بالکل مطلق العنان فرماں روا ہوتا تھا، دربار کی زینت ہوتے تھے۔ اور وقت پڑنے پر نقدی اور فوج سے اس کی امداد کرتے تھے۔

ہندوستان میں دستور تھا کہ بادشاہ اپنے بڑے بڑے عہدہ داروں کو تنخواہ کے بجائے جاگیریں دیتا تھا۔ جس کے بدلے وہ شاہی فرامین کے مطابق حکومت کا کام کرتے تھے۔ ان جاگیرداروں، صوبہ داروں، اور منصب داروں کے علاوہ اور کوئی ایسا شخص نہیں ہوتا تھا جو زمین کا مالک یا زمیندار کہلاتا ہو۔ زمین پر کام کرنے والے کسان براہِ راست بادشاہ یا جاگیردار کو مال گذاری دیتے تھے۔ یہ نظام کار مغلوں کے زمانے تک رہا۔ مگر جب مغلوں کو زوال ہوا اور طوائف الملوکی پھیلی تو جہاں کہیں جس کو اقتدار ہوا، وہی ایک مخصوص خطۂ زمین کا مالک بن بیٹھا۔ یہ حالت تو موضوع سے بالکل الگ ہے۔ اس زمانے میں نہ کسان کو اطمینان نصیب تھا نہ مالک کو۔ مگر جب آہستہ آہستہ انگریزوں کی مقبوضات بڑھتی گئیں اور انھیں فوجداری کے ساتھ ساتھ مال کے محکموں کا انتظام بھی کرنا پڑا تو انھیں بڑی دقتیں پیش آئیں۔ ایک غیر ملک کے رہنے والے دیسی آدمیوں سے کسی طرح کا معاملہ آسانی سے نہیں کر سکتے تھے۔ کہیں اختلاف زبان۔ کہیں اختلاف معاشرت اور کہیں اختلاف مفاد مانع ہونے لگے۔ اس وقت انھوں نے سوچا کہ مال گذاری وصول کرنے کے لئے ہندوستانی ایجنٹ اور ٹھیکیدار مقرر کرنے چاہئیں۔ چنانچہ انھوں نے یہی کیا۔ اور

کامیاب رہے۔ یہ ٹھیکے اور تحصیلیں پہلے میعادی ہوتی تھیں اور کمپنی اپنا فائدہ دیکھ کر زیادہ باثر اور کامیاب لوگوں کو ٹھیکے دیتی تھی۔ یہ ٹھیکے دار رعایا سے اتنا وصول کرتے تھے کہ سرکاری مطالبہ ادا کرنے کے بعد کچھ بچ بھی رہے اس سلسلے میں یہ ٹھیکے دار مظالم بھی کرتے تھے۔ جس کے ثبوت انگریزی حکومت کی تاریخ کے ابتدائی اوراق میں بہت کثرت سے ملتے ہیں۔ مگر پھر ۱۷۹۳ء میں لارڈ کارنوالس کے ایک بند و بست کے ذریعے یہ نظام دوامی کردیا گیا اس طرح کسان ہمیشہ کے لئے ان ٹھیکہ داروں کے قبضے میں آگئے۔ اور زمین کی ملکیت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگئے۔

۱۸۵۷ء کا پرآشوب زمانہ ہندوستان سے انگریزوں کی وقعت کھوچکا تھا۔ اور وہ اپنا وجود باقی رکھنے کے لئے جہاں ہر جائز و ناجائز کوشش روا رکھتے تھے وہاں ہندوستانیوں کی خوشامدیں کرکے پناہ کے طالب بھی ہوتے تھے۔ اور جس نے انھیں پناہ دے دی اسے انھوں نے حسب وعدہ ہنگامہ فرو ہوجانے کے بعد زمینیں دلائیں۔ تعلقہ داروں، زمینداروں کا ایک طبقہ اس طرح وجود میں آیا کہ بیٹھے بٹھائے زمین ہاتھ آگئی۔ اور وہ اس کے مالک بن گئے۔

ہندوستان کے تعلقہ داروں، پٹے داروں، نوابوں اور زمینداروں کی تاریخ کا یہ مختصر سا جائزہ لینے سے یہ بات تو ثابت ہوگئی کہ ان کا وجود ہندوستان کے اقتصادی نظام میں بالکل اتفاقی ہے انگریزوں کے اقتدار کے ابتدائی ایام میں ان کی حیثیت ٹھیکہ داروں سے زیادہ اور کچھ نہ تھی اور چونکہ کمپنی کو صرف مال گذاری سے کام تھا۔ اس لئے یہ لوگ آزاد ہوکر رعایا سے جیسا چاہتے تھے سلوک کرتے تھے پیداوار ہو یا نہ ہو، فصل خراب ہوجائے۔ قحط پڑے۔ اُن کی بلا سے۔ یہ اپنے مطالبات کسان کی ہڈی گلا کر وصول کرتے تھے۔ مال گذاری کے علاوہ ہر قسم کی رشوت جائز رکھتے تھے۔ زمینداروں میں نذرانہ، مالکانہ، آبیانہ، شادیانہ اور اسی قسم کے دوسرے اور جو مطالبات رائج ہیں، اسی زمانے کی یادگار ہیں۔

ٹھیکہ داروں کے اس نظام میں آگے چل کر تبدیلی بھی ہوئی۔ بنگال، بہار اور صوبہ متحدہ کے مشرقی اضلاع میں جہاں استمراری بند و بست ہوچکا تھا یہ نظام بدستور باقی رکھا گیا۔ مگر دوسرے صوبوں

مثلاً مدراس، بمبئی اور یوپی وغیرہ میں تبدیلیاں ہوئیں۔ مدراس اور بمبئی میں تو رعیت واری بندوبست رائج کیا گیا جس سے رعایا کا تعلق براہِ راست سرکار سے ہوگیا۔ مگر یوپی کے محال واری بندوبست سے تعلقہ دار اور پٹے داروں کا وجود نہ صرف باقی رہ گیا بلکہ مستقل ہوگیا۔ بہار اور بنگال میں بندوبست استمراری کے سبب وہ علاقے جو ٹھیکہ داروں کے زیرِ نگرانی تھے۔ ہمیشہ کے لئے ٹھیکہ داروں کی ملک ہوگئے اور وہاں بھی مالک اور محروم کے دو متناسب طبقے قائم ہوگئے۔

اس زمانے سے اس طبقے کے لوگوں کا کسانوں کے ساتھ آقا اور غلام کا تعلق چلا آتا ہے۔ حکومت عوام کی حالت بدلنے سے گھبراتی ہے۔ اس لئے زمیندار بھی خوب کھل کھیلتے ہیں۔ اور حکام مال کی خوشنودی کے لئے جس طرح چاہتے ہیں مال گذاری کی آڑ میں اُن سے سلوک کرتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ انسان اپنی فطری دنارتِ طبع سے مجبور ہے۔ وہ لوگ کم ہوتے ہیں ـــــ اور جو ہوتے ہیں، اُن کا درجہ عام سطح سے بہت بلند ہوتا ہے ـــــ جو تمام انسانوں کو ہر حیثیت سے ایک سطح پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ ورنہ ایک ایسی فضا میں کہ غربت و افلاس کا تسلط ہو، جو لوگ کھاتے پیتے بھی ہیں۔ اپنی حالت کو غنیمت سمجھتے ہیں اور چونکہ برسوں کے مشاہدے سے سمجھ لیتے ہیں کہ زندگی کی جو عام سطح قائم ہوگئی ہے وہ نہیں بدل سکتی، اپنی حالت کو قائم رکھنے کے لئے ہر طرح کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے لئے قدرتاً وہ ایسی طاقت کا سہارا لینے پر مجبور ہوتے ہیں جو مقتدر ہوتی ہے اور اپنی طرف سے اس طاقت میں اضافہ کرنے کی کوشش بھی کرتی ہے۔ یہ فعل بالکل فطری اور نفسیاتی تحریک سے ہوتا ہے۔ ارادے کو اس میں بہت کم دخل ہوتا ہے۔

ہندوستان میں بحالتِ موجودہ زمینداروں کی بالکل یہی کیفیت ہے۔ طوائف الملوکی کا آشوب، پھر غیروں کا قبضہ، اس کے بعد بتدریج عوام کی پست حالی۔ یہ وقت کے وہ حقائق تھے جن کے پیش نظر انھیں اتفاقی طور پر جو حیثیت حاصل ہوگئی تھی اسے باقی رکھنے کے لئے انھوں نے انگریزی حکومت کا ساتھ دیا اور اب بھی دے رہے ہیں۔ ملک کی سیاسی اور اقتصادی بیداری نے تو انھیں اور بھی آتشِ زیرِ پا کر دیا ہے اور برطانوی اقتدار کے بقا ہی میں ان کی بقا بھی نظر آتی ہے۔

ہندوستان کی سیاسی بیداری اور سوراج کی تحریک میں زمینداروں نے ہمیشہ حکومت کا ساتھ دیا۔ کچھ زمیندار تو ایسے ضرور ہیں جو نہایت خلوص اور صداقت سے اس قومی جنگ میں شریک ہیں، لیکن اُن کی حیثیت یا تو مستثنیات کی ہے یا پھر یہ لوگ چھوٹے زمینداروں کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو الفاظ کے لحاظ سے تو زمیندار ہیں مگر بلحاظ معنی کسانوں کے طبقے میں آتے ہیں۔ اس حقیقت کا اظہار پٹنے کی زمیندار کانفرنس میں بابو مہیش پرشاد ایم اے ایل نے مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا تھا۔ واضح رہے کہ بابو مہیش پرشاد بھی ایک بڑے زمیندار ہیں۔

"ملک کی آزادی کی جنگ میں زمینداروں نے ہمیشہ رکاوٹ ڈالی ہے۔ سول نافرمانی کی تحریک میں زمیندار جماعتی حیثیت سے اس سے الگ رہے۔ بڑے بڑے زمیندار جو جنتا کے فطری لیڈر تھے۔ لڑائی سے الگ تھلگ رہے۔ چھوٹے چھوٹے زمینداروں نے یہ دیکھ کر کانگریس میں پناہ لی اور یہ سمجھا کہ اُن کے حقوق کی وہی محافظ ہے۔"

جب تک سوراج کی تحریک صرف تحریک تھی۔ اس وقت تک زمینداروں نے نہ صرف یہ کہ اس تحریک کی مخالفت کی بلکہ حکومت کی پہنچ سے باہر جو علاقے تھے وہاں پیغام رسانی پکڑ دھکڑ اور اپنے مقدور بھر سزا اور گوشمالی زمینداروں ہی کی طرف سے ہوتی تھی۔ امن سبھائیں قائم کر کر کے کانگریس کے جلسوں کے مقابلے میں جلسے کر کے قوم کے لیڈروں کی ہجو اور سرکار برطانیہ کی قصیدہ خوانی کی جاتی تھی اور عوام کو کانگریس کی شرکت سے باز رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی۔

اب جب کہ کانگریس کی کوشش اور قربانی سے نئے آئین کے ماتحت ہندوستانیوں کے ہاتھ میں کچھ منصب پہنچ گئے تو زمینداروں کو بہت خطرہ ہوا اور انتخابات کے سلسلے میں انھوں نے رائے دینے والوں کو ہر ممکن طریقے سے پھسلانے کی کوشش کی۔ ... کبھی دھمکی دی گئی کہ اگر کانگریس کے امیدوار کو ووٹ دیا تو سارے کھیت بے دخل کرلئے جائیں گے۔ لگان یں گھر نیلام کرا لیا جائے گا۔ مال گذاری بڑھا دی جائے گی۔ کھیتوں کا نذرانہ دینا پڑے گا کبھی امیدیں دی گئیں کہ فلاں راجہ صاحب کو فلاں نواب صاحب کو ووٹ دو اس لئے کہ تم لوگ ہمارے پالے پلے ہو۔ ہماری زمین سے تمھارا خرچ چلتا ہے۔ اور یہ ہمارا کام ہے۔ باقاعدہ کارندے

اور منیجر علاقوں میں گھوم گھوم کر کانگریس کے خلاف پرچار کرتے تھے۔ مگر ان تمام تدابیر کے باوجود جب کانگریس کی اکثریت منتخب ہوگئی تو مایوسی کے ساتھ ساتھ کھٹکا بھی ہوا۔ پہلے تو عارضی وزارتوں سے کسی قدر دل بندھے رہے لیکن آخر کار جب کانگریسی وزارت کے منصبوں پر آگئے اور انھوں نے اپنے پروگرام اور منشور کے مطابق کام شروع کیا تو چاروں طرف سے زمینداروں کے احتجاج کی آوازیں آرہی ہیں۔ جلسے ہو رہے ہیں۔ انجمنیں قائم ہو رہی ہیں۔ کانگریس کے چندوں کی یاد دلائی جارہی ہے اور ملک کی ذہنی نشوونما میں اپنے طبقے کا حصہ اجاگر کیا جارہا ہے۔ غرض ایک ہنگامہ برپا ہے۔

اس عرصے میں مجالس آئین ساز کی تقریروں کے علاوہ زمینداروں کے دو جلسے بڑے پیمانے پر منعقد ہو چکے ہیں ایک بہار کے زمینداروں کی کانفرنس پٹنے میں اور دوسری لکھنؤ میں۔ ان کانفرنس کی کارروائیوں میں موضوع بحث کانگریس کا رویہ اور عوام کی خدمت کا جذبہ رہا ہے۔ انھیں دو عنوانوں کے ماتحت جس سے جتنا بھی ہوسکا، کانگریس اور کانگریس کے انقلابی رجحان کی مذمت کی۔ کانگریس کو (Divide and Rule) کی منافقانہ پالیسی کا ملزم ٹھہرایا اور اس کے مقابل ایک متحدہ محاذ قائم کرنے کا عزم صمیم کیا۔ دوسرے عنوان پر بھی خوب خوب دادِ خطابت دی گئی: زمینداروں نے ہمیشہ کسانوں کا بھلا چاہا ہے۔ ان کے مددگار و غم گسار رہے ہیں۔ کسان اور زمیندار دونوں ایک خاندان کے دو رکن ہیں زمیندار کسانوں کے قریبی اور حقیقی رہنما ہیں۔ اور جو لوگ انھیں انقلاب کی طرف لے جانا چاہتے ہیں اور زمینداروں کے خلاف بھڑکاتے ہیں وہ صرف اپنی سیاسی اغراض پوری کرنے کے لئے انھیں سپر بناتے ہیں اور

'زمینداروں کو ان کے عمل کا جو خالص ہمدردانہ اور قومی تھا، کیا انعام ملا۔ اگر عوام کو خود غور کرنے کا موقع دیا جاتا تو وہ سمجھتے کہ ان کے لئے زمینداروں نے کیا کیا ہے' لیکن ان کے دماغ میں تو یہ بات بٹھائی گئی ہے کہ جو کچھ انھیں ملا ہے، وہ کانگریس کی بدولت ملا ہے۔ حالانکہ مجالس آئین ساز میں اس زمانے میں اس کی کوئی آواز بھی نہ تھی۔'' [۱]

---

[۱]:۔ راجہ صاحب جہاں گیر آباد کا خطبہ صدارت

اس کے علاوہ ایک عنوان "زمینداروں کے وجود کی ناگزیری" بھی رہا ہے۔ اس پر بھی خوب سر حاصل بحثیں ہوئیں۔" زمینداروں نے قومی تمدن و معاشرت، زبان، مذہب و اخلاق، علم و فن۔ تعلیم و اصلاح میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ خود کانگریس نے موجودہ اقتدار زمینداروں ہی کے بل بوتے پر حاصل کیا ہے۔ زمیندار موجودہ سماج کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔"

ان تقریروں اور دعووں میں اتفاق سے زمینداروں کی طرف سے اسی پہلو کو روشن کرنے کی کوشش کی گئی ہے جسے زمینداری نظام کے مخالفین اپنے نظریے کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں یعنی عوام اور زمینداروں کا تعلق۔

یہی پہلو واقعی غور کے قابل بھی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں جب سے زمینداروں کا وجود ثابت ہے اس وقت سے ہندوستان کو بہت سی منزلوں سے گذرنا پڑا ہے اس عرصے میں اس نے پستیاں بھی دیکھیں اور بلندیاں بھی، لیکن غریب عوام کا افلاس سوا روز بروز بڑھنے کے گھٹتا نظر نہیں آتا۔ زمینداروں کا یہ دعویٰ کہ انھوں نے کسانوں کی بہتری کے لئے اکثر اوقات نقصان تک برداشت کئے ہیں، بے بنیاد اور بے دلیل معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر کبھی ایسا ہوا بھی ہوگا تو کسی خود غرضانہ مصلحت کی بنا پر ہوا ہوگا، جس میں خلوص کا شائبہ تک نہ تھا، ورنہ ایمان اور دیانت داری سے جو قدم بھی اٹھایا جاتا ہے رائیگاں نہیں جاتا۔ اگر عوام کی بہتری کے لئے کوئی کام کیا گیا ہوتا تو آج وہ روٹی کے ٹکڑوں اور کپڑے کے چیتھڑوں کے محتاج نہ ہوتے۔

زمیندار اپنے وجود کی اہمیت ثابت کرنے کیلئے ایک دلیل ایسی لاتے ہیں جو واقعی اس قابل ہے کہ اس پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ زمینداروں ہی کے طبقے سے ہندوستان کی تہذیب قدیم کا نام باقی ہے۔ انھیں کے دم قدم کی بدولت تمدن و معاشرت، مذہب و اخلاق اور شعر و ادب کا چراغ روشن ہے۔ انھوں نے اپنے روپئے سے اپنی محنت اور اپنے ایثار سے ایسے ادارے قائم کئے ہیں جنھیں آج تہذیب و تمدن اور مذہب کا محافظ کہنا چاہیئے۔ جہاں تعلیم حکومت کے بخل کا شکار ہوئی وہاں زمینداروں نے تعلیم گاہیں قائم کیں۔

یہ دلیل واقعی معقول اور غور طلب ہے۔ ہندوستان کا پرانا تمدن مغربی تمدن کے سیلاب

میں اپنی وقعت کبھی کا کھو چکا تھا اگر اس باب میں زمینداروں نے اس کی سرپرستی نہ کی ہوتی۔ یہی حال تعلیم کا بھی ہے۔ زمینداروں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور گو اپنی تعلیم کا استعمال غلط کیا لیکن اس میں شک نہیں کہ انھوں نے اپنی تعلیم سے ملک کی ذہنی خدمات بھی انجام دی ہیں اور ان خیالات میں اگر وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کی ذات سے ہندوستان کے عہدِ زریں کی یادگار قائم ہے تو وہ حق بجانب ہیں۔

لیکن یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے اس کا دوسرا رُخ اتنا ہی کریہہ اور ہولناک ہے جتنا یہ خوبصورت اور جاذبِ نگاہ ہے۔ ہندوستان کی آبادی کا بڑا حصہ ان عوام پر مشتمل ہے جن کے لئے ملک کی غلامی کے بعد سے تمدن و معاشرت اور تعلیم اور تہذیب نقوشِ باطل سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔ انھیں اپنے پیٹ کی فکر ہی سے نجات نہیں ملتی تو وہ تمدن و معاشرت کی طرف کیا توجہ کریں گے۔ یہ چیزیں انسانی زندگی کا جوہر ضرور ہیں اور اُن کے بغیر انسان انسان نہیں کہلا سکتا۔ لیکن اُن کی نشوو نما کے لئے ضروریاتِ زندگی کی طرف سے اطمینانِ کلی شرط ہے۔ تاریخ کے تاریک ادوار اس جوہر سے کیوں خالی نظر آتے ہیں۔ اس لئے کہ انھیں رفعِ احتیاجات کی دُھن میں زندگی کو مرصع اور خوش گوار تر بنانے کی فرصت ہی نہیں ہوتی تھی۔ ہندوستان کا کسان تاریخ کے اس تابناک دور میں بھی اپنی زندگی سے تاریخ کے اسی تاریک عہد کی یاد تازہ کرتا ہے۔ بقائے تمدن کے لئے زمیندار کی یہ کوشش جو اس کے وجود کی واحد وکیل ہے اگر کسانوں کے لئے بھی موجبِ برکات ہوتی اور اس سے وہ بھی برابر نہیں، تو ایک حد تک ہی سہی فیض یاب ہوتے تو یقیناً قابلِ تحسین تھی۔ مگر حالات یہ نہیں ہیں۔ تعلیم، تمدن اور مذہب کے بقا کے لئے جو کچھ بھی کیا گیا ہے اس سے کسان کو دور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا ان اداروں سے فیض یاب بھی وہی لوگ ہوتے ہیں جن کے پاس روپیہ ہے اور روپیہ پیدا کرنے کے ذرائع۔ پیٹ کے علاوہ کسان جماعتی زندگی کا صرف ایک پہلو کسی قدر جانتا ہے اور اسے برتتا ہے۔ وہ چند مذہبی رسمیں ہیں جن کی صورتیں امتدادِ زمانہ نے مسخ کر دی ہیں۔ ان میں بھی موجودہ تعلیم و تمدن کا کوئی حصہ نہیں ہے بلکہ یہ سینہ بہ سینہ اس زمانے سے چلی آ رہی ہیں۔ جب مذہب اور معاشرت کے ادارے قائم نہ تھے۔ بلکہ بے لوث اور مخلص مبلغین اپنے ذخیرۂ علم سے لوگوں کو فیض یاب کرتے تھے۔ غرض ہندوستان کے زمیندار اور سرمایہ دار جس طرح قوم کی دولت کے یکا و تنہا مالک ہیں، اسی طرح تمدن، معاشرت، تعلیم مذہب و

اخلاق اور علوم اجتماعی بھی انھیں کی ملک میں آگئے ہیں اور طرفہ یہ ہے کہ یہ لوگ موجودہ انقلابی فضا سے بچنے کے لئے اسی چیز کو سپر بھی بناتے ہیں۔ فائدہ خود اٹھاتے ہیں۔ احسان ساری جماعت پر رکھتے ہیں۔

ان حالات کے پیش نظر کیا یہ خیال قائم کرنا کہ اس تہذیب و تمدن کی وجہ سے عوام کا نقصان چھوڑ کوئی فائدہ نہیں ہو رہا ہے مبالغہ ہوگا؟ حالات کے اس تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کل تہذیب و تمدن کی بقا کا سوال عوام کی بہتری کی کوشش میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ تہذیب و تمدن بجائے خود بڑی چیز نہیں لیکن ان کا استعمال اکثر برا ہوتا ہے۔ دنیا کی گذشتہ چند صدیوں کی تاریخ شاہد ہے کہ صاحب ملک طبقے مذہب اور تہذیب و تمدن کو عوام کی طاقت کے مقابلے میں آڑ بنا کر مدتوں اپنے وجود کا تاریک پہلو چھپاتے رہے ہیں۔ ان "زریں اصول حیات" کو بالکل اسی طرح آج ہندوستان میں بھی برتا جا رہا ہے۔ جب بھوکے عوام کروڑوں کی تعداد میں بھوک سے تڑپتے ہوتے ہیں تو زمینداروں اور پونجی پتیوں کا طبقہ تہذیب و تمدن کے راگ الاپ الاپ کر درد آشنا دلوں کو محو خواب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

زمینداروں نے اپنے احتجاجی جلسوں میں اپنی تنظیم کے پہلو پر بہت کافی زور دیا ہے اور اس کا اہم ترین جزو چھوٹے زمینداروں کی جماعت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ بڑے زمینداروں نے چھوٹے زمینداروں کو بتایا ہے کہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ کانگریس کی پالیسی صرف بڑے زمینداروں ہی کے لئے مہلک ثابت ہوگی بلکہ وہ چھوٹے زمینداروں کی جڑ بھی کاٹ دے گی۔ اس کے علاوہ انھیں یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ کانگریس ان کو اپنی طرف ملا کر انھیں ان کی وسیع برادری سے الگ کرنا چاہتی ہے۔ اور اس طرح زمینداروں کے طبقے میں پھوٹ ڈالنا چاہتی ہے۔

چھوٹے زمینداروں کی حالت کسانوں سے کسی طرح بھی بہتر نہیں ہے اور نہ اُن کا مفاد کسانوں سے مختلف ہے۔ یہ طبقہ کانگریس کی جنگ میں کافی بڑی تعداد میں شریک ہوا تھا اور اس خیال سے شریک ہوا تھا کہ اس کے حقوق کی حفاظت کانگریس کے علاوہ اور کوئی جماعت نہیں کر سکتی۔ تناسب کے لحاظ سے وہ سب سے زیادہ یعنی ساڑھے بارہ لاکھ کی تعداد میں ہیں اور غربت و افلاس اور تعلقدار اور مہاجن کے ہاتھوں وہ بھی کسانوں کی طرح تنگ ہیں۔ بڑے زمیندار انھیں اپنی صحبتوں کے ناقابل

سمجھتے ہیں اور انھیں اپنے گھروں میں ملازم تک رکھتے ہیں غرض چھوٹے زمینداروں کا بڑے زمینداروں سے مفاد کے لحاظ سے میل ناممکن ہے یوں یہ دوسری بات ہے کہ یہ لوگ آیندہ اپنی تحریک میں والنٹیروں کی رسد کے لئے ہمدردی کرکے اُن کی تائید حاصل کرلیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ یہ ہمدردی محض مصلحت اندیشی پر مبنی ہوگی۔ بہار کے زمینداروں نے کانگریس کے خلاف ستیاگرہ کی جو دھمکی دی ہے، وہ صرف اس اُمید پر کہ ستیاگرہ کے حربے کا استعمال چھوٹے زمیندار کانگریس میں رہ کر سیکھ چکے ہیں۔ اور وہ اُن کے ذریعے اپنی تحریک کامیابی سے چلا سکیں گے۔

رہا کانگریس پر پھوٹ ڈالنے کا الزام تو یہ ایک غیر ذمہ دارانہ بیان ہے کانگریس گورنمنٹ نے مالگزاری کے متعلق یوپی میں جو احکامات صادر کئے ہیں ان کا صاف مقصد تھا کہ مالگزاری کی وصولی میں زمیندار کی مالی حالت کا لحاظ رکھا جائے۔ یعنی جن زمینداروں کے پاس واقعی روپیہ نہیں ہے۔ یا جن کے علاقوں میں بہت سالگان باقی ہے ان پر سختی نہ کی جائے۔ اس کے برخلاف ۱۹۳۳ء میں اُس وقت کی حکومت نے جو حکم صادر کیا تھا۔ وہ یہ تھا کہ دس ہزار یا اس سے زیادہ مال گذاری ادا کرنے والوں پر سختی نہ کی جائے۔ اس کھلی ہوئی تقسیم کے خلاف ایک لفظ بھی نہ کہا گیا اور جب یہ امتیاز اُٹھا دیا گیا۔ اور ہر زمیندار سے یکساں برتاؤ کرنے کی تدبیر نکالی گئی تو کہا جاتا ہے کہ کانگریس زمینداروں میں پھوٹ ڈالتی ہے۔

زمینداروں کا طبقہ مستقبل کی طبقہ وارانہ جنگ کے امکان سے بہت ہراساں ہے اور کانگریس کی تحریک پر یہ الزام ہے کہ اس کے ذریعے موجودہ برادارانہ نظام جماعت میں طبقہ وارانہ ذہنیت کی پرورش کی جارہی ہے اور ایک خاص طبقہ زمینداروں کے خلاف پیدا کیا جارہا ہے۔ لیکن جب اُن کے جلسوں اور صدارتی خطبوں پر نظر ڈالی جاتی ہے تو طبقہ آفرینی کا الزام الٹے انھیں کے سر لگتا ہے۔ کوئی تقریر یا بیان ان الفاظ سے خالی نہیں ہوتا کہ "زمینداروں کو متحد ہونا چاہئے" "ہمارا بحیثیت ایک مستقل جماعت کے یہ فرض ہے اور وہ فرض ہے" ان الفاظ سے طبقہ پروری ثابت ہوتی ہے یا بھائی چارا؟ اس کے فیصلے کے لئے ہم خود زمینداروں کے احساسِ سلیم کو دعوت دیتے ہیں لیکن اگر کانگریس طبقہ وارانہ کشمکش کی فضا نہ بھی پھیلائے اور خواہ زمیندار اس کے خلاف بڑی سے بڑی طاقت کیوں استعمال

کریں، جس وقت تک سامراجی اور سرمایہ دارانہ نظام قائم ہے یہ کشمکش جلد یا بدیر وجود پذیر ہوگی اس لئے کہ دنیا نے اپنا رنگ بہت کچھ بدل دیا ہے۔ ہندوستان پر حالانکہ ابھی وہ رنگ غالب نہیں آیا ہے لیکن وہ اس کا اثر ضرور محسوس کرنے لگا ہے۔

رفتارِ عالم

اسپین

یورپ کے سیاسی مطلع پر جنگ کی گھٹائیں گھر گھر کر آرہی ہیں، اگر کہیں امید کی بجلی چمکتی بھی ہے تو اس کی چمک اندھیرے کی ایک نئی تہ جمانے کا کام کرتی ہے، قریباً دو مہینے ہوئے برطانوی وزیرِ اعظم نے میسولینی سے نامہ و پیام کی طرح ڈالی، خیال تھا کہ دونوں حریف صلح و صفائی سے آپس کے جھگڑے نمٹا لیں گے، شاید حبش کے معاملہ میں برطانیہ جھک جانے اور بحیرہ روم میں میسولینی برطانیہ کے حقوق ماننے میں تامل نہ کرے، لیکن ابھی سلام و دعا تک معاملہ پہنچا تھا کہ نیائن کانفرنس بلانے کی ضرورت پیش آگئی (رسالہ جامعہ بابت اکتوبر) بس پھر کیا تھا سب کیا کرایا اکارت گیا، اور پہلے ہی دن دوستی میں کھنڈت پڑ گئی، نیائن کانفرنس کی وجہ سے میسولینی بھرے بیٹھے تھے کہ انھیں ہٹلر کا بلاوا آیا، جرمن میں ان کا بڑے معرکہ کا استقبال ہوا، دونوں ڈکٹیٹروں نے اپنے اونچے اونچے بولوں سے دنیا کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ روم اور برلن کی دوستی پکی ہوگئی ہے، اور دونوں کبھی بھی ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے، اس ملاقات کے بعد میسولینی نے وطن پہنچتے ہی ایک طرف تو طرابلس میں فوجیں بھیجنا شروع کر دیں اور دوسری طرف فرانکو کو کھلم کھلا امداد دی۔ برطانیہ، حبش اور بحیرہ روم کی وجہ سے اٹلی سے خفا تھا ہی، اب فرانس کو خدشہ ہوا کہ اگر اٹلی کا حلیف فرانکو اسپین کا مالک بن گیا اور اسپینی ساحل کے قریب کے جزیروں میجارکا اور منارکا پر اٹلی کا جھنڈا لہرانے لگا تو یورپ میں وہ جرمنی، اٹلی اور ان کے حلیف فرانکو کے نرغہ میں تینوں طرف سے گھر جائے گا، اور ان جزیروں کی وجہ سے اس کے لئے افریقی مقبوضات سے آمد و رفت جاری رکھنا بھی مشکل ہوگا اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں فرانس عاجز اور بے بس ہو جائے گا۔

حالات کی نزاکت کا تقاضہ تھا کہ فرانس کے سیاسی حلقے تلملا اُٹھتے، اور اسپین کو اٹلی کے قبضہ میں جانے سے روکنے کے لئے برطانیہ سے تعاون کا مطالبہ ہوتا، چنانچہ عدم مداخلت کانفرنس کا شور پھر بلند ہوا، فرانس نے دھمکی دی کہ اگر اٹلی مداخلت سے باز نہ آیا تو وہ بھی اسپین کی حکومت کی مدد کرے گا' کانفرنس کی کارروائی شروع ہوئی، فرانس نے اپنے مطالبات پیش کئے، اٹلی اور جرمنی نے اُن کے ماننے سے انکار کیا، برطانیہ ثالث تھا، فرانس اسپین کی حکومت کی مدد پر تلا ہوا تھا، برطانیہ نے اُسے روکا، اُدھر اٹلی اور جرمنی کو ہموار کیا آخر طے پایا کہ اسپین کی دونوں جماعتوں کی قانونی حیثیت تسلیم کرلی جائے لیکن اس شرط پر کہ پہلے باہر کی فوجیں جو فریقین کی طرف سے اسپین میں لڑ رہی ہیں واپس بُلالی جائیں، اب اس بات پر جھگڑا ہوا کہ واپسی کس طرح عمل میں آئے، قصہ کوتاہ دونوں جماعتوں کے نقطۂ نظر مختلف تھے، ایک کمیشن بھیجنے کی تجویز ہوئی، کمیشن تو جب جائے گا جائے گا، اب تو چین اور جاپان کی جنگ نے سب کو اُدھر متوجہ کر دیا ہے، فرانکو ہے کہ برابر بڑھتا چلا جا رہا ہے، میڈرڈ پر سخت بمباری شروع ہے، اور اگر حالات ایسے ہی رہے، اور اٹلی کی مدد فرانکو کو برابر پہنچتی رہی تو اسپین کی اشتراکی حکومت کب تک مقابلہ کرے گی،

برطانیہ اور اسپین ناظرین کو تعجب ہوگا کہ برطانیہ نے اسپین کے معاملہ میں یہ انوکھا چلن کیوں اختیار کیا ہے، غیر جانب داری کا ڈھونگ رچا کر ایک طرف تو اس نے فرانس کو اسپینی حکومت کی مدد سے باز رکھا اور دوسری طرف اٹلی اور جرمنی کو کھلم کھلا فرانکو کی مدد کرنے کا موقعہ دیا، فرانس کی اشتراکی حکومت اور فرانسیسی جمہور اسپین میں مداخلت پر مصر تھے لیکن برطانیہ نے جرمنی کے حملہ سے ڈرا کر فرانس کو ایسا کرنے سے روکا، آخر اس سے برطانیہ کا مقصد کیا ہے، کیا وہ اسپین کو جنرل فرانکو کے سرپرستوں جرمنی اور اٹلی کے ہاتھ میں دینے میں راضی ہے، کیا جبل الطارق کے اردگرد ہٹلر اور میسولینی کی قوت برطانی سامراج کے لئے خطرناک نہیں، بحیرہ روم کی سیادت کی خاطر تو وہ اٹلی سے دست وگریباں ہے، کیا اسپین پر فرانکو کا قبضہ بحیرہ روم میں برطانی سیادت پر اثر انداز نہ ہوگا،

اس معمہ کو سمجھنے کے لئے یہ جان لیجئے کہ اسپین کے معاملہ میں برطانی سیاست دانوں کی دو جماعتیں ہیں، برطانیہ کے قدامت پسند سیاسئین کا گروہ فرانکو سے اتنا نا امید نہیں، وہ سمجھتا ہے کہ فرانکو برطانی مفاد کا دشمن نہیں اور اسپین کا مالک بن کر وہ میسولینی کا پٹھو نہیں بنے گا، ان سیاسئین کا خیال ہے کہ برطانیہ کو فرانکو سے تعلقات قائم کر لینے چاہیئے، اور اس سے دوستی کر کے اُسے ہٹلر اور میسولینی کے اثر سے نکالنے کی سعی کرنا چاہیئے چنانچہ کچھ عرصہ ہوا برطانیہ کے غیر سرکاری سفیر فرانکو کے ' دربار'' میں پہنچ گئے ہیں اور اُدھر فرانکو نے اپنے نمائندے لندن بھیج دئے ہیں۔

بعض خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ فرانکو اور اٹلی کے فوجی افسروں میں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہونا شروع ہو گئی ہیں، کچھ تعجب نہیں کہ فرانکو میڈرڈ لے کر اٹلی کے احسان کا جوا گردن سے اُتار پھینکے اور یورپ میں نئے دوست ڈھونڈ لے،

برطانیہ کے سیاست دانوں کا تدبر شروع ہی سے غیر جانب داری کی اہمیت سمجھ رہا تھا انگریز جذبات کی رو میں کسی خاص سیاسی مسلک کی حمایت یا مخالفت کرنا نہیں جانتے، وہ واقعات کی روشنی میں اپنی راہ نکالتے ہیں، نہ اشتراکیت سے انھیں لگاؤ ہے اور نہ فاشستی قوت سے یارانہ، اسپین کی اشتراکی حکومت برطانیہ کے پہلو میں فرانکو کے کانٹے سے کم تکلیف دہ نہیں ہو سکتی تھی، لیکن فرانکو اگر برطانیہ دوستی کا عہد کر کے اسپین کی عنان حکومت کا مالک بن جائے تو برطانیہ کو اور کیا چاہیئے۔

ابھی ابھی برطانیہ نے پرتگال سے بھی نئے سرے سے دوستی گانٹھی ہے، اسپین کے معاملہ میں دونوں ملکوں میں کچھ بگاڑ ہو چلا تھا لیکن مصلحت وقت جذبات پر غالب آئی، اور پرتگال کے ساتھ برطانیہ کو دوستی کرنا ہی پڑی، یہ یاد رہے کہ پرتگال اسپین کی اشتراکی حکومت کا سخت مخالف اور فرانکو کا یار دمساز ہے، پرتگال اور برطانیہ کی اس نئی دوستی سے اسپین کے مستقبل اور فرانکو کے آئندہ طرز عمل کا پتہ لگ سکتا ہے۔

اٹلی۔ اٹلی نے جمعیت الاقوام کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا، یوں تو حبش کی جنگ کے زمانہ

سے اٹلی جمعیت سے بے تعلق تھا لیکن اس ہفتہ اس نے رہے سہے رشتہ کو بھی توڑنے کا اعلان کر دیا، اب وہ لیگ سے کٹ کر جرمنی اور جاپان کے ساتھ جا شامل ہوا ہے، جمعیت اقوام سے اس وقت قطع تعلق کے اس کے سوا اور کیا معنی ہو سکتے ہیں کہ جرمنی، جاپان اور اٹلی کے اتحاد کو اور مضبوط کیا جائے، اور برطانیہ اور فرانس کے خلاف متحدہ محاذ کی ایک عملی صورت پیش کر دی جائے، اٹلی کے اس اقدام کو سمجھنے کے لئے پچھلے ایک ماہ کی سیاسی سرگرمیوں کا جاننا ضروری ہے

اٹلی اور برطانیہ کا بگاڑ حبش کے حملے سے شروع ہوا، حبش پر اٹلی کا قبضہ برطانی سامراج کو ذرا نہیں بھاتا، اس وقت فرانس نے میسولینی کی اس طرح مدد کی جس طرح آج برطانیہ فرانکو کی کر رہا ہے، نتیجہ یہ نکلا کہ حبش اٹلی نے ہتھیا لیا، انگریزوں نے اب تک اٹلی کے اس غاصبانہ قبضہ کو تسلیم نہیں کیا، میسولینی برطانیہ کی اس روش پر جلا ہوا ہے، پچھلے دنوں برطانی وزیر اعظم نے میسولینی کی طرف دوستی کا ہاتھ ضرور بڑھایا لیکن بیل منڈھے نہ چڑھی، سچ یہ ہے کہ مسولینی انگریزوں سے ابھی صلح کرنا نہیں چاہتا وہ جانتا ہے کہ برطانیہ بین الاقوامی سیاست کی الجھنوں میں بری طرح گرفتار ہے، چین جاپان کی جنگ مشرق بعید میں برطانی مفاد کو ختم کر کے رہے گی، میسولینی کی گیدڑ بھبکیاں اس وقت محض بے کار نہیں ہیں، چنانچہ وہ ایک طرف روم اور برلن کے اتحاد کا راگ الاپتا ہے تو دوسری طرف جرمنی، جاپان، اور اٹلی کی دوستی کا اعلان کرتا ہے، اس کا خیال ہے وہ اس طرح برطانیہ کو دق کر کے حبش اور بحیرہ روم کی قضیہ میں اس سے اپنی من مانی شرطیں منوا سکتا ہے۔

اپنے ان منصوبوں کو پورا کرنے کے لئے میسولینی نت نئی چالیں چلتا ہے، فرانس کے خلاف ٹیونس، الجزائر اور مراکش کے عربوں کو اکسایا جا رہا ہے، ادھر مصر کی سرحد پر ایک لاکھ کے قریب فوج اکٹھی کر رکھی ہے، ریڈیو کے ذریعہ عربی زبان میں بڑے زور شور سے پروپگنڈا شروع ہے، حبش پر قابض ہو کر وہ دریائے نیل کے ایک منبع کا بھی مالک بن گیا ہے، اسپین میں اٹلی کا اثر تو اپنا کام کر ہی رہا ہے، بہر حال میسولینی کے تمام مہروں کی زد اس وقت برطانیہ پر ہے، ظاہر ہے یا تو وہ جھلا کر لڑنے مرنے پر تل جائے گا یا میسولینی کی باتیں مانے گا، لڑائی کی آگ میں کودنا اس وقت

برطانیہ کو منظور نہیں اب صرف دوسرا ہی راستہ کھلا ہے، واقعہ یہ ہے کہ میسولینی بھی برطانیہ سے لڑائی مول لینا نہیں چاہتا، وہ جانتا ہے کہ اس بازی میں اول تو جیت مشکل ہے دوسرے حبش اور اسپین میں اپنی طاقت صرف کر کے نئی جنگ کی طرح ڈالنا ٹھیک نہیں، مگر دوسروں کی کمزوریوں سے اس وقت خوب فائدہ اٹھا رہا ہے۔

جرمنی

فرانس کے سابق وزیر اعظم مشہور اشتراکی رہنما موسیو بلوم نے پچھلے دنوں ایک تقریر میں کہا کہ ضرورت ہے کہ برطانیہ، فرانس اور روس آپس میں ایکا کرلیں، پر برطانیہ اس معاملہ میں اب تک تذبذب میں ہے، فرانس کی رفاقت پر تو برطانیہ مجبور ہے لیکن روس سے اس کا اتحاد ابھی مشکل نظر آتا ہے، بات یہ ہے کہ برطانیہ کے قدامت پرست طبقے اشتراکی روس سے کچھ زیادہ خوش نہیں، اور دوسرے انھیں ہٹلر کی دوستی سے کلی ناامیدی بھی نہیں، ان کے خیال میں ہٹلر کی حکمت عملی اور برطانی مفادمیں تصادم کا بہت کم امکان ہے، ہٹلر بذات خود برطانیہ سے بگاڑ نہیں چاہتا، لے دے کے فریقین کے درمیان اگر کوئی جھگڑا ہے تو وہ نوآبادیات کا ہے جو جنگ عظیم میں جرمنی سے چھین لی گئی تھیں اور اس جھگڑے کا نمٹانا کچھ اتنا مشکل نہیں کہ خون خرابے کے بغیر نہ ہوسکتا ہو۔

یورپ کی فضا میں روم اور برلن کے اتحاد کا غلغلہ ہر طرف بپا ہے، برطانیہ اس اتحاد کے خلوص کا زیادہ قائل نہیں، ۱۹۱۴ء میں بھی اٹلی جرمنی کا ساتھ دینے کا عہد کر چکا تھا لیکن عین وقت پر اپنا قول ہار گیا، اور فرانس اور برطانیہ کے ساتھ مل گیا، سیاسی دنیا کی دشمنیاں اور دوستیاں تو ڈھلتی چھاؤں ہیں۔ آج میسولینی ہٹلر کی دوستی پر نازاں ہے لیکن اگر جرمنی آسٹریا کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرے تو میسولینی ہی سب سے پہلے ہٹلر کا گلا دبائے گا، کسی حکومت کو دوسری پر مطلق بھروسہ نہیں، آخر برطانیہ کیوں نہ روم اور برلن کی دوستی کو کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کرتا۔

کچھ عرصہ ہوا لارڈ ہیلی فیکس (سابق لارڈ اروِن) جرمنی گئے، جانے کے لئے بہانہ تو کچھ اور کیا لیکن مقصود ہٹلر، گوئرنگ اور دوسرے نازی لیڈروں سے ملنا تھا، چنانچہ آپس میں

ملاقاتیں ہوئیں، معاملہ تو سب کا سب پردہ راز میں ہے، برطانی پارلیمنٹ میں سوائے اس سرسری ذکر کے اور کوئی بحث نہیں ہوئی، البتہ کابینہ میں اس مسئلہ پر خوب گفتگو ہوئی، اس سلسلہ میں فرانس کے وزیراعظم اور وزیر خارجہ لندن بلائے گئے ان کی ملاقاتوں کے بعد صرف یہ معلوم ہوسکا کہ برطانیہ اور فرانس یک جان اور دو قالب ہیں، اور آئندہ دونوں پورے اتفاق سے ہر شاہراہ پر گامزن ہوں گے،

لارڈ ہیلی فیکس کی اس ملاقات کے بعد جرمنی میں نوآبادیات کا مسئلہ بڑے زور شور سے اٹھایا گیا ہے، کہا جاتا ہے کہ برطانیہ نوآبادیات کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے تیار ہے اگر جرمنی اسلحہ کو کم کرنے پر تیار ہو، اور جمعیت اقوام کی رکنیت قبول کرے، برطانیہ اور جرمنی کا معاملہ ابھی بیچ میں ہی تھا کہ اٹلی نے جمعیت اقوام سے علیحدگی کا اعلان کر دیا اور اتحاد ثلاثہ کی تان چھیڑ کر بین الاقوامی سیاست کی فضا میں اور پیچیدگیاں پیدا کر دیں،

فرانس، برطانیہ، اٹلی، جرمنی، اسپین اور روس کی باہمی کھینچا تانی تو آپ نے ملاحظہ فرمائی لیکن مشرقی یورپ کی حکومتوں کا بھی برا حال ہے، پولینڈ، چکوسلوویکیا، یگوسلاویا، رومانیا اور اسٹریا اور ہنگری کی حکومتوں کو اپنی اپنی فکر پڑی ہے، مثل مشہور ہے کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے، اگر بڑی سلطنتوں میں چھڑ گئی تو ان چھوٹی حکومتوں کو لامحالہ کسی نہ کسی کا ساتھ دینا ہوگا، اب ہر حکومت اپنے حلیف ڈھونڈنے میں مصروف ہے، سیاست داں دارالخلافوں کے چکر کاٹ رہے ہیں، باہم نامہ و پیام کا سلسلہ شروع ہے، بہرحال عالمگیر جنگ کا خطرہ ہے کہ بھوت کی طرح یورپ والوں کے سروں پر سوار ہے۔

جنوبی امریکہ جنوبی امریکہ کی جمہوریتوں میں آئے دن انقلابات ہوتے رہتے ہیں، پچھلے دنوں خبر آئی تھی کہ برازیل میں فاشستی حکومت برسراقتدار آگئی، اور اس نے پہلا کام یہ کیا کہ باہر کے سرمایہ پر پابندیاں لگا دیں، اندازہ ہے کہ ان پابندیوں کی وجہ سے برطانیہ کا کروڑوں روپیہ جو برازیل میں لگا ہے خطرہ میں پڑ گیا ہے، چین کی منڈی تو برطانیہ کے ہاتھ

سے جا رہی ہے، اب جنوبی امریکہ سے بھی برطانیہ کا اقتدار اٹھتا نظر آتا ہے۔

جنگ عظیم سے پہلے جنوبی امریکہ کی منڈیوں میں برطانیہ کے مقابلہ پر کوئی نہ تھا، ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد ایک دفعہ برطانی مدبر لارڈ کینگ نے کہا تھا کہ اگر پرانا امریکہ ہمارے پاس نہیں رہا تو اس کی تلافی اب جنوبی امریکہ سے کرنی چاہیئے، چنانچہ برطانی سرمایہ نے جنوبی امریکہ کی تجارت سے خوب ہاتھ رنگے، اور لائڈ جارج کے قول کے مطابق تو جنگ عظیم میں برطانیہ کی جیت کا ایک سبب ارجن ٹائن کا گوشت اور اناج تھا۔ جنگ ختم ہوئی تو اقتصادی سربلندی کا سہرا برطانیہ کے سر سے چھن چکا تھا، چنانچہ ریاست ہائے متحدہ کو اس وقت جنوبی امریکہ پر اپنا اقتصادی اقتدار جمانے کا اچھا موقع مل گیا، چنانچہ برطانیہ دوسرے درجہ پر آگیا۔ اور امریکہ نے اس کی جگہ لے لی۔

جنوبی امریکہ میں خام اجناس کی بڑی کثرت ہے، پیٹرول میں بھی ریاست ہائے متحدہ کے بعد اس کا نمبر ہے ۱۹۳۰ء کی عالمگیر کساد بازاری نے جنوبی امریکہ کا اقتصادی توازن بھی بگاڑ دیا، ملک میں مزدوروں کی شورش اور سرمایہ داروں کی حرص نفع طلبی نے طبقہ واری جنگ کی نیو ڈالی بات بات پر دونوں میں کشاکش ہونے لگی، اس افراتفری میں باہر کی حکومتوں کو دخل دینے کا خوب موقع ملا، جمہوریتوں کے صدروں کے انتخاب میں حریف سلطنتیں اپنے اقتدار سے کام لینے لگیں، ہر حکومت اپنے نمائندہ کی پیٹھ ٹھونکتی، الغرض اجنبی سرمایہ نے جنوبی امریکہ کی ریاستوں کو سازشوں، غارتگریوں اور بغاوتوں کا میدان کارزار بنا دیا ہے۔ منظر مختلف ہیں، نام جدا جدا ہیں، مگر ساری دنیا میں ہر جگہ بس بات ایک ہی ہے۔ ایسا سخت تصادم ہے کہ انسانیت کی قسمت اس فیصلہ سے وابستہ معلوم ہوتی ہے۔

خام اجناس کی تلاش میں آج دنیا کی بڑی حکومتیں دیوانی ہو رہی ہیں، جنوبی امریکہ کی خانہ جنگی اور بدامنی جرمنی، جاپان اور اٹلی کے لئے جو خام اجناس کی بھوک میں دنیا کو کھانے پر تل گئے ہیں خداداد نعمت تھی، اب ان تینوں نے جنوبی امریکہ پر حملہ بول دیا ہے، اشتراکیت کی جگہ فاشستی تحریک لے رہی ہے، ملکی سرمایہ دار فاشستی حکومتوں کی مدد سے مزدوروں کو بری طرح سے کچل

رہے ہیں - ارجن ٹائن میں برطانیہ کا سرمایہ سب سے زیادہ لگا ہوا ہے ، اور جزائر برطانیہ کو اناج اور گوشت زیادہ تر اسی ملک سے جاتا ہے۔ یہاں کے اطالوی آباد کار میسولینی کے اثر میں آچکے ہیں - اور برطانی مفاد پر میسولینی کے زبردست پروپگنڈے کی سخت زد پڑ رہی ہے۔ برازیل میں "Heil Hitler" کے نعروں سے فضا گونج رہی ہے ابھی حال میں برازیل اور جرمنی کا تجارتی معاہدہ ہوا ، اس کا اثر یہ ہے کہ برطانیہ اور امریکہ کی تجارت گھٹ گئی اور جرمنی کو ان کا حصہ مل گیا ، برازیل میں تقریباً ۵ لاکھ کے قریب جاپانی ہیں ، اُن کا زور بھی اپنا رنگ لا رہا ہے ، دوسرے جاپان کا سستا مال جنوبی امریکہ کی منڈیوں سے برطانیہ اور امریکہ کو نکال باہر کرنے میں بہت حد تک کامیاب ہو چکا ہے۔

اس وقت جنوبی امریکہ کی اکثر ریاستوں میں جرمنی ، جاپان اور اٹلی کا پروپگنڈا بڑے زور شور سے ہو رہا ہے ، اور موجودہ کساد بازاری اور مزدوروں کی شورش نے اس پروپگنڈے کے لئے فضا بھی سازگار پیدا کر رہی ہے ، نتیجہ یہ ہے کہ برطانیہ اور امریکہ کے ہاتھ سے جنوبی امریکہ کی تجارت اور اس کی خام اجناس کا اجارہ آہستہ آہستہ نکل رہا ہے ، اور اگر واقعات کی رفتار یہی رہی تو آئندہ جنگ میں برطانیہ کو ارجن ٹائن سے گوشت اور اناج کا ملنا بھی مشکل ہو جائے گا - م - س
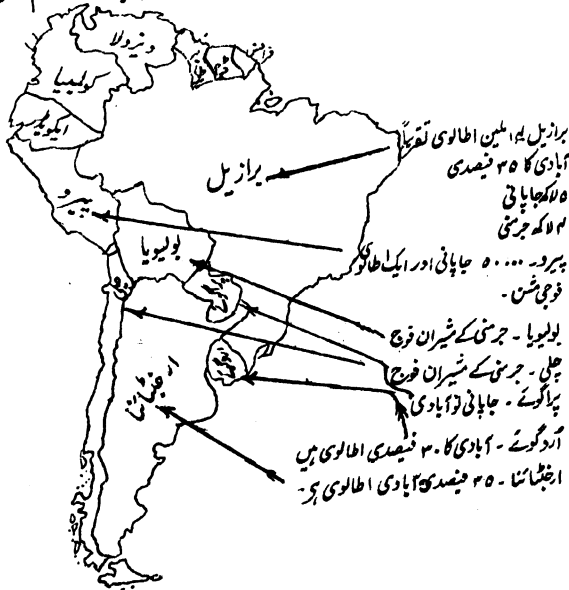
مصر جیساکہ ہمارا خیال تھا مصر کی سیاسی جماعتوں کے فضول جھگڑوں نے آخر ناگوار شکل اختیار کرلی، "قاہرہ" کی تازہ اطلاع ہے کہ "سبز پوش جماعت" کے ایک نوجوان نے وفد کے رہنما اور موجودہ وزیر اعظم نحاس پاشا پر پے در پے کئی گولیاں چلائیں، حسن اتفاق تھا کہ موصوف بال بال بچ گئے، اب تک تین سو کے قریب گرفتاریاں ہو چکی ہیں۔

وفد کے حامیوں کے جوش کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے اس حملہ کی خبر سُن کر دستوری جماعت کے لیڈر محمد محمود پاشا کے مکان پر حملہ بول دیا اگر وقت پر پولیس نہ پہنچ جاتی تو بڑا خون خرابہ ہوتا، سبز پوش نوجوان کی اس حماقت سے اُن کے حریف خوب فائدہ اٹھائیں اور کچھ بعد نہیں کہ حالات اتنے نازک ہو جائیں کہ یا تو نحاس پاشا مختار مطلق بننے کی کوشش کریں یا وزارت سے الگ کر دیے جائیں۔

مصر میں نوجوانوں کا بے قابو ہو کر اس قسم کے سنگین سیاسی جرائم کر گزرنا کوئی نئی بات نہیں، آرام طلب اور رنگین مزاج مصریوں کی طبیعت کا یہ میل کچھ عجیب ہی ہے، نپولین کو مصر میں قیام کے عرصہ میں اس رجحان کا کافی تلخ تجربہ ہوا۔ انگریز بھی اس کی وجہ سے کبھی نچنت نہ بیٹھ سکے نوجوانوں کے اس جنون پر ایک دفعہ ایک انگریز مدبر نے کہا تھا کہ مصر میں ٹھنڈی ہوا کے نرم نرم جھونکوں کے ساتھ یکبارگی آندھیاں اور جھکڑ بھی آجاتے ہیں۔

"سبز پوش" تحریک ردّعمل ہے تجربہ کار سیاسیین کی بے عملی اور خود غرضی کا، ۱۹۳۴ء میں اس تحریک کی داغ بیل پڑی، سبز پوش نوجوان سیاسی مسلک میں انتہا پسند تو ہیں ہی لیکن اُن کے پیش نظر مذہبی اور اخلاقی اصلاح کا پروگرام بھی ہے، ان کا لیڈر احمد حسین ۱۹۳۳ء میں جامعہ مصریہ کا طالب علم تھا، زمانہ تعلیم میں اُس نے طلبہ کی جماعت میں اپنا رسوخ پیدا کیا، اس نے دیکھا کہ ۱۹۲۰ء کے انتہا پسند رہنما وزارتوں کا مزہ چکھ کر اعتدال کی طرف مائل ہیں، سعد زغلول مرحوم کے وقت کے سیاسی تصورات فرسودہ ہو چکے ہیں، احمد حسین نے نوجوانوں کے سامنے ایک نئے مصر کی تصویر کھینچی، اُس کی پُراثر تقریروں نے طلبہ کے اُن جذبات کو اُبھارا جو صدیوں سے اُن کے آباؤ اجداد کے دلوں میں پرورش پا رہے تھے۔ سعد مرحوم کے سامنے صرف مصر کی آزادی کا مسئلہ

تھا، احمد حسین کی آنکھوں نے دنیا یکسر بدلی ہوئی دیکھی ۱۹۲۰ء میں مشرق قریب کے ممالک بے جان لاشے تھے، لیکن چودہ برس کی مدت نے ان کی کایا پلٹ دی تھی۔ اب مصر مرکز تھا عربی اور اسلامی دنیا کا۔ احمد حسین نے نوجوانوں کو سلطان صلاح الدین کا زمانہ یاد دلایا جب مصر صرف آزاد نہیں بلکہ آزاد اسلامی دنیا کا پایہ تخت تھا، اس نے مصری طلبہ کو بتایا کہ اسلامی تمدن کو خونخوار صلیبیوں اور مردم خوار تاتاریوں سے بچانے والے ہمارے ہی آبا و اجداد تھے، ازہر ہی وہ شمع ہے جو ہزار برس سے اپنی روشنی سے اسلامی دنیا کے گپ اندھیرے کو منور کر رہی ہے

اگر سعد زغلول ازہر سے نالاں تھے تو احمد حسین اس پر نازاں، سعد نے شامیوں اور فلسطینیوں سے بھائی چارہ رکھنے سے انکار کر دیا تھا اور احمد حسین مشرق قریب کو مصر کا داہنا ہاتھ اور ٹیونس اور مراکش کو بایاں ہاتھ سمجھتا ہے۔

سبز پوش تحریک کی اہمیت سیاسی کی بجائے تمدنی زیادہ ہے، انیسویں صدی کی ابتدا میں برسوں کے سوئے ہوئے مصر نے آنکھ کھولی تو اسے فرانس نے اپنی گود میں لیا۔ فرانسیسی اثر نے مصریوں کو "فراعنہ پرست" بنایا، سعد زغلول نے مصر، مصریوں کے لئے نصب العین پیش کیا اور اب مصر اسلام کی وراثت کا محافظ بن کر میدان میں قدم رکھتا ہے۔

سبز پوشوں کی جماعت کا نام "نوجوان مصر" ہے، ان کی ہر دلعزیزی دیکھ کر وفد پارٹی نے نیلی پوش" میدان میں لا کھڑے کئے آخر الذکر کی پشت پر حکومت ہے، اس لئے ان کی درازدستیاں بہت بڑھ گئی ہیں، کبھی کبھی دونوں جماعتوں میں تصادم ہو جاتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اسی دشمنی نے ایک سبز پوش نوجوان کو سیاسی جرم کے ارتکاب پر ابھارا ہے۔

بے شک وفد جماعت کی اکثریت ہے، اور نحاس پاشا کو لوگ بہت چاہتے ہیں، لیکن ہوا کا رخ بتاتا ہے کہ نوجوان مصر جیسی جماعتیں ایک نہ ایک دن وفد کی سیادت کو ختم کر کے رہینگی

چند دن سے تو قاہرہ سے برابر یہ خبریں آرہی ہیں کہ نحاس پاشا کی وزارت اب ٹوٹنے ہی والی ہے، موصوف پارلیمنٹ میں اپنی اکثریت کے بل بوتے پر ملک کے دستور اساسی میں ایک

اہم تبدیلی کرانا چاہتے ہیں، جس کے لئے بادشاہ تیار نہیں۔ اگر وزارت کے اصرار اور بادشاہ کے انکار کا یہی حال رہا تو آخر میں نحاس پاشا کو مستعفی ہی ہونا پڑے گا۔

مصر کے دستور اساسی میں بادشاہ کو پارلیمنٹ برخاست کر کے اپنے چنے ہوئے وزیروں کی مدد سے ملک پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہے، دراصل دستور کی یہی دفعہ ذمہ دار ہے اُن تمام وزارتی انقلابوں کی جو ۱۹۲۳ء سے اب تک مصر میں ہوئے ہیں، مرحوم شاہ فواد انگریزوں کے ساختہ پرداختہ تھے، اکثر ایسا ہوتا کہ جب کوئی وزارت قومی مطالبات کے لئے انگریزوں کے خلاف اڑ جاتی تو دوسرے دن شاہ فواد پارلیمنٹ کو ٹھکانے لگاتے، اور نئے وزیر جو برطانی ہائی کمشنر کے چنے ہوئے ہوتے حکومت کی باگ سنبھالتے، ایک بار پہلے ۳۰ء میں بھی نحاس پاشاہ نے دستور اساسی کی اس دفعہ کو بدلنے کی کوشش کی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ پورے پانچ سال تک دستور معطل رہا، اور غیر ذمہ دار وزارتیں برسر اقتدار رہیں، آخر خدا خدا کر کے حبش و اٹلی کی جنگ نے نازک صورت حال پیدا کی، اور بہت خون خرابے کے بعد مصر میں پرانا دستور بحال ہوا، اب نحاس پاشا کی وزارت پھر دستوری چٹان سے ٹکرانا چاہتی ہے، دیکھئے اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔

مصری برطانی نئے معاہدہ سے پہلے تو برطانیہ کو صرف اسی دفعہ کی وجہ سے آئے دن ملک کے معاملات میں دخل دینے کا موقع مل جاتا تھا، چنانچہ لارڈ لائڈ (سابق گورنر بمبئی) کی قماش کے ہائی کمشنر تو معمولی معمولی باتوں پر وزارت کو برطرفی کی دھمکی دے دیا کرتے تھے، لیکن اب حالات بدل چکے ہیں انگریز بین الاقوامی سیاست کی الجھنوں میں گرفتار ہے، اور وہ کسی طرح نہیں چاہے گا کہ اپنے کسی فعل سے مصر کی اکثریت سے بگاڑ پیدا کرے۔ قاہرہ کی ۳۰ دسمبر کی اطلاع ہے کہ وفدی وزارت ٹوٹ گئی اور محمد محمود پاشا وزیر اعظم ہوگئے

حجاز حج کا زمانہ قریب آرہا ہے، سرزمین حجاز کے باشندوں اور حکومت دونوں کے لئے حج ہندوستان کے موسم برسات کا سا حکم رکھتا ہے، حاجی زیادہ آئیں تو رعیت اور راعی نہال ہو جاتے ہیں اور کم ہوں تو قحط سالی ہوتی ہے، ہندوستان کے مسلمانوں نے تو اب اس ارض مقدس سے دلچسپی لینا ہی چھوڑ دیا ہے، اب نہ "تطہیر حجاز" کا جوش رہا اور نہ احیائے خلافت

راشدہ کا ولولہ، حجاز کی دھن سمائی تھی تو تن من کی بھی خبر نہ رہی تھی، ہر مجلس میں ابن سعود کا ذکر اور ہر سرگرمی حجاز کے لئے وقف، اب بھلا یا ہے تو خبر بھی نہیں لیتے کہ اس سرزمین پر کیا گزر رہی ہے۔

سنہ ۱۹۳۰ء کی عالمگیر کساد بازاری نے ابن سعود کے خزانہ کو بھی خالی کر دیا، جاوا، ہندوستان اور مصر سے حاجی کم آئے، آمدنی گھٹ گئی، حکومت کے لئے اپنے کارندوں تک کو تنخواہ دینا مشکل ہو گیا ابن سعود نے ادھر ادھر سے قرض لینے کی بہت کوشش کی لیکن سنگلاخ پہاڑیوں، ریت کے تودوں اور بدوؤں کے خیموں کو دیکھ کر کون روپیہ دے، آخر حکومت کو معدنی کانوں اور تیل کے چشموں کا خیال آیا، اور ایک انگریز کمپنی کو زمین کے ان خزانوں کو نکالنے کا ٹھیکہ دیا گیا۔ اگر کمپنی کی کوششیں بارآور ہوئیں تو عراق اور ایران کی طرح حجاز کی مالی مشکلات بھی اس تیل سے بہت حد تک حل ہو سکیں گی۔

شریف حسین کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کو حجاز میں اپنا اثر قائم کرنے کا بہت اچھا موقع ملا تھا لیکن "اصولی جنگ" نے ہمیں عملی دنیا سے بے تعلق کر دیا، ہم بے کار نظری بحثوں میں اُلجھ گئے، نکلے تو تھے مسلمانوں کی عالمگیر اخوت قائم کرنے اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے مسلمانوں کو خلافت اور حجاز سے ہی بدظن کر دیا، بے وجہ کی شوراشوری کا انجام بے نمکی کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا ہے، ۹ کروڑ مسلمانوں کی اس بے سری فوج نے ہندوستان میں تو اپنی بھد کرائی تھی، اسلامی دنیا میں بھی اس نے اپنے وقار کو خود اپنے ہاتھوں دفن کر دیا۔

تعجب تو یہ ہے کہ شریف حسین اور ابن سعود کے جھگڑے میں ہم نے زمین و آسمان ایک کر دیا تھا لیکن جب بدلے ہوئے حالات کو ذرا سدھارنے کا وقت آیا تو ہماری صلاحیتوں نے بالکل جواب دے دیا، اپنے مقابلہ میں مصر والوں کو دیکھئے، شریف حسین اور ابن سعود کے جھگڑے کے وقت وہ خاموش رہے (جسے ہم نے اس وقت اسلام فروشی اور مصر پرستی سے موسوم کیا) بعد میں محمل کے حادثہ کی وجہ سے دو تو ملکوں میں شکر رنجی پیدا ہو گئی، لیکن اب صلح و صفائی ہے، مصری سرمایہ برابر حجاز پہنچ رہا ہے "بنک مصر" نے جدہ اور مکہ میں اپنی شاخیں کھول دی ہیں، موسم حج میں ہوائی

آمد ورفت کا انتظام کر لیا ہے، حاجیوں کو لانے والے جہاز بھی بنک مصر کے ہیں، کچھ عرصہ سے بنک نے ہوٹلوں کا سلسلہ قائم کرنا شروع کر دیا ہے، ان دنوں حکومت مصر کافی مقدار میں حجاز کی حکومت کو قرض دینے پر غور کر رہی ہے، ظاہر ہے مسلمانوں کا سرمایہ اگر حجاز کی ترقی کے لئے فراہم نہ ہوگا تو غیر مسلم دنیا اس میدان کو کیوں چھوڑے گی۔ پھر ترقی ہوگی مگر آزادی اور اختیار؟ کیا ہندی مسلمان اس سلسلہ میں کچھ نہیں کر سکتے۔

ہم نے سب کچھ لٹا کر بے ننگ و نام کا لقب پایا، اور دوسرے ہیں کہ اپنے اندانے میں رہ کر دوسروں کو نفع بھی پہنچاتے ہیں اور خود بھی فائدہ اٹھاتے ہیں۔

مراکش

اسپین کی خانہ جنگی میں مراکشی عربوں کی شرکت نے دنیا کی تاریخ میں ایک نئے انقلاب کا امکان پیدا کر دیا ہے۔ آج الجزائر، ٹیونس اور مراکش کے گاؤں گاؤں اور شہر شہر میں اسپین کی جنگ کا چرچا ہے، اور عرب اپنے قہوہ خانوں میں بڑے جوش و خروش سے اپنے بھائی بندوں کی بہادری اور ان کے کارناموں کا ذکر کرتے ہیں، اور اس دن کا بڑی بے تابی سے انتظار کر رہے ہیں جب مراکش سے لے کر مصر کی سرحد تک یہ ملک پردیسی غاصبوں سے آزاد ہو جائے گا اور مسلمان بے دین عیسائیوں کو اپنے وطن مقدس سے نکال باہر کریں گے۔

معلوم نہیں فرانکو نے کن وعدوں پر اسپینی مراکش کے عربوں کو اپنے ساتھ ملایا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اس واقعہ سے عربوں کے حوصلے بڑھ گئے ہیں اور اب فرانکو کو فتح ہو یا شکست عربوں کو غلام رکھنا ناممکن ہو گیا ہے، سیاسی بیداری کے ساتھ اس کی دوسری وجہ شمالی افریقہ کی اقتصادی بدحالی ہے، اسپینی مراکش کا علاقہ تو زیادہ سرسبز بھی نہیں، البتہ فرانس نے اپنی مقبوضات میں زمین کو زرخیز بنانے میں بڑی سعی کی لیکن اس کا حاصل تمام کا تمام فرانسیسی نوآبادکاروں کو ملتا ہے، مراکشی جیسے پہلے خالی ہاتھ تھا اب بھی ویسا ہی ہے، اور پچھلے دو برس کی خشک سالی نے تو اسے بالکل قلاش بنا دیا ہے، ظاہر ہے فاقہ کشی کا حل بغاوت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

کہتے ہیں مراکشی کے خمیر میں آگ ہی آگ ہے، ساتویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کو ان علاقوں کو فتح کرنے میں برسوں تک جنگیں کرنا پڑیں، اور پھر اسلامی دور کے ایک ہزار سال میں یہ سرزمین ہمیشہ بغاوت گاہ بنی رہی، دوسروں کی حکومت یہ لوگ مشکل سے ہی مانتے ہیں، خود اپنے بھائیوں کا استبداد ان کی برداشت سے باہر تھا، اب آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ ایک پردیسی حکومت جس کا مذہب، تمدن اور زبان اہل مراکش سے بالکل مختلف ہو ان سرکش اور آتشیں مزاج والوں کو کب تک غلام بنا سکتی ہے۔

مراکش، اور الجزائر فرانس کے سیاسی اور معاشی وجود میں ریڑھ کی ہڈی کا کام دے رہا ہے، ہزاروں من غلہ اور لاکھوں من شراب ان علاقوں سے فرانس پہنچتی ہے۔ تقریباً چھتر ہزار فرانسیسی مراکش میں اور دس لاکھ الجزائر میں آباد ہوگئے ہیں، مراکشی اور الجزائری فوجیں ہی تھیں جو فرانس کے دشمنوں کے سامنے جنگ عظیم میں سینہ سپر ہوئیں، اور آئندہ ان ہی پر فرانس کو بھروسہ ہے۔ اب اگر شمالی افریقہ کی بے چینی اور بدامنی بڑھتی ہی گئی تو فرانس کی زندگی خطرہ میں پڑ جائے گی،

الجزائر میں فرانس کی ایک لاکھ فوج پڑی ہے، جن میں زیادہ تر وسط افریقہ کے کالے سپاہی ہیں، فرانس جانتا ہے کہ وہ الجزائر کی ۶۰ لاکھ آبادی کو اپنی ایک لاکھ فوج سے قابو میں نہیں رکھ سکتا، اسی طرح مراکش کے جنگجو قبائل کو فوج کے زور سے فرمانبردار بنائے رکھنا مشکل ہو گیا ہے، اب وہ ہوائی قوت کو بڑھا رہا ہے، فرانس کا خیال ہے کہ وہ صرف طیاروں کی مدد سے شمالی افریقہ کی بغاوت کو فرو کرسکے گا لیکن آپ جانتے ہیں کہ دلوں کی آگ یوں توپ و تفنگ سے نہیں بجھتی، اور محکوم کا غصہ اور انتقام حاکموں کی سختی اور استبدادیان کی دریادلی، اور مہر و کرم سے کم نہیں ہوتا، مراکش کی مسلمان آبادی جسے غاصب عیسائی حکومت نے نہ صرف اپنا غلام بنا رکھا تھا، بلکہ اُنھیں اپنے مذہب تمدن اور زبان سے زبردستی دور رکھنے کی کوشش کی تھی اب آزاد ہو کر رہے گی۔

جنگ عظیم نے اسلام کے جس سیلاب کو بڑی مدتوں کے بعد حرکت دی تھی، وہ افغانستان ایران، ٹرکی اور مشرق قریب کے ممالک سے بہتا ہوا بحر اوقیانوس تک پہنچ کر رہے گا، اور دنیا ایک بار پھر اس دور کو دیکھے گی جو آج سے ایک ہزار برس پہلے رونما ہو چکا ہے۔

میسولینی اور اسلامی دنیا

پریشان حالی و درماندگی میں دست گیری کرنے والے کو بزرگوں نے دوست بتایا ہے لیکن اگر دست گیری میں خلوص نیت کی شرط نہ ہو تو آج میسولینی مسلمانوں کا سب سے بڑا دوست ہے اس لئے کہ آجکل اس کی مہربانیاں ان پر عام ہو رہی ہیں۔ میسولینی اس وقت جو کچھ بھی کر رہا ہے وہ اطالیہ کی خارجی سیاست کا تقاضہ ہے، جو اسے اپنی زندگی کے لئے لابدی نظر آتا ہے۔ مگر بہر حال یہ چیز ہے بہت دلچسپ۔ ادھر برطانیہ اور فرانس، امن وامان، کے قیام کے لئے شدید کارروائیوں کے لئے مجبور ہوتے ہیں ادھر میسولینی کو مظلوموں کی دلدہی کا موقعہ مل جاتا ہے۔ الجزائر کے مظلوموں تک وہ خود تو نہیں پہنچ سکا لیکن اس کے بالکل متصل اپنے علاقے لبیا میں اُس نے اسلام کی نصرت وحمایت کے جو پرشور نعرے لگائے ہیں اُن کی گونج کیا الجزائر میں پہنچی؟ اور پھر کسی کو کیا خبر کہ پس پردہ عملی ہمدردی بھی شامل حال ہو۔ اطالوی پریس اسلامی ملکوں کی خبروں کو خوب نمک مرچ لگا کر شائع کرتا ہے اور جب مراکو کے متعلق خود فرانسیسی اخبار یہ کہتے ہوں کہ"

> "ہمیں اپنے آپ ہی سے پوچھنا چاہئے کہ کیا ہم نے شمالی افریقہ میں ان فرائض کو پورا کیا ہے جو ہم پر عائد ہوتے ہیں۔ صحت اور صفائی، متعدی بیماریوں کی روک تھام، پانی کی فراہمی وغیرہ وغیرہ سماجی کاموں کی ایک اچھی خاصی فہرست بن سکتی ہے۔ اب بتائیے ہم نے کیا کیا ہے، جب ہم اپنے غیر متوازی میزانیہ اور وطنی مشکلات کو دیکھتے ہیں تو دل اطمینان دلاتا ہے کہ جو کچھ کیا ہے اس سے زیادہ ہم کر بھی نہیں سکتے تھے لیکن بہر حال فتح ایک بڑے عرصہ تک حقوق سے زیادہ فرائض ہی عاید کرتی ہے۔"

تو اطالیہ کے اخبارات اُس پر کیا کچھ حاشیہ نہ چڑھائے ہوں گے۔ بحیرہ روم کے

ساحلی مقامات میں کچھ نہیں تو پچاس لاکھ مسلمان تو ضرور ہیں یہ سب اطالیہ کے زیر اثر ہیں فلسطین کے لئے یہاں گرمجوشی کے ساتھ چندے ہوئے برطانیہ نے مفتی اعظم اور ان کے ساتھیوں کے خلاف جو اقدام کیا ہے اس سے اس تمام علاقے میں برہمی پھیل گئی اور یہاں تک سننے میں آیا کہ مفتی اعظم بیت المقدس کے بعد لیبا ہی کو اپنے قیام سے معزز فرمائیں گے ۔ ادھر مفتی اعظم نے فلسطین سے جاتے ہوئے جو بیان دیا تو اس کے یہ جملے بڑی آب و تاب کے ساتھ اطالوی اخبارات میں چھاپے گئے

برطانیہ کو ہوشیار ہو جانا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ اپنے موجودہ طرز عمل کی بدولت وہ عربوں کی بلکہ تمام عالم اسلام کی رہی سہی ہمدردی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے ۔"

انگریز پر بھروسہ کرنے کی سزا عرب بیس سال سے اب تک بھگت رہے ہیں اگر اب کہیں ان دوسرے "خیر اندیش" پر اعتبار کیا تو ظاہر ہے کیا ہوگا ۔

عربوں کو تو محض اپنی قوت کے بل پر لڑنا ہے جبشہ کی نوخیز سلطنت، جسکی مہم میں اطالیہ نے شرم و شرافت ہی نہیں بلکہ جان کی بازی لگادی تھی، اس کی تعمیری کوششوں کا خاص مرکز ہے۔ اسی متاع عزیز کی بدولت آج سب پر اس کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے، حبشہ کی داخلی تعمیر و ترقی کے لئے حال ہی میں تیرہ ارب لیرا حکومت نے منظور کئے ہیں جو ۲ سال تک بالاقساط ادا ہوں گے۔ لیکن خارجی حفظ و امن اس سے بھی زیادہ ضروری تھا۔ ادھر امام یمن کے متعلق خبر اڑی تھی کہ وہ میسولینی کے دام میں نہیں آئیں گے۔ یمن اور حبشہ کا قرب اور پھر غضب بالائے غضب درمیان میں برطانوی بحر و بر اس لئے وہ سب سے پہلے امام کی طرف ملتفت ہوا اور بالآخر رام کر لیا ۔ ۱۵ ستمبر کو ۲۶ء والے تجارتی اور دوستانہ معاہدہ کی تجدید عمل میں آگئی ۔ یمن کی طرف سے تحفے تحائف بھیجے گئے اور پھر یہ اطلاع بھی آگئی کہ امام نے اطالیہ سے سامان جنگ منگایا ہے۔

سلطان ابن سعود سے تعلقات کچھ زیادہ اچھے نہیں تھے لیکن اطالیہ کی ایک چپتی کام آگئی ۔ ۲۶ء میں امام اور سلطان لڑا کئے اور آپ (اطالیہ) یمن کے دوست ہونے کے باوجود غیر جانب داری کی شان سے کھڑے تماشہ دیکھا کئے ۔ اس احسان کا تھوڑا بہت تو اثر ہوتا ہی چاہئے تھا

حبشہ کی ساری جنگ میں عرب سے کوئی آواز نہ اٹھی۔ ادھر حبشہ پر قبضہ ہوتے ہی میسولینی نے سلطان کا دل اس طرح ہاتھ میں لیا کہ حجاج کا ایک قافلہ اس نئی سلطنت سے شاید پہلی بار بھیجا۔ اور بقول مارننگ پوسٹ بہت سوں کے مصارف بھی جناب میسولینی نے برداشت کئے۔

آجکل عدن کی صورت حال بھی خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ برطانوی پارلیمنٹ نے ستمبر میں یہ طے کیا کہ حضر موت جو اب تک نیم برطانوی علاقہ تھا بالکل اپنے تصرف میں لے لینا چاہئے حالات کی نزاکت دیکھتے ہوئے تجویز کو فوراً جامۂ عمل پہنا دیا گیا۔ عرب بدو اپنی آزادمنشی پر حملہ برداشت نہ کر سکے۔ کچھ اور نہ بن پڑا، دو چار انگریزوں کو گولی کا نشانہ بنا دیا۔ عدن کی اور حضر موت کی بے چینی اطالیہ کے لئے دو وجہوں سے اہم ہے ایک حبشہ سے قرب دوسرے اُمت اسلامیہ۔ اطالوی اخبارات میں ان خبروں کو نمایاں جگہ ملی۔ ان ہی اخباروں کا بیان ہے کہ بدوؤں پر ہوائی جہازوں سے آٹھ دن تک بمباری کی گئی۔ اور آباد فصلیں، بھیڑ بکریاں، اونٹ سب تہس نہس کر کے رکھدئے اس اطلاع میں مبالغہ کی آمیزش ضرور ہوگی لیکن یہ تو واقعہ ہے کہ حضر موت میں کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ انگریز حاکم کبھی سختی کرتے ہیں اور کبھی خود ہی نرم بن جاتے ہیں۔

مصر اطالوی مقبوضات کے بیچوں بیچ میں ہے، اپنی سیاسی اہمیت کی وجہ سے وہ کس کو محبوب نہیں ہے۔ پھر میسولینی کو کیوں نہ عزیز ہوگا۔ یوں بھی کوئی پچاس ہزار اطالوی مصر میں بسے ہوئے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ اسکندریہ جیسے اہم نقطہ پر میسولینی مصر سے تعلقات برابر بڑھا رہا ہے۔ مانترو کانفرنس جو برطانیہ کی فسوں کاری اور مصریوں کی سادہ لوحی کی وجہ سے ضرورت سے زیادہ عظیم الشان بن گئی تھی، اس میں اطالوی سفیر نے ہر آڑے وقت میں مصر کو سہارا دیا۔ فرانسیسی نمایندے جب بنا بنایا کھیل بگاڑنے والے تھے تو اطالوی سفیر نے شدت کے ساتھ مصریوں کا ساتھ دیا۔ غرضیکہ مصر سے بنائے رکھنے کی بھی میسولینی ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔

فلسطین کے خونچکاں واقعات بھی اطالیہ میں دردمندی کے ساتھ سنے اور سنائے جاتے ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ فلسطین والوں کو خود بھی میسولینی سے کوئی توقع ہے لیکن ان حالات میں

مثبت ہمدردی بھی کچھ کم نہیں ہے۔ عید میلاد النبی کے موقع پر جلسوں میں کہیں کہیں "محافظ اسلام" میسولینی کی تصویر بھی آویزاں ہوئی تھی۔

اِدھر البانیا تو عملی حیثیت سے اطالوی نوآبادی ہی بن گیا ہے۔ اٹلی میں تیل کا کال ہے۔ البانیہ سے اُسے تیل بھی مِل جاتا ہے۔ البانیہ کے تہذیب و تمدن میں بھی اطالیہ بقدر ضرورت مدد کرتا ہی رہتا ہے۔ یہ دس لاکھ کی آبادی اور ایک معقول بندرگاہ اطالیہ کے لئے امداد غیبی کی حیثیت رکھتا ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ برطانیہ، اطالیہ کی اس غمخواری کے جواب میں کیا کر رہا ہے اس لئے کہ ع۔ بہت باریک ہیں واعظ کی چالیں، اس کے ہاں ابھی بہت سے لارنس موجود ہیں۔ عربوں سے قریب تر ہونے اور اپنے پروپیگنڈے کو کامیاب تر بنانے کے لئے اسی مہینے اتنا تو ضرور ہوا ہے کہ لندن کے ریڈیو اسٹیشن سے عربی میں تقریریں براڈکاسٹ ہونے لگی ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ عرب عربی کے اس "عروج" پر مسرور ہیں۔

بہر حال انگریز دوستی کا دم بھریں یا میسولینی زخموں پر پھایا رکھیں، دونوں مطلبی ہیں،

چین اور جاپان کی جنگ

۷ جولائی کو پائی پنگ سے کوئی تیس میل مغرب کی طرف ایک جاپانی فوج میں جو "مشق" کر رہی تھی اور ایک چینی فوج میں جسے یہ مشق ایک خطرناک حقیقت کی پرچھائیں معلوم ہوئی ذرا سی جھڑپ ہو گئی، جاپان نے جھٹ چین پر پچھلے معاہدوں کی خلاف ورزی کا الزام لگایا، اپنی نیک نیتی اور صلح پسندی اور چینیوں کی فتنہ پروری دونوں کا اعلان کیا، اور مدافعت کے لئے کارروائی شروع کر دی۔ اس مدافعت میں جنگ کا ایک مکمل نقشہ سامنے رکھا گیا تھا۔ اور جاپانی فوجوں نے نہایت باضابطگی اور ترتیب سے بڑھنا شروع کیا۔ اب چینی دارالسلطنت ان کے قبضے میں ہے، اور چین کے باقی دونوں سیاسی اور تہذیبی مرکزوں کان ٹون اور ہانکاؤ پر حملہ ہو رہا ہے۔

جاپان کا مقصد، کم از کم نان کنگ کی فتح تک، یہ تھا کہ چین کے پانچ شمالی صوبوں، چاہار، سوئی یوآن، شان سی اور شان تنگ پر پورا تسلط ہو جائے۔ جنگ کے اس حصے کو ہم پانچ

دہموں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ لڑائی شروع ہوتے ہی جاپانی فوجوں نے پائی پنگ کے مغرب، جنوب مغرب اور جنوب مشرق میں جو تین ریلوے جنکشن ہیں ان پر قبضہ کیا، اور پائی پنگ سے ٹی ان ٹس پاؤٹنگ اور کلگان کو جو ریلوے لائنیں جاتی ہیں ان کا سہارا لے کر آگے بڑھیں۔ پہلی مہم یہ تھی کہ پائی پنگ سے ٹی ان ٹس ہوتے ہوئے تاکوتک، جہاں بحری فوج اپنے قدم جما چکی تھی، قبضہ کیا جائے، اور پھر ٹسی نان پر۔ دوسری مہم کا مقصد پائی پنگ۔ ہانکاو ریلوے پر اس حد تک قبضہ کرنا تھا کہ شانسی صوبہ جاپانیوں کے لئے محفوظ ہو جائے۔ تیسری مہم کلگان، تاتنگ، سوئی یوآن کی طرف بھیجی گئی، تاکہ چاہار اور سوئی یوآن صوبوں پر قبضہ کرے اور اندرونی منگولیا کی فوجوں سے مل جائے۔ پانچویں مہم شنگ ہائی اور چھٹی نان کنگ کی تھی۔

اب شمال سے دیکھئے تو تیسری مہم نے پائی پنگ سے سوئی یوآن تک جو ریل جاتی ہے اس کے آخری اسٹیشن پاؤ ٹوتک قبضہ کر لیا ہے، اور اندرونی منگولیا کے شہزادے تہ دانگ نے چینیوں کو صوبہ یوآن کے شمالی حصے سے بے دخل کر کے جاپان کی دوستی کا حق ادا کیا ہے۔ اس مہم میں تاتنگ پر قبضہ کرنے کے بعد جاپانی فوج کا ایک حصہ تائی یوآن کی طرف مڑ گیا، تاکہ پائی پنگ ہانکاؤ ریلوے کے برابر جو لائن تائی یوآن سے اتر دکھن جاتی ہے اس پر قبضہ کرے۔ یہ سمجھئے چوتھی مہم تھی، اور اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ دوسری مہم کی فوج کو، جو پائی پنگ ہانکاؤ ریلوے کے ساتھ پائی پنگ سے جنوب کی طرف بڑھ رہی تھی، چینیوں کو شانسی صوبے سے نکالنے میں مدد دے۔

ان چاروں محاذوں پر چینی کہیں بھی جم کر مقابلہ نہ کر سکے، اس لئے کہ ہمت تو تھی مگر سامان نہ تھا۔ جاپانیوں کا خیال تھا کہ شانگ ہائی پر بھی وہ اسی طرح اپنے سامان اور تنظیم کی بدولت بازی لے جائیں گے لیکن یہاں پر چینی اڑ گئے۔ فتح بہر حال جاپانیوں کی ہونا تھی لیکن چینی فوج کی ہمت اور ایثار نے اس کو ایک مثال بنا لیا ہے جو یقیناً آئندہ مقابلوں میں کام آئے گی۔ شانگ ہائی اور نان کنگ کی فتح جاپانیوں کی پانچویں مہم تھی اب وہ دریائے یانگ ٹسی کے ساتھ ساتھ ہانکاو کی طرف بڑھ رہے ہیں اور کانٹون پر حملہ، جواب شروع ہو رہا ہے، یہ نئی مہمیں ہیں ان میں بھی جاپان کو کامیابی ہوگی

لیکن اب تک جو کچھ حاصل ہوا ہے اس کا اندازہ کر لینا ضروری ہے، کیونکہ ہر فتح میں شکست کا بھی کچھ نہ کچھ سامان ہوتا ہے،

جاپان نے شمال کے تین صوبوں کی تمام ریلوے لائنوں اور بڑے شہروں پر قبضہ کر لیا ہے، بس شان تنگ ابھی باقی ہے۔ یہ کام دراصل اتنا مشکل نہ تھا، جتنا کہ وہ جواب شروع ہو رہا ہے۔ کیونکہ چینیوں کی مخالفت برابر جاری ہے اور کہیں کہیں کامیاب بھی ہوئی ہے، جاپانیوں کو اب پھیل کر لڑنا ہوگا، اسقدر پھیل کر کہ ان کے ہوائی جہاز اور ٹینک کچھ زیادہ کام نہ آئیں گے، اس لڑائی کا سدباب شاید جاپان دوست صوبہ داروں اور کاؤنسلوں کے قیام سے بھی نہ ہو سکے، اس لئے کہ موجودہ چینی حکومت جنگ کو قومی حیثیت دینے میں کامیاب ہوئی ہے اور اب چینی کمیونسٹ بھی خلوص سے اس کی مدد کر رہے ہیں۔ جاپانی تسلط بھی ویسا نہیں جیسا کہ فتوحات کی خبریں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے، چین بہت بڑا اور بہت آباد ملک ہے، ریلوے لائنوں اور بڑے شہروں پر جاپان کا قبضہ ہونے سے چینیوں کے لئے اپنی مخالفت کو منظم کرنا قریب قریب ناممکن ہوگا، مگر دوسری طرف اتنے بڑے ملک میں قزاقانہ جنگ کا مقابلہ کرنا ایک مہم ہے جو شاید جاپانی فوج سے بھی سر نہ ہو سکے گی،

حال میں جاپانی جنرل ماتسوئی نے، جو شانگ ہائی نان کنگ کی فوج کا سپہ سالار ہے، اس کا اعتراف کیا ہے کہ جاپانی فوج تھک گئی ہے اور سردی بھی اتنی بڑھ گئی ہے کہ سستانے کو موقع مل جائے تو کچھ مضائقہ نہ ہوگا لیکن اگر چینیوں کی سرکشی کا یہی رنگ رہا تو جاپانی لڑائی جاری رکھیں گے اور ہانکاؤ تک یانگ سی کی وادی پر قبضہ کر لیں گے۔ دراصل اب چینیوں کو اس کا بھی موقع نہ دیا جائے گا کہ سرکشی سے توبہ کریں، جاپان کی فوجی پارٹی نے کہا ہے کہ ہانکاؤ اور کان ٹون دونوں فتح کئے جائیں گے اور مجرم چین کو موت کی سزا دی جائے گی۔

تعلیمی دُنیا

رکٹر لارن زلیاکس اور مسٹر سالٹر ڈیوس نیو ایجوکیشن فیلوشپ کے ڈیلیگیٹوں نے ۵ ر دسمبر کو جامعہ ملیہ کا معائنہ کیا۔ نیو ایجوکیشن فیلوشپ کل دُنیا کی تعلیم نو کی انجمن ہے جسکا مقصد تعلیم جدید کے اصولوں اور طریقوں کی اشاعت ہے اس کے مقاصد کے پرچار کے لئے انجمن کے تین ممتاز ممبر اس موسم سرما میں ہندوستان کا دورہ کر رہے ہیں۔ رکٹر زلیاکس کا تعلیمی تجربہ بطور طالب علم اور استاد بین الاقوامی ہے، ان کی تعلیم امریکہ ہوئی انگلستان میں بیڈیلز Bedales کے مشہور و معروف ادارے میں سات سال کی طویل مدت تک استاد رہے اس کے بعد انہوں نے تعلیم نو کے اصولوں کو ذاتی طور پر عملی جامہ پہنانے کے لئے اپنے وطن ہلنگ فورس Helsingfors فن لینڈ میں ایک ہائی اسکول قائم کیا آپ ایک بین الاقوامی کمیشن کے جو مسئلہ امتحانات پر تحقیقات کرنے کے لئے مقرر ہوا تھا صدر رہ چکے ہیں اور آج کل نیو ایجوکیشن فیلوشپ کے صدر ہیں۔

مسٹر سالٹر ڈیوس کا انگلستان کی سب سے ترقی پذیر کاونٹی (ضلع) کے تعلیمی نظم و نسق کا چالیس سالہ تجربہ ہے۔ آپ کینٹ Kent کاونٹی کے ڈائرکٹر تعلیمات ہیں۔ تعلیم پر کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور نیو ایجوکیشن فیلوشپ کے انگریزی حلقے کے صدر ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے دونوں اصحاب کو جامعہ کی سیر کرائی اور انہیں وہ بلند اصول بتائے جن پر جامعہ کام کر رہی ہے، نیز آپ نے ان مشکلات کا بھی ضمناً تذکرہ کیا جو ان کو اس کام میں برابر پیش آتی رہی ہیں۔ دونوں اصحاب جامعہ کے طریقہ تعلیم۔ عملی ماحول اور بچوں کی آزادی اور تخلیقی آرٹ کی دلچسپیوں سے بے حد محظوظ ہوئے۔

یہاں ہم ان کی چٹھیوں سے چند اقتباسات دیتے ہیں جو انہوں نے ذاکر صاحب کو لکھیں۔

زلیاکس صاحب لکھتے ہیں:۔ جامعہ ملیہ کی سیر اور ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے مخلص معاونین سے گفتگو میرے لیئے بے حد موثر او رتخیل آفریں تجربہ تھی۔ یہ ادارہ اپنے بلند اصول تعلیمی روح اور عملی جذبے

کی بنا پر جو اس میں کارفرما ہے ان تمام اداروں سے بہتر ہے جنہیں میں نے خود دیکھا ہے یا جن کے متعلق سُنا ہے،

اسی طرح مسٹر سالٹر ڈیوس نے مفصلہ ذیل الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔

مجھے جامعہ ملیہ اسلامیہ اسکول کی سیر سے بے حد دلچسپی ہوئی۔ یوں تو مجھے اپنے کل دنیا کے دورے میں بہت سے مدرسے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے مگر مجھے اتنا کہنے میں بالکل تامل نہیں ہے کہ آپ کا مدرسہ کئی پہلوؤں سے ان تمام اداروں سے زیادہ دلچسپ ہے، میرے خیال میں آپ ان تمام اصولوں کو عملی شکل دے رہے ہیں جنہیں دنیا نے ابھی تک محض نظریہ کے طور پر تسلیم کیا ہے اور تعلیمی دنیا انکو بہت آہستہ آہستہ بتدریج عمل میں لا رہی ہے، درحقیقت آپ ان تعلیمی اصولوں کو عملاً کام میں لا رہے ہیں جو میں اپنی کاونٹی کینٹ Kent میں رائج کرنا چاہتا ہوں، میری دلی تمنا ہے کہ آپ اور آپ کے معاونین اپنے بلند مقاصد میں کامیاب ہوں، اور آپ کا مکمل ادارہ جلد نئی تجویز کردہ عمارت میں منتقل ہو جائے،

اٹلی سینور بٹائی وزیر معارف ملی نے ایوان نمائندگان (چیمبر آف ڈپٹیز) میں تقریر کرتے ہوئے فاشزم کے تعلیمی پہلو پر یوں تبصرہ کیا۔

ہر مدرسے کی روح میں فاشزم کا عنصر نمایاں ہونا چاہیئے۔ اطالوی تہذیب کے اتحاد اور یکجہتی کا راز اس میں مضمر ہے کہ یہ سو فیصدی فاشزم کے اصولوں پر مبنی ہے اور اسے دوسرے عناصر سے کسی قسم کی رواداری اور سمجھوتے سے بدترین قسم کی منافرت ہے، ہمارا طرۂ امتیاز یہی ہمارا فاشسٹ ہونا ہے یہی جنگ کے لیئے ہمارا ہتھیار ہے اور اسی سے ہی ہم تہذیب و تمدن کی ترویج کے لیے جنگیں لڑتے ہیں۔ اسی تہذیبی مقصد کے لیئے ہمیں پیہم جنگ کرنا چاہیئے اور جب تک یہ چیز کارزار حیات میں ایک مستقل صورت اختیار نہ کرے تب تک ہمیں آرام کا سانس نہ لینا چاہیئے،

سینیٹ میں ایک تقریر کے دوران میں سینور بٹائی نے اعلان کیا کہ اب تک مدارس میں ۱۰۹۰۸ ریڈیو کے سٹ لگ چکے ہیں جن سے ڈو ملیون بچے استفادہ کر رہے ہیں،

ڈنمارک میں عملی اسکول۔ کچھ سالوں سے ڈنمارک کے ماہرین تعلیم طلبار کی اس بڑھتی ہوئی تعداد کو شبہ اور بے چینی کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے جو مڈل اسکولوں میں داخلہ لے رہے ہیں یہ ادارے کتابی تعلیم کے سلسلہ کی ابتدائی کڑی ہیں، طلبار کا رجحان محض کتابی تعلیم سے ہٹانے کے لئے تجویز کی گئی ہے کہ ایک نئے قسم کا اسکول جاری کیا جائے جسکا نام عملی اسکول ہو اور جس میں امتحانات کی کوئی قید نہ ہو۔ اس اسکول کا اصل مقصد ایسے طلبار کی ضرورت کو پورا کرنا ہے جو آئندہ زندگی میں کسی دستکاری کو پیشہ بنائیں گے،

انڈین سائنس کانگریس کے جشن جوبلی کی تقریب میں جو سائنس داں انگلستان یا دیگر ممالک سے شرکت کی غرض سے آرہے ہیں ان میں سے بعض کو کلکتہ یونیورسٹی کی طرف سے اسناد بیش کی جائیں گی۔ ان میں سے قابل ذکر سر جیمز جین صدر مشترکہ اجلاس کانگریس، سر آرتھر سٹینلے اڈنگٹن مشہور ماہر ریاضی وہیئت داں، ڈاکٹر آسٹن کیمبرج کے معروف پروفیسر طبعیات، ڈاکٹر رینگ پروفیسر نفسیات فیڈرل یونیورسٹی زیورش۔ پروفیسر فیشر لندن۔ پروفیسر ارنسٹ بیکر کیمبرج وغیرہم ہیں،

کاروباری تعلیم Vocatinal education۔ پچھلے دنوں ہندوستان کے تعلیمی حلقوں میں گاندھی جی کی تعلیمی اسکیم اور اس کے صنعتی پہلو سے بہت دلچسپی اور کہیں کہیں ہلکی یا شدید نکتہ چینی کا اظہار کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں چند ایک ترقی پذیر ممالک کے مدارس میں نصابی اصلاحات کے سلسلہ میں چند چیزیں اس امر کو زیادہ واضح کردیں گی کہ آج کل تعلیمی دنیا میں بالعموم نصاب میں کاروباری رجحان کو پیدا کرنے اور تعلیم کو آئندہ زندگی کے مشاغل سے نزدیک تر لانے کے لئے کیا جد و جہد کی جارہی ہے،

فرانس میں Seine و الیرز کے بائر ابتدائی اسکولوں میں پچھلے اکتوبر سے دیہاتی دستی صنعت و حرفت کے سکھانے کا انتظام کیا گیا ہے، اس میں بارہ سال سے زیادہ عمر کے بچے داخل ہوسکیں گے۔ ہر ہفتے بیس گھنٹے تو کاروباری تربیت کے لئے۔ دس عام تعلیم اور چھ زراعتی اصول اور عملی تجربات کے لئے مخصوص کردیئے گئے ہیں۔ بچوں کے لئے مختلف پیشوں میں سے انتخاب کرنے کے لئے دلچسپ انتظام

کیا گیا ہے۔ مقامی صناع مثلاً بڑھئی۔ لوہار قفل بنانے والا۔ زراعتی مستری۔ بجلی کا مستری وغیرہ بچوں کو اپنی مخصوص صنعت سکھاتے ہیں۔ بچے صرف ایک صنعت باقاعدہ طور پر نہیں سیکھتے بلکہ یہ کوشش کی جاتی ہے کہ وہ ان سبھی پیشوں میں تھوڑی بہت دلچسپی لیں اور بالآخر آئندہ زندگی کے لئے اپنے رجحان اور میلان کے مطابق ایک پیشہ چن لیں، اس انتخاب کا حق انہیں اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے، جب وہ بڑھئی کی شاگردی میں ۱۶۰ گھنٹے، لوہار کے پاس ۲۴۰۔ زرعی مستری کے پاس ۱۶۰ گھنٹے۔ جست کی نالیاں درست کرنے والے کے ہاں ۸۰ گھنٹے اور بجلی کے مستری کی شاگردی میں ۱۶۰ گھنٹے کی تعلیم مکمل کر چکیں گے،

بلجیم میں مزدوروں کی یونیورسٹی ۔ شارلی روئی کے مقام پر ایک سوشلسٹ صوبے کے وسط میں ایک ایسا تعلیمی ادارہ قائم کیا گیا ہے جو اس پورے صوبے کی اقتصادی زندگی کے لئے دل و دماغ کا حکم رکھتا ہے، چونکہ یہ یونیورسٹی مزدور اور غریب طبقہ کے لئے کھولی گئی ہے، اس کے لئے اس کا بنیادی اصول کم سے کم خرچ پر اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم مہیا کرنا ہے، اس کا ہر بات میں لحاظ رکھا جاتا ہے۔ جو طلبا دن میں تعلیم پاتے ہیں وہ کھانا وہیں ایک رستوران میں کھاتے ہیں، جس کا انتظام طلبا کی انجمن امداد باہمی کے ہاتھ ہے۔ یہاں محض خوراک کے دام لئے جاتے ہیں اگرچہ نرخ بہت ہی کم ہیں تاہم خوراک کا معیار تسلی بخش ہوتا ہے، طلبا کے لئے ایک دار الاقامہ بھی اسی طرز پر چلایا جا رہا ہے، جہاں صرف دھلائی کا خرچ لیا جاتا ہے، باقی سب کام طلبا، اپنے ہاتھ سے کرتے ہیں، اس نظام کے ماتحت تعلیم کا خرچ اسقدر کم ہو گیا ہے کہ ایک ہفتے کی خوراک اور رہائش کے لئے محض ۶۰ سے ۷۰ بلجیک فرانک درکار ہوتے ہیں جو تقریباً سات روپیہ کے برابر ہوتے ہیں، اس پر بھی بعض نادار طلبا کے لئے اور کمی کی گنجائش باقی رہتی ہے،

اس ادارے کا مقصد ہانائو کے صوبے کے لئے مزدور۔ کاریگر، صناع اور انجینیر مہیا کرنا ہے۔ لیکن طلبا کا تعلق تعلیم کے بعد ختم نہیں ہو جاتا بلکہ پرانے اور نئے طلبا، ایک ادارے میں منسلک ہیں جس کی مصروفیات کا مرکز یونیورسٹی ہے، یونیورسٹی کا کام ان کی آئندہ زندگی میں ان کے لئے معیار عمل پیش کرنا ہے جس سے وہ اپنی کارگزاری کا مقابلہ کرتے رہتے ہیں، مفید معلومات اور جدید تحقیقات کی اطلاعات بھی انہیں اس ادارے

سے ملتی رہتی ہیں۔ اپنی کاروباری زندگی میں ان کو جو دقتیں اور مشکلات پیش آتی ہیں ان کے سلجھانے کے لئے ان کے پرانے اساتذہ ہمیشہ تیار رہتے ہیں،

اس ادارے کا مقصد محض کاریگر اور مستری ہی تیار کرنا نہیں بلکہ ایسے دل و دماغ کی تربیت کرنا ہے جو محنت سے عار نہ کرے، ہاتھ کا کام اس کے لیے ایک شان خودداری لئے ہوئے ہو اور اس کے ساتھ ساتھ تعلیم کے تہذیبی اور کرداری پہلوؤں کو بھی خاص اہمیت دی جاتی ہے، ادارے کا مقصد کلچرڈ یا مہذب مزدور تیار کرنا ہے، ضبط و نسق کی پابندی اور بلند کردار کی تخلیق میں اساتذہ کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ ہر استاد طلبا کے لیے مثل خاندان کے شفیق باپ کے ہیں۔

یونیورسٹی کی دیواریں۔ انجن روم۔ بورڈنگ وغیرہ مختلف قطعات اور فوٹو سے مزین ہیں۔ فوٹو کے ذریعہ اخلاق کی تعلیم بہت پرانا طریق ہے۔ مگر ان چیزوں کی اہمیت جبھی ہو سکتی ہے کہ وہ ایسے ماحول میں لگائے جائیں جہاں کہ لفظی عبارت کو عملی شکل دی گئی ہو جب کسی کمرے میں ٹالسٹائی یا کنفوشس کے جملے خوبصورت تحریریں چسپاں ہوں اور ساتھ ہی محنت کی عزت کا بلند اصول ادارے کے ہر شعبے میں جاری وساری ہو تو ان قطعات کا اثر گہرا اور دیرپا ہو سکتا ہے،

اس یونیورسٹی کو یہ فخر حاصل ہے کہ یہ دنیا کی سب یونیورسٹیوں سے کم عمر کے طلبا، کے داخلے کی اجازت دیتی ہے، ابتدائی جماعتوں میں ۱۲ سال سے ۱۴ سال کے طلبا، ہیں۔ یہ طلبا، زیادہ تر ہاتھ سے کام کرتے ہیں، کام کی مختلف نوعیت سے ان کی دلچسپیوں میں بے حد اضافہ ہو جاتا ہے اور بعض تو اس والہانہ شغف سے کام کرتے ہیں کہ ان کو حد سے زیادہ تھکا دینے والی مشقت سے بچانے کے لئے خاص احتیاط کرنی پڑتی ہے، بہر حال اس اوائل عمر میں ہاتھ کا کام ان پر کسی قسم کا ضرر رساں اثر نہیں ڈالتا۔

مصر۔ محمود النمر نیزی بے نے جو وزارت معارف میں کاروباری تعلیم کے کنٹرولر ہیں اس تعلیم کی ترویج اور توسیع کے سلسلے میں حکام کے سامنے چند دلچسپ اور مفید تجاویز پیش کی ہیں ان کی رائے میں مدارس میں کھلونے بنانے کی صنعت کی تعلیم کا خاص طور پر انتظام کرنا چاہیئے، جس کے لئے اک طرف تو ملک میں بے حد مانگ موجود ہے اور دوسری طرف یہ صنعت غیر ملکی کھلونوں کی درآمد کا مناسب اور مستقل سد باب

کردیگی۔ اس کے علاوہ وزارت کی توجہ نئی نسل کے لئے صناع اور عمدہ دستکار پیدا کرنے کی طرف مبذول ہو چکی ہے، اس سلسلہ میں یہ سفارش کی گئی ہے کہ اگر کوئی بچہ اپنے باپ کی صنعت یا دستکاری سیکھنا چاہے گا تو اسکی فیس اور دیگر تعلیمی مصارف میں پچاس فیصدی کمی کردی جائیگی۔ فن معماری، جہازسازی اور آرائشی آرٹ کی تعلیم پر خاص توجہ دی جارہی ہے،

فلسطین فلسطین میں تین بچوں کے گاؤں ہیں جنہیں اکثر جمہوریہ اطفال کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے،
ماسٹر شفیہ کا گاؤں جسکی بنیاد آج سے ۱۱ سال پہلے رکھی گئی تھی ۱۵۰ بچوں کی آبادی پر مشتمل ہے، بچوں کے لئے چار دار الاقامے ہیں لڑکے اور لڑکیاں علیحدہ رہتے ہیں لیکن ہر قسم کا زرعی کام اکٹھا کرتے ہیں اور باہمی اشتراک اور تعاون سے گاؤں کے زراعتی فارم کو بہت کامیابی سے چلاتے ہیں، یہاں آٹھ گھنٹہ روزانہ کام کا اصول رائج ہے اور اسی میں سکولی مضامین، زراعت اور خانگی کام سب شامل ہے، کام بچوں کو ان کی عمر اور جسمانی صحت کا لحاظ کرکے دیا جاتا ہے تعلیم کی حیات ملی سے گہری وابستگی اور تعلق ہے،

تل عفیف اور یوروشلم کے مابین بن شمن کا گاؤں ۱۹۲۹ء میں قائم کیا گیا جس میں ۳۰۰ بچے ہیں۔ یہاں اور بھی کم عمر کے بچے موجود ہیں جنکو تین گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے، تین سے آٹھ سال، نو سے تیرہ۔ چودہ سے سترہ، ان تمام گاؤں میں لڑکے لڑکیاں اکٹھے پڑھتے ہیں اور ضبط و نسق کا انصرام بچوں کے ہاتھ میں ہے،

گاندھی جی نے جب پہلے پہل ہریجن اخبار میں اپنی تجاویز پیش کی تھیں تو اس سلسلے میں انہوں نے ضمناً فلسطین کے مدارس کا بھی ذکر کیا تھا کہ وہاں اس قسم کی کوشش کی جارہی ہے۔ در حقیقت ہندوستانی تعلیمی مسائل کے لئے ہمیں مفید ہدایات ان مغربی ممالک سے نہیں مل سکتیں۔ جنکا کافی نظام مشین کی صنعت پر مبنی ہے اور جن کے ہاں روپیہ کی اتنی فراوانی ہے کہ وہ تعلیمی اداروں کی تشکیل اور اصلاح کے لئے دل کھول کر خرچ کرسکتے ہیں، ہمارے لئے زیادہ مفید ان ممالک کی مثالیں ہیں جو اقتصادی لحاظ سے پسماندہ ہیں، جن کی کثیر آبادی زراعتی یا گھریلو دستکاری سے

اپنا گزارہ چلاتی ہے، اس قسم کے ممالک فلسطین میکسیکو وغیرہ میں ہیں۔ فلسطین کے یہودیوں کو اس چیز کی خاص ضرورت ہے کہ وہ اپنی قوم کو جو صدیوں سے زرعی اور صنعتی مشاغل سے علیحدہ ہو چکی ہے دوبارہ ان کی طرف لائیں، ہندوستان میں بھی ہمیں اپنی پرانی صنعتی روایات کو جو ایک زمانہ میں یورپ اور مشرق قریب کی منڈیوں میں خراج تحسین حاصل کرتی تھیں دوبارہ زندہ کرنا ہے اس سلسلے میں یہ کہنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ فلسطین میں بھی گاندھی جی کی رائے کے مطابق بچوں کو ابتدائی جماعتوں سے ہی پیشہ یا ہنر یا کسی صنعت سے روشناس کرانے کی کوشش کی جاتی ہے مکیسکو ( ) پچھلے دنوں میکسیکو کے اسکولوں کی تعداد میں جو کسان اور ان کے بچوں کی تعلیم کے لئے کھولے گئے ہیں، معتد بہ اضافہ ہوا ہے، یہ تسلی بخش ترقی کسانوں کی اپنی کوشش کا نتیجہ ہے جو اپنے گاؤں میں تعلیم جاری کرنا چاہتے ہیں اور جو اسکولوں کے کلچرل اور سماجی فوائد کے معترف ہو چکے ہیں،

پچھلے دنوں پیرس میں کل دنیا کی نمائش منعقد ہوئی تھی جسکے سلسلے میں مفصلہ ذیل بین الاقوامی کانفرنسوں نے اپنے اجلاس کئے۔

ایک کانفرنس حفاظتِ اطفال Welfare W[illegible] کی ہوئی جسمیں طبی اور قانونی شعبوں کے علاوہ ایک شعبہ تعلیمات بھی تھا جس میں تعلیم کے دوران میں سزا۔ اس کے طریق اور نتائج اور اس کی اخلاقی حیثیت پر بحث و تمحیص کی گئی تھی۔

انجمن صلیب احمر (جونیر رڈ کراس) کی بھی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ان مسائل پر بحث کی گئی جن کی مدد سے اس تحریک میں اجتہاد اور دلچسپی کی روح پھونکی جا سکے۔ نیز بین المدارس خط و کتابت اس مفید تحریک کی موجودہ حالت اور اسکی ترقی کے امکانات۔ اور ایک سالنامہ کی ترتیب کا مسئلہ بھی اسی جلسے میں پیش کیا گیا۔

ان کے علاوہ یوتھ ہوسٹل کانفرنس۔ لوری نوجوانوں کی کانفرنس اور تجرباتی معلمی کی کانفرنس

کا بھی انتظام کیا گیا۔ آخر الذکر کے صدر موسیو پیرن مشہور معروف سائنس داں ہوں گے

پچھلے دنوں دنیائے مصوری میں پروفیسر نکولس دی روئرش کی پنجاہ سالہ جوبلی کی تقریب منائی گئی۔ پروفیسر موصوف کی چار ہزار تصویریں جن میں سے بیشتر نادر روزگار ہیں یورپ امریکہ اور ہندوستان کے عجائب خانوں کلچر گیلریوں اور روئرش ہالوں میں موجود ہیں، روئرش ہال وہ عمارتیں ہیں جو مصور کے قدردانوں نے اس کے شاہکاروں کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے پیرس۔ بلگراڈ۔ ریگا بنارس زاگریب، پراگ۔ الہ آباد وغیرہ میں بنوائی ہیں، روئرش عجائب خانہ واقعہ نیویارک میں ہی ایک ہزار کے قریب تصاویر موجود ہیں، روئرش نہ صرف ایک ماہر فن اور روحانی حس کو بیدار کرنے والا مصور ہے بلکہ وہ ایک سائنس داں، آثار قدیمہ کا ماہر، فلسفہ اور بین الاقوامی اخوت کا کلچرل علمبردار ہے۔ روئرش کی دلچسپ شخصیت اور اسکی ادبی، فنی اور فلسفیانہ دلچسپیوں نے آئن شٹائن۔ سیتر لنک آندر کیف اور ٹیگور جیسی بلند پایہ ہستیوں سے خراج تحسین حاصل کیا ہے،

پچھلے دنوں روئرش نے نگر میں جو کلو کی وادی میں واقع ہے اُرسوتی ہمالین ریسرچ انسٹیوٹ قائم کیا ہے، جہاں مصور نے اپنا مستقبل کا گھر بنالیا ہے، یہاں ہندوستان اور مرکزی ایشیا کی تاریخ، آثار قدیمہ، لغت اور علم حیوانات و نباتات پر علمی تحقیقات کی جاتی ہے۔ روئرش نے اپنی اس والہانہ محبت و عقیدت کا اظہار جو اسے ہندوستان کے تمدن اور تہذیب سے ہے اپنی تصنیفات میں پرجوش طرز بیان میں کیا ہے،

ہنگری۔ بوڈاپسٹ میں بیکار اساتذہ کی انجمن کا ایک جلسہ ہوا جسکی افتتاحی تقریر میں اساتذہ کی باہمی تعاون اور ایک ایسے مستقل ادارے کے قیام کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے جو ہنگری کے تقریباً سات ہزار اساتذہ کے روزگار کا ضامن ہو سکے، انجمن کے بنیادی اصول یہ ہونے چاہئیں۔ ٹریننگ کالجوں میں طلباء کی کم سے کم تعداد لی جانا چاہیئے، تربیت یافتہ اساتذہ کا حق ملازمت اس مدت کی

نسبت سے بڑھنا چاہیئے، جو انہیں ڈپلوما پاس کرکے گزر چکی ہے، مثلاً ایسے فرد کو جسے حال میں ہی ڈپلوما ملا ہو دوسرے پر ترجیح نہ دینا چاہیئے جو برسوں سے روزگار کا متلاشی ہو۔ ایسی نئی جگہیں اور ملازمتیں تلاش یا پیدا کرنا چاہئیں جن پر اساتذہ مقرر کئے جا سکتے ہیں، مثلاً گھروں پر تعلیم دینا، پبلک جگہوں کی نگہداشت، غریب بچوں کی امداد کے ادارے۔ انجمن الاطفال کا انتظام وغیرہ،

مہاراجہ ٹراونکور نے اپنی چھبیسویں سالگرہ کے موقعہ پر ٹراونکور یونیورسٹی قائم کرنے کا اعلان کیا۔ اس کے مقاصد نظام تعلیم کی نئے سرے سے تشکیل۔ ٹکنیکل تعلیم اور اس کی ترقی عملی سائنس کے بارہ شعبوں میں علمی تحقیقات کا بہتر طریق پر منظم کرنا اور اس کے لئے آسانیاں بہم پہنچانا کیرالہ آرٹ اور کلچر کی ترقی اور اس کی حفاظت ہونگے، یونیورسٹی کے چانسلر مہاراجہ ٹراونکور اور وائس چانسلر سر سی۔ پی راماسوامی آئر دیوان ریاست ہوں گے۔ جن کی ان تھک کوششوں کے طفیل یونیورسٹی معرض وجود میں آئی ہے، ہمیں امید ہے کہ نظام تعلیم کی از سر نو تشکیل کو یونیورسٹی کے ہاتھوں میں دے کر ارباب اختیار اس غلطی کے مرتکب نہ ہوں گے، جو برطانوی ہند کے ماہرین تعلیم کرتے رہے ہیں جنہوں نے پورے ابتدائی اور ثانوی درجوں کو یونیورسٹی میں داخل ہونے کا ابتدائی زینہ بنا لیا ہے۔

الہ آباد یونیورسٹی کی تقریب جوبلی اس سال بہت دھوم دھام سے منائی گئی جس میں بہت سی یورپی اور امریکی یونیورسٹیوں کے نمائندے بھی شریک ہوئے۔ بہت سے مشاہیر علم و سیاست کو ڈاکٹر کی ڈگریاں دی گئیں، اس مرتبہ یونیورسٹی کے جلسۂ اسناد کا ایڈریس مالوی جی نے ہندی زبان میں پڑھا۔

ڈاکٹر سید حسین صاحب نے جامعہ میں دو تقریریں فرمائیں، صاحب موصوف ایک زمانے میں خلافت کے پرجوش کارکن اور روزنامہ انڈیپنڈنٹ کے مدیر تھے، اور اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے حکومت نے آپ کو جبرالٹر میں قید کر دیا تھا۔ آجکل آپ امریکہ کی ساؤتھ کیلی فورنیا

یونیورسٹی میں اسلامیات کے لکچرر ہیں۔ امریکہ آپ نے اپنے بے نظیر زور قلم اور جادو بیانی سے میدان صحافت اور تقریر میں بڑا نام پیدا کیا ہے، آپ ایک عرصہ تک رسالہ نیوا ورنیٹ کے مدیر رہے جو مشرقیات پر امریکہ کے بہترین جرائد میں شمار ہوتا تھا،

لارڈ نفیلڈ Nuffield نے جامعہ اوکسفورڈ کو ایک گریجویٹ کالج کے قیام کیلئے دس لاکھ پاؤنڈ کا عطیہ دیا ہے۔ عمارت کے لئے زمین بھی جسکی قیمت ایک لاکھ پونڈ ہے، لارڈ موصوف نے اپنی طرف سے عطا کردی ہے، اس کے علاوہ فزیکل کیمسٹری کا ایک معمل قائم کرنے کی غرض سے ایک لاکھ پونڈ اور طبّی تحقیقات کی امداد کے لئے دو لاکھ پونڈ دیئے ہیں، اس مقصد کے لئے پچھلے سال انہوں نے بیس لاکھ پونڈ دیئے تھے، ان کی کل عطیات کی رقم ایک کروڑ پونڈ کے قریب ہوتی ہے، گریجویٹ کالج کا مقصد نصاب میں سوشل مضامین کے مطالعہ کو سماجی ضروریات، صنعت و حرفت وغیرہ سے قریب تر لانا ہے، اس ادارے کی ایک خصوصیت وہ طلبار ہوں گے جو نصف وقت تو مختلف پیشیوں اور کارخانوں میں کام کریں گے اور نصف وقت تعلیمی مصروفیت میں گزاریں گے، ایسے طلبار کے لئے فیلوشپ اور وظائف کا خاص انتظام کیا گیا ہے، ہندوستان میں جہاں بدقسمتی سے امیر طبقے کو فراھمی زر اور اسکی حفاظت یا اس کے بے جا اسراف سے فرصت نہیں ہے، لارڈ نفیلڈ جیسے ہمدردان قوم عنقا کا حکم رکھتے ہیں۔ برشیٹ یا انا ملائی چٹیار۔ نظام حیدرآباد یا ٹاٹا کے عطیات ایک صحرائے ویران کے لیئے پانی کے ایک قطرے سے زیادہ نہیں ہیں

اوکسفورڈ یونیورسٹی میں سیل روڈس۔ جنوبی افریقہ کے مشہور انگریز سیاستداں اور استعماریت پسند مفکر نے مختلف ممالک کے طلبار کے لئے وظائف مقرر کئے ہیں جنہیں سیل روڈس سکالرشپ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اس سلسلہ میں جرمن طلبا نے بھی اس رعایت سے فائدہ اٹھایا۔ اب ھامبرگ کے ایک سوداگر نے جو اپنا نام اخفائے راز میں رکھنا چاہتا ہے، شکریہ اور امتنان

کے طور پر انگریز طلباء کے لئے جرمن یونیورسٹیوں میں وظائف قائم کرنے کا اعلان کیا ہے۔ ان وظائف کی رقم تین ہزار مارک سالانہ ہوگی۔

معطی نے ان وظائف کو قائم کرتے ہوتے یہ آرزو ظاہر کی ہے کہ یہ عطیات جرمن اور انگریزوں میں مفاہمت اور رواداری کی بنیادیں مضبوط کردیں گے اور اس ذریعہ سے یورپی تمدن و تہذیب کے اتحاد و یگانگت کا احساس شدت سے پیدا ہوگا،

---

۴ نومبر کو لیسسٹر میں برٹش ورکرز ایجوکیشنل اسوسی ایشن کا سالانہ اجلاس زیر صدارت ڈاکٹر ٹاونی منعقد ہوا جس میں چار سو مندوبین نے شرکت کی۔ اپنی صدارتی تقریر میں انہوں نے مزدوروں کی تعلیمی تحریک کے دو مقاصد کی تصریح کی۔ پہلا مقصد تو مزدور جماعت کے افراد کے لئے ایسی تعلیمی سہولتیں مہیا کرنا جنکے ذریعے سے ان کی خوابیدہ قوتیں بیدار ہو جائیں۔ دوسرا عوام میں اس بے انصافی کا احساس پیدا کرنا جو مزدو طبقے کے تعلیمی معاملات میں برتی جا رہی ہے اور ایک ایسے نظام تعلیم کی تشکیل کے لئے راہ صاف کرنا جسکا اصل الاصول جمہوریت ہو۔ دوسری اور اہم تجاویز کے علاوہ اس کانفرنس نے ایک تجویز اسکولی بچوں کے لئے بہتر غذا اور ریاضت جسمانی کے مسئلہ پر منظور کی۔ کانفرنس کی رائے میں حکومت نے اب تک اس اہم مسئلہ کو حل کرنیکی کوئی تسلی بخش کوشش نہیں کی۔ بقول ایک مقرر کے ورزش جسمانی کو بہتر غذا کے مسئلہ پر فوقیت دینا گاڑی کو گھوڑے کے آگے جوتنا ہوگا،

ژورنال دی ماسکو۔ ازبکستان میں کتب خانوں کی تعداد میں حیرت انگیز اضافے پر تبصرہ کرتا ہوا لکھتا ہے "سنہ ۱۹۳۰ء میں کتب خانے محض ۷، تھے سنہ ۱۹۳۵ء میں ان کی تعداد ۴۴۴ ہو گئی، اور تجویز یہ تھی کہ سنہ ۱۹۳۶ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۲۸۰ ہو جائے گی جن میں سے ۱۵ کتب خانے دیہی حلقوں میں ہوں گے سنہ ۱۹۳۶ء کی تجویز کے مطابق محض شعبۂ تعلیم کے کتب خانوں کے لئے ایک ملیون

کتابیں فراہم کی جائیں گی۔ ہر گاؤں کی لائبریری میں کم از کم دو ہزار کتابیں ہونگی اور ہر ایک سرکٹ Circuit لائبریری میں چھ ہزار سے آٹھ ہزار۔

ایران۔ مدارس کی تعطیلات کے ایام میں ملک بھر میں اساتذہ کے لئے ایسے کورسوں کا انتظام کیا گیا ہے، جو ان کی تعلیمی اور کلچرل استعداد میں اضافہ کر سکیں۔ مختلف اضلاع میں کھیلوں کے کیمپ کا انتظام کیا گیا جن کی مدت دو ہفتے سے تین ہفتے تھی ان کیمپوں میں نہ صرف اساتذہ کو ایک دوسرے سے ملنے جلنے اور تبادلۂ خیالات کا موقعہ مل گیا بلکہ وہ کھیل اور جسمانی ریاضت کے جدید سائنٹفک طریقوں سے بھی روشناس ہو گئے۔

مسلم لائبریری بنگلور۔ مسلم لائبریری بنگلور کے ناظم صاحب کیطرف سے ایک اپیل موصول ہوئی ہے، اس میں ہمدردانِ زبان و ادب اردو سے درخواست ہے کہ اس ادارے کی امداد کی جائے، ابھی اس کی اپنی کوئی عمارت نہیں ہے اور کتابیں بھی ناکافی ہیں، ناظم صاحب نے اپنے مراسلے میں مسلم لائبریری کی خدمات پر بھی ایک نظر ڈالی ہے اور آخر میں زعمائے قوم کی چند رائیں بھی پیش کی ہیں جس سے لائبریری کی افادیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

ہندوستانی زبان کے موجودہ رجحان ارتقا کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہندوستانی قوم کے ہر فرد کا یہ فرض ہے کہ وہ قومی زبان کے نشو و نما کے لیے ہر ممکن کوشش کرے، قوموں کی زندگی بڑی حد تک ان کے ادب سے وابستہ ہوتی ہے، اس نظریئے کے ماتحت مسلم لائبریری بنگلور امداد کی جائز طور پر مستحق ہے۔ اس کی حوصلہ افزائی ایک قومی خدمت ہے،

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۸۹۲

بسم اللہ

جامعہ

زیر ادارت:۔ ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ ڈی

جلد ۲۹	فروری ۱۹۳۸ء	نمبر ۲

فہرست مضامین

قیمت سالانہ صہ — فی پرچہ ۸ ر

(پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع برقی پریس دہلی)

جدید تصوّریت

جدید تصوّریت زمانۂ حال کے فلسفہ کا سب سے آخری نظریہ ہے۔ اس کو بیشتر فلسفی فکر کا ایک نہایت مجتہدانہ مذہب خیال کرتے ہیں، اس کے خاص نمائندے دو اطالوی ہیں (بے نی ڈیٹو کروچے (پ ۱۸۶۶) اور گیودنی جنٹائل (پ ۱۸۷۵) فلسفہ کے اس مذہب کو دعویٰ تو عالم گیر استناد کا ہے لیکن مبدء اور خواص کے لحاظ سے وہ یکسر اطالوی ہے، کیوں کہ کروچے اور جنٹائل دونوں اس بات کے مدّعی ہیں کہ وہ حُسن کاری اور تاریخ کی اہمیت پر زور دے کر دنیا کے بارے میں خالص اطالوی نقطۂ نظر کا اظہار کر رہے ہیں۔

لیکن ہم کو بحث فی الوقت ان کے فلسفے سے ہے اور اس باب میں اگر ہم یہ دیکھیں کہ ان کا ہیگل کے فلسفہ سے کیا رشتہ ہے تو غالباً ان کی اہمیت کا اندازہ لگانے میں ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی، کیونکہ ان کے نظریئے اصل میں ہیگل ہی کے فلسفہ کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں۔

ہیگل کے شاہکار عقیدے دو ہیں۔

(۱) پہلا یہ کہ فکر ایک زندہ اور مُقرون حقیقت ہے یعنی کائنات کی پوری وسعتوں میں حقیقی اور موجود اگر کوئی شے ہے تو وہ فکر ہے، اس طرح فکر جب کائنات کی واحد موجود شے ہے تو ضروری ہے کہ حقیقت کی ترجمانی اسی کے ذریعہ ہو — اور

(۲) دوسرا یہ کہ بلا واسطہ فکر یا راست تجربہ کے عقب میں فکر کی مجموعی وحدت کارفرما ہے۔ یہ کُلّی فکر یا وجود مطلق انفرادی فکر سے بہت زیادہ بلند پایہ ہے لیکن اس کے باوجود وہ انفرادی فکر میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ اس کی یہ سرایت ضروری اس لئے ہے کہ انفرادی فکر اسی کی وجہ سے قابلِ فہم بھی ہے اور حقیقی بھی۔

ان عقیدوں کے متعلق ہیگل کا خیال یہ تھا کہ وہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں اور باہم غیر متناقض ہیں لیکن بعض اصحاب کی رائے یہ ہے کہ ان میں موافقت نہیں پیدا کی جا سکتی کیونکہ وہ ایک دوسرے کے نقیض ہیں۔

لیکن جہاں پہلے عقیدے سے اعراض ممکن نہیں وہیں ہیگل کے فلسفہ کی اصولی ترقیوں سے یہ لازم آتا ہے

کہ دوسرے عقیدہ پر زور دیا جائے، چنانچہ انگریزی تصوریت کا ایک نہایت اہم دبستان جس کے سربرآوردہ وکلا بریڈلے اور بوسینکے ہیں وجودِ مطلق کی کلّی اور انفرادی فکر کی جزئی حقیقت پر نہایت شدت سے زور دیتا ہے۔ کیونکہ یہ اس کا مرکزی عقیدہ ہے، اس عقیدہ کا سب سے نتیجہ خیز نکتہ یہ ہے کہ کائنات ساکن اور مکمل ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ انفرادی فکر مسلسل ترقی کرسکتا اور اپنی ترقی کے نتائج کو مسلسل ترتیب دے سکتا ہے لیکن کائنات بہرحال وحدت ہے اور مکمل۔ اس کی فطرت میں اضافہ کی کوئی گنجائش نہیں دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ عدیم التغیر ہے لیکن انگریز تصوریئین جو کُل کو اپنی جگہ پر بالکل مکمل سمجھتے ہیں اس سے یہ کہیں مترشح نہیں ہوتا کہ کائنات مجموعی حیثیت سے مردہ اور متناہی ہے، اس کے برخلاف وہ تو ہردم اپنے نئے ہونے کا ہر وقت ثبوت بہم پہنچاتی رہتی ہے کیونکہ متناہی صورتوں میں اپنے آپ کو مسلسل ظاہر کرتی ہے۔ اب ہر متناہی صورت چونکہ اس کا پورے طور پر کبھی اظہار نہیں کرتی نہیں کرسکتی اس لئے دوسری صورتوں سے قطعی مختلف ہوتی ہے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ کائنات کے ظہور آپس میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف یعنی نئے ہوتے ہیں، لیکن اس کے باوجود کہ وہ ہر جزئی ظہور میں یکساں داخل اور ساری ہے اور اس کے باوصف کہ وہ اپنی لامتناہی کلیت کو ہر لحظہ برقرار رکھتی ہے اس میں بذاتِ خود کوئی تغیّر نہیں ہونے پاتا۔ یعنی وہ تاریخ نہیں کیوں کہ تاریخ کی روئدادوں میں بلا کا تنوع ہوتا ہے، کائنات کے اس تصور پر بڑے بڑے حملے ہوئے ولیم جیمس اور رناتجین نے اپنے نقطۂ نظر سے موجوئیین نے اپنے لحاظ سے اور جدید تصوریئیں نے اپنے زاویۂ نگاہ سے اس پر متعدد اعتراضات کئے ہیں اس تصور پر جو اتنی نکتہ چینیاں کی گئیں اُن کے اسباب یہ ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ وجودِ مطلق جو کلی حقیقت کے مترادف ہے ہمارے متناہی تجربہ کے عقب میں اور اس سے ورے ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ہمارے تجربہ کی رسائی کے ماوراء ہے یعنی حقیقت کا علم ممکن نہیں۔ اور

(۲) دوسرا یہ کہ وجودِ مطلق انفرادی افکار کا منبع بھی ہے اور مرجع بھی بہ الفاظ دیگر یہ کہ وہ تجربہ کی کُلّی شرط اور مختتم تالیف ہے اس سے دو باتیں لازم آتی ہیں۔

(ا) یہ کہ ترقی معدوم اور تغیر بے حقیقت ہے اور

(ب) یہ کہ فکر فاعل نہیں بلکہ منفعل ہے۔

مختصر یہ کہ اگر کائنات مجموعی حیثیت سے درحقیقتہً غیر متغیر اور مکمّل ہے تو اس کے ظہورات کی مرئی تفرق اور کثرت بھی اسی کی طرح غیر متغیر اور مکمّل ہے، لہذا ہیگل کا یہ قول کہ "فلسفہ تاریخ ہے" سراسر بے معنی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ انگریز تصوریئیں اور ان کے ناقدوں کی مناظرہ آرائیوں کے محاسن اور معائب سے تفصیلی بحث کا یہ کوئی محل نہیں تاہم اگر ہیگل کے مذکورہ بالا قول کے مضمرات پر ایک سرسری مگر مُبصرانہ نظر ڈال لی جائے تو غالباً بے جا نہ ہوگا کیونکہ یہیں سے جدید تصوریئین اپنے ہیگلی ساتھیوں سے جدا ہوتے ہیں اور یہیں سے اس ترقی کی داغ بیل پڑتی ہے جو ان کے ہاتھوں ہیگل کے فلسفہ کو نصیب ہوئی۔ اگر ذہن ہی کائنات کی واحد موجود شے ہے تو تاریخ سے مراد ظاہر ہے کہ ذہن کی تاریخ ہوگی لہذا اس میں نہ صرف واقعات اور سانحات کی کھتونی ہوگی بلکہ ذہن کی ترقیاں بھی درج ہوں گی۔ یہاں تک تو جدید تصوریئیں اپنے ہیگلی ساتھیوں کے دوش بدوش ہیں لیکن اس کے بعد ان کی رائیں مختلف ہوجاتی ہیں۔ جدید تصوریئیں کہتے ہیں کہ اگر حقیقت عبارت ہے وجود مطلق سے تو وہ زماناً آگے نہیں بڑھ سکتی یعنی ترقی نہیں کرسکتی، کیونکہ وجود مطلق بہرحال مکمل اور غیر متغیر ہے اسی طرح فکر اگر وجود مطلق کا ایک متناہی ظہور ہے یعنی پہلے ہی سے مکمّل تو وہ فاعل نہیں ہوسکتا کیونکہ فعلیت تغیر اور ترقی کو مستلزم ہے۔ اور پھر تاریخ میں چونکہ ترقی کا تصور متضمن ہے اور وجود مطلق اور بنابریں فکر دونوں مکمل ساکن ہیں لہذا حقیقی تاریخ کا وجود محال ہے لیکن ہیگل تو کہتا ہے کہ "فلسفہ تاریخ ہے" تو کیا یہ جملہ بے معنی ہے؟ اگر نہیں تو یہ ضروری ہے کہ ہیگل کا دوسرا عقیدہ باطل ہو چنانچہ جدید تصوریئیں کہتے کہ ہمیں اس وجود مطلق کو جو ساکن ہے اور راست انفرادی تجربوں کے عقب میں کارفرمائی کر رہا ہے یک قلم بھلا دینا چاہیئے اور دیکھنا صرف ان تجربوں کو چاہیئے جو انفرادی ہیں اور جن کی معرفت ہمیں بلا واسطہ حاصل ہے، کروچے اور جنٹائل کی ترقی کا راز یہی ہے ان کے نزدیک ذہن فُعّال ہے اس نے اپنے کو آپ ہی خلق کیا اور وہ اپنے سے ہی تمام چیزیں خلق کرتا ہے وہ حقیقی اور لفظی معنوں میں دنیا کی واحد موجود شی ہے اس کے سوا دنیا میں کوئی چیز موجود نہیں حتیٰ کہ وہ وجود مطلق بھی نہیں جو ابتدا میں سبھوں کا مصدر اور انتہا میں سبھوں کا مرجع ہے

فلسفہ حقیقت کی ہستی یا ماہیت سے بحث کرتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ذہن کی ہستی یا

ماہیت سے بحث کرتا ہے گویا فلسفہ عبارت ہے، ذہن کے اپنے آپ غور کرنے سے لیکن ذہن کا اپنے آپ پر غور کرنا اپنے آپ کو خلق کرنے کے مساوی ہے اور یہ چیز ذہن کی عین ماہیت اور ہستی ہے لہذا ذہن دُہرا فعل انجام دیتا ہے، ایک تو اپنے آپ کو یا اپنی ترجمانیوں کو خلق کرتا ہے اور دوسرے اپنے آپ کی یا اپنی تخلیقوں کی ترجمانی کرتا ہے خالق کی حیثیت سے وہ تاریخ ہے، لہذا تاریخ سے وہ حقیقت مراد ہے جو ہر وقت حاضر ہے وجہ یہ کہ ذہن حقیقت کی یعنی اپنی تخلیق میں مسلسل مصروف ہے۔ ترجمان کی حیثیت سے وہ فلسفہ ہے، لہذا فلسفہ تخلیقی فعلیت کے استمرار سے زیادہ کچھ نہیں، وجہ یہ ہے کہ ذہن بہ سبب اپنی مسلسل تخلیق کے تکمیل نفس کا ایک عمل ہے پس ذہن جو اپنی ماہیت اور ہستی سے بحث کرتا ہے تو یہ خود اسکی ماہیت اور ہستی ہے اس طرح فلسفۂ تاریخ اور تاریخ فلسفہ دونوں ایک ہیں۔

غرضکہ ہیگل اور جدید تصوریئیں کی حیثیتوں میں بیّن فرق یہ ہے کہ اوّل الذکر کے نزدیک کائنات میں زمانی ترقّی برائے نام ہے اور مؤخر الذکر کے ہاں وہ ایک ٹھوس حقیقت ہے، اس طرح حقیقت ایک دائمی تکوّن ہے وہ کبھی کامل نہیں ہوسکتی کیوں کہ کامل اور تاریخی ہونا دو متناقض خواص ہیں جو کہیں اور کبھی مجتمع نہیں ہوسکتے لیکن حقیقت کی یہ حرکت نامتناہی اقدام نہیں بلکہ دوری حرکت ہے یہ حرکت حقیقت کی جان ہے، اس میں مسلسل اُپج ہے کیوں کہ حقیقت دائرہ میں گردش کرتے ہوئے ہمیشہ اپنا اضافہ آپ کرتی ہے لیکن یہ اضافہ کبھی مکمل نہیں ہوتا، یوں ہر پل میں اسکو کچھ نہ کچھ حاصل ضرور ہوتا ہے، مگر جو حاصل ہوتا ہے وہ پورے طور پر نہیں ہوتا، حقیقت کے یہ دو خاصّے ہیں اور ان کا اظہار وہ ایک سرے سے لے کر دوسرے تک بالکل مساویانہ کرتی ہے۔ اس ضمن میں کروچے کے الفاظ یہ ہیں "ترقی کا تصور اس ڈھب کا ہونا چاہیے کہ اس سے بیک وقت دو شرطیں پوری ہوں ایک تو یہ کہ ہر پل میں حق اور خیر حاصل ہو اور دوسری یہ کہ ہر نئے پل میں شک پیدا ہو لیکن اس سے یہ ہرگز مراد نہیں کہ جو حاصل ہوگیا اُسے کھو دیا جائے بلکہ یہ ہے کہ اُسے محفوظ رکھا جائے، گویا ہر وقت ایک نیا حل پیش ہو اور ہر دم ایک نیا مسئلہ اٹھ کھڑا ہو جس سے نئے حل کی ضرورت داعی ہو اس طرح ترقی کا حقیقی تصوّر وہ ہے جس کے پیش نظر دو بالکل مختلف مقصد نہ ہوں یعنی متیقن الحصول غایت یا "متناہی ترقی" اور ناممکن الحصول غایت یا "نامتناہی ترقی" دونوں

سے مجتنب ہو۔"

کروچے کے ان الفاظ کو آپ کے سامنے پیش کرنے کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ جدید تصوریئیں کے عام مابعد الطبیعی تصور کی ضروری تلخیص ہماری نظروں کے سامنے رہے اور دوسرا یہ کہ کائنات کے بارے میں کروچے کا نقطۂ نظر کیا ہے یہ ہمیں معلوم ہو جائے، آیئے اب یہ دیکھیں کہ اس تصور کو فلسفہ کے روایتی مسائل پر کیسے منطبق کیا گیا لیکن اس مقصد کے لئے بہتر یہ ہو گا کہ ہم کروچے اور جنٹائل کے نظریوں پر الگ الگ نظر ڈالیں۔

(۲)

بے نی ڈیٹو کروچے۔ کروچے نے اپنے فلسفہ کا نام "فلسفہ روح" تجویز کیا ہے اور چار جلدوں کو محیط ہے جس کے نام علی الترتیب یہ ہیں۔

(۱) جمالیات یا حُسن کاری اور زبان حکمت،

(۲) منطق یا خالص تصور کی حکمت

(۳) عملی فلسفہ یا معاشیات اور اخلاقیات۔ اور

(۴) تاریخ نگاری کا نظریہ اور اس کی تاریخ

ان کتابوں کا انگریزی زبان میں ترجمہ ڈگلس اینسلی نے کیا ہے یہ تو خیر ایک جملہ معترضہ تھا لیکن اس سے پہلے کہ ہم کروچے کے فلسفہ کی گہرائیوں میں اُتریں مناسب یہ ہو گا کہ اس کے بنیادی عقیدہ کو جس کے بموجب ذہن دنیا کی واحد موجود شے ہے ذرا زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کریں کیوں کہ اس سے ہمیں آئندہ سطور کے سمجھنے میں مدد ملے گی۔

عام تصوری فلسفیوں کی طرح کروچے بھی یہ مانتا ہے کہ دنیا میں صرف تجربہ ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے وجود کا ہمیں پکا یقین ہے لہذا حقیقی صرف تجربہ ہے اس کے سوا کوئی چیز حقیقی نہیں اور اگر ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہ تجربہ سے متعلق ضرور ہے، یعنی یا تو اس کی کوئی شرط ہے یا اس کا کوئی جزو ہے یا اسکی کوئی حرکت ہے یا اس کا کوئی درجہ ہے یا اس سے متعلق کوئی مفروضہ ہے، اس کے علاوہ یہ تجربہ

یکسر بالفعل اور محض حال ہی حال ہے، رہ گئے ماضی اور مستقبل سو وہ حقیقی صرف اس لئے ہیں کہ حال پر منحصر اور اس سے مربوط ہیں۔

بادی النظر میں معلوم یہ دیتا ہے کہ تجربہ میں ایک اور چیز لا ینفک طور پر اس کا جزو ہے، یہ وہ شئ ہے جس کا تجربہ کیا جاتا ہے اور جو صاحب تجربہ کے روبرو موجود ہے اور تجربوں کو حرکت میں لاتی اور اس کے خواص کی تعیین کرتی ہے لیکن یہ خیال ایک باطل خیال ہے کیوں کہ تجربہ اور تجربہ میں آنے والی چیز کا یہ امتیاز یہ معنی رکھتا ہے کہ تجربہ کو تجربہ سے الگ کیا جائے، حالانکہ تجربہ ایک کُل ہے ایک وحدتِ تام ہے اور بہ لحاظ ماہیت سراسر ذہنی۔ اس کے ماسوا تجربہ اور تجربہ میں آنے والی چیز کی یہ تفریق بجائے خود صاحبِ تجربہ ذہن کی ایک پیداوار ہے اس طرح ''شے'' کوئی چیز نہیں وہ کبھی ہمارے تجربہ میں نہیں آتی تجربہ میں ہمیشہ مفروضہ شے کا تجربہ آتا ہے اور تجربہ کا تجربہ خود تجربہ ہے، لہذا راست معرفت ہمکو ہمیشہ اپنے تجربہ کی حاصل ہوتی ہے کسی اور چیز کی نہیں کیونکہ کوئی اور چیز ہے ہی نہیں، جب صورت حال یہ ہے تو یہ فرض کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ شے یا خارجی دنیا کی حیثیت ذہن کی ایجاد سے کچھ زیادہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ خارجی دنیا کے مقرون کُل کی ایک تجرید ہے، جسکو ذہن اپنے مقاصد اور مصالح کی تکمیل کے لئے انجام دیتا ہے۔ یوں جب خارجی شے کا کہیں وجود نہیں تو یہ ضروری ہے کہ ذہن اپنی اشیاء کو آپ خلق کرے۔ چنانچہ ہوتا ہی ہے اور اسی سے ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ تجربہ بذاتہ ایک ایسی فعلیت ہے جو اپنی تعیین اور تخلیق آپ کرتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر تجربہ آپ اپنا خالق بھی ہے اور آپ اپنی مخلوق بھی۔ چونکہ جو کچھ ہوگا وہ اسی قبیل سے ہوگا۔ اس لئے یہ ماننے میں کوئی دشواری نہیں کہ حقیقت ایک عالمگیر ذہن یا روح ہے۔ جو اپنے آپ اور اپنے ماحول دونوں کو یکساں پیدا کرتی ہے لہذا ذہن ایک گنبد بے در ہے۔ جس میں نہ کوئی چیز داخل ہو سکتی ہے اور نہ اس سے کوئی چیز خارج ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی حقیقت چونکہ بے صورت نہیں ہوتی لہذا ہر وہ صورت جسکو حقیقت اختیار کرتی اور کر سکتی ہے لازماً ذہن یا تجربہ پر مبنی ہوتی ہے اور ہونی چاہئے۔ اس طرح حقیقت سرتاسر تجربہ سے پیدا ہوتی ہے اور ایسی کوئی حقیقت ہمارے علم میں نہیں جو تجربہ پر مبنی نہ ہو۔

اب چونکہ حقیقت گوناگوں صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ اور ہر صورت تجربہ پر مبنی ہوتی ہے اس لئے ہر صورت مساوی حقیقت رکھتی ہے ان حالات کے تحت فلسفہ کا واحد فریضہ یہ ہے کہ وہ ان متنوع صورتوں کو مناسب ترتیب سے جگہ دے ان کے باہمی رشتہ کی تعیین کرے اور جو خدمتیں وہ تجربہ کے کل کی تعمیر میں انجام دیتی ہیں ان کو پورے طور پر اجاگر کرے۔ کروچے کا فلسفہ اس نصب العین کو لے کر میدان عمل میں آتا ہے۔ اس لئے آئیے یہ دیکھیں کہ وہ اپنے پیش نہاد کی تکمیل میں کہاں تک کامیاب رہتا ہے۔

(ا) نظری فعلیت۔ صورتوں میں پہلی صورت علم کی ہے، جسے کروچے نظری فعلیت کے نام سے موسوم کرتا ہے، اب چونکہ تجربہ کے تصور سے ہی یہ لازم آتا ہے کہ ذہن علم کے معروض کو خود پیدا کرے، لہذا نظری فعلیت کی تحتانی قسمیں دو ہیں (۱) ایک وہ جس کے تحت میں ذہن مادہ بہم پہنچاتا ہے اور (۲) دوسری وہ جس کے تحت میں وہ اس مادہ کی تبویب اور تنظیم کرتا ہے۔ یہ قسمیں بالترتیب (۱) وجدان اور (۲) تصوری فکر کہلاتی ہیں۔ اور جمالیات اور منطق میں اس سے بحث کی جاتی ہے۔

(۱) وجدان۔ کروچے کے نزدیک حسی ادراک کوئی چیز نہیں اس کے یہاں نہ محسوسات ہیں اور نہ معطیات حواس۔ جو کچھ ہے وہ تجربہ ہے۔ اس طرح جب اشیا یا معطیات حواس کا کوئی وجود نہیں تو تجربہ میں کوئی انفعالی عنصر بھی نہیں، لہذا ادراک کوئی ایسا عمل نہیں ہے جس میں ذہن ا کو کسی خارجی شے ب کی معرفت حاصل ہوتی ہے یا جس میں ا، ب کو اپنے سانچوں میں ڈھالتا ہے یا جس میں ا، ب کے ساتھ گھل مل جاتا ہے یا جس میں ا، ب میں اور ب، ا میں نفوذ پاتا ہے یا جس میں ا، ب کی تالیف کرتا ہے (جیسا کہ اکثر فلاسفۂ متقدمین نے سمجھا ہے) بلکہ ایک فعلیت ہے جس میں ا اپنے معطیات کو تمثالات اور وجدانات کی صورت میں خود ہی پیدا کرتا ہے، اس فعلیت کا اصلاحی نام جمالی فعلیت ہے۔

کروچے نے ملکۂ ادراک کی ان لفظوں میں تعریف کر کے اس کو گویا حسن کار یا شاعر کا ملکہ

بنا دیا ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ادراک کا تعلق صرف شاعروں اور حسن کاروں سے ہے۔
کیونکہ ادراک میں ہم سب حقیقتاً اپنی حسن کاری اور شاعری کا اظہار کرتے ہیں، میں اوپر یہ کہہ آیا ہوں
کہ جسمانی فعلیت اپنے معطیات آپ پیدا کرتی ہے اور اب اس عمل کی انتہائی حزم و احتیاط کے ساتھ
تشریح کرتے ہوئے میں یہ کہوں گا کہ ذہن اپنے وجدانات کو تمثالات کی صورت میں ظاہر کرتا ہے
لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ وجدانات اور تمثالات ایک دوسرے سے ممتاز ہیں یا جو وجدان
ظاہر نہ ہو وہ وجدان کی حیثیت سے باقی رہ سکتا ہے، اس لئے کہ وجدان اور تمثالی کے جداگانہ ناموں
میں صرف زبان کی ضروریات کا خیال ملحوظ ہے ورنہ نہ ان کی ہستیاں ایک دوسرے سے الگ ہیں
اور نہ وہ جداگانہ وظائف انجام دیتے ہیں اور پھر یہ واقعہ ہے کہ کوئی وجدان ایسا نہیں جو ظاہر
نہ ہوا ہو کیونکہ وجدان خود آپ اپنا اظہار ہے لیکن وجدانات کو تمثالات کی صورت میں ادا کرنا
حسن کار کے فریضہ سے ہے، لہذا حسن کاری سراسر غنائی چیز ہے، یعنی یہ کہ جو وجدانات شاعر کی روح
کے اعماق میں جنم لیتے ہیں ان کو ادا کیا جائے اس کے ماسوا حسن کے معنی خود اظہار کے ہیں یا زیادہ
کامیاب اظہار کے ہیں۔ لہذا قبح مماثل ہے قصورِ اظہار کے علیٰ ہذا حسن سے جو ہمیں رغبت ہوتی
ہے اس کی وجہ کامیابیِ اظہار کی پسندیدگی ہے اور قبح سے جو نفرت ہوتی ہے اس کا سبب قصورِ اظہار
کی ناپسندیدگی ہے اور پھر جیسے اظہار تخلیق حسن ہے ویسے ہی اس کی داد اور قدردانی بھی تخلیقِ حسن ہے
لہذا ہم حسن کار کی طبعی جولانیوں کو پسند اور قدر کی نگاہوں سے صرف اس لئے دیکھتے ہیں کہ وہ ہمارے اپنے وجدانوں
کو نہایت کامیاب پیرایہ میں ادا کرتا ہے غرض کہ کروچے کے نزدیک حسن کاری اظہار سے زیادہ نہیں ہے۔
حاصل کلام یہ کہ جمالی فعلیت نہ اشیاء کی واقعیت یا عدم واقعیت پر غور کرتی ہے نہ ان کی تعریف یا تبویب
یا تنظیم انجام دیتی ہے اور نہ ان کے تخمینہ کی زحمت گوارا کرتی ہے اس کے برعکس وہ صرف ان کو جوں
کی توں قبول کرتی اور جوں کی توں ظاہر کرتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ حسن کار کسی خارجی شئے
کے اثرات کو ظاہر کرتا ہے، کیونکہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ بہار کی حسن فروش صبح نے اقبال کی نظم
"گل رنگیں" پیدا کی۔ اس طرح جن چیزوں کو حسن کار ادا کرتا ہے وہ اس کے اپنے وجدانات ہیں ان

وجدانات کو ذہن پیدا کرتا ہے اور ان سے وہ مسالہ بنتا ہے جس سے حقیقت کی تعمیر ہوتی ہے، یہاں تک جو فلسفہ کروچے کا پیش کیا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:۔

(۱) ہر تجربہ میں ایک عنصر ایک لمحہ ایسا ہوتا ہے جس میں وجدانات کو سوچا یا چُنا نہیں جاتا بلکہ ان کی حالت میں انھیں قبول اور ظاہر کیا جاتا ہے، اس لمحہ کی فعلیت تجربہ اور فکر دونوں کی لازمی شرط ہے یہ فعلیت اگرچہ تصوری عناصر (جن کا ذکر آگے آتا ہے) کے بغیر بالفعل کبھی نہیں ہوتی، کیوں کہ وہ فکر کے ترکیبی اجزا ہیں تاہم منطقی اعتبار سے اسکو ان تصوّری عناصر سے الگ کیا جا سکتا ہے۔ وجہ یہ کہ فکر اور تصور ہمیشہ ایک مقدم واقعہ پر منحصر ہوتا ہے اور یہ مقدم واقعہ جمالی فعلیت ہے لیکن جہاں جمالی فعلیت تصوّر سے منفک ہو سکتی ہے تصوّر جمالی فعلیت سے منفک نہیں ہو سکتا یوں کروچے جمالی فعلیت کو تجربہ میں سب سے نچلا یعنی سب سے پہلا درجہ دیتا ہے، حالانکہ کانٹ اور دوسرے فلسفیوں نے اسے سب سے اونچا یعنی سب سے آخری درجہ دیا تھا۔

(۲) تجربہ کا یہ عنصر حسن کاروں اور شاعروں کے کارناموں میں خاص طور پر اجاگر ہوتا ہے اور نظری اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ادراک میں ایک ابتدائی مرحلہ ایسا بھی آتا ہے جب کہ ہر انسان لازمی طور پر شاعر بھی ہوتا ہے اور حسن کار بھی۔ چنانچہ کروچے کہتا ہے کہ "ہر انسان کا ذہن اس کی نظری زندگی کے پہلے لمحہ میں جو تخئیلی اور وجدانی ہوتا ہے تجرید یا تأمّل سے گراں بار نہیں ہوتا۔ اس لمحہ میں وہ شاعر ہوتا ہے۔ شاعری کی طرح حسن کاری بھی اولین ادراکات کو خلق کرتی اور علمی زندگی کی بنا ڈالتی ہے، وہ ہمارے ذہنوں میں اشیا کی ان اوضاع کو ہمیشہ تازہ رکھتی ہے جنہیں فکر تأمّل کے اور عقل تجرید کے حوالہ کرتی ہے، اس طرح حسن کاری کی بدولت ہم سدا شاعر بنے رہتے ہیں پس حسن کاری اگر نہ ہو تو نہ تفکر حرکت میں آسکتا ہے اور نہ اس کے پراسرار تخلیقی کارنامے انجام پا سکتے ہیں"، کروچے فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ حسن کاری اور ادبیات کا ایک بلند پایہ نقاد بھی ہے یا شاید وہ پہلے نقاد ہے اور پھر فلسفی لیکن کچھ ہی ہو اتنا بہر حال یقینی ہے کہ معاصر ادیبوں اور حسن کاروں کی تخلیقوں پر جتنی بھی تنقیدیں اس کے قلم سے نکلی ہیں ان سب کا مرکزی اور بنیادی خیال یہ ہے کہ حسن کاری اظہار کے مترادف ہے،

(۲) تصوّر۔ نظری فعلیت کی دوسری قسم تصوری فکر کے نام سے موسوم ہے یہ فکر معروض وجدان میں عمومیت پیدا کرتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر نظری فعلیت کی پہلی قسم جو وجدانات اور تمثالات بہم پہنچاتی ہے ان میں اضافات کے قائم کرنے اور ان اضافات کو جاننے کا عمل کروچے کی زبان میں تصوری فکر کہلاتا ہے۔ یہ فکر ہمیشہ جمالی فعلیت کے متعاقب واقع ہوتا ہے کیوں کہ اس فعلیت سے اس کا مواد بہم پہنچتا ہے، لہذا یہ فکر کبھی جمالی فعلیت کے بغیر وقوع پذیر نہیں ہو سکتا، جمالی فعلیت میں جو وجدانات ہمارے ہاتھ آتے ہیں وہ انفرادی اشیاء کے وجدانات ہوتے ہیں یا اگر صحتِ بیان کا زیادہ اہتمام کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ خود انفرادی اشیا، ہوتے ہیں، اچھی شراب، اچھی شطرنج، اچھی سیرت ان کی چند مثالیں ہیں یہاں پر آپ نے دیکھا کہ اچھائی کا ایک تصور آپ کے روبرو پیش ہوا ہے جس کے ذریعہ آپ ان مختلف وجدانوں کے باہمی علاقوں کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں، اس تصور سے کلیت تشکیل پاتی ہے جو تفکرات کی ایک لازمی شرط ہے،

رسل کے ہاں یہ تصور کلیہ کی صورت میں نمودار ہوتا ہے لیکن کروچے کا تصور موجودئیں کے کلیہ کے ساتھ ایک گونہ مشابہت رکھنے کے اصلاً اس سے مختلف ہے، سب سے بڑا اختلاف ان میں یہ ہے کہ کروچے کے نزدیک تصور یکسر ذہنی ہے صفتوں کی جماعت کا جو خارجی دنیا میں پائی جاتی ہے قائم مقام نہیں۔ وہ تفکر کا ایک لمحہ ایک مرحلہ ہے، اور اس کے خواص تین ہیں (۱) ایک یہ کہ وہ کلّی ہوتا ہے (۲) دوسرا یہ کہ وہ مظہر ہوتا ہے اور (۳) تیسرا یہ کہ وہ مقرون ہوتا ہے۔

ان سہ گانہ خاصوں کو پہلے سے بخوبی سمجھ لینا ضروری ہے، کیونکہ انہی کی بدولت حقیقی اور غیر حقیقی یا جعلی تصوروں میں تمیز ممکن ہے۔ آیئے ہر ایک خاصہ پر الگ الگ نظر ڈال لیں،

تصوّر کا پہلا خاصہ جیسا کہ اوپر ظاہر کیا گیا یہ ہے کہ وہ کُلّی ہوتا ہے۔ اس سے کروچے یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ تصوّر تجربہ کے ہر ظہور میں برابر موجود ہوتا ہے، اس طرح کے کلّی تصوروں میں صفت، شکل، ارتقا، اور حسن کا شمار ہے گویا ہر معمولی سے معمولی، چھوٹے سے چھوٹے، اور مجرّد سے مجرّد تجربہ میں صفت شکل، اور حسن کے خواص لازماً موجود ہوتے ہیں۔ اگر کسی تجربہ میں یہ نہ پائے جائیں تو سمجھ لیجے

وہ تجربہ غیر حقیقی ہے۔ اسی طرح تصور زندگی کے ہر ادراک یا ہر وجدان یا ہر تمثال میں یکساں اور ساری ہے، لیکن جہاں وہ اس میں جاری وساری ہے وہیں اس کے ماورا بھی ہے یعنی اگر جملہ انفرادی تجربوں کو یکجا جمع کرنا کسی طرح ممکن ہوتا تب بھی یہ تجربے مجموعاً تصور کی جگہ نہیں لے سکتے۔ لہٰذا صفت ایک تو حقیقت کے ہر ظہور میں لازماً موجود ہوتی ہے اور دوسرے وہ حقیقت کے جملہ ظہوروں کی "میزان کل" نہیں ہوتی۔

تصور کا دوسرا خاصہ یہ ہے کہ وہ مُظہر ہوتا ہے یعنی تمثال جمالی فعلیت کا اظہار کرتی ہے، اسی طرح تصور منطقی فعلیت کا اظہار کرتا ہے، فکر کے حقیقی ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ صورت کا حامل ہو اگر وہ کسی صورت کا حامل نہ ہوگا تو فکر بھی نہ ہوگا فکر کو یہ صورت تصور سے ملتی ہے تصور فکر کو صورت ویسے ہی عطا کرتا ہے، جیسے کہ تمثال وجدان کو عطا کرتی ہے، لہٰذا تصور فکر یا منطقی فعلیت کا صوری اظہار ہے،

تصور کا تیسرا اور آخری خاصہ یہ ہے کہ وہ مقرون ہوتا ہے، مقرون ہونے سے حقیقی ہونا مراد ہے، اب تصور چونکہ تجربہ کے ہر لمحہ میں یکساں موجود ہوتا ہے اور تجربہ حقیقت کی واحد صورت ہے، وہ تصوری بھی ہے مقرون ہونے کی یہ صفت جبلی اور حقیقی تصوروں میں مابہ الامتیاز ہے جبلی تصوّر ایک اسم جمع ہے ان متعدد ادراکات کا جو آپس میں ایک خاصیت مشترک رکھتے ہیں۔ مثلاً گھر مثلث پانی، آدمی وغیرہ۔ فلسفہ کا بڑا حصہ سدا اس کوشش میں لگا رہا کہ کسی نہ کسی طرح ان جبلی تصوروں کو حقیقی ثابت کر دکھائے یعنی یہ منوا دے کہ وہ اشیاء کی جن جماعتوں کی قائم مقامی کرتے ہیں ان سے الگ اپنا وجود رکھتے ہیں۔ لیکن کروچے ان کوششوں کو لاحاصل کوششیں قرار دیتا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک گھر کا جبلی تصوّر انفرادی گھروں کے مجموعے سے علیحدہ اور بالذات قائم نہیں ہے وہ ایک اسم جمع ہے جسے ہم چاہیں تو ذہنی مختصر نویسی کا ایک جوڑ بھی کہہ سکتے ہیں، یہاں پر ہوتا در اصل یہ ہے کہ ذہن جملہ موجود گھروں سے بعض مشترک صفات منتزع کرتا اور انھیں گھر کے نام سے موسوم کرتا ہے، اس طرح گھر ایک علامت بن جاتا ہے: جو تمامی موجود گھروں میں سے ہر ایک پر یکساں دلالت

کرتی ہے؛

جعلی تصور کی اس تعریف سے اس کی اہمیت میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا، کیونکہ وہ تمام مخصوص حکمتوں کا مدار علیہ ہے مطلب یہ ہے کہ جس طرح منطق خالص تصوّر سے بحث کرتی ہے اسی طرح طبیعی اور ریاضیاتی حکمتیں جعلی تصور سے بحث کرتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ کروچے فلسفہ کو مقرون حکمت اور مخصوص حکمتوں کو مجرد حکمتیں قرار دیتا ہے۔ فلاسفہ پر عموماً اور تصوریئین پر خصوصاً یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ سائنس سے بیر رکھتے ہیں لیکن اس الزام کی حقیقت بس اتنی ہے کہ تصوریئین حکمتوں کے معروضات کو حقیقی نہیں مانتے ورنہ ان کو نہ حکمتوں کے افادہ پر کوئی شک ہے اور نہ ان کے نتائج کی اہمیت پر کوئی شبہ، وہ کہتے صرف یہ ہیں کہ حکمتوں کے موضوعات کو حقیقت سے نہیں بلکہ اس کی تجریدوں سے سروکار ہے جو ایک خاص غرض و غایت کے تحت پایۂ تکمیل کو پہنچائی گئی ہیں۔ اسی طرح انھیں حکمتوں کے نتائج کی صحت میں کوئی کلام نہیں البتہ وہ مانتے صرف یہ ہیں کہ یہ صحت مطلق نہیں اضافی ہے یعنی یہ کہ حکمتوں کے نتائج ایک خاص دائرہ کے اندر صحیح ہیں اور یہ دائرہ وہ ہے جسے ہر سائنس داں اپنی مرضی کے مطابق کھینچتا ہے۔ اتنا جان لینے کے بعد آیئے یہ دیکھیں کہ بنائے قضیہ کیا ہے؟

اوپر یہ بتایا جا چکا ہے کہ جدید تصوریئین کے نزدیک ایک تو حقیقی صرف ذہن ہے دوسرے جب ذہن حقیقت میں نفوذ کرتا ہے تو تجربہ حاصل ہوتا ہے اور تیسرے ذہن کے تجربہ سے الگ کوئی حقیقت موجود نہیں ہے، لہٰذا کسی چیز کا کہیں وجود نہیں جو ذہن کے تجربہ میں آئی ہو یعنی جو تجربہ سے الگ اور قائم بالذات ہو۔ اب سائنس پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایسی چیزوں سے بحث کرتی ہے جو ذہن سے الگ اور مستقل الوجود ہیں، مثلاً اعداد کے خواص کہ جن سے علم حساب بحث کرتا ہے، حیات حیوانی کا کردار کہ جس سے حیوانیات بحث کرتی ہے؛ ذہن کی ساخت کہ جس سے نفسیات بحث کرتی ہے اور حرارت و آواز کے خواص کہ جن سے طبیعیات بحث کرتی ہے، ان حکمتوں میں مذکورہ بالا اشیاء پر ان کی اضافات پر اور اُن قانونوں پر جن کے مطابق وہ وقوع پذیر ہوتی ہیں، اس طرح بحث کی جاتی ہے گویا کہ وہ قائم بالذات ہیں۔ اُن کا وجود تجربہ سے مستغنی ہے اور وہ بالکل حقیقی ہیں، حالانکہ ان چیزوں کو متعلقہ حکمتیں تجربہ کے

معروف کل سے بذریعہ تجرید حاصل کرتی ہیں، انھیں ان کے مشترک خواص کے اعتبار سے چھنٹی اور چھانٹی ہیں اور یوں ان سے اسمائے جمع مرتب کرتی ہیں جو کروچے کی زبان میں جعلی تصورات کہلاتے ہیں،

لیکن ادراکات کہ عین حقیقت سے بذریعہ تجرید حاصل ہوں ان سے بحث کرنے والی حکمتوں میں ایک ایسا حق پایا جاتا ہے جو مقررہ حدود کے اندر حقیقی ہے، لہذا حکمتوں میں صرف وہی حکمت مطلق حقیقی نتائج کی حامل ہو سکتی ہے جو یکسر واقعی چیز یعنی عین ذہن سے بحث کرتی ہو، اس طرح فلسفہ سائنس سے بدرجہا زیادہ حقیقی ہے، کیونکہ وہ خالص تصوّر سے بحث کرتا ہے جو ذہن کی کوئی تجرید نہیں بلکہ اس کی زندگی کا ایک لمحہ ہے،

خالص تصوّر کے اس خیال کو ترقی دے کر کروچے اس سے دو عقیدے اور اخذ کرتا ہے، ان میں سے ایک کا تعلق ماورائی تجربہ سے ہے اور دوسرے کا عمل کے امکان سے،

اب تک ہمنے جس تجربہ کا ذکر کیا ہے، اور اب تک ہمیں جس تجربہ سے سروکار رہا ہے وہ تمام تر افراد کا تجربہ ہے اس تجربہ کے ماورار بالفرض اگر کوئی کُلّی ذہن ہو بھی تو نہ اس کا ثبوت آسان ہے اور نہ اس ثبوت کو سمجھنا سہل ہے، چنانچہ بیشتر فلسفیوں کی متفقہ رائے یہ ہے کہ ایسا ثبوت اگر کوئی بہم پہنچا یا بھی جائے تو لائق وثوق نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ کروچے کا فلسفہ وجود مطلق کا انکار کرکے بعض سخت قسم کی تنقیدوں کی آماجگاہ بن گیا ہے، اس پر نہ صرف موضوعی تصوریت[1] ہی کا الزام عاید ہو سکتا ہے، بلکہ یہ بھی اس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ لاغیر نفسیت[2] میں بہ آسانی تبدیل ہو جاتا ہے، لیکن یہ موقع اس قسم کی تنقیدوں کے اظہار کا نہیں ان کو میں اس مضمون کی آخری سطروں میں پیش کروں گا، فی الحال اتنا جان لینا بھی کافی ہے اور ضروری بھی کہ ان الزاموں کے مقابلہ

---

[1] Subjective idealism کا ترجمہ ہے اس سے وہ عقیدہ مراد ہے جو یہ بیان کرتا ہے کہ ہمکو علم صرف اپنے تصورات کا ہوتا ہے [2] solipsism کا ترجمہ ہے جس سے وہ عقیدہ مراد ہے جو یہ کہتا ہے کہ کائنات کے واحد موجودات ہمارے ذہنی احوال ہیں، مترجم۔

میں کروچے اپنی مدافعت آسانی سے نہیں کر سکتا۔ تاہم اس خیال سے کہ کروچے کے فلسفہ کا مجوزہ خاکہ نا تمام نہ رہے میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ یہاں اس کے مذکورہ بالا دونوں عقیدوں کو جن کے بغیر اس کا نظام فلسفہ مکمل نہیں ہو سکتا تھا مجملاً بیان کردوں۔

کروچے کہتا ہے کہ فلسفہ میں بحث جس تجربہ سے کی جاتی ہے وہ انفرادی نہیں بلکہ کُلّی تجربہ ہے کیونکہ کلّی ذہن سے تعلق رکھتا ہے، اس تجربہ سے فرد کے تجربہ کو گہرا لگاؤ ہے۔ فلسفہ کُلّی شعور سے بحث کرتا ہے، فرد کے شعور سے نہیں کیونکہ فرد آخر فرد ہے اور کُلّی شعور وہ ہے جس پر ہر فرد کی فردیت مبنی ہے"، اس نقطہ پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انفرادی ذہن کو کلّی ذہن کے ساتھ ملانے والی کڑی کون ہے، کروچے کہتا ہے کہ تصور اور اسکی دلیل کا خلاصہ یہ ہے،

وجدانات کا تصوّرات سے گراں بار ہونا ضروری ہے، جو وجدانات تصوّرات سے گراں بار نہیں ہوتے وہ نرے حسی ادراکات ہوتے ہیں، جن کی ماہیت اور حیثیت کے بارے میں ہم اس وقت تک کچھ نہیں کہہ سکتے جب تک کہ سوچنا نہ شروع کردیں لیکن سوچنے کے معنی تصدیق قائم کرنے کے ہیں اور کوئی تصدیق تصورات سے خالی نہیں ہوتی۔ اس طرح وجدانات اور تصورات کے ملنے سے تصدیق مبنی ہے، جو فکر کی اظہاری صورت ہے، ہم اپنے خیالات کو دوسروں پر اور دوسرے اپنے خیالات ہم پر اسی تصدیق کی صورت میں ظاہر کرتے ہیں گویا تصدیق ہمارے آپس میں ایک مشترک چیز ہے۔ لیکن اگر میرا تجربہ بالکلیہ انفرادی ہے تو یہ مشترک چیز موجود نہیں ہو سکتی، میں ایک پیدائشی اندھے میں رنگ کا کوئی خیال نہیں پیدا کر سکتا کیونکہ میرے اور اس کے مابین کوئی ایسا واسطہ موجود نہیں ہوتا جس کے ذریعہ میں اپنے شعور کو اس کے شعور کے ساتھ ملا سکوں، اس کے ماسوا تصورات مختلف ذہنوں میں مشترک ہوتے ہیں، مثلاً صفت کا تصوّر کہ وہ نہ صرف میرے ہی تجربہ کی دلیل ہے بلکہ دوسروں کے بھی تجربہ کی دلیل ہے اس طرح ہم انسان آپس میں مراسلت اپنے تجربہ کے وجدانی عناصر کے ذریعہ نہیں کرتے بلکہ تصوری عناصر کے ذریعہ کرتے ہیں، لیکن صفت کا تصوّر اس وقت تک مختلف ذہنوں اور تجربوں میں مشترک نہیں ہو سکتا جب تک کہ جملہ ذہن اور تجربے ایک کلّی ذہن کے مختلف شئون نہ ہوں، لہٰذا تصوّر کلّی اس لئے ہے کہ کلّی تجربہ کا ایک لمحہ ہے،

کروچے کلّی تجربہ کے وجود کو ایک اور حجّت کے ذریعہ ثابت کرتا ہے ۔ یہ حجّت تاریخ کے اس تصور پر مبنی ہے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے ۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ " تاریخ " ذہنی فعلیت کا خلاصہ ہے یوں ذہن کوئی ایسی چیز نہیں جس کی کوئی تاریخ ہو یعنی جو اپنے تاریخی حوادث سے الگ اور ممیز ہو ۔ بلکہ وہ آپ اپنی تاریخ ہے اور ایک ایسی تاریخ ہے جس کا حال اس کے ماضی کے ذریعہ اور جس کا مستقبل اس کے حال کے ذریعہ علی الاتصال متعین ہوا چلا جاتا ہے ، لہٰذا ایک تو فرد کے ذہنی عمل کی تاریخ لامتناہی ہے ، اور دوسرے اس تاریخ میں اور اس ذہنی عمل میں جس کی وہ کھتونی کرتی ہے کوئی فرق نہیں ۔ پس ثابت ہوا کہ حقیقت جس سے ذہن بحث کرتا ہے یا جسے وہ اپنے لئے خلق کرتا ہے تاریخ ہے اس کو دوسرے لفظوں میں ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کلّی حقیقت تاریخ ہے کیوں کہ ذہن ہمیشہ کلی حقیقت سے بحث کرتا ہے ، اس طرح جب انفرادی ذہن بھی تاریخ ہے اور سنساری ذہن بھی تاریخ تو یہ ماننے میں کون امر مانع ہے کہ وہ دونوں ایک ہیں ۔ (ب) عملی فعلیت ۔ اخلاقیات کے بارے میں کروچے کے خیالات کا مکمل اقتباس اگر ضبط تحریر میں لایا جائے تو مضمون کی کوتاہ دامنی بری طرح مجروح ہو جائیگی ۔ اس لئے میں یہاں پر اس کی اخلاقیات کے صرف چند موٹے موٹے خد و خال بیان کر دینے پر قناعت کرونگا ، اخلاقیات میں ذہن کی دوسری فعلیت بروئے کار آتی ہے ۔ جسے کروچے عملی فعلیت کے نام سے موسوم کرتا ہے جس طرح نظری فعلیت کا وظیفہ علم ہے اسی طرح اس فعلیت کا وظیفہ ارادہ یا عمل ہے ۔ یہاں پر میں نے ارادہ یا عمل کے الفاظ جان بوجھ کر استعمال کئے ہیں کیونکہ کروچے کے نزدیک ان میں باہم کوئی فرق نہیں ہے ، جیسے کوئی وجدان ایسا نہیں جو ممنونِ اظہار نہ ہو ویسے ہی کوئی ارادہ ایسا نہیں جو شرمندۂ عمل نہ ہو ۔ واقعہ یہ ہے کہ ارادہ عمل سے منفک نہیں یعنی وہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کے متعاقب " ہاتھ پاؤں کی حرکتیں واقع ہو بھی سکتی ہیں اور نہیں بھی بلکہ یہ حرکتیں خود ارادہ ہیں " ۔ اس طرح ہر چھوٹے سے چھوٹا اور ضعیف سے ضعیف ارادہ بھی عضویہ کو حرکت میں لاتا ہے اور خارجی اثرات پیدا کرتا ہے ۔ علی ہذا بے ارادہ کوئی عمل واقع نہیں ہو سکتا ۔ جو چیز عمل میں نہیں یعنی ارادہ نہیں ۔ وہ میکانی حرکت ہے اور میکانی حرکت ایک جبلی تصوّر ہے ۔

عملی فعلیت نظری فعلیت کے تابع ہے کیوں کہ عمل علم پر موقوف ہے ، اس میں شک نہیں کہ

علم عمل کے لئے ہے مگر اس میں بھی شک نہیں کہ علم عمل کے بغیر ہو سکتا ہے درحالیکہ عمل علم کے بغیر معرض وجود میں نہیں آسکتا، نظری فعلیت کی طرح عملی فعلیت کی بھی قسمیں دو ہیں (۱) معاشیات اور (۲) اخلاقیات پہلی قسم مفید کے تصور پر مبنی ہے اور دوسری خیر کے تصور پر جس طرح عملی فعلیت نظری فعلیت کے تابع ہے، اسی طرح اخلاقیات معاشیات کے تابع ہے، پھر جیسے نظری فعلیت عملی فعلیت سے آزاد اور بے تعلق ہے ویسے ہی معاشیات اخلاقیات سے آزاد اور بے تعلق ہے اس فرق کے قیام سے یہ اظہار مقصود ہے کہ معاشیاتی قسم کی فعلیت میں ہمارے اعمال ایسی چیزوں سے متعلق ہوتے ہیں جو شخصی طور پر مفید ہوتی ہیں اور اخلاقیاتی قسم کی فعلیت میں یہ شخصی احتیاجات اور ان کی تسکینات اوروں کی احتیاجات اور تسکینات بن جاتی ہیں۔ اس طرح خیر کا تصور افادہ کے کلی تصور سے زیادہ نہیں۔ وہ دوسروں کی خواہشات اور احتیاجات کے متعلق اسی قسم کے عمل کا متقاضی ہے جس قسم کے عمل کی ہماری اپنی خواہشات اور احتیاجات کی تکمیل کے لئے ضرورت ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ ہر عمل میں افادہ اور خیر دونوں برابر برابر شریک ہوتے ہیں۔ یعنی نہ خالص معاشی، نفس پرستانہ، اور انفرادی عمل جیسی کوئی چیز موجود ہے اور نہ خالص اخلاقی، غیر پرستانہ، اور کلی عمل جیسی کوئی چیز چنانچہ کروچے کہتا ہے کہ "خالص سے خالص اخلاقی چال چلن میں بھی ایک عنصر ایسا موجود ہوتا ہے جس سے ہم اغماض برتنا چاہتے ہیں کیوں کہ ہمارا عمل ہمہ گیر ہونے پر بھی انفرادی اور شخصی ہوتا ہے"۔ لہذا نفس پرستی اور غیر پرستی دو معارض تصورات نہیں بلکہ تجربہ کے دو ایسے لمحے ہیں جو از روئے منطق ایک دوسرے سے مربوط اور ناقابل انفکاک ہیں اسطرح ہر عمل ایثاری بھی ہوتا ہے اور استیثاری بھی۔

الغرض کروچے کے نظریۂ علم کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ واحد حقیقی شے صرف ذہن یا تجربہ کو سمجھتا ہے یہ ذہن یا تجربہ بالذات ایک فعلیت ہے جس میں دو لمحات ہوتے ہیں (۱) خالص وجدان اور (۲) خالص تصور یہ دونوں لمحے نہ ایک دوسرے کے آگے ہیں اور نہ پیچھے۔ بلکہ یہ زمانی اضافت ان میں پائی ہی نہیں جاتی۔ پھر نہ ان میں سے کوئی ایک دوسرے کے بغیر اپنا وظیفہ انجام دے سکتا ہے، مختصر یہ کہ ان کے آپس میں ایک گہرا اتحاد ہے یہ اتحاد ایک ترکیب کا نتیجہ ہے جو تجربہ کو اسی حالت میں ملتی ہے، جس میں کہ وہ ہے

اب یہ لمحات جو الگ الگ کئے گئے ہیں تو وہ بعد کے غور و تامّل کا نتیجہ ہیں۔ ورنہ اصل میں تو وہ دونوں ایک ہیں۔ لہٰذا تجربے دو ممتاز چیزوں کی وحدت ہے، اضداد کا مجموعہ نہیں ہے

یہاں پر کروچے کے فلسفہ کی ضروری تلخیص ختم ہو جاتی ہے، اس لئے اب ہمیں گیا وِنّی جنٹائل سے رجوع کرنا چاہیئے اور یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس نے جدید تصوریت میں کون کون سی جدتیں کی ہیں۔

(۳)

گیا وِنّی جنٹائل۔ جنٹائل کروچے کا ایک شاگرد ہے، مگر ایک ایسا شاگرد ہے جو اُستاد سے بہت آگے بڑھ نکلتا ہے، اس نے کروچے کے ساتھ ملکر جدید تصوّریت کو مقبول بنانے میں ان تھک کوشش کی ہے لیکن ساتھ یہ بھی کوشش کی ہے کہ استاد کے نظریوں کو ان کی منطقی انتہاؤں تک پہنچائے،

اس کا پورا فلسفہ اس کی دو کتابوں میں بند ہے، جن کے نام علی الترتیب یہ ہیں۔

(۱) خلاصۂ تعلیمات ——————— اور

(۲) ذہن عمل خالص کی حقیقت سے

آخری تصنیف خطبات کا ایک مجموعہ ہے، اس کا انگریزی میں ترجمہ پروفیسر ولڈن کار نے کیا ہے جو ۱۹۲۲ میں چھپا۔

جنٹائل جیسا کہ ابھی ابھی ذکر کیا گیا ہے کروچے کے نظریوں کو ان کی منطقی انتہاؤں تک پہنچاتا ہے لہٰذا تمہیداً یہ بتلانیکی ضرورت ہے کہ وہ جاتا کس سمت میں ہے کروچے جیسا کہ ہمیں معلوم ہے تجربہ کو ایک وحدت یا فنہ کل سمجھتا ہے۔ یہ کل دو لمحوں یا فعلیتوں پر مشتمل ہے، اپنی باری پر یہ دو لمحے یا فعلیتیں پھر اور دو قسموں پر مشتمل ہیں گویا تجربہ چار قسم کی فعلیتوں کی ایک ترکیب ہے، ان چار قسم کی چار فعلیتوں کے متعلق یہ مان لیا گیا ہے کہ وہ ذہن کی یکتائی میں کوئی خلل نہیں ڈالتیں، لیکن تجربہ کے یہ جوڑ چونکہ ذہن کے اپنے آپ پر غور کرنے کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ ایسے فروق ہیں جو منطقی طور پر تجربہ سے مستنبط ہوتے ہیں، لہٰذا ذہن بیک وقت وحدت اور چار طرح کی کثرت نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر وہ وحدت کاملہ ہے تو اپنے آپ سے ایسے فروق نہیں پیدا کر سکتا جو اس کی اپنی وحدت کی طرح حقیقی ہوں۔ لیکن

یہ فروق اگر ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ اس کے معطیات ہیں تو وہ نہ کبھی وحدت تھا اور نہ اب ہے
اس طرح ذہن اگر وقت واحد میں وحدت اور سرچشمۂ کثرت نہیں ہو سکتا تو ہمیں یا تو کروچے کے لمحوں اور ان کی تحتانی قسموں سے ہاتھ دھو لینا چاہیئے یا پھر تجربہ کی وحدت ہی سے دست بردار ہو جانا چاہیے۔ جنٹائل نے اپنے لئے پہلی راہ منتخب کی ہے وہ ایک ایسے ذہن کا قائل ہے جو یکسر وحدت ہے جو اول بھی وحدت ہے اور آخر بھی وحدت ہے۔ اب رہ گئی کثرت سو وہ اسی وحدت سے ماخوذ ہے
جنٹائل ذہن یا تجربہ کو لفظی معنوں میں دنیا کی واحد موجود شے سمجھتا ہے گویا دنیا اس کے نزدیک صرف شاہد روح کی جلوہ گاہ ہے،

لیکن ایک ایسے دعویٰ میں دقت یہ ہے کہ اس کی رو سے کثرت کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی۔ یہ نہیں بتلایا جا سکتا کہ حقیقت جب ایک ہے جب وہ دنیا کی ہر چیز کو جس سے وہ خود بھی خارج نہیں یکساں بناتی اور بگاڑتی ہے اور جب وہ جملہ اضداد اور فروق کو پوری قوّت سے دفع کرتی ہے تو یہ ہماری دنیا اور یہ اسکی مختلف چیزیں موجود کیسے ہو سکیں، کیسے ہو گئیں؟

جنٹائل کہتا ہے کہ مجاز کی کثرت حقیقت کی وحدت کا بروز ہے مگر سوال یہی ہے کہ یہ بروز واقع ہوتا کیونکر ہے؟ کیوں کہ ہمیں شروع ہی میں یہ باور کرایا گیا ہے کہ تجربہ دنیا کی واحد موجود شے ہے اور یہ کہ تجربہ میں آنے والی شے کو خود تجربہ ہی میں تلاش کرنا چاہیئے گویا علم ایک ایسی اضافت ہے جو ذہن اور خارجی دنیا کے مابین نہیں پائی جاتی بلکہ خود تجربہ کے اندر موجود ہوتی ہے، جنٹائل کو اس نتیجہ یا دعویٰ کی صحت سے انکار نہیں وہ کہتا ہے کہ شعور ذات اس دعویٰ کی ایک مسکت دلیل ہے۔ کیونکہ اس میں جاننے والا موضوع بھی ذہن ہی ہوتا ہے اور علم میں آنیوالا معروض بھی ذہن ہی، بالفاظ دیگر یہ کہ شعور ذات میں ذہن اصلاً واحد اور یکتا رہتے ہوئے ان دونوں شکلوں میں مساویانہ کارفرما ہوتا ہی یا یہ کہ ایک ہی ذہن ایک ہی وقت میں عالم بھی ہوتا ہے، اور معلوم بھی لیکن واضح رہے کہ موضوع اور معروض ذہن کے دو ٹکڑے نہیں ہیں۔ اس کے برعکس ذہن اپنی ہر شکل میں سالم اور ثابت ہوتا ہے، موضوع کی صورت میں بھی وہ اتنا ہی کامل ہوتا ہے جتنا کہ معروض کی صورت میں۔ اس طرح ذہن

جو ہستی کی ان شکلوں میں تفریق کرتا اور انھیں اپنی اپنی سمتوں میں بڑھنے جانے کی اجازت دیتا ہے تو گویا وہ اپنے آپ میں تفریق کرتا اور اپنے آپ کو مختلف سمتوں میں بڑھنے جانے کی اجازت دیتا ہے لیکن خیال رہے کہ وہ ہر شکل میں مسلّم ہوتا ہے غرض کہ شعور ذات دو ایسی ممتاز شکلوں کی ایک ترکیب ہے جن میں سے ایک کا روپ اگر ذہن دھارے تو موضوع کہلاتا ہے اور اگر دوسرے کا تو معروض۔

اب جو بات شخصی طور پر صحیح ہے وہ کلّی طور پر بھی صحیح ہے کیونکہ ذہن دنیا کی واحد موجود شے ہے اور شعور ذات ذہن کی خاصیت ہے اگر یہ کوئی اجمال ہے اور تفصیل طلب تو میں کہوں گا کہ تجربہ کا دنیا کی واحد حقیقی اور موجود شے ہونا، صرف اسی کی معرفت کا ہمیں راست حاصل ہو سکنا اور اس کا مکمل وحدت ہونا یہ ایسے واقعات ہیں جو جنٹائل کے ہاں کروچے سے زیادہ اہم ہیں کیونکہ جنٹائل کا ذہن باوجود دنیا کی ظاہری کثرت اور سطحی گوناگونی کی تہ میں کام کرنے کے اپنی متاع وحدت کو ایک مفلس کی طرح سدا اپنے سینہ سے چمٹائے رکھتا ہے تو کیا یہ سامنے والا مکان یہ سڑک یہ جنگل یہ درخت محض فریب، دھوکہ، جھل اور التباس ہیں؟ اگر نہیں تو ذہن کی مکمل وحدت کہاں؟ جنٹائل کہتا ہے کہ موضوع اور معروض کا یہ فرق اعتباری ہے، ایک تو اس لئے کہ تجربہ اور بنابریں ذہن کے سوا دنیا میں کوئی چیز نہ موجود ہے اور نہ حقیقی اور دوسرے اس کے کہ یہ فرق پیداوار ہے، اس اضافت کی جو شعور ذات میں پائی جاتی ہے اور عرف عام میں علم کہلاتی ہے شعور ذات میں جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے موضوع بھی ذہن ہی ہوتا ہے اور معروض بھی ذہن ہی لیکن کسی نے آج تک یہ جرارت نہیں کی کہ ذہن کو ذہن سے جدا کرے، لہذا اس واقعہ کے پیش نظر کہ ذہن دنیا کی واحد موجود شے ہے اور اپنے معروضات خود آپ پیدا کرتی ہے یہ ماننے میں کوئی امر مانع نہیں کہ کلی حقیقت یا کلی ذہن کا نمونہ شعور ذات ہے، کیوں کہ شعور ذات ذہن کی بلند ترین خصوصیت ہے،

یوں ذہن کا مطالعہ دو طرح ممکن ہے موضوع کے شعور کی حیثیت سے اور معروض

کے شعور کی حیثیت سے موضوع کے شعور کی حیثیت سے جب مطالعہ کیا جاتا ہے تو حسن کاری وجود میں آتی ہے اور معروض کے شعور کی حیثیت سے جب کیا جاتا ہے تو مذہب ظہور پذیر ہوتا ہے گویا حسن کاری موضوعی اور مذہب معروضی چیز ہے لیکن نہ حسن کاری اعلیٰ درجہ کی حقیقت ہے اور نہ مذہب کیونکہ اول الذکر اگر قطعی موضوعی ہے تو موخر الذکر قطعی معروضی ہے اور اعلیٰ درجہ کی حقیقت موضوعیت اور معروضیت کا مرکب ہوتی ہے تو پھر یہ شرف کس کو حاصل ہے، جنٹائل کہتا ہے کہ فلسفہ .... حسن کاری اور مذہب کا ایک مرکب یا آمیزہ ہے" فلسفہ اس لئے کہ جملہ صورتیں بالآخر اس میں ضم ہو جاتی ہیں حق، بالفعلیت کاملہ اور روح کا نمائندہ ہے" جنٹائل کا یہ تصور فلسفہ ہیگل کے تصور سے چنداں مختلف نہیں لیکن جنٹائل اور ہیگل میں اتفاق صرف اسی ایک نقطہ پر نہیں اور بھی کئی متقاطع نقاط ہیں۔

اس نوبت پر جنٹائل کے فلسفہ کا سب سے زیادہ حیرت انگیز پہلو ہمارے سامنے آتا ہے، اس کا یہ تصور جس کا میں اب ذکر کرنے چلا ہوں ایک ایسا تصور ہے جو جدید تصوریت سے ہمدردی نہ رکھنے والوں کو بے حد چونکا دیگا وہ کہتا ہے کہ فلسفی حقیقت کا خالق ہے کیونکہ فلسفہ نام ہے حقیقت کے مطالعہ کا جس کو عین ذہن کا مطالعہ بھی کہا جائے تو بے جا نہیں اس طرح فلسفہ ایک ایسا عمل ہے جس میں ذہن اپنے آپ کو جانتا ہے لیکن ذہن اپنے آپ کو جانتا اسی وقت ہے جب کہ وہ اپنے آپ کو سوچے لہذا ذہن جب اپنے آپ کو جانتا ہے تو اپنے آپ کو سوچتا ہے اور اپنے آپ کو سوچنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے آپ پر اپنے آپ کا اضافہ کر رہا ہے یعنی اس ذات کو پیدا کر رہا ہے جو اس کے علم میں آتی ہے، فکر کی ماہیت ہی یہ ہے کہ وہ اپنے کو مسلسل خلق کرتا ہے۔ اور اس کی تخلیق یہ ہے کہ ہم اس کو سوچیں گویا فکر کا فکر فلسفہ ہے اس طرح فلسفہ جس فکر پر فکر کرتا یعنی جس فکر کو فلسفاتا ہے، اس سے بالذات جدا نہیں بلکہ واقعہ میں اسی کے تسلسل سے عبارت ہے۔
غرضکہ فلسفہ اور حقیقت دونوں ایک ہیں اور فلسفی اسی اعتبار سے حقیقت کا خالق ہے کیوں کہ فلسفانے سے مراد پیدا کرنا ہے اور پیدا فکر ہوتا ہے جو کائنات کی واحد حقیقی شے ہے،

اس طرح فکر کا علم حقیقت کا علم ہے اور فکر کے متعلق فکر کرنے کے معنی اسے پیدا کرنے کے ہیں۔ چنانچہ جنٹائل کہتا ہے "موجود کوئی شے نہیں بلکہ یہ فکر ہے جو اپنے آپ کو پیدا کرتے ہوئے موجودات کو پیدا کرتا ہے۔"

یہاں تک جو فلسفہ جنٹائل کا پیش کیا گیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے،

(۱) تجربہ دنیا کی واحد موجود شے ہے اور تجربہ میں آنے والی شے خود تجربہ کا ایک جزو ہے اب جو ہم اسے تجربہ سے علیحدہ خیال کرتے ہیں تو اس میں صرف استدلال کی رعایت یا سہولت مدنظر ہے زیادہ کچھ نہیں۔

(۲) ذہن بسبب دنیا کی واحد موجود شے ہونے کے اپنے معروضات خود آپ پیدا کرتا ہے

(۳) شعور ذات تجربہ یا ذہن کی ایک اعلیٰ خصوصیت ہے یہاں موضوع بھی ذہن ہی ہوتا ہے اور معروض بھی ذہن ہی۔

(۴) ذہن کا مطالعہ جب موضوع کے شعور کی حیثیت سے کیا جاتا ہے تو حسن کاری وجود میں آتی ہے اور جب معروض کے شعور کی حیثیت سے کیا جاتا ہے تو مذہب نمودار ہوتا ہے، فلسفہ حسن کاری اور مذہب دونوں کا مجموعہ ہے وہ شعور ذات کی ایک اعلیٰ قسم ہے فلسفی حقیقت کا خالق ہے،

(۵) کُلی حقیقت یا کُلی تجربہ یا کُلی ذہن (کیونکہ ان اصطلاحوں میں معناً کوئی فرق نہیں) کا نمونہ شعورِ ذات ہے۔

ان پہلوؤں پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالنے کے بعد میں اب یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ انفرادی تجربہ اور کلی (یعنی مجموعی) تجربہ میں کونسا رشتہ ہے،

جنٹائل جیسا کہ سطور بالا کا مطالعہ شاہد ہے یہ مانتا ہے کہ فرد کا تجربہ شعورِ ذات کا ایک مکمل نمونہ ہے، اس سے یہ نتیجہ بداہتہً مستنبط ہوتا ہے کہ جملہ تجربے شعور ذات کے وزن پر ہیں، لیکن جملہ تجربے شعور ذات کے وزن پر اسی وقت ہو سکتے ہیں جب کہ وہ ایک تجربۂ اعلیٰ کے اجزا ہوں ورنہ اس اشتراک

معنوی کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ یہ تجربہ اعلیٰ یا یہ ہمہ گیر اور دائم الفعل ذہن ایک کامل بالذات اور خود راز حقیقت ہے اور ہر انفرادی تجربہ باوجود اپنے ساتھی تجربوں سے مختلف ہونے کے ایک نہ ایک طرح اس کی آئینہ برداری کرتا ہے، اس طرح کلی تجربہ شخصی تجربوں میں داخل اور ان کی ایک گٹھڑی ہے۔

جنٹائل کا فلسفہ ایک دقیق فلسفہ ہے مگر یہ قصور اس بنیادی اصول کا ہے جس پر وہ مبنی ہے۔ اور جو یہ ہے "تجربہ دنیا کی واحد حقیقی شے ہے لہذا حقیقت اگر حقیقت ہے تو اس کا مثل تجربہ ہونا لازمات سے ہے"۔ اس طرح ذہن جب ایک مرتبہ یہ خیال کر لیتا ہے کہ تمامی حقیقت اس کی اپنی صورت پر ہے تو وہ جلد اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ حقیقت واقعتہً اس کی اپنی فعلیت یعنی فلسفہ سے عبارت ہے کیونکہ فلسفہ میں ذہن اپنے آپ پر غور کرتا ہے اور اپنے آپ پر غور کرنا اپنے موضوع (یا اپنے آپ) کو آپ پیدا کرنے کے مترادف ہے۔

یہ دعویٰ معلوم تو بے حد مستبعد دیتا ہے مگر واقعہ میں اتنا مستبعد نہیں ہے کیونکہ جب تجربہ کا وجود بدیہی ہے اور یہ بھی یقینی ہے کہ شعور ذات تجربہ کی سب سے مستقل اور واضح قسم ہے تو یہ ماننے میں کوئی امر مانع نہیں کہ کائنات ذہن کی یا ذہن کی سب سے اعلیٰ فعلیت یعنی فلسفہ کی مثل ہے، تاکہ جنٹائل کے اصول کا عالمگیر اطلاق دشوار ہے مگر یہ بھی کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تجربہ آنیوالی شے تجربہ کا جزو نہیں غرضکہ معروض ذہن کی پیداوار ہے۔

اس نقطہ پر پہنچکر جنٹائل کے اس اساسی دعوی کو سمجھنا کچھ مشکل نہیں رہتا جس کی رو سے تجربہ ایک آزاد اور خود مختار فعلیت ہے، وہ اپنی ذات اور اپنی دنیا کا خالق ہے وہ موجودات کو بھی ویسے ہی پیدا کرتا ہے۔ جیسے کہ اپنی ذات کو۔

(۴)

<u>ایک سرسری تنقیدی نظر</u>۔ یہاں پر جدید تصوریت کے فلسفہ کی روداد ختم ہو جاتی ہے اور اگر میں بھول نہیں رہا تو مجھے چند الفاظ اس فلسفہ کے حسن و قبح پر کہنے ضرور ہیں۔

کروچے اور جنٹائل متفق صرف اصول میں ہیں ورنہ فروع میں ان کا اختلاف انتہا کو پہنچا

ہوا ہے۔ جنٹائل کروچے کے نتائج کو ادھورے نتائج سمجھتا ہے کیونکہ اس کا خیال ہے کہ کروچے صرف آدھی دور چل کر رہ گیا ہے اس غلطی کے کفارہ کی ادائی کی ذمہ داری اس نے اپنے سر لی ہے، گویا جو کام استاد انجام نہ دے سکا اسے شاگرد نے پورا کیا اس میں شک نہیں کہ کروچے بھی جنٹائل کی طرح اس بات کا دل وجان سے متمنی تھا کہ جدید تصوریت کی منطق کو زیادہ سے زیادہ غیر متناقض بنائے لیکن وہ اپنی کوششوں میں زیادہ کامیاب نہ رہ سکا وجہ یہ ہے کہ وہ تجربہ کی وحدت کا اقرار بھی کرتا ہے اور اس سے کثرت کے حصول کا خواہاں بھی ہوتا ہے یہ بھی مانتا ہے کہ تجربہ فاعل اور ترقی پذیر ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ وہ وجدان اور تصور کے فرق کو قائم رکھتا ہے۔ لہٰذا تجربہ اگر بڑھتا ہے تو اس کی صورتوں کے فروق ابتدا میں معین نہیں ہوتے۔ لیکن اگر وہ معین ہوتے ہیں یعنی تجربہ بڑھتا نہیں ہے تو روح کی وحدت وحدت نہیں۔

آیئے اب تھوڑی دیر کے لئے ہیگل کے فلسفہ سے رجوع کریں یہاں آپ محسوس کریں گے کہ تجربہ کروچے کے فلسفہ کی طرح ممیزات کی نہیں بلکہ اضداد کی ترکیب ہے۔ ظاہر ہے کہ اضداد کی ترکیب سے تناقضات پیدا ہوتے ہیں اور تناقضات سے نئی نئی ترکیبیں ظاہر ہوتی ہیں جن سے پھر نئے نئے تناقضات پیدا ہوتے ہیں۔ اور سلسلہ اس وقت تک برابر جاری رہتا ہے جب تک کہ مطلق یا ہمہ گیر ترکیب حاصل نہیں ہو جاتی۔ لہٰذا اضداد کی ترکیب میں ایک دائمی ترقی ہے ایک مستمر نمو ہے لیکن ممیزات کی ترکیب میں ایسی کوئی سمائی نہیں وہ مزید ترقی کی کوئی احتیاج پیدا نہیں کرتی۔ اس میں تناقضات ہوتے نہیں ہیں۔ لہٰذا ممیزات بالکل ساکن ہیں اور ان میں کوئی محرک ایسا نہیں جو انھیں آگے بڑھائے اور زیادہ سے زیادہ کامل وحدت کی طرف رجوع کرے۔

انہی باتوں کو دیکھتے ہوئے جنٹائل نے ذہن کی وحدت پر بے حد زور دیا ہے۔ یہ تو خیر کروچے کے فلسفہ کی ایک تنقید تھی اور بہ ہر صورت کوئی ایسی چیز نہیں جسے بنیادی کہا جا سکے، کیونکہ اس سے جدید تصوریت کی مرکزی کمزوریوں کا پتہ نہیں چلتا اس کے لئے ہم کو کچھ اور چھان بین کرنی چاہیئے ایک بات یہاں بطریق احتیاط کہہ دینی ضرور ہے اور وہ یہ کہ ذیل کی تنقیدوں میں ہیگل کے فلسفہ سے کروچے اور جنٹائل کے مجموعی فلسفوں کا مقابلہ کیا جائے گا، ورنہ جو لوگ یہ نہیں مانتے کہ فکر یا تجربہ یا روح حقیقت کی واحد

صورت ہے ان کے نقطۂ نظر سے اس فلسفہ پر کوئی رائے زنی نہیں کی جاسکتی تردید کو چھوڑ دیجئے۔

جدید تصوریت پر حسب ذیل اعتراضات (تصوری نقطۂ نظر سے) وارد ہوتے یا ہوسکتے ہیں۔

(ا) ایک یہ کہ جدید تصوریت نے لاغیرنفسیت یا موضوعی تصوریت سے بچنے کی جو کوششیں کی ہیں وہ کامیاب نہیں ہیں۔

وجہ یہ ہے کہ اس کا بنیادی دعویٰ یہ ہے کہ انفرادی تجربہ کے عقب میں یا اس کے ماوراء کوئی چیز موجود نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کروچے اور جنٹائل دونوں نے کلی تجربہ کے وجود کا اقرار کیا ہے۔ لیکن ان کو خود اپنے پیش کردہ مقدمات کی بنا پر یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ایک ایسی چیز کے وجود کا اقرار کریں جو بلا واسطہ ان کے علم میں کبھی نہیں آتی یا جس کا علم انھیں تجربہ کی بنا پر نہیں ہوتا ایسی صورت میں ان کے مجموعی تجربہ کی حیثیت کسی طرح لاک کے جوہر یا تنقیدی موجودیین کی طبیعی شئے سے زیادہ نہیں کیوں کہ راست علم ہم کو ان میں سے کسی کا بھی نہیں ہوتا۔ لہذا جدید تصوریت کا کلی تجربہ یعنی جملہ انفرادی تجربوں کا مجموعہ ایک معروضہ ہے جس سے کوئی فائدہ متصور نہیں۔

اس کے مقابلہ میں ہیگل کے فلسفہ کو لیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہاں پر موضوعی تصوریت اور لاغیر نفسیت دونوں سے بچاؤ کا کافی سامان مہیا ہے۔ کیوں کہ ہیگل یہ مانتا ہے کہ بلا واسطہ تجربہ متناہی اور جزئی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں نہ کلّی حقیقت بہ تمام وکمال موجود ہے اور نہ وہ یکسر حقیقی ہے چنانچہ اگر ہم اس کی تحلیل کریں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ تضادات اور تناقضات سے مملو ہے اب یہ تناقضات اور تضادات رفع اسی وقت ہوتے ہیں جب کہ ہم ایک وجود مطلق کا اقرار کریں یعنی یہ مانیں کہ انفرادی تجربہ ایک بڑے کل کا ایک چھوٹا سا جزو ہے، لہذا کل اپنے ہر جزو میں موجود ہے۔ یوں ہیگل کے فلسفہ پر موضوعی تصوریت یا لاغیرنفسیت کا الزام عاید نہیں کیا جاسکتا۔

(ب) دوسرا یہ کہ جدید تصوریت کثرت کی کوئی توجیہ نہیں کرسکتی۔

اس میں شک نہیں کہ کروچے نے تجربہ کی چار فعلیتوں کے ذریعہ کثرت کی توجیہ کرنے کی ایک اچھی کوشش کی ہے لیکن اس کوشش کی جنٹائل کے ہاتھوں جو درگت ہوئی وہ ہم سے مخفی نہیں۔

اس طرح تجربہ واحد رہتے ہوئے چار قسم کی فعلیتوں کا مبنیٰ نہیں ہوسکتا لیکن اس کی وحدت کاملہ بھی تو کثرت کے عقدۂ سربستہ کو نہیں کھول سکتی کیونکہ کثرت صرف اسی وقت وحدت سے برآمد ہوسکتی ہے جبکہ اس کی بالقوت وحدت میں پہلے سے موجود ہو لیکن اگر کثرت کا امکان بھی وحدت میں پایا جائے تو وحدت وحدت نہیں رہتی اس کے برعکس اگر کثرت کو التباس قرار دیا جائے تب بھی دقت میں کوئی کمی رونما نہیں ہونے پاتی کیونکہ ایک حقیقی وحدت سے ایک ظاہری کثرت کا صدور اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ ایک حقیقی وحدت سے ایک حقیقی کثرت کا صدور مشکل ہے ۔ بنابریں وحدت نہ کثرت کی توجیہ کرسکتی ہے اور نہ خطا کی ۔

(ج) تیسرا اور آخری اعتراض یہ ہے کہ جدید تصوریت میں ذہن کی فعلیت کا کوئی سبب نہیں ہیگل کے فلسفہ نے تو خیر یہ کہہ کر کہ کل اپنے اجزار میں مسلسل ظاہر ہوتا رہتا ہے اور اجزار متناقض ہوتے ہیں ذہن کی فعلیت کی ایک وجہ جواز دریافت کرلی کیونکہ تناقصات سے بلند ہونے کی کوشش ایک ایسی کوشش ہے جس سے کائنات کی ترقی کے عنصر کی توجیہ بخوبی ہوجاتی ہے لیکن جدید تصوریت کے پاس اس ترقی کی وجہ جواز کیا ہے وہ حرکت کی مدعی ہے لیکن یہ نہیں بتلاتی کہ اس حرکت کا محرک کون ہے وہ کیا چیز ہے جو ذہن کو مسلسل بڑھتے رہنے پر اکساتی ہے ۔

ان آرار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہیگل کا کوئی پیرو جدید تصوریت پر کون کون سے اعتراضات کرسکتا ہے لیکن جو تصوریت کے معروضات ہی کو تسلیم نہیں کرتے ان کے لئے ہیگل اور جدید تصوریت کے فلسفوں کے مابہ النزاع سوالات بالکل بیکار ہیں ۔ اور اسی لئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ایک فلسفے پر جو اپنے مسلمات اپنے نقطۂ نظر اور اپنے استدلال کے اعتبار سے موجودیت یا نتائجیت سے قطعاً مختلف ہے اس کے دائرہ سے الگ ہوکر کوئی تنقید نہیں کی جاسکتی ورنہ ایسی تنقید مریخ کے ساکنوں کی موسیقی پر تبصرہ کرنے کے مترادف ہوگی لہذا ناظرین کو چاہئے کہ وہ فلسفۂ جدید نے تصوریت کی جو نئی نئی شاخیں منظر عام پر لائی ہیں ان میں سے کسی ایک کو پسند کرنے سے پہلے تصوریئیں اور موجودیئیں کے مباحثوں پر ایک ناقدانہ نظر ڈال لیں اور پھر آگے بڑھیں ۔

(ترجمہ)

رنگِ داغ

از حضرت متینؔ مچھلی شہری یادگارِ داغ رحمتہ
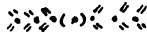
مجھے وہ شوق کامل ہے مرا وہ جذبِ کامل ہے
کہ راہِ عشق میں ہر ہر قدم پر ایک منزل ہے

یہ مانا میں نے وہ سفاک ہے ظالم ہے قاتل ہے
مگر مل جائے ایسا اور کوئی دوست مشکل ہے

طریقِ عشق میں ہے راہزن بھی خضر بھی دل ہے
بڑی دشوار منزل ہے بڑی آسان منزل ہے

ہمارے دل کو کہتے ہو کہ یہ کس کام کا دل ہے
یہی وہ شے ہے عالم میں جو تم ایسوں کے قابل ہے

محیطِ غم سے بیڑا پار ہونا سخت مشکل ہے
اندھیری رات، طوفاں خیز دریا، دور ساحل ہے

آلٰہی خیر! دونوں بجلیاں ٹکرانے والی ہیں
اُدھر برقِ نگہ ہے اِس طرف بیتابیٔ دل ہے

رگوں میں رُوح بن کر دوڑتی ہیں عشق کی لہریں
بدن میں میرے جو قطرہ لہو کا ہے وہ اک دل ہے

تجھے دل دیکے ہم کھوئے گئے ہیں دونوں عالم سے
بتِ ناآشنا۔ تیری محبت کا یہ حاصل ہے

تسلی دینے آئے تھے، کہ وہ تڑپانے آئے تھے
گئے ہیں جب سے آ کر اور بھی اب مضطرب دل ہے

بس اتنا فرق ہے، پتھر اگر وہ ہے تو یہ پانی
تمہارے پاس بھی دل ہے ہمارے پاس بھی دل ہے

الٰہی! کیا نرالی شان ہے۔ بحرِ محبت کی
کہ ہر ہر قطرہ دریا اور ہر اک موج ساحل ہے

متینؔ اچھی گزرتی ہے تصور میں حسینوں کے
ہمارا کلبۂ احزاں بھی گویا عیش منزل ہے

انڈین اکنامک کانفرنس

انڈین اکنامک کانفرنس کا اکیسواں اجلاس ۲۸ سے ۳۱ دسمبر ۱۹۳۷ء تک حیدرآباد دکن میں ہوا۔ ڈاکٹر پی۔ جے۔ تھامس پروفیسر معاشیات مدراس اس کے صدر تھے، جنرل سکریٹری ڈاکٹر بی۔ وی نرائن سوامی نائیڈو اور لوکل سکریٹری مولوی حبیب الرحمٰن صاحب ناظم معلومات عامہ (سابق صدر شعبۂ معاشیات) اور ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی صدر شعبہ معاشیات جامعہ عثمانیہ تھے۔ علی گڈھ، بنارس، کلکتہ، بمبئی، مدراس، ناگپور پٹنہ کی جامعات کے نمائندے اور تیس کے قریب بیرونی ممبروں نے کانفرنس میں شرکت کی۔ جامعہ عثمانیہ اور نظامیہ کے طلبائے معاشیات بھی کانفرنس میں شریک رہے۔

۲۸ دسمبر کو ۱/۲ ۱۰ بجے اعلیٰ حضرت حضور نظام کے پیام سے رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری، نواب حیدر نواز جنگ بہادر نے کانفرنس کا افتتاح کیا۔ سر اکبر نے خطبہ افتتاحیہ میں ریاستوں اور برطانوی ہند کے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "ریاستیں قدیم زمانہ سے ہندوستان کی تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہی ہیں اور ان ہی کی بدولت ملک کی قدیم تہذیب کے تصورات محفوظ رہے، اب ریاستوں کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس عظیم الشان سرزمین ہند کی عافیت اس پر منحصر ہے کہ یہاں مختلف قوتوں کے درمیان صحیح توازن قائم رہے جس سے اتفاق و اتحاد کی تشکیل ہوتی ہے، اور ایک قوت دوسری قوت کے دائرہ عمل میں دخل انداز ہونے کی کوشش نہ کرے کیونکہ تاریخ شاہد ہے کہ جب ایسا ہوا تو سارے ملک نے اس سے نقصان اٹھایا ہے۔" مسائل حاضرہ میں سب سے پہلے آپ نے مسئلہ بے روزگاری کا ذکر کیا اور اس کا علاج طرز تعلیم کی از سرنو تنظیم بتلائی۔ اس سلسلہ میں آپ نے کہا "بے روزگاری کا خاتمہ اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ ہم اپنے طرز تعلیم کو مسائل حاضرہ کے مطابق بنادیں۔ ملک میں ہر قسم کے قدرتی ذرائع موجود ہیں اور ان سے کام لینا ہمارا فرض ہے"۔ اعداد و شمار کے متعلق کہا کہ "علم الاعداد کی بڑی اہمیت ہے۔ ماہرین معاشرت

اور ارباب حکومت دونوں کے لئے صحیح اعداد ہی تنہا رہنما ہیں ان کے بغیر ہمارے پاس کوئی ایسا مواد نہیں جنکی بنا پر ہم کوئی صحیح فیصلہ کرسکیں، اور جب ایسا مواد دستیاب ہوجائے تو اس پر غیر جانب دارانہ طور پر غور کرنا چاہیئے اور فرقہ پرستی کی زنجیروں سے آزاد ہوکر ہمکو اپنے اغراض کے بنیادی اتحاد کو تسلیم کرلینا چاہیئے۔"

صاحب صدر کے خطبۂ صدارت کا عنوان "ہندوستانی معشیت کے اہم مسائل" تھا خطبہ کافی طویل اور مبسوط تھا۔ آپ نے ہندوستانی معشیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ آپ نے بتلایا کہ تجارت خارجہ کے اضافہ، اور صنعت و حرفت کی ترقی کے باوجود ملک کے عام معیار زندگی میں کوئی قابل لحاظ تغیر نہیں ہوا آپ نے ملک کے معیار کی پستی کا سبب پیدائش دولت کی کمی اور تقسیم دولت کی عدم مناسبت کو قرار دیا۔ ہندوستانی کسان کا قرضہ اور اس کی دیگر مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے اس کو اس شخص سے تشبیہ دی جو گردن تک پانی میں کھڑا ہے اور جسکو ایک موج غرق کردینے کے لئے کافی ہے، صنعت و حرفت کے سلسلہ میں آپ نے کہا کہ ملک کے موجودہ مسائل کا حل بڑی بڑی صنعتوں کے قیام سے ختم نہیں ہوسکتا۔ ہمکو جاپان اور جرمنی کی تقلید کرنی چاہیئے جہاں متعدد صنعتیں گھریلو طور پر قائم ہیں، نیز زراعت جو ہمارے ملک کا خاص پیشہ ہے ہماری توجہ کا مستحق ہے اور اس کے بغیر صنعت و حرفت کی ترقی بھی ناممکن ہے، پھر عوام کی قوت خرید میں بھی اضافہ کی ضرورت ہے، حکومت کی قرضہ کی پالیسی پر آپ نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "یہ پالیسی بہت قدیم اور فرسودہ ہوچکی ہے۔ ملک میں سڑکوں، ذرائع آب پاشی اور دیگر مفاد عامہ کے کاموں کی بڑی قلت ہی ۳۴-۱۹۲۳ء میں جب کہ کساد بازاری اپنے عروج پر تھی حکومت قرض لے کر ادنی شرح پر ان کاموں کو شروع کرسکتی تھی۔ عدم مداخلت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ بڑی صنعتیں اور بڑی آراضیاں خود اپنے پاؤں پر کھڑی ہوں مگر چھوٹے پیمانہ پر کام کرنے والوں اور مزدوروں کو حکومت کے تحفظ کی ضرورت ہے، ان کو درمیانی آدمیوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔ تجارت خارجہ کے سلسلہ میں کہا کہ موجودہ زمانہ میں قومیت کے تخیلات اور خود کفالتی کے خیالات نے ہندوستان کی برآمد میں بڑی تخفیف کردی، ضرورت ہے کہ بعض بیرونی بازاروں کو مستحکم کرلیا جائے مگر اس کے لئے مال کی خوبی بڑھانا، خرید و فروخت کے طریقے کو منظم کرنا، اور خاص خاص ممالک سے تجارتی معاہدے کرنا از حد ضروری ہیں۔ نیز موجودہ دور میں ممالک غیر سے تجارت کے بارے میں

امید بخش توقعات قائم نہیں کی جا سکتیں۔ اس لئے ہندوستان کو اندرونی تجارت کی طرف زیادہ کوشش نہ کرنا چاہیئے بلکہ آبادی کے معیار صحت و کارکردگی کو بڑھانا چاہیئے۔ تاکہ ہم "محنت" کے ثمرات سے پورا پورا فائدہ اُٹھا سکیں۔ آخر میں آپ نے کہا کہ ہندوستان کی معاشی ترقی کا انحصار صوبجاتی حکومتوں اور دیسی ریاستوں پر ہے۔ یہ ان رکاوٹوں کو دور کر سکتے ہیں جو ہمارے معیار زندگی کو پست اور قوت خرید کو ادنیٰ بنائے ہوئے ہیں اور ایسا معاشی لائحہ عمل تیار ہو سکتا ہے جس سے پیدائش دولت میں اضافہ اور معیار زندگی میں بلندی ہو۔ اور اس کام میں معاشین کو ان کا ہاتھ بٹانا چاہیئے۔

کانفرنس میں بحث و مباحثہ کے لئے حسب ذیل موضوع مقرر کئے گئے تھے۔

(۱) تجارتی چکر کا نظریہ

(۲) انڈیجنس بنکینگ اس کی تاریخ اور مسائل

(۳) ہندوستان میں مسئلہ بے روزگاری

(۴) صوبجاتی مالی مسائل۔

پہلے تین موضوع پر مقالے پڑھے گئے اور چوتھے موضوع پر تقریریں ہوئیں۔ دو ایک مقالہ نگار حضرات نہ آسکے اس وجہ سے ان کے مقالے رہ گئے۔ جو مقالے پہلے وصول ہو گئے تھے دہ ماہ ستمبر کے "انڈین جنرل آف اکنامکس" میں شائع ہو گئے تھے اور باقی کانفرنس میں تقسیم ہوئے۔

تجارتی چکر کے نظریہ کے سلسلہ میں بعض حضرات نے ہیرڈ اور کینز کے خیالات پیش کئے۔ مگر زیادہ تر بحث و مباحثہ اس بات پر رہا کہ کیا تجارتی چکروں میں تسلسل پایا جاتا ہے اور کیا یہ ایک یکساں وقفہ کے بعد ظہور میں آتے ہیں۔ یہاں دو گروہ تھے ایک کا خیال تھا کہ ان میں قریب قریب تسلسل اور یکسانیت موجود ہے، دوسرے کا خیال تھا کہ ان میں کسی قسم کی یکسانیت اور تسلسل موجود نہیں۔

انڈیجنس بنکینگ کی بحث بڑی دلچسپ ہو گئی۔ جب ڈاکٹر انوار اقبال صاحب قریشی نے انکے علیحدہ وجود سے ہی انکار کیا۔ آپ نے کہا کہ "انڈیجنس بنکینگ" کی اصطلاح من گھڑت ہے اور دیسی زبانوں میں اس طبقہ کا کوئی الگ نام نہیں ہے۔ انڈیجنس بینکرس اور مہاجنوں میں کوئی امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ آپ

نے مختلف صوبجاتی بنکینگ انکوئری کمیٹیوں کے حوالے دے کر بتایا کہ وہ بھی ان میں کوئی فرق نہ بتا سکیں اور کمیٹی نے جن افراد کو اس فہرست میں شامل کیا ہے جو تقریباً دونوں قسم کے کام کرتے ہیں، آپ نے بتایا کہ ساہوکار اس وقت تک بینکر ہی نہیں کہلا سکتے جب تک کہ وہ باقاعدہ امانتیں حاصل نہ کریں کیونکہ امانتیں حاصل کرنا بینک کا اساسی فرض ہے۔ نیز بینک کی تعریف یہ کی کہ ایسا ادارہ جو امانتیں حاصل کرے اور قرض دے۔ اس کے بعد آپ نے چند مقامی بینکاروں کی مثالیں دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ انڈجنس بینکرس اور ساہوکاروں میں کوئی فرق نہیں اور آپ نے ان تمام خیالی امتیازات کی تردید کی ہے جو مختلف بنکینگ کمیٹیوں نے ان دونوں کے مابین قائم کئے تھے۔ مگر کانفرنس میں کسی نے آپکی اس تردید سے اتفاق نہ کیا اور بعض حضرات نے اپنے دلائل و استدلال پیش کرنے کی بجائے صوبجاتی اور مرکزی بنکینگ انکوئری کمیٹیوں کی رائے ہی پیش کی۔ گویا کمیٹیوں یا کمیشن کی رائے غلط ہی نہیں ہوسکتی۔

ڈاکٹر راؤ (احمدآباد) نے بے روزگاری کی مختلف قسمیں بتائیں اور ہندوستان میں جس قسم کی بیکاری ہے اسکو دور کرنے کی تدابیر پیش کیں۔ پروفیسر کاروے (بمبئی) نے ہندوستان کے مختلف طبقوں مثلاً تعلیمیافتہ، صناع، زراعت پیشہ کی بے روزگاری کا ذکر کیا۔ آپ نے امداد غرباء، بے روزگاری کے بیمہ، قحط کی امدادی رقم میں توسیع اور دیہات میں امداد بے روزگاران پر زیادہ زور دیا۔ مسٹر ایس۔ اے۔ صمد۔ (کلکتہ) نے ملک کے کمانے والے اور ان کے مقابلے میں عمروں کے لحاظ سے کچھ نہ کمانے والوں کے اعداد پیش کئے۔ ملک کی بے روزگاری کا مقابلہ غیر ممالک کے مختلف ادوار سے کیا۔ تعلیم یافتہ بے روزگاروں کی تعداد ان کی ڈگریوں کے لحاظ سے پیش کی اور اسکو حل کرنے کی مختلف تدابیر پیش کیں۔

ڈاکٹر انبھونی ناور (آگرہ) نے بتایا کہ اس زمانہ میں روزگار کے مواقع کثرت سے پیدا ہوگئے ہیں ہمکو بھی نئے نئے مواقع پیدا کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ نئے مواقع میں آپ نے ہوابازی کو پیش کیا۔ اور ہندوستانی ہوائی فوج، ہوائی فوجی تعلیم کے کالج، اور اندرون ملک ہوائی جہازوں سے آمد و رفت کی توسیع پر زور دیا اور نوجوانوں کے سامنے ایک نیا میدان پیش کیا۔

بمبئی کے پروفیسر سی۔ این وکیل نے صوبجاتی مالیات پر ایک طویل اور دلچسپ تقریر کی۔ آپ نے

کہاکہ اب صوبوں کو نئے نئے اختیارات ملے ہیں۔ مگر انہیں نئی نئی اسکیمیں جاری کرنے کے لئے مزید اخراجات کی ضرورت ہے۔ زراعت سے اب مزید آمدنی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ پھر زراعت خود امداد کی محتاج ہے۔ اس لئے صوبجاتی حکومتوں کو نئے نئے محاصل مثلاً تفریحی ٹیکس، پیشہ وری ٹیکس، محصول فروخت محصول تمباکو عائد کرنے کی ضرورت ہے۔ مفاد عامہ کی خدمات کو خانگی افراد کے ہاتھوں میں نہ چھوڑنا چاہئیے کیونکہ ایک تو کثیر منافع خانگی لوگوں کو ملتا ہے۔ دوسرے حکومت ان پر محصول بھی نہیں لگا سکتی کیوں کہ وہ اس کا بار صارفین پر منتقل کردیں گے۔ نئے نئے قرضے لینا بھی ضروری ہے۔

ڈاکٹر گیان چند نے جو پٹنہ یونیورسٹی اور حکومت بہار کے نمائندے تھے کہاکہ صوبجاتی حکومتوں اور مرکزی حکومت کی آمدنی اور اخراجات میں کوئی مناسبت نہیں۔ ضرورت ہے کہ مرکزی حکومت انکم ٹیکس کا کچھ حصہ صوبوں کو دے۔ آپ نے بہار کے حالات کو پیش کرتے ہوئے کہاکہ حکومت بہار کو صحت عامہ، دیہی تنظیم، ابتدائی تعلیم اور امداد باہمی کے لیئے ۲ کروڑ سالانہ مزید روپیہ کی ضرورت ہے۔ بہار میں آبکاری کی آمدنی بہت کم ہے، حکومت بہار مرکزی حکومت کے ملازموں کی تنخواہ میں تخفیف نہیں کرسکتی۔ وہ صوبجاتی ملازموں کی تنخواہ میں تخفیف، اور زرعی آمدنیوں پر محصول لگانے پر غور کررہی ہے۔ آپ نے محصول وراثت کو بھی مزید آمدنی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بتایا اور مرکزی حکومت کے فوجی اخراجات میں تخفیف کی ضرورت کو ظاہر کیا۔

صاحب صدر نے کہاکہ یقیناً مدافعت و قناعت ہر ملک کے لئے ضروری ہے مگر اس میں حد سے زیادہ بڑھ جانا بھی ٹھیک نہیں۔ صوبوں پر نئے دستور کی رو سے جو نئی پابندیاں عائد ہوتی ہیں اس کے لئے مزید اخراجات کی ضرورت ناگزیر ہے۔ ملک کی آمدنی کا لحاظ کرتے ہوئے تنخواہیں بہت زیادہ ہیں۔ ان میں تخفیف کی ضرورت ہے تاکہ تقسیم دولت میں عدم مساوات کی صورت باقی نہ رہے محصول فروخت ہر شے پر لگانا زیادہ مفید ہے۔ مفاد عامہ کی خدمات حکومت کو اپنے ہاتھ میں لینا ضروری ہے اور اس وقت تک ان کے اخراجات میں تخفیف نہیں کی جاسکتی۔ اس سلسلہ میں میسور کی مثال قابل تقلید ہے جہاں برقی روشنی کا انتظام حکومت کے ہاتھ میں ہے۔ دیاسلائی کی صنعت

کو بھی خانگی افراد کے ہاتھوں میں چھوڑنا مناسب ہیں۔ صوبجاتی حکومتوں کو نئے نئے قرضوں کی بھی ضرورت ہے۔ کیونکہ ہندوستان کا قومی قرضہ بہت کم ہے۔ صوبہ متحدہ کے وزیر اعظم قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے اپنے یہاں کے اخراجات میں اضافہ کر دیا ہے۔

دوران کانفرنس میں پروفیسر ڈی، جی، کاروے، پروفیسر ڈی، جی کاٹے، اور ڈاکٹر دی، کے آر، دی، راؤ نے مختلف ہندوستانی معاشی موضوعات پر عام فہم تقریریں کیں۔ نمائندان اور ممبران کو رائٹ آنر یبل سر اکبر حیدری، نواب مہدی یار جنگ بہادر۔ اور مجلس استقبالیہ کی جانب سے عصرانے دیئے گئے اور محکمہ آرائش بلدہ کے نئے مکانات، زرعی مزرعہ حمایت ساگر، عثمان ساگر، ادارہ مصنوعات ملکی صنعتی رقبہ شیر آباد۔ دار الضرب سرکار عالی، قلعہ گول کنڈہ اور میوزیم وغیرہ کی سیر کرائی گئی۔ ۳۱ر دسمبر کو ۹ سے ۱/۲ ۱۰ تک کانفرنس کا کاروباری جلسہ ہوا جس میں آئندہ سال کے عہدہ داران کا انتخاب عمل میں آیا۔

مجموعی حیثیت سے کانفرنس بہت کامیاب رہی، طعام و قیام کا انتظام بہت معقول تھا مندوبین و اراکین یہاں کے حسن انتظام سے بہت خوش ہوئے۔ اس کامیابی کا سہرا مولوی حبیب الرحمن صاحب ناظم معلومات عامہ کے سر ہے۔ جنہوں نے شعبہ ہائے معاشیات و عمرانیات کے اساتذہ مودبین اقامت خانہ، اور رضا کار طلبا ر کے اشتراک سے اسکو کامیاب بنایا۔

فیڈریشن یا وفاق

فرقہ وارانہ اختلاف کی وجہ سے ہندوستان کی فضا ایسی خراب ہوگئی ہے کہ کسی معاملہ میں اتحادِ عمل کا خیال بھی مشکل سے آتا ہے۔ مگر ایک مسئلہ ایسا ہے کہ جسکی بابت سب فرقے اور سب جماعتیں متفق معلوم ہوتی ہیں۔ وہ مسئلہ فیڈریشن یا وفاق کا ہے۔ قانون حکومت ہند میں وفاقی نظام وضع کیا گیا ہے۔ اسے سب ناپسند کرتے ہیں اور اس کو ہندوستان کے لئے ناقابل قبول اور موجودہ نظام سے بھی زیادہ مضر سمجھتے ہیں اس پر سب متفق ہیں کہ کوئی ایسی حکمت عملی اختیار کرنی چاہئے کہ جس سے قانون مذکور کے وفاقی جز پر عمل درآمد نہ ہونے پائے۔ مگر جب یہ سوال آتا ہے کہ وہ حکمت عملی کیا ہو تو مختلف جواب ملتے ہیں۔ جب کانگریس نے فیصلہ کیا کہ اس کے نمائندوں کو صوبوں میں عہدے قبول کرلینے چاہئیں تو اس کا مطمح نظر یہ تھا کہ صوبوں کی اسمبلیوں اور وزیروں کے ہاتھوں میں جو اختیارات آئیں گے ان کو فیڈریشن کو روکنے کے لئے استعمال کیا جائے۔ اب سات صوبوں میں کانگریس کی اکثریت ہے اور ان کی حکومت کانگریس کے ہاتھ میں ہے۔ مگر یہ بات روز بروز زیادہ صاف ہوتی جارہی ہے کہ یہ نئی طاقت وفاق کا مقابلہ کرنے میں کارگر نہیں ہوسکتی۔ کیوں۔ اس کی کیا وجہ ہے۔

۱۹۳۵ء کے قانون کے مجوزیہ جانتے تھے کہ اہل ہند اس کو کبھی منظور نہ کریں گے۔ بلکہ اس کو نیست نابود کرنے کی پوری پوری کوشش کریں گے اور اسی کوشش میں ہندوستان کے قابل سے قابل قانونی دماغ شریک ہوں گے۔ اس لئے انہوں نے اسکو بناتے ہوئے ان امور کا خاص طور پر خیال رکھا۔ اور ایک ایسا نظام تجویز کیا کہ جسکو آئینی طریقوں سے ناکام بنانا ممکن نہیں۔ گورنر جنرل کو مرکز میں اور گورنروں کو صوبوں میں مختلف قسم کے وسیع اختیارات دیئے۔ قانون بنانے کے، احکام جاری کرنے کے، رعایا سے مالیہ نہ وصول کرنے اور اسکو خرچ کرنے کے۔ الغرض ان کو وہ سب اختیارات دیدیئے جو کہ عام طور پر قانون ساز جماعتوں اور [illegible] دار وزیروں کو حاصل ہوتے ہیں۔

قانون ۱۹۳۵ء کے وفاقی جز کو نافذ کرنے کے لئے جو طریقہ مقرر کیا گیا ہے۔ اس کی صراحت دفعہ ۵ میں کی گئی ہے۔ اس کی رو سے بادشاہ کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ پارلیمنٹ کی درخواست پر فیڈریشن کو بذریعہ اعلان قائم کرائے۔ صرف شرط یہ ہے کہ ریاستوں کی معینہ تعداد فیڈریشن میں داخل ہونے کے لئے تیار ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ صوبوں کے وزیروں یا ان کی قانون ساز جماعتوں سے فیڈریشن کے قیام کی بابت کوئی مشورہ نہ کیا جائے گا۔ لہٰذا ان کے کسی فعل کا اس پر اثر انداز ہونا بظاہر خارج از بحث ہے۔

فیڈریشن کے قیام کے اعلان کے بعد اگلا قدم وفاقی قانون ساز جماعتوں یعنی فیڈرل اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ کا وجود میں لانا ہوگا۔ ان جماعتوں کے کچھ ممبر تو برطانوی ہندوستان کے صوبوں کے نمائندے ہوں گے اور کچھ ریاستوں کے۔ فیڈرل اسمبلی میں جو صوبوں کی طرف سے ممبر ہوں گے۔ ان کو صوبوں کی اسمبلیاں منتخب کریں گی۔ اگر وہ ان کو منتخب کرنے سے انکار کردیں تو بظاہر وفاق کا کام تمام ہو سکتا ہے اصولاً اس کا امکان ضرور ہے۔ قانون کی دفعہ ۶۶ کی رو سے اگر ⅔ سے زیادہ ممبر کسی صوبہ کی اسمبلی کے اجلاس سے غیر حاضر ہوں تو اس کی کارروائی کو ملتوی کر دینا ضروری ہے، لہٰذا جب کبھی کسی صوبہ کی اسمبلی میں فیڈرل اسمبلی کے ارکین کا مسئلہ پیش ہو اور اس کے ⅔ سے زیادہ ممبر غیر حاضر ہو جائیں تو اس کی بابت کارروائی کو ملتوی کر دیا جائے گا۔ اور انتخاب عمل میں سے آنے سے رہ جائے گا۔ مگر اس ترکیب پر صرف اس شکل میں عمل کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ صوبہ کی اسمبلی کے ارکین کی اکثریت جو کہ ⅔ سے زیادہ ہو وفاقی ممبروں کے انتخاب کو روکنے کا فیصلہ کرے اور اس پر استقلال سے قائم رہے۔ اس وقت کانگریس کو یہ اکثریت حاصل نہیں ہے اور ⅔ ایسی غالب اکثریت ہے کہ سیاسی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا حصول آئندہ بھی نہایت دشوار معلوم ہوتا ہے۔

کونسل آف اسٹیٹ میں ریاستوں کے نمائندوں کا تناسب زیادہ ہوگا۔ ان کی تعداد ۱۰۴ ہوگی۔ صوبوں کے نمائندے ۱۵۶ ہوں گے۔ ان کا انتخاب براہ راست عوام کی طرف سے ہوگا۔ حق رائے دہندگی کی شرائط کم و بیش وہی ہونگی جو اب پرانے نظام کے مطابق مرکزی اسمبلی کی ہیں۔ ان حالات میں کونسل آف اسٹیٹ میں غالباً اکثریت وفاق کے مخالفوں کی نہیں بلکہ اس کے موافقوں کی ہوگی۔

لہذا اس جماعت سے وفاق کی بیخ کنی کرنے میں مدد کی توقع رکھنا بے سود ہوگا۔

بعض لوگوں کا یہ بھی خیال معلوم ہوتا ہے کہ وفاق کے قائم ہو جانے کے بعد ہم اسکو ختم کر سکتے ہیں یا کم از کم اس میں خاطر خواہ تبدیلیاں کر سکتے ہیں۔ غالباً مسٹر سیتہ مورتی کے ذہن میں یہی بات تھی جب انہوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ "جس طرح ڈی ویلرا نے آئرلینڈ میں حکومت پر قبضہ حاصل کر کے وہاں کے نظام میں تبدیلیاں کیں ہم بھی کر سکیں گے"۔ مگر یہ قیاس ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ ہماری مجوزہ وفاقی قانون ساز جماعت مقتدر نہ ہوگی۔ یعنی یہ کہ اسکو صرف چند مخصوص معاملات کی بابت قانون بنانے کا حق ہوگا۔ اور آئینی معاملات اس زمرہ میں نہیں ہیں۔ لہذا اس کو قانون حکومت میں تغیر و تبدل کرنے کا مجاز نہ ہوگا۔ آئرلینڈ کو اسٹیٹیوٹ آف ویسٹمنسٹر کی رو سے اتنی تبدیلیاں کرنے کا حق حاصل ہو گیا تھا۔ اور سلطنت برطانیہ کی عدالت عالیہ پریوی کونسل نے بھی دو مشہور فیصلوں میں اس حق کو تسلیم کر لیا تھا۔ بخلاف اس کے قانون حکومت ہند نے اسکو وفاقی قانون ساز جماعت کے دائرہ اختیار سے صریحی طور پر خارج کر دیا ہے۔

بیشک اگر فیڈرل اسمبلی میں وفاقی نظام کے مخالفوں کی اکثریت ہو تو وہ اس کو درہم و برہم کر سکتے ہیں۔ اسمبلی میں ۲۵۰ ممبر صوبوں کی طرف سے ہوں گے۔ اور ۱۲۵ ریاستوں کی طرف سے۔ جہاں تک ریاستوں کے نمائندوں کا تعلق ہے اس کا گمان کرنا ہی بہت عبث ہے کہ وہ وفاق کی مخالفت میں کوئی عملی حصہ لیں گے۔ ان کی سعی تو یہ ہوگی کہ مخالف کوششوں کو ناکامیاب بنائیں اور عجب نہیں کہ اس سعی میں رشوت ناجائز دباؤ طرح طرح کے لالچ اور مذہبی تعصب کا جال پھیلا کر صوبوں کے بعض نمائندوں کی بھی معاونت حاصل کی جاسکے۔ مگر فرض کیجیے کہ فیڈرل اسمبلی میں وفاق کے مخالفوں کی مستقل اکثریت ہے۔ آئینی رواج کے لحاظ سے جس پارٹی کی اکثریت ہوتی ہے اسی کو اپنی وزارت قائم کرنے کا حق ہوتا ہے اگر وفاق کے مخالف اپنی وزارت قائم کرتے ہیں اور اس قانون کے بموجب جسکو ناقص اور آزادی کا منافی سمجھتے ہیں کام کرتے ہیں تو یہ وفاق کی مخالفت نہیں بلکہ در حقیقت اس کی موافقت ہوگی اگر وہ اس کی بندشوں سے آزاد ہو کر کام کرنے کی کوشش کریں گے تو ان کے افعال خلاف قانون ہوں گے۔

اور گورنر جنرل ان کو علیحدہ کر دے گا۔ آج کانگریسی وزیر صوبوں میں اپنے عہدوں پر قائم ہیں۔ اسوجہ سے کہ قانون نے جوانکے اختیارات کی حد بندی کر دی ہے وہ اسکو تسلیم کرتے ہیں اور اسکو توڑنے کی کوشش نہیں کرتے۔

اگر بالفرض فیڈرل اسمبلی میں اکثریت جوکہ وفاق کی مخالف ہے عہدے قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے یا عہدوں سے برخاست کر دیجاتی ہے تو گورنر جنرل اقلیت کے نمائندوں کو عہدوں پر مقرر کر دیگا۔ اگر اکثریت قانون سازی کے کام میں ارکاوٹیں، پیدا کرتی ہے۔ گورنر جنرل کونسل آف اسٹیٹ کے (جس میں جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں وفاق کے مخالفوں کی اکثریت ہونا بہت دشوار ہے) اور "مشترکہ اجلاس" کے ذریعہ سے اور اپنے اختیارات خصوصی کی مدد سے قانون پاس کرا سکتا ہے۔ اور اقلیتی وزرا کا بجٹ بھی منظور کرا سکتا ہے۔ یہ صورت حال کچھ ایسی ہی ہو گی جیسی کہ آج کل مرکزی اسمبلی میں ہے۔ کہ حکومت ذمہ دار ہے۔ اسمبلی کی اکثریت اس کے خلاف ہے۔ اس کے پیش کئے ہوئے مسودات کو رد کر دیتی ہے۔ بجٹ کو نامنظور کرتی ہے۔ مگر پھر بھی حکومت چلتی رہتی ہے اور جو کچھ چاہتی ہے کرتی رہتی ہے اور اس کی تمام کارروائیاں قانوناً درست اور جائز تصور کی جاتی ہیں۔

پس اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ وفاق کے مخالف آئین کی چار دیواری میں رہ کر اسکو نیست و نابود کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ان کی تقریریں۔ ان کی تحریکیں اور ترمیمیں جو بسا اوقات منظور ہو جایا کریں گی قومی جذبات کے پر اثر مظاہرے ہوں گے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ آئین کو اگر تبدیل کیا جا سکتا ہے تو وہ صرف سیاسی جدوجہد کے ذریعہ سے۔

۱۹۳۵ء کے دستور کے متعلق جو بنیادی اعتراض ہے وہ تو یہ ہے کہ ہندوستانیوں کا بنایا ہوا نہیں بلکہ ایک غیر قوم کی پارلیمنٹ کا ہے۔ اسکے علاوہ اس کی بہت سی دفعات ایسی ہیں جو ہندوستان کے مفاد کے خلاف ہیں مگر باوجود ان دونوں نقائص کے کانگریس نے اس کے صوبجاتی جز کے نافذ ہو جانے پر عہدے قبول کر لئے۔ کانگریسیوں نے اس بات کی کوشش ضرور کی کہ انگریزوں کی طرف سے یہ اقرار کر لیا جائے کہ گورنر اپنے خصوصی اختیارات کو استعمال نہ کریں گے۔ مگر انہوں نے اس قسم کا کوئی اقرار نہ کیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب دستور کے وفاقی جز کا نفاذ ہو تو جو پارٹیاں اس کے خلاف ہیں وہ عہدے قبول کرنے پر غیر مشروط طریقہ پر آمادہ ہو جائیں یا کوئی ایسی شرائط پیش کریں کہ جن کے

پورا ہونے سے وفاقی نظام کی وہ برائیاں رفع ہوجائیں جو اس کو ناقابل قبول بناتی ہیں۔ وہ شرائط کیا ہوسکتی ہیں صوبوں میں عہدے قبول کرنے کے لئے تو کانگریس نے صرف یہ شرط پیش کی تھی کہ گورنر اپنے خصوصی اختیارات کو استعمال نہ کریں۔ مگر مرکزی جز میں علاوہ گورنر جنرل کے خصوصی اختیارات کے جن کے استعمال نہ کئے جانے کا تو وعدہ ہونا چاہیے۔ اور بھی بہت سی دفعات ایسی ہیں جو کہ ہندوستان کے لئے مضر ہیں۔ ان میں سے بعض کا ہم ذکر کرتے ہیں۔

وفاقی قانون ساز جماعت کے دونوں ایوانوں میں ریاستوں کے نمائندے ہوں گے۔ مگر قانون نے یہ لازم نہیں کیا کہ یہ نمائندے منتخب شدہ ہوں۔ عام طور پر یہ قیاس کیا جاتا اور درست قیاس کیا جاتا ہے کہ ان کو ریاستوں کے والی اپنی مرضی کے مطابق نامزد کر دیا کریں گے۔ یہ ممبر ریاستوں کے باشندوں کے جذبات اور خیالات کے ترجمان نہ ہوں گے۔ بلکہ اپنے رئیسوں کی خواہشات کے۔ مگر باوجود اس کے بھی وہ قابل اور دردمند ہوسکتے ہیں۔ نامزدگی کے طریقہ پر اصل اعتراض یہ ہے کہ نامزد کردہ اراکین اور منتخب شدہ اراکین کی ذہنیت میں زمین آسمان کا فرق ہوگا۔ اوّل الذکر کی وہ ذہنیت نہ ہوگی جو کہ ذمہ دارانہ خود اختیاری حکومت کے چلانے کے لئے ضروری ہے۔ یہ ایک ایسا نقص ہے کہ اگر انگریز چاہیں تو اس قانون کو تبدیل کئے بغیر دور کرسکتے ہیں۔ گورنر جنرل بحیثیت بادشاہ کے نمائندہ تمام ریاستوں پر اقتدار رکھتا ہے اور ان کو مجبور کرسکتا ہے کہ جن اراکین کو وہ وفاقی قانون ساز حکومت کے ایوانوں میں بھیجیں وہ صحیح معنی میں ان کی رعایا کے نمائندہ ہوں۔

بجٹ کی بابت جو دفعات ہیں وہ ملک کے مفاد کو مدنظر رکھکر نہیں بنائی گئیں۔ جب تک ان پر عمل درآمد ہوتا رہیگا۔ ہندوستان کو شدید نقصان پہنچتا رہیگا۔ دفعہ ۱۱ کی رو سے فوج اور بیرونی معاملات کے محکموں پر وائسرائے کا پورا پورا اختیار ہوگا اور دفعہ ۳۴ کی رو سے قانون ساز جماعت کو اس بات کا حق نہ ہوگا کہ وہ ان محکموں کے خرچ کے لیئے جو رقم گورنر جنرل تجویز کرے اس میں تخفیف کرے۔

علاوہ ازیں دفعہ ۱۲ نے مالی معاملات کو گورنر جنرل کی خاص ذمہ داری قرار دیا ہے اور اس کو اس امر کا ذمہ دار بھی قرار دیا ہے کہ کوئی ایسا قانون نہ بننے دے کہ جسکی وجہ سے برطانیہ سے آنے والی

اشیا پر غیر معمولی ٹیکس لگ سکے۔ جب تک کہ یہ دفعات مسترد نہ کر دی جائیں ہندوستان کے
اقتصادی حالت کی درستی ممکن نہیں۔

معجم المصنفین

"معجم المصنفین" کے نام سے ایک جلیل القدر اور مہتم بالشان عربی کتاب مدت سے حیدرآباد میں زیر تالیف ہے۔ مولانا حیدر حسین صاحب شیخ الحدیث ندوۃ العلماء کے برادر محترم مولانا محمود حسن خاں صاحب مدظلہ نے اس عظیم الشان کام کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا ہے۔ یہ کتاب ایک نہایت مستند اور ضخیم انسائیکلوپیڈیا کی صورت میں تالیف ہو رہی ہے اور دولت آصفیہ خلدہا اللہ تعالیٰ کی سرپرستی و کفالت میں یہ زبردست علمی کام سرانجام پا رہا ہے۔

یہ مضمون مولانا عبدالقدوس صاحب ہاشمی ندوی کے عربی مقالے کا ترجمہ ہے جو جمعیۃ دائرۃ المعارف حیدرآباد میں شیوخ و علمائے ازہر کی آمد کے موقع پر ان کے سامنے پڑھا گیا۔ مولانا عبدالقدوس صاحب کتاب مندرجہ عنوان کی تالیف میں مولانا محمود حسن صاحب کا دست راست ہیں۔ عربی ادب و انشاء پر آپکو غیر معمولی عبور حاصل ہے۔ چونکہ آپ کے اس مقالے سے معجم المصنفین کی اہمیت اور اس کے تفصیلی حالات کے علاوہ اور بہت سی کارآمد معلومات حاصل ہوتی ہیں اسلئے اس کا ترجمہ قارئین کی نذر کیا جاتا ہے۔

صدر محترم و حاضرین کرام!

میں اس موقع پر کوئی تقریر کرنا یا مفصل علمی مقالہ پیش کرنا نہیں چاہتا بلکہ صرف اتنا چاہتا ہوں کہ دولت آصفیہ نے عربی زبان کی خدمت میں جو مساعی مبذول رکھی ہیں ان میں سے بعض سے آپ کو روشناس کراؤں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دولت ابد مدت نے انتہائی توجہ کے ساتھ اس زبان کی خدمت میں کما حقہ حصہ لیا ہے۔ جو حضارت اسلامیہ کے آغاز سے آج تک علمی زبان بنی ہوئی ہے۔ انہی مساعی مشکورہ میں کتاب معجم المصنفین کا نام سب سے زیادہ جلی اور نمایاں نظر آتا ہے جو ہنوز تنقیح و ترتیب کے منازل سے گزر رہی ہے۔ اب تک اس کی چار جلدیں شائع ہوئی ہیں اور باقی انشاء اللہ عنقریب شائع ہوں گی۔ یہ عظیم الشان کتاب تقریباً

بیس ہزار مطبوعہ صفحات میں ختم ہوگی۔ بلحاظ موضوع یہ اپنی نوعیت کی ایک ہی کتاب ہوگی۔ جس کی ضرورت و حاجت محتاجِ بیان نہیں۔ کوئی عالم جسے علم و مدنیت اسلامیہ کی تاریخ سے شغف ہو اس نوع کی کتاب سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ جو اسلامی تمدن قرون ماضیہ میں انتہائی عروج حاصل کر چکا ہو۔ اور آج تک اسی آب و تاب کے ساتھ باقی ہو اس کی تاریخ کہاں تک اعتنائے التفات کی مستحق نہ ہوگی۔

جن لوگوں کو تاریخ تمدن و حضارت سے دلچسپی رہی ہے۔ خصوصاً اسلامی مدنیت اور زبان عربی کے ادب سے زیادہ تعلق رہا ہے ان سے یہ امر مخفی نہیں کہ مسلمانوں نے اپنی حکومت و سلطنت کا دائرہ وسیع ہونے کے بعد ہی علوم و فنون کی خدمت شروع کر دی تھی۔ خود بھی کتابیں تالیف کیں اور یونان، فارس اور ہندوستان کے علمائے متقدمین کی کتابوں کے ترجمے بھی اپنی زبان میں کیے۔ بلاشبہ انہوں نے اپنی ان خدمات میں اتنی زیادہ ترقی کی کہ تمام پچھلی قوموں سے اس خصوصیت میں بڑھ گئے اور تالیف میں اتنا غلو کیا کہ بعض مولفین نے پانچسو تالیفوں سے زیادہ کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں۔ اور بعض کی تالیفات کی تعداد تو اس سے بھی زیادہ ہے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ دراصل تالیف کا کام عربی زبان میں قرآن کریم کے نزول کے بعد سے شروع ہوا ہے اور یہ قول کہ عربی میں سب سے پہلی کتاب جڑی بوٹیوں پر ایک یمنی شخص نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پہلے لکھی تھی، افسانوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ تاریخ آداب پر جس شخص کی نظر ہو وہ ہرگز اسے تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوگا۔ حق یہ ہے کہ نزول قرآن سے قبل کوئی عربی کتاب موجود ہی نہ تھی اور اگر کہیں کچھ منتشر اور نامکمل اجزاء توریت و انجیل کے تراجم کے تھے بھی تو وہ اتنے غیر مرتب اور ناقص تھے کہ ان پر لفظ کتاب کا اطلاق ناممکن معلوم ہوتا ہے۔

دنیا کی ہر ترقی کرنیوالی قوم آغازِ تالیف کے معاملہ میں مشترک نظر آتی ہے۔ اس نوع کی تمام اقوام میں دیکھا گیا ہے کہ سب سے پہلے آداب دین کی تدوین کی جاتی ہے۔ اس خصوص میں ہندوستانی، یونانی ایرانی اور مصری سب یکساں ہیں۔ چنانچہ ہند، یونان، فارس اور مصر قدیم میں سب سے پہلے وہی گیت جمع کیے گئے جو ان کے معبودوں کی تعریف میں گائے جاتے تھے۔ دینی آداب کے بعد علوم فلسفہ وغیرہ پر توجہ ہوئی۔ رہے عرب تو ان میں چونکہ عمرو بن لحی بانی بت پرستی کے ظہور کے بعد سے کوئی خاص مذہب نہ رہا

تھا۔ اس لئے ان کی کوئی تالیف بھی نہ تھی۔ مذہبی نہ فلسفیانہ۔

جب یونان کا دور اپنی تمام منازل عروج طے کرچکا۔ ایرانیوں اور سریانیوں کے علمی بازار بابل میں چلتے چلتے ماند پڑ گئے۔ علوم کی بھڑکتی ہوئی آگ فارس میں بجھ گئی تو قیاصرۂ روم کی باری آئی اور ملک طبیعیات ہندسہ، فلکیات، عنصریات، الہیات اور تمام علوم حکمت و فلسفہ کا مرکز بن گیا۔ اس کے بعد دولت اسلامیہ کا دور آیا۔ زمانہ نے اپنی فطری گردش کے مطابق پلٹا کھایا اور ساری دنیا خدا کے نور سے جگمگا اٹھی۔ اس دور کے ابتدا میں مسلمانوں کی توجہ تبلیغ کی طرف بہت زیادہ تھی۔ ان کے سینے امہات علوم اور اصول معارف کے خزینے بنے ہوئے تھے۔ اللہ کی کتاب ان کے ہاتھوں میں تھی۔ اس لئے شروع شروع میں ان کے لئے کوئی صحیفہ مرتب ہوا نہ کوئی کتاب۔ چھوٹے اپنے بڑوں سے سیکھتے اور علوم حاصل کرتے۔ اور یہی وہ طریقہ تھا جسے روایت و حدیث کا طریقہ کہا جاتا ہے۔ وہ اسی طرح روایت و سماعت سے تلقین و تعلیم کا فرض پورا کرتے اور رجال و رواۃ حدیث کے جو حالات معلوم ہوتے انھیں ازبر کرتے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ تدوین و تالیف کے کام میں تفنن اور تنوع سے بھی کام لیتے جاتے تھے۔ ان کی توجہات مختلف علوم میں تصنیف کی طرف بھی مبذول ہو گئی تھیں۔ آہستہ آہستہ ان کے علوم کے مجموعے بہت بڑھ گئے اور کتابوں کی اتنی کثرت ہو گئی کہ اگر کوئی گننا چاہے تو ان کا شمار ناممکن ہے۔ اسی زمانہ سے روایت کا رواج کم ہوا اور سابقہ طریقہ سے حدیث بیان کرنے کے ابواب تقریباً بند ہوگئے۔ یہ صورت تیسری صدی کے اواخر میں رونما ہوئی اور حدیث، فقہ، تفسیر، اصول فقہ، رجال، عقائد، کلام، معانی اور بیان کو علوم اسلامیہ کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اور غالباً صرف و نحو کو بھی انہی کی ایک شاخ قرار دیا گیا۔

اسی طرح جب اللہ نے ممالک و بلاد کے خزانے مسلمانوں کے لئے کھول دیئے تو ان کی توجہ علوم فلسفہ و حکمت کی طرف مبذول ہوئی۔ انہوں نے خود ان علموں کو حاصل کیا اور سُریانی، رومی، ایرانی اور ہندوستانی زبانوں سے ان علموں کی کتابوں کے ترجمے کئے۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ فلسفہ کی کتابیں یونانی سے عربی میں دوسری زبانوں کے واسطے سے ترجمہ ہوئی ہیں اور جو براہِ راست یونانی زبان سے لی گئی ہیں، ان کی تعداد بہت کم ہے۔ غرض مسلمانوں کی علمی مساعی سے یونان، بابل اور فارس وغیرہ کے علوم سے کوئی علم ایسا باقی نہ رہا جس کی کتاب عربی میں ترجمہ نہ

ہوگئی ہو۔ نہ اس نوع کی کوئی کتاب ایسی بچی جس کی ان کے یہاں نقل نہ کی گئی ہو۔ یہ سب کچھ بلاد مشرق میں خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں اور بلاد مغرب میں خلفائے امویہ کے عہد میں ظہور پذیر ہوا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو علوم اوائل سب کے سب ضائع ہو جاتے۔

امریکی مستشرق ایڈورڈ کتاب اکتفاء القنوع میں لکھتا ہے

"عربوں نے علوم ریاضی کی نہایت مکمل خدمت کی ہے۔ اگر عرب نہ ہوتے تو ریاضیات میں یونانیوں کی بہت سی تصانیف ضائع ہو جاتیں۔ ان کی بدولت یہ تصانیف عربی زبان میں محفوظ ہیں گو ان کی یونانی اصل مفقود ہو چکی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عبداللہ بن محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس ابوجعفر دوسرے عباسی خلیفہ نے علوم ریاضی وغیرہ کے احیا کا کام شروع کیا اور اپنی وسیع مملکت میں مترجم علماء کی خدمات حاصل کیں۔ جنھوں نے خلیفہ کے لئے ہندوستانی، سریانی، فارسی اور یونانی تصانیف کے ترجمے کئے۔ اس کے بعد دوسرے خلفاء خصوصاً ہارون رشید اور اس کے بیٹے مامون الرشید نے بھی اس کی پیروی کی۔"

اس طریق عمل نے علمائے مسلمین کو علوم اسلامیہ اور علوم اوائل کا مجمع البحرین بنا دیا۔ تصانیف کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ کتابوں اور تالیفوں کے ناموں میں اشتباہ ہونے لگا۔ مولفین اور مصنفین کے القاب و اسماء میں بھی خلط ملط ہونے کا اندیشہ بڑھ گیا اور رفتہ رفتہ ارباب تصانیف کی ایک جماعت تک اس اندیشہ کی زد میں آگئی۔ مثلاً رسائل اخوان الصفاء فلاسفہ کی ایک جماعت کے مرتب کئے ہوئے ہیں اور حکیم مجریطی نے بھی ایک کتاب اخوان الصفاء کے نام سے تصنیف کی ہے۔ ان دونوں میں جو امتیاز ہے علماء سے مخفی نہیں۔

کتابوں کے ناموں میں تو اس حد تک متشابہت پیدا ہو گئی کہ کوئی کتاب ایسی نہیں ملتی جس کی ہمنام دوسری موجود نہ ہو یا ایک کا نام بعض اجزا میں دوسرے کا شریک نہ ہو۔ کتاب الاشباہ والنظائر مولفہ ابن نجیم المصری المتوفی ۹۷۰ھ فقہ حنفی کی وسیع کتابوں میں ہے۔ اس کے مقابل اسی موضوع پر طوری الحنفی کی ایک کتاب بھی اسی نام سے موجود ہے۔ ساتھ ہی شیخ صدر الدین محمد بن عمر عرف ابن الوکیل شافعی المتوفی ۷۱۶ھ کی کتاب فقہ شافعی میں اسی نام سے موسوم ہے۔ ان کے علاوہ نحو میں علامہ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ کی کتاب کا بھی یہی نام ہے۔ خود کتاب کشف الظنون جو کتب وفنون کے اسماء میں تمیز قائم کرنے کے لئے تالیف کی گئی ہے

اس کا نام بھی تشابہہ سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اس نام کی ایک مشہور کتاب حاجی خلیفہ رومی کی ہے جسکا نام کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون ہے۔ دوسری کشف الظنون عن الشروح والمتون ابراہیم مصری کی ہے۔ تیسری کشف الظنون فی تحقیق الفنون ایک شام کے عالم کی لکھی ہوئی ہے۔

اسی پر مولفین کے اسمار والقاب اور انساب کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ابن اثیر کے نام سے علمار کی ایک جماعت موجود ہے۔ ملاحظہ ہو۔

ابن اثیر صاحب "النہایۃ" لغات حدیث میں
ابن اثیر صاحب "الکامل" تاریخ میں
ابن اثیر صاحب "المثل السائر"
} یہ تینوں جزیرہ کے علمار سے ہیں۔

ابن اثیر عقائد کی ایک کتاب کے مصنف ہیں اور یہ یمن کے علمار سے تھے۔

یہی حال "ابن جریر" کا ہے۔ ایک ابوجعفر محمد بن جریر طبری ہیں جو ائمہ اہل سنت میں مذہب جریرین کے امام اور تاریخ وتفسیر وغیرہ کی مشہور کتابوں کے مصنف ہیں۔ دوسرے ابوجعفر محمد بن جریر طبری جو نہ صرف پہلے کے ہمنام بلکہ ہم نسب بھی ہیں فرقہ شیعہ کے ایک عالم اور ان کی مذہبی تصنیفات کے منصف ہیں۔

اسی طرح لفظ "یہودی" کو لیجئے تو ایک یہودی طبیب باشندہ بغداد کتاب الطب النبوی کے مصنف ہیں اور دوسرے علمائے بغداد میں یہودی کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ بغداد کے محلہ "یہودیہ" میں رہتے تھے مذہباً یہودی نہ تھے بلکہ مسلمان عالم تھے۔

جب مشابہت اس نوبت کو پہنچ گئی تو مصنفین اور تصانیف کے حالات کا علم ضروری ٹھہرا۔ اگر یہ علم نہ ہو تو ظاہر ہے کہ کتابوں کے حوالے میں بڑی غلطیاں واقع ہوں۔

تالیف وتصنیف کی کثرت ہونے پر علمار کو ضرورت محسوس ہوئی کہ ایک ایسی فہرست وضع کیجائے جس سے کتابوں کے منہ پر جو پردہ پڑا ہوا ہے۔ اٹھایا جاسکے۔ اور شیخ محمد ابن اسحاق ندیم بغدادی المتوفی ۳۸۵ھ نے اس موضوع پر اپنی مشہور کتاب تالیف کی اور اپنی کتاب کو علمار کے طبقات کے مطابق ترتیب دیا۔ پھر شیخ الطائفۃ امامیہ ابوجعفر طوسی المتوفی ۴۶۰ھ نے ایک کتاب لکھی وہ بھی ابن الندیم کی کتاب کی

طرح ہے۔ مگر یہ دونوں کتابیں پیاسے کے لئے پانی کا ایک قطرہ کا حکم رکھتی ہیں۔ ان کتابوں کے بعد صدیوں تک علماء کو اس موضوع پر کوئی تیسری کتاب نہ ملی۔ اس کے بعد مولی طاش کبری زادہ رومی متوفی ۹۶۷ھ کا زمانہ آیا۔ اور اس نے اپنی مسموعات و مقروآت (سنی اور پڑھی ہوئی کتابوں) کو ایک کتاب میں جمع کرکے اس کا نام مفتاح السعادۃ رکھا۔ اس کے بعد حاجی خلیفہ رومی متوفی ۱۰۶۸ھ نے اپنی مشہور کتاب کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون تالیف کی جسے ابراہیم کی کتاب سے اضافے کرنے کے بعد طبع کیا گیا اور یہ کتاب مشرق و مغرب کے علماء میں مشہور ہوگئی۔

مصنفین کا حال یہ ہے کہ لوگوں نے قرون اولیٰ میں مولفین کے حالات ترتیب دئے اور اس موضوع پر سب سے پہلے تصنیف کرنے والے کا نام جہاں تک معلوم ہو سکا شیخ مورخ احمد بن ابی طاہر طیفور بغدادی متوفی ۲۸۰ھ ہے۔ اور اس تصنیف کا نام "اخبار المولفین" ہے یہ کتاب متوسط حجم کی ہے۔ بڑی نہ چھوٹی، مصنفین وغیرہ کے حال میں یہ پہلی تالیف ہے، اس میں بیشتر حالات انہیں علماء کے ہیں جو عراق و حجاز میں یا ان سے قریب کے مواضع میں پیدا ہوئے۔ احمد بن ابی طاہر کے بعد اس خصوص میں شیخ علامۃ ابوالحسن علی بن انجب بغدادی متوفی ۶۷۴ھ کا نام آتا ہے جنکی کتاب (اخبار المصنفین) چھ جلدوں میں ہے۔ اس میں علوم و فنون میں تصنیف و تالیف کا کام کرنیوالے کثیر التعداد اشخاص کے حالات بڑی محنت سے جمع کئے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ یہ جلدیں نایاب ہوچکی ہیں اور اب کسی ملک میں نہیں پائی جاتیں۔ اور اگر پائی بھی جائیں تو ظاہر ہے کہ زمانہ کی ترقی اور مولفین مابعد کے تسلسل سے ناقص رہیں گی۔ ان میں ان مولفین کے حالات نہ مل سکیں گے جو اس کتاب کی تالیف کے بعد ہوئے۔

تراجم رجال کی جو کتابیں ہمارے سامنے ہیں وہ سب بہت مختصر اور کسی ایک فرقہ یا ایک شہر کے باشندوں کے حالات یا ایک عہد کے حالات تک محدود ہیں۔ ان میں یہ ممکن نہیں کہ کوئی طالب تحقیق ہندوستان اور ماوراء النہر وغیرہ عجمی و مشرقی ممالک کے علماء کا حال پڑھ سکے۔ کیونکہ عربی زبان میں طبقات کی موجودہ کتابیں جو علمی زبانوں میں سب سے زیادہ عام ہیں، ان کے حالات سے خالی ہیں۔ ان کے سوانح صرف کتابوں میں یا شعرائے عجم کے تذکروں یا صوفیوں کے مکتوب وغیرہ میں ملتے ہیں۔ بلاشبہ اس قسم کی کتابوں سے دور دراز

مقامات کے عربی بولنے یا عربی علوم سے شغف رکھنے والے۔ مثلاً یورپ و ایشیا کے بہت سے ممالک کے علمار خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

عہد حاضر کے علما نے بھی تراجم رجال پر کتابیں تصنیف کی ہیں۔ مگر یا تو انھوں نے اپنی کتابوں کی بنار مشہور لوگوں کے ناموں پر رکھی ہے اور ان کی تصانیف وغیرہ کا اعتبار نہیں کیا ہے۔ اس لئے بسا اوقات ان مشہور لوگوں کا حال تو ان کتابوں میں ملجاتا ہے۔ جو دوسرے اعتبارات سے اہمیت رکھتے ہیں۔ مگر ان اشخاص کا نہیں ملتا جنہوں نے اپنی پاکیزہ زندگی کی یادگار کسی عربی کتاب یا رسالے کی شکل میں چھوڑی۔ اس کی مثال خیر الدین زرکلی کی قاموس الاعلام یا کتاب المشاہیر وغیرہ ہیں یا صرف مطبوعہ تصنیفات کے ذکر پر اکتفا کیا ہے۔ جو امریکی مصنف ایڈورڈ کی کتاب اکتفار القنوع کا حال ہے۔ یا یوسف الیان سرکس دمشقی کی کتاب معجم المطبوعات اور جامع التصانیف الحدیثۃ وغیرہ کا۔

ان کتابوں کے مفید ہونے میں کلام نہیں لیکن ان سے مقصود پورا نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ یہ کتابیں اپنے موضوع پر حاوی نہیں ہیں۔ مثلاً ان میں ایسی تمام تصانیف اور مصنیفین کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ جو بلادِ عجم و ہند میں ہوئے ہیں۔ ان میں ایسی کتابوں کے نام نہ ملیں گے جو طہران، بوشہر اور شیراز کے مطابع سے عربی زبان میں شائع ہوئی ہیں۔ رہیں یورپ کے علمار کی کتابیں جو اس موضوع پر لکھی گئی ہیں تو وہ زیادہ تر آداب لغت عربی کی تاریخ پر مبنی ہیں مصنیفین کے حالات پر نہیں۔ پھر وہ خود عربی زبان سے ماخوذ ہیں جن میں ایشیا کے مشرقی ملکوں اور ماوراء النہر کے عالموں کا کوئی حال نہیں ملتا۔ جیسے پروفیسر بروکلمان جرمنی مستشرق کی تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ہے۔ یہ اگرچہ بہت سے مصنیفین اور تصنیفات کی جامع ہے تاہم اس میں بہت سے مولفین اور تالیفات کا تذکرہ درج ہونے سے رہ گیا ہے۔ مزید برآں اس کتاب میں متعدد مواقع پر کتب تراجم کے اصلی مآخذ تک رسائی نہ ہونے اور فارسی میں کم لیاقت ہونے کی وجہ سے پروفیسر موصوف کو دھوکا بھی ہوا ہے۔

جب صورت حال یہ ہو تو ظاہر ہے کہ علمار اور عربی کتب کے متعلق تحقیق کرنے والے طلبار کو ایک ایسی کتاب کی کتنی سخت ضرورت ہوگی۔ جو اپنے موضوع پر حاوی اور متعلقہ مقاصد کو پورا کر سکتی ہو مقام

شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عربی زبان سے شغف رکھنے والے اشخاص پر احسان فرمایا اور علامہ محمود حسن خانصاحب ٹونکی مدظلہ نے اس معرکہ آرا کتاب کی تالیف فرمائی جو تمام مذکورہ بالا مقاصد کی جامع ہے۔ مولانا زادبقاءہ نے کتاب کے لئے مواد حاصل کرنے کی غرض سے دور دراز ملکوں کا سفر کیا۔ شام، عراق اور دیار مصر وغیرہ کی سیاحت کی۔ جہاں عربی، فارسی کی قلمی اور نادر کتابوں کے خزانے محفوظ تھے۔ اور اس خصوص میں ناقابل بیان زحمت اُٹھا کر اپنی کتاب میں تقریباً ڈیڑھ ہزار کتابوں کا خلاصہ درج فرمایا۔ اب خدا کے فضل وکرم سے یہ کتاب اتنی جامع اور حاوی کتاب ہوگئی کہ اس سے زیادہ کسی کے تصور میں نہیں آسکتی۔ یہ بات دوسری ہے کہ کسی کو استقصائے کامل کا دعوے مناسب نہیں اور خدا نے ہر عالم کے مقابلہ میں ایک اس سے بڑا عالم پیدا کیا ہے۔

معجم المصنفین میں ایسے دو ہزار اشخاص کا تذکرہ ہے جنکا نام "احمد" ہے۔ جب صرف احمد نام کے دو ہزار لوگوں کا ذکر ایک کتاب میں ہو تو یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کی ضخامت اور وسعت کا اندازہ کیا ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ یہ کتاب تقریباً چالیس ہزار مصنفین کے تذکرے، ان کے حالات کی تحقیق، سنین وفات اور ان کی اولاد وغیرہ کے ذکر پر مشتمل ہے۔ جس میں ان کے انساب، القاب اور تصنیفات وغیرہ کی نسبت جتنے شبہات ہوسکتے ہیں، رفع کردیئے گئے ہیں۔ اس کتاب میں ہر ایسے شخص کا ذکر مل سکتا ہے۔ جس نے آغاز عہد تالیف سے کرسنہ ۱۳۵۰ھ تک عربی میں کوئی تصنیف چھوڑی ہے۔ مگر استقصائے کامل انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ خدا قابل احترام مولف کو عمر مدید ارزانی فرمائے آج آپ رجال وطبقات کے علم میں علماء کے رئیس اعظم ہیں۔ آپ کی عمر ستر سے تجاوز کرچکی ہے۔ اور آپ نے اپنی تمام عمر حالات کے جمع کرنے اور ان کی تنقیح وتنقید کرنے میں صرف کی مادی اور نقاد محققین کے مسلک پر کتاب مرتب فرمائی۔ آپ جس کتاب سے اخذ کرتے ہیں، پہلے اس سے مصنف کی حالات درج کرتے ہیں۔ پھر ان کتابوں کا ذکر کرتے ہیں جو اس کے مورخ میں مختلف نظر آتی ہیں۔ پھر اسی باب میں اپنی رائے لکھتے ہیں۔ آخر میں اس کی تصانیف گنواتے اور ان فہرستوں اور کتابوں کے نام درج کرتے ہیں جن سے یہ معلومات اخذ کی ہیں۔ اس بنا پر یہ کتاب ان مصنفین کے تراجم میں جو عربی زبان میں کوئی یادگار چھوڑ گئے ہیں۔ سب سے زیادہ وسیع کتاب اور نہایت عظیم الشان دائرۃ المعارف ہے۔

اس کتاب کے مسودات، حروف معجمہ کی ترتیب سے آخر اسماء تک مکمل ہوچکے ہیں۔ یعنی "یونس"

سے کے نام تک۔ یہ کتاب جب مکمل طور پر طبع ہوگی تو بیس ہزار صفحات پر ختم ہوگی۔ ابتک چار جلدیں چھپی ہیں جن کے صفحات کا مجموعہ (۱۴۰۰) ہے۔ پہلی جلد مقدمہ اور علوم عربیہ کی تقسیم پر مشتمل ہے۔ دوسری میں ائمہ وفقہائے اربعہ کے حالات ہیں۔ تیسری اور چوتھی میں صرف ان مصنفین کا تذکرہ ہے جنہیں سے ہر ایک کا نام ابراہیم ہے۔ ببیضات تقریباً چار ہزار صفحے کے تیار ہیں اور باقی تصحیح و تنقیح کی منزل سے گزر رہے ہیں۔

جب مذکورہ بالا چاروں جلدیں شائع ہوئیں تو علماء اور مستشرقین نے ان کو نظر قبول و استحسان سے دیکھا۔ ان کی بہت تعریف کی اور ان کے متعلق ملاحظات و شذرات لکھے اور سب نے بالاتفاق یہ رائے ظاہر کی کہ یہ کتاب اس موضوع پر سب سے زیادہ جامع اور بہترین کتاب ہے۔ تعریف کرنے والے حضرات میں علامہ سید سلیمان ندوی مشہور جرمنی مستشرق سالم کرنکوی اور شیخ محمد صالح کی وغیرہ شامل ہیں۔ بہت سے یورپین صاحب نے تو اس جیسی وسیع کتاب کے ایک شخص کے ہاتھوں مرتب ہونے کو ناممکن قرار دیا ہے اور اس واقعہ کو عجائب زمانہ میں شمار کیا ہے۔

مصنف علام کو اس زبردست مجموعہ کی تالیف کا خیال کس طرح آیا اور ایک شخص تذکرہ و تراجم کے موضوع پر ایسی دائرۃ المعارف مرتب کرنے میں کیونکر کامیاب ہوا۔ اس کی تشریح خود مولف کے الفاظ میں سن لیجئے۔ مولف دام ظلہ مقدمہ کتاب میں لکھتے ہیں۔

"میں اپنی طالب علمی کے زمانہ ہی سے ان علما کے حالات معلوم کرتا رہتا تھا جنہوں نے مختلف علوم میں تصنیف و تالیف کی۔ اور ان مشہور ائمہ کے تذکرے لکھتا رہتا تھا جن کے آثار علوم و فنون میں ملتے ہیں۔ اسی طرح مختلف بیاضوں میں لکھتے لکھتے مصنفین و مولفین کے حالات پر ایک مختصر سا تذکرہ جمع ہو گیا۔ پھر گردش زمانہ سے مجھے کچھ مدت تک علم و علماء کے مذاکرے سے دستکش ہونا پڑا۔ اور جو کچھ میں نے لکھا تھا وہ بھی نظری ہو گیا اس کے بعد اللہ نے مجھ پر کرم فرمایا اور اپنی ضرورت و شوق کی بنا پر ابنائے دنیا سے علیحدگی اختیار کر سکا۔ میں نے موقع کو غنیمت جانا اور کتاب سے شغل رکھنے کو کسب معاش کے مشغلے پر ترجیح دی۔ یکایک مجھے یہ بات سوجھی کہ جو مسودہ میں نے شروع میں جمع کرتے کرتے چھوڑ دیا ہے۔ اسے مکمل کر لوں۔ کیونکہ اہل علم کو پڑھنے سے زیادہ اس قسم کی کتاب کی ضرورت ہے کہ اس کتاب کا نفع زیادہ عام ہے۔ اسلئے میں نے اس کام کے پورا

کرنے کا عزم کیا اور اللہ پر بھروسہ کیا۔ لیکن حالات مصنفین کا موضوع ان کی کثرت کی وجہ سے بہت وسیع تھا اور کسی ایک شہر یا گروہ یا صدی کے ساتھ مخصوص نہ تھا۔ پھر ان کے حالات کے ماخذ یعنی ان اصحاب کی تاریخ کے مجموعے جنہیں علمار کے مختلف گروہوں نے تصنیف کیا ہے موضوع کے غیر عام ہونے کی وجہ سے اس مقصد کے لئے کفایت نہ کرتے تھے۔ مثلاً ان کتابوں میں سے بعض صرف نویں یا دسویں صدی وغیرہ کے مشاہیر و اعیان کے ذکر تک محدود ہیں یا بعض مخصوص طبقات مثلاً طبقات حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ، یا طبقات محدثین قرار اطبار، نحویین وغیرہ کے حالات پر منحصر ہیں۔ بعض امرائے ملک کے لئے مخصوص ہیں بعض میں صرف ایک شہر کے لوگوں کا ذکر ہے، مثلاً شام، مصر یا حلب یا اندلس وغیرہ، اس لئے اس کتاب کے بہت سے ابواب واصول قرار دے کر اسے متفرق ضخیم وقصیر تصنیفات وتالیفات سے مرتب کرنا ضروری تھا۔ اللہ نے اپنے فضل سے مجھے اپنے شہر میں کتب خانہ پر تصرف عطا فرمایا اور میں نے اہتمام والتزام کے ساتھ کام شروع کر دیا۔ پھر اسی مقصد سے بلاد بعیدہ کا سفر کیا اور انکے علمی خزانوں سے مستفید ہو کر اس مسودہ کی تکمیل میں منہمک ہوا"۔

ان مسودات کی تنقیح وترتیب میں ایک معین اور اس مسودہ کی سرگذشت سے مطلع ہونے کے اعتبار سے میں آپ کی معلومات میں اتنا اضافہ اور کرنا چاہتا ہوں کہ جس وقت حضرت مولف اپنے مسودات کو مکمل فرما چکے تھے اس وقت آپکو دولت آصفیہ نے جو ہندوستان کی اسلامی سلطنتوں کی واحد یادگار اور ہندوستان کی اسلامی حضارت کا مرکز ہے آپ کو اپنے پایۂ تخت حیدرآباد میں بلایا اور نواب عماد الملک ناظم تعلیمات نے جو خود ایک منتخب وممتاز عالم تھے اور عربی زبان کی خدمت پر بہت زیادہ توجہ فرماتے تھے۔ آپ کو باصرار تمام آمادہ کیا کہ آپ اپنے اس زبردست کام کو دولت آصفیہ کی اعانت سے تکمیل کو پہنچائیں۔ چنانچہ اب یہ کتاب اسی بابرکت حکومت کی مالی مدد اور مادی ومعنوی مساعدت سے طبع ہو رہی ہے۔ ابتک اس کام کیلئے ضروری اخراجات کئے جا چکے ہیں اور آئندہ بھی باقی اجزار اسی سرکار ابد قرار کے مصارف سے طبع ہونگے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عربی لغت وآداب کے تمام محبوں کو اس کتاب سے مستفید فرمائے۔

از مولانا عبد القدوس صاحب ہاشمی ندوی
مرسلۂ جناب محمد زکریا صاحب مائل۔

یومِ اقبال

گذشتہ زمانوں میں بالعموم اہل کمال کو ان کے کمال کی داد ان کی زندگیوں میں نہیں ملتی تھی۔ بلکہ مرنے کے بعد جبکہ وہ اس دنیا کو چھوڑ کر چلے جاتے ان کا نام روشن ہوتا تھا۔ عرفی نے اسی کا ماتم کرتے ہوئے کہا ہے۔

چہ دل کشاید ازیم کہ بعد ازیں گویند   کہ بودہ است فلاں دام اسمہ استاد
ازینکہ بعد بریدن تمام شانہ شود   گرہ کشادہ نگردد زطرۂ شمشاد

لیکن آج ذرائع الحاق واتصال اسقدر بڑھ گئے ہیں کہ ساری دنیا بمنزلہ ایک گھر کے ہوگئی ہے۔ اور جو کمال کسی میں ہوتا ہے فوراً ہی لوگ اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سر اقبال کے اشعار کی محبوبیت اور مقبولیت نہ صرف ہندوستان بلکہ دیگر اسلامی ممالک تک بھی پہنچ چکی ہے۔ اور ہر پڑھے لکھے مسلمان کے دل میں ان کی عزت اور عظمت جاگزیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "دی انٹر کالجیٹ مسلم برد رہوڈ" نے اس سال کے آغاز میں ۹ جنوری کو "اقبال ڈے" منانے کا فیصلہ کیا تاکہ دنیائے اسلام کے اس عظیم الشان شاعر کے حضور میں وہ اپنی طرف سے عقیدت کا نذرانہ اور تحسین کا خراج پیش کرے۔ ان طلبا نے مجھے بھی اس جلسہ میں مدعو کیا اور نہایت اصرار کے ساتھ۔ اس لئے میں ۹ جنوری کو دہلی سے لاہور پہنچا۔ دن صرف ایک تھا اور پڑھنے والے۔ بولنے والے۔ نظمیں اور مضامین سنانے والے بہت۔ یعنی تقریباً تین سو کی تعداد میں۔ اس وجہ سے پروگرام بہت طویل ہوگیا تھا۔ اور تین تین گھنٹے کی تین نشستیں صبح ۹ ½ بجے سے رات کے ۹ ½ بجے تک رکھی گئی تھیں۔ پہلی نشست میں مسٹر گوکل چند نارنگ صدر جلسہ تھے۔ ہمارا دہلوی قافلہ ذرا دیر سے پہنچا تھا اس لئے ہم اس نشست کے آخر میں شریک ہو سکے۔ اور بعض مقالات اور نظمیں سننے سے محروم رہے۔ دوسری نشست ڈیڑھ بجے زیر صدارت شیخ عبدالقادر صاحب ممبر انڈیا کونسل منعقد ہوئی۔ اس میں متعدد مقالے نہایت عمدہ تھے۔ خاصکر خواجہ غلام السیدین صاحب ایم۔ اے ڈی پرنسپل ٹریننگ کالج

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کا انگریزی مقالہ بہت گراں قدر تھا۔ مولانا عابد علی صاحب عابد ایم۔ اے کی تحریر بھی نہایت دلچسپ تھی۔ اور حفیظ جالندھری کی شاعری اور موسیقی دونوں داد کے قابل تھیں۔ نیز صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم ایم۔ اے نے اقبال کی شاعرانہ حیثیت کو کامیابی کے ساتھ نمایاں کیا تھا۔

تیسری نشست جو ساڑھے چھ بجے شام کو شروع ہوئی اس میں علامہ عبداللہ یوسف علی صدر تھے اسی نشست میں بیگم شاہنواز نے ایک مختصر تقریر فرمائی اور اعلان کیا کہ ان کے شوہر نے دس مربعے زمین ڈاکٹر اقبال کے چھوٹے بیٹے جاوید کے نام اسی اقبال ڈے کے سلسلہ میں منتقل کر دی ہے۔ اس اعلان نے اس یادگار کو ایک مادی قوت بخشی اور حاضرین نے اس پر نہایت خوشی اور تشکر یہ کا اظہار کیا۔ اس کے بعد علامہ عبداللہ یوسف علی نے اپنی جگہ پر مجھ کو بٹھا دیا اور خود چلے گئے۔ پروفیسر محمد عمر فاروق ایم۔ اے، اور پروفیسر منیر الدین صاحب ایم۔ ایس۔ سی۔ نے انگریزی زبان میں پر مغز مقالے پڑھے۔ کئی نظمیں بھی پڑھی گئیں۔ جن میں سے مولینا اسد ملتانی کی نظم خصوصیت کے ساتھ دلچسپی سے سُنی گئی۔ آخر میں چودھری غلام احمد صاحب پرویز نے اپنی تقریر اقبال اور قرآن پر شروع کی۔ جو اس قدر پسند کی گئی کہ خاتمہ کے وقت بار بار لوگ درخواست کرتے تھے کہ کچھ اور اضافہ کیجئے۔ مگر چونکہ وقت زیادہ گزر چکا تھا اس لئے میں نے جلسہ کو ختم کر دیا اور حسب ذیل تقریر کی۔

ڈاکٹر اقبال کے کلام کا میں اس وقت سے سلسلہ وار مطالعہ کر رہا ہوں جبکہ آج سے ایک تہائی صدی بیشتر شیخ عبدالقادر کا رسالہ مخزن لاہور سے نکلتا تھا جس میں ان کی نظمیں چھپا کرتی تھیں۔ زمانۂ مابعد میں ڈاکٹر صاحب کی مثنویوں اسرار خودی و رموز بیخودی اور پیام مشرق نیز جاوید نامہ وغیرہ پر میں نے تبصرے بھی لکھے جو ملک کے ممتاز رسالوں میں شائع ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب کے کلام کے ساتھ میری دلچسپی اور گرویدگی کی خاص وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری سے شعر اور ادب کی جسقدر خدمت کی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ اسلام اور قرآن کی خدمت کی ہے۔

ادھر صدیوں سے مسلمانانِ ہند کی حالت یہ ہو گئی ہے کہ قرآن سے ان کو لگاؤ نہیں رہا

ہے اور ان کا دینی رشتہ اس کی تعلیمات سے ٹوٹا ہوا ہے ۔ وہ صرف ان خیالات کے پیرو ہیں جو سرتاسر انسانی ہیں جنکو ملاوں نے فرقہ بندی اور باہمی افتراق کا ذریعہ بنا کر ملت کے اجتماعی شیرازہ کو ایسا درھم برھم کر رکھا ہے کہ جدید تعلیمیافتہ مسلمان نوجوانوں کے دلوں میں ان کی حالت دیکھ کر خود اسلام اور قرآن کی طرف سے بے اعتنائی بلکہ بدگمانی پیدا ہو گئی جو اس صورت میں ہر عقلمند اور صاحب فہم کے دل میں پیدا ہی ہونی چاہئے تھی۔ ایسی حالت میں ڈاکٹر اقبال نے جو خود تعلیم جدید کے ایک درخشندہ آفتاب ہیں اپنی خداداد قابلیت اور اندرونی روشنی سے شاعری کے ساز پر وہ دیپک کا راگ چھیڑا۔ جس سے مسلم نوجوانوں کے افسردہ دلوں میں قرآن کی محبت کی آگ بھڑک اٹھی اور انہوں نے اس کی عظمت اور اسلام کی حقیقت کو پہچانا۔

بھولے ہوئے راستہ کی طرف قوموں کو مائل کرنا اور ان کو دلوں کو ہدایت کی جانب موڑنا وہ کام ہے جس کے لئے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل گزشتہ زمانوں میں انبیاء کرام آیا کرتے تھے ۔ وہی کام قدرت نے ڈاکٹر صاحب سے اور ڈاکٹر صاحب نے اپنی شاعری سے لیا ۔ مولانا گرامی مرحوم کا یہ قول کسقدر صحیح ہے ۔

در دیدۂ معنی نگہاں حضرت اقبال ‏ ‏ ‏ ‏ پیغمبرے کرد و پیمبر نتواں گفت

دوسری طرف ہماری شاعری بجائے خود اسقدر مہمل ہو گئی ہے کہ اس کے تمام رشتے حیات اور عمل سے مدت ہائے دراز سے ٹوٹے ہوئے ہیں ۔ شعراء خود نہیں سمجھتے کہ وہ کس ہذیان میں مبتلا ہیں اور کس لئے مبتلا ہیں ۔ بس ایک پرانی لکیر ہے جسکو پیٹتے چلے جاتے ہیں ۔ یہاں تک کہ اس صدی کے نامور شاعر اور قومیت کے مبصر مولانا حالی مرحوم نے کہا ۔

وہ شعر و قصائد کا ناپاک دفتر ‏ ‏ ‏ ‏ عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر
ملک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر ‏ ‏ ‏ ‏ زمیں جس سے ہے زلزلہ میں برابر

وہ علموں میں علم ادب ہے ہمارا
ہوا علم دیں جس سے تاراج سارا

ڈاکٹر اقبال نے اسی عام بدذوقی کی دنیا میں اپنی شاعری کا رشتہ زندگی اور بالخصوص اسلامی اور قرآنی زندگی کے ساتھ قائم کیا۔ یہ وہ چیز ہے جس کے لئے توفیق الٰہی اپنے کسی خاص ہی بندے کو چنتی ہے۔ چنانچہ آج بھی جبکہ ان کے کلام کا اتنا نمونہ ہمارے شعراء کے سامنے موجود ہے کوئی ان کی نکالی ہوئی شاہراہ پر چلنے کے قابل نہ ہوسکا۔ بعضوں نے صرف لفظی نقالی کی کوشش کی مگر زندگی کی ان برقی لہروں کو نہیں دیکھ سکے جو ڈاکٹر صاحب کے شعروں کی رگ رگ میں دوڑ رہی ہیں۔

اسلامی زبانوں میں سے کم سے کم تین زبانوں۔ عربی۔ فارسی اور اردو کے اکثر بڑے بڑے شعراء کے کلام کا میں نے غور اور دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ ڈاکٹر اقبال کے اشعار ایسے دلکش، امیدوں سے ایسے بھرے ہوئے اور اسلامی حقائق سے اتنے لبریز ہیں کہ میں انکو اسلام کا سب سے بڑا شاعر ماننے پر مجبور ہوں۔ اس انتہائی زوال اور ذہنی پستی کے زمانہ میں مسلمانان ہند کے لئے ان کا کلام قدرت کی طرف سے ایک موہبت کبریٰ ہے۔ جس نے نوجوانوں کی جدید دماغی تعمیر میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ اور آئندہ کے لئے وہ ہمارا نہ صرف ادبی بلکہ ملی سرمایہ ہے۔

ہر چند کہ یہ پہلا اقبال ڈے تھا اور طلبا کی طرف سے تھا جنکے ابتدائی کاموں میں لازمی طور پر خامیاں ہوتی ہیں لیکن بحیثیت مجموعی نہایت کامیاب رہا۔ مولانا عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو۔ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی۔ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر جامعہ ملیہ اور ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر جامعہ عثمانیہ کے آنے کی بھی خبریں تھیں اور ان میں سوائے مولانا عبدالحق صاحب کے سب کے نام بھی پروگرام میں درج تھے۔ لیکن یہ حضرات اپنی مجبوریوں کی وجہ سے نہ آسکے ورنہ اقبال ڈے اور بھی زیادہ کامیاب رہتا۔

دوسرے دن ہم ڈاکٹر اقبال سے ملے جو ہمارے منتظر تھے۔ ۹ بجے سے سلسلۂ گفتگو ساڑھے بارہ بجے تک رہا۔ امسال حج کی شرکت کا ارادہ رکھتے تھے مگر بیماری اور کمزوری کی حالت یہ ہے کہ کوٹھی سے باہر

نکلنا مشکل ہے۔ کہتے تھے کہ میں تو دو سال سے ارادتاً سفر حج میں ہوں۔ عملاً جب موقع اللہ دے۔ بلکہ وہ اشعار بھی لکھ لئے ہیں جو اس سفر سے متعلق ہیں۔ ان میں سے کہیں کہیں سے کچھ سنایا بھی۔ مکہ سے مدینہ کی روانگی کے وقت ایک غزل لکھی ہے جس میں اللہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

تو باش اینجا و با خاصاں بیامیز   کہ من دارم ہوائے منزل دوست

یہ شعر سناتے ہی گریہ ایسا گلوگیر ہوا کہ آواز بند ہو گئی اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ مجھے یہ دیکھکر مجبوراً موضوع سخن بدلنا پڑا۔

اسلم جیراجپوری

نوائے مظلوم

(مولوی محمود علی خاں بی اے)

رہے گا لعنتِ سرمایہ داری میں جہاں کبتک — میسر ہوگی مظلوموں کو ظالم سے اماں کبتک

غضب ہے جو بنائے اطلس و دیبائے زنگا رنگ — رہے محروم تن پوشی لگائے دھجیاں کبتک

ستم ہے جو کمائے سیم و زر گاڑھے پسینے سے — وہ ہو پامالِ اصحابِ نِعَم اے آسماں کبتک

فراہم ہو یہ اسبابِ معیشت سب کسانوں سے — مگر بھوکے رہیں، کھائیں ہماری جھڑکیاں کبتک

زمیں اُن کی حجر اُن کے ثمر اُن کے شجر اُن کے — وہ ہوں محرومِ آسائش اُٹھائیں سختیاں کبتک

سمٹ کر کھیت سے سیلابِ دولت شہر میں آئے — تعیش میں کریں شہری وہ دولت رائگاں کبتک

کرو آگاہ اس مخلوق کو اپنی حقیقت سے — کہو زندہ بنو آخر وجود بے نشاں کبتک

کریں برباد اپنے عیش میں دولت کسانوں کی — یہ ظلم ناروا یہ قہر زیر آسماں کبتک

وہ لفظوں سے کماتے اور کھوتے بھی ہیں لفظوں سے — یہ کفر اقتصادی اور یہ سود و زیاں کبتک

ہے خوں آشامیٔ مزدور ہی سے فربہی ان کی — الٰہی رنگ لائے گا یہ خونِ بے زباں کبتک

رہے گی کب تلک سرمایہ کی یہ گرم بازاری — گریں گی خرمنِ مزدور پر یہ بجلیاں کبتک

اُٹھو دنیا میں کچھ کر کے دکھاؤ نوجوانو! تم — یہ لاحاصل عمل بے سود یہ آہ و فغاں کبتک

بھروسہ اپنی قوت پر کرو سعی و عمل سیکھو — یہ ذکرِ عہدِ زرّیں اور یادِ رفتگاں کبتک

وطن کو اقتصادی موت سے مل کر بچاؤ تم
غلامی کی مصیبت میں رہے ہندوستاں کبتک

تنقید و تبصرہ

مبادی سیاسیات، جلد دوم (حکومت) موٗلفہ جناب ہارون صاحب شیروانی۔ ایم۔ اے (آکسن) ایف۔ آر۔ ایچ۔ ایس، بیرسٹرایٹ لا، صدر شعبۂ تاریخ و سیاسیات، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن تقطیع ۲۲×۱۸، حجم ۱۵۴ صفحے، مع فہرست اصطلات قیمت ے ر

مبادی سیاسیات، کی پہلی جلد تھوڑے دن ہوئے شائع ہوچکی ہے۔ اور اب اس کے فاضل مصنف نے یہ دوسری جلد شائع کرکے مضمون مکمل کردیا ہے، پہلی جلد میں مملکت یا ریاست اور اس کے اداروں اور شعبوں پر نظری بحث کی گئی تھی، اس دوسری جلد میں حکومت کے مختلف کام اور کام کرنے کے طریقے، سیاسی زندگی کے مظہر اور اس کا کاروبار بہ ترتیب اور مناسب تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔

کتاب لکھنے کا مقصد طالب علموں کی ایک بڑی ضرورت پوری کرنا ہے، کیونکہ اب تک اردو میں سیاسیات پر کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جسے طالب علم پڑھ سکیں یا پڑھیں تو سمجھ سکیں۔ مبادی سیاسیات کے فاضل مصنف چونکہ خود اس فن کے استاد ہیں اس لئے وہ اپنے علم میں ملکہ رکھتے ہیں اور یہ بھی بخوبی جانتے ہیں کہ طالب علم کے لئے کتاب کو کس طرح مفید اور آسان بنایا جاسکتا ہے، سیاسیات کا ہر پہلو بہت سلجھا کر پیش کیا گیا ہے۔ بعض اصطلاحیں ثقیل معلوم ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ طبیعت ان کی عادی نہیں ہے لیکن خیالات کی طرح مصنف کی زبان بھی بہت سلجھی ہوئی ہے۔ ہم یہ بات خاص طور پر تعریف کے قابل سمجھتے ہیں کہ فاضل مصنف نے علم کو خالص بنانے کی فکر میں اپنے زمانے کے حالات کو نظر انداز نہیں کیا ہے، اور اگرچہ انہوں نے وہ غیر جانب داری برتی ہے جو ہر عالم کے لئے ضروری ہے، حالات حاضرہ پر ان کی بحث بصیرت افروز ہے۔ روس، اٹلی اور جرمنی کی سیاسی و معاشی تحریکوں، ہندوستان کے لئے دستور (۱۹۳۵ء) اور سیاسی پارٹیوں کی تحت میں کانگرس اور مسلم لیگ کا ذکر کیا گیا ہے، اور

انھیں ابواب پر نظر ڈالنے سے پتہ چل جاتا ہے کہ فاضل مصنف کا نقطۂ نظر بہت معقول ہے اور انہیں دنیا کے کاروبار سے وہ دلچسپی اور لگاؤ ہے جو ایک اچھے استاد کو ہونا چاہئے۔ اس کے ساتھ ہی کتاب نہایت مستند بھی ہے، اور حاشیوں میں ایسی کتابوں کا حوالہ دیدیا گیا ہے جس سے فاضل مصنف نے مدد لی ہے اور جس سے ناظرین مزید تفصیلات معلوم کر سکتے ہیں۔ ان تمام صفتوں کا خیال رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ "یہ مبادی سیاسیات" علمی اور درسی کتاب کا ایسا نمونہ ہے جو اب تک کم دیکھنے میں آیا ہے۔

چند ہمعصر - از مولوی عبدالحق صاحب۔ مرتبہ شیخ چاند مرحوم تقطیع $\frac{22 \times 18}{8}$ حجم ۱۵۱ صفحہ کتابت، طباعت، کاغذ عمدہ قیمت درج نہیں، شائع کردہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد۔ دکن۔

یہ جناب مولوی عبدالحق کے ۱۴ مضامین کا مجموعہ ہے جو موصوف کے شاگرد رشید شیخ چاند مرحوم نے اپنی وفات سے کچھ دن پہلے مرتب کیا تھا۔ ان مضامین میں ہندوستان کے چند مشہور اور اور دو ایک غیر مشہور افراد کی سیرت پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ یہ سب لوگ کسی نہ کسی حیثیت سے اپنے اقران و امثال میں امتیاز رکھتے تھے۔ ان میں تین باکمال شعرا ہیں یعنی مولانا حالی، حضرت گرامی اور امیر مینائی پانچ جیّد علما ہیں یعنی مولوی چراغ علی، مولوی سید علی بلگرامی، مولوی عزیز مرزا، مولوی وحیدالدین سلیم، اور پروفیسر مرزا حیرت ایران کے ایک حاذق حکیم یعنی امتیازالدین مرحوم۔ چار رہبران قوم ہیں یعنی سیّد محمود مرحوم، نواب محسن الملک خواجہ غلام الثقلین اور مولانا محمد علی اور ایک غریب سپاہی ہے جس نے علم و فضل جاہ و منصب سے محروم ہونے کے باوجود اس زمرے میں جگہہ پائی ہے یعنی گدڑی کا لعل "نور خاں"۔ غرض یہ ایک مرقع ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی کا جس میں ہر رنگ کی بہترین تصویریں نظر آتی ہیں۔

سیرت نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ محقق بھی ہو اور مصوّر بھی، نقاد بھی ہو۔ اور مبصّر بھی اور اسی کے ساتھ ہمدرد بھی کیونکہ ہمدردی کے بغیر انسانی زندگی کا صحیح مطالعہ ناممکن ہے۔ فاضل

مصنف کی ذات ان صفات کی جامع ہے اس لئے انہوں نے حسب امید سیرت نگاری کا پورا حق ادا کر دیا ہے۔ اکثر اشخاص کے مفصّل ذاتی اور خاندانی حالات فراہم کئے گئے ہیں اور اُن کی تنقیح اور تصدیق میں ہر طرح کی احتیاط برتی گئی ہے۔ پھر اُن خاکوں میں رنگ بھرنے میں مصنف کے قلم نے موقلم کا کام کیا ہے اور ان کے جاں بخش انداز تحریر نے ان خاموش تصویروں میں جان ڈالدی ہے خصوصاً مولانا حالی اور نور خاں کے حالات کو پڑھ کر پڑھنے والے کو دھوکا ہو جاتا ہے کہ اس نے ان بزرگوں کو کبھی نہ کبھی دیکھا ہے۔ ہندوستان کے سیرت نگاروں کی سنت کے خلاف کسی شخص کے محاسن کے بیان کرنے میں مبالغہ سے کام نہیں لیا گیا۔ یہاں تک کہ جن حضرات سے مصنف کو انتہائی عقیدت ہے ان کی تعریف میں بھی ضبط و اعتدال کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ جس میں جو کمزوریاں تھیں وہ بھی بے لاگ بیان کر دی ہیں لیکن عموماً خشونت اور بے دردی سے نہیں بلکہ نرمی اور ہمدردی سے۔

مضامین کی ادبی حیثیت کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب اپنے اسلوب کے بادشاہ ہیں۔ معانی کے وزن کو عبارت کی سلاست اور متانت کو شگفتگی کے ساتھ سمونا ان کا حصّہ ہے اور یہ کتاب اِس کی ایک روشن مثال ہے۔

اسلامی ہند پر ایک نظر۔ از محمد شیب خاں صاحب فیروز۔ تقطیع $\frac{22\times 28}{8}$۔ حجم ۱۰۴ صفحہ کتابت طباعت اچھی، کاغذ اوسط درجہ کا۔ قیمت ۸ر

ملنے کا پتہ قومی دارالاشاعت۔ برلہ۔ ضلع علی گڈھ۔

اس رسالہ کا موضوع یہ ہے کہ "ہندوستان کے مسلمان اس وقت کس مقام پر ہیں اور کیا کر رہے ہیں یعنی ان کی سیاسی حالت اور ان کا سیاسی عمل کیا ہے۔ اس کی اصل کی وجہ یہ ہے کہ غدر کے بعد ان کی دلچسپی کا مرکز ہندوستان سے اسلامی ممالک کی طرف منتقل ہو گیا اور ان کی سرگرمیاں اسی خارجی سیاست تک محدود ہیں۔ حالانکہ حقیقی سیاسی زندگی وطن پر مبنی اور وطن کی پابند ہونی چاہئے۔ اگر مسلمان اب بھی اپنا سیاسی نظریہ بدل کر ہندوستان کی کو اپنا نصب العین بنالیں تو ان کی بے حسی، بے عملی اور نا اتفاقی دور ہو جائے۔ اور جو

احساس کمتری ان میں خواہ مخواہ پیدا ہوگیا ہے وہ جاتا رہے"۔ رسالہ کا انداز تحریر خطیبانہ ہے۔ لیکن اس کے مضامین واقعات کے مشاہدے اور غور وفکر کا پتہ دیتے ہیں۔ جو لوگ سیاسی مسائل سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے اس کا مطالعہ مفید اور محرک خیال ثابت ہوگا۔

دنیائے تبسم۔ از حضرت شوکت تھانوی حجم ۲۱۶ صفحہ تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$ لکھائی چھپائی معمولی کاغذ عمدہ قیمت عہ/ر۔ شائع کردہ حالی پبلیشنگ ہاوس کتاب گھر دہلی۔

حضرت شوکت تھانوی کے مزاحیہ مضامین دنیائے اردو میں بہت مقبول ہیں۔ یہ نیا مجموعہ سلسلۂ "تبسم" کی ایک نئی کڑی ہے۔ جو لوگ طوفان تبسم وغیرہ پڑھ چکے ہیں۔ انھیں" دنیائے تبسم" کے پڑھنے سے یہ اندازہ ہوگا کہ مصنف کا آرٹ برابر ترقی کر رہا ہے۔ ظرافت کے پردے میں ہندوستانی معاشرت پر تنقید کرنے کا جو طریقہ شوکت صاحب نے نکالا ہے اس میں انہیں اپنے ہم عصروں سے زیادہ کامیابی ہوئی ہے۔ طنز کی تلخی کو وہ خوش طبعی کی شیرینی سے اس قدر کم کر دیتے ہیں کہ دوا آسانی کے ساتھ حلق سے اتر جاتی ہے۔ اور پورا اثر کرتی ہے۔ مبالغے کے برتنے کا انہیں خاص سلیقہ ہے ان کا مبالغہ حقیقت کے خط وخال کو مٹنے نہیں دیتا۔ صرف اس کے مضحک پہلو کو نمایاں کر دیتا ہے۔ "مقروض" "لکھنو کا گانگریس سیشن" "مرحومہ" "اختلاج" اس مجموعے کے سب سے کامیاب مضامین ہیں "مینا رگبند" اور "شہوت" کتاب کے عام معیار سے کسی قدر پست ہیں۔ پہلا مضمون ایک پھبتی کہنے کے لئے لکھا گیا ہے دوسرے میں نرا مبالغہ ہے اور کوئی "بات" پیدا نہیں ہوتی۔ "فلم فوجدار" کا آغاز طنزیہ انداز کا عمدہ نمونہ ہے لیکن یہ انداز آخر تک نہیں نبھ سکا۔ اور آگے چل کر بحث بالکل سنجیدہ ہوگئی ہے۔ لیکن عبارت کی روانی، طرز بیان کی دلآویزی، بے تکلف شگفتگی اور بے تصنع شوخی سے کوئی مضمون خالی نہیں اور مجموعی طور پر یہ کتاب شوکت صاحب کی بہترین تصانیف میں شمار کی جاسکتی ہے۔ جناب رشید احمد صاحب صدیقی کے مقدمے نے جس میں متانت اور ظرافت آپس میں آنکھ مچولی کھیلتی ہیں۔ کتاب کے لطف میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔

رفتارِ عالم

ممالکِ غیر

ہسپانیہ اور چین ہسپانیہ کی خانہ جنگی جاری ہے۔ لیکن دونوں فریق، ان کی حامی اور غیر جانب دار یا عدم مداخلت کی خواہشمند ریاستیں اس طویل جنگ سے عاجز آگئی ہیں۔ حال میں تیروئیل کے مقام پر باغی فوجیں پس پا کردی گئی ہیں۔ باغی اگر یہ مورچہ سر کرلیتے تو حکومت کا فوجی محاذ ٹوٹ جاتا اور دارالسلطنت کو ولنشیا سے کہیں اور منتقل کرنا پڑتا۔ لیکن اس جنگ میں کوئی مقابلہ فیصلہ کن نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ معاملہ چکانا لڑنے والوں کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ ان لوگوں کے جو انہیں لڑا رہے ہیں۔

چین کی لڑائی بھی طول کھینچ رہی ہے۔ ٹسی نال اور ٹسنگ ٹاؤ فتح کرنے کے بعد سے سمجھنا چاہئے کہ دریائے یانگ ٹسے کے مشرقی حصے، اور اس دریا سے لیکر شمالی دیوار تک سارے ملک پر جاپانیوں کا قبضہ ہو گیا ہے، اور سوا ایک ذرا سے ٹکڑے کے جو کانٹون اور ہانکاؤ کو ملاتا ہے چین کی تمام ریلوے لائنیں جاپان کے تصرف میں آگئی ہیں۔ جاپانی اس وسیع علاقے میں "جاپان دوست" حکومت قائم کرنے کی تدبیریں کر رہے ہیں۔ اور ان کی طرف سے اعلان کیا جاچکا ہے کہ وہ اس انتظام میں کسی غیر قوم کی دخل اندازی گوارا نہ کریں گے۔

جاپانیوں کا اب بھی یہ دعوے ہے کہ وہ چین پر لشکر کشی نہیں کر رہے ہیں۔ ان کی ساری کارروائی مدافعانہ ہے۔ پھر کیا تعجب ہے جو انہوں نے ۱۲ جنوری کے ایک اعلان میں یہ کہا کہ جنگ کا جاری رہنا یا ختم ہوجانا مارشل چیانگ کائی شک کے رویئے پر منحصر ہے اور وہ خود جنگ کے لئے تیار ہیں اور صلح و آشتی سے سمجھوتا کرنے پر بھی آمادہ۔ ان کے مطالبات اب بھی وہی ہیں جو جنگ سے پہلے تھے۔ یعنی یہ کہ چین پر ان کا معاشی اور سیاسی تسلط ہوجائے، چاہے نام کو حکومت چینی ہو۔ اور اگر چینیوں کی غیرت ایسی شرط منظور کرنا گوارا کرتی تو وہ لڑائی کی مصیبت کیوں جھیلتے۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ مارشل چیانگ کائی شک

اور ان کے ساتھ چینی قوم اور بھی سرکش ہو جائے گی۔ چینی حکومت نے روس اور امریکہ سے اسلحہ اور بہت سا ضروری سامان جنگ خریدا ہے۔ ڈاکٹر سن یاٹ سن کے لڑکے مسٹر فو غیر معمولی سفیر بن کر ماسکو گئے ہیں اور جاپان کی مخالفت نے چیانگ کائی شک اور مغربی چین کے کمیونسٹ سپہ سالاروں میں جو اتحاد کرا دیا تھا وہ اب اپنا پھل لا رہا ہے۔ یہ سنا گیا ہے کہ بیرونی منگولیا میں روسی کوشش کر رہے ہیں کہ جاپانی اثرات پر غلبہ حاصل کر لیں۔ ہانکاؤ میں اس وقت سو روسی پائلٹ (ہوائی جہاز چلانے والے) مع اپنے جہازوں کے موجود ہیں، اور چینی بیانات کے مطابق اس زمانے میں ان کے ہوائی جہازوں نے جاپان کو خاص نقصان پہنچایا۔

جاپانی اس جنگ کی ہر مہم میں کامیاب ہوئے ہیں۔ لیکن اگر چینی لڑائی پہ تُلے رہیں تو یہی کامیابی جاپانیوں کی شکست کا سامان بن سکتی ہے اگر چینی قزاقانہ جنگ کا طریقہ اختیار کریں اور انہیں باہر سے تھوڑی بہت مدد ملتی رہے تو جاپانیوں کی جان پر بن آئے گی اور ان کی حکومت غالباً دیوالیہ ہو جائیگی انہوں نے لڑائی یہ سمجھ کر شروع کی تھی کہ چینی بالکل مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ قبل اس کے کہ کوئی تیسرا فریق درمیان میں پڑ سکے۔ لیکن چینیوں کی ہمت ہر شکست کے بعد بڑھتی نظر آتی ہے۔ مغربی قومیں تو بے شک وہی غیر جانب داری برت رہی ہیں جس پہ جاپانیوں نے بھروسا کیا تھا۔ یعنی جاپان ان سے جو کچھ چاہے خرید سکتا ہے۔ اور چین کے لئے خرید و فروخت پر کوئی قید نہیں تو آمد و رفت کے دروازے قریب قریب بند ہیں۔ پھر بھی بہت ممکن ہے کہ جاپان کی یہ شکایت کہ امریکہ سے سامان چین کے اندر پہنچایا گیا ہے۔ صحیح ہو۔ اور مغربی قومیں یہ دیکھ کر کہ جاپان نہ جلدی سے کامیاب ہوتا ہے نہ ان کی غیر جانب داری کا احسان مانتا ہے۔ چین کو چوری چھپے مدد پہنچا کر جاپان کو اتنا حیران کریں کہ وہ سیاست کے آداب برتنے پر مجبور ہو جائے اور سارا شکار خود ہی کھا جانے کا بیہودہ حوصلہ نہ کرے۔

جاپان اور مغربی ممالک۔ جاپانیوں نے لڑائی شروع ہوتے وقت جو وعدہ کیا تھا کہ وہ چین میں دوسری قوموں کے حقوق اور اغراض کا لحاظ کریں گے۔ اس پر شاید کسی کو اعتبار نہ تھا۔ لیکن اعتبار کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا اب جو جاپان نے رفتہ رفتہ جتا دیا ہے کہ وہ اپنی چینی حکومت اور سیاست کو شراکتی کمپنی کی شکل نہ دے گا۔ تو کسی کو کچھ بنائے نہیں بنتا۔ جاپانی سپاہیوں اور ہوائی جہازوں نے

امریکیوں اور انگریزوں کے ساتھ جو زیادتیاں اور گستاخیاں کیں ان کی معافی جاپانی حکومت نے فوراً مانگ لی۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ یہ زیادتیاں ان ملکوں کا درجۂ حرارت معلوم کرنے کے لئے کی گئی ہوں۔

اب دیکھنا ہے کہ برطانیہ اور امریکہ کی صلح پسندی جاپانیوں کی جسارت کو کہاں تک برداشت کرے گی۔ چین میں مغربی قوموں میں سب سے زیادہ سرمایہ انگریزوں کا ...... لگا ہوا ہے اور حیثیت قائم رکھنے کی ضرورت سب سے زیادہ انہیں کو ہے اب تک انگریز اپنی کمزوری کو دوستی کے پردے میں چھپاتے رہے ہیں، لیکن جاپان ان کو دبتے دیکھ کر اور دبا رہا ہے۔ ہانگ کانگ کے انگریز گورنر نے حال میں ایک اعلان کے ذریعے یقین دلایا ہے کہ شہر اور جزیرہ بالکل خطرے میں نہیں ہے اور معلوم ہوتا ہے فی الحال جاپان نے جنوبی چین پر سمندر یعنی ہانگ کانگ اور کانٹون کی طرف سے حملہ کرنے کی مہم ملتوی کر دی ہے۔ مگر جاپانی جہازوں نے ہانگ کانگ سے کانٹون کا رستہ بند کر دیا ہے اور رہا ہانگ کانگ انگریزوں کے پاس رہا بھی تو اس سے انہیں کوئی فائدہ نہ ہو سکے گا۔ اب انگریزی اخبار سنگاپور کے بحری مرکز کی اہمیت اس انداز سے جتا رہے ہیں کہ ہانگ کانگ چھوڑ دینے میں کوئی خاص مال یا حیثیت کا نقصان نہ معلوم ہو۔

فاشسٹ اتحاد۔ نومبر ۱۹۳۶ء میں جرمنی اور جاپان کے درمیان "اینٹی کومنٹرن" معاہدہ ہوا تھا۔ جس میں کومیونزم کی مخالفت کا بیڑا اٹھایا گیا تھا۔ پچھلے نومبر میں اٹلی بھی اس اتحاد میں شامل ہو گیا، اور نئے سال کا تحفہ یہ ہے کہ آسٹریا، ہنگری اور رومانیہ بھی اس میں شریک ہو گئے ہیں۔ رومانیہ میں پہلی جنوری کو فاشسٹ حکومت بھی قائم ہوئی۔ اس طرح نازیوں نے ایک بڑی مہم جس میں انہیں کئی بار ناکامیابی ہوئی تھی۔ آخر کار سر کر لی۔ رومانیہ کے انقلاب اور فاشسٹ اتحاد میں نئے ارکین کے اضافے سے یورپی سیاست کی بے چینی اور بڑھے گی۔ اس لئے کہ یہ اتحاد نام کو تو عقیدے کا اتحاد ہے۔ لیکن یہ بھلا کیسے ممکن ہے کہ اس میں اور کوئی بھید نہ ہو۔

ڈینیوب کی وادی۔ آسٹریا، ہنگری اور رومانیہ کے فاشسٹ اتحاد میں شامل ہو جانے سے تمام ملکوں کی سیاست پر بڑا گہرا اثر پڑے گا۔ جو دریائے ڈینیوب کی وادی میں واقع ہیں۔ یعنی ان تین ملکوں کے علاوہ

چکوسلواکیا، یوگوسلافیہ اور بلغاریہ۔ جنگ عظیم کے بعد سے یہ تمام ملک اس فکر میں ہیں کہ اپنے خام مال کی نکاسی کا انتظام کریں اور ساتھ ہی یہ بھی چاہتے ہیں کہ اپنی صنعت کو فروغ دیں اور مصنوعات کے لئے غیروں کے دست نگر نہ ہوں۔ آپس میں یہ خام مال کا تبادلہ کر نہیں سکتے۔ اس لئے کہ سب میں پیداوار قریب قریب ایک ہی طرح کی چیزوں کی ہے، جرمنی اور اٹلی جو ان کا خام مال خرید نے پر تیار ہیں یہ شرط لگاتے ہیں کہ اس کے معاوضے میں ان کی مصنوعات لی جائیں۔ اگر یہ ریاستیں فرداً فرداً تبادے کا ایسا انتظام کرنے کی کوشش کرتیں ہیں کہ ایک دوسرے کی کمی پوری کریں تو وہ قومیں جنھیں اب تک خاص تجارتی حقوق حاصل تھے اور سب سے زیادہ جرمنی اور اٹلی اس پر اعتراض کرتے ہیں اور ان کے قطع تعلق بھی نہیں کیا جاسکتا۔

دوسری طرف جرمنی اور اٹلی دونوں تجارتی تعلقات کے ساتھ ڈینیوب کی ریاستوں سے سیاسی راہ رسم بھی بڑھانا چاہتے ہیں، تاکہ جنگ کی حالت میں غلے اور دوسری خورونوش کی اشیا حاصل کرنے میں دشواری نہ ہو۔ خام مال کے خریداروں کی حیثیت سے انکے مقابلے کا اور کوئی نہیں، اور چکوسلواکیا کے سوا ڈینیوب کی ریاستوں میں کسی کو لیگ یا برطانوی فرانسیسی اتحاد کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں، اس لئے اگر اور کسی طرح رکاوٹیں نہ ہوں تو جرمنی، اٹلی اور ڈینیوب کی ریاستیں ایسا سیاسی اور معاشی اتحاد قائم کرسکتی ہیں جو صلح اور جنگ کی حالت میں سب کے لئے یکساں طور پر مفید ہو۔ آسٹریا۔ ہنگری اور رومانیہ کا "اینٹی کومنٹرن" معاہدے میں شریک ہونا وسط یورپ کے ایسے ہی اتحاد کا پیش خیمہ ہوسکتا ہے۔

لیکن یہ اتحاد چکوسلواکیا کے لئے موت کا پیغام ہوگا۔ کیونکہ وہاں کی جرمن اقلیت نازی حکومت کی ہمدرد ہے اور ہنگامہ آرائی کے لئے بے چین۔ پولینڈ کے لئے بھی یہ اتحاد کچھ کم خطرناک نہ ہوگا۔ اب دیکھنا ہے کہ یہ دونوں ریاستیں، جو صلحنامہ ورسائی کی بدولت وجود میں آئیں اور جس کا بین الاقوامی سیاست میں خاص مصرف یہ تھا کہ جرمنی کا بازو مارتی رہیں۔ برطانیہ، فرانس اور لیگ سے کتنی مدد حاصل کرسکیں گی۔

برطانیہ اور آئرلینڈ ۔ برطانیہ کے لئے یوں بھی پریشانی کے کون کم اسباب تھے جب اٹلی اسے بحر روم سے اور جاپان مشرق بعید سے بے دخل کرنے کا درپے ہے، اور اب آئرلینڈ نے ایک نئی مشکل پیدا کردی

ہے۔ آئرلینڈ کی "آزاد ریاست" کی معاشی زندگی کا دارومدار اس پر ہے کہ انگلستان سے تبادلے کا ایسا انتظام ہو جائے کہ جس سے آئرلینڈ کو تمام ضروری اشیاء ملتی رہیں مگر اس کی مجبوریوں سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا جائے اسی طرح آئرلینڈ کی سیاسی اور تمدنی آزادی کا دارومدار اس پر ہے کہ انگریز اسے کمزور جان کر دبا نہ سکیں نئے دستور میں جو حال میں شائع ہوا ہے برطانیہ کے بادشاہ کی وہ رسمی حیثیت جس کی انگریز بڑی قدر کرتے ہیں سمجھنا چاہیئے مٹا دی گئی ہے، اور شاید اسی حملے کے جواب میں پارسال شہنشاہ جارج ششم کو السٹر کا سفر کرنے کی زحمت دی گئی۔ السٹر کا صوبہ آئرلینڈ کی آزاد ریاست سے الگ ہے، کیونکہ یہاں آبادی نسل، مذہب اور سیاسی خیالات کے اعتبار سے آئرلینڈ کے باقی باشندوں سے بالکل مختلف ہے۔ اب آئرلینڈ کے صدر مسٹر ڈے ویلیرا اس تفریق کو مٹانا اور السٹر کو آئرلینڈ کی ریاست میں شامل کر دینا چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ ۱۹۲۲ء میں السٹر کو انگریزوں نے اسی غرض سے علیحدہ رکھنے پر اصرار کیا تھا کہ ان کا آئرلینڈ پر دباؤ رہے۔ مسٹر ڈے ویلیرا کی تجویز ہے کہ السٹر اور "آزاد ریاست" کو ملانے کے لئے ایک وفاق قائم کیا جائے اور ایسے کسی اتحاد کے لئے کچھ عرصے سے پروپگینڈا بھی ہو رہا ہے۔ اسی مسئلے کو طے کرنے کے لئے السٹر کے گورنر نے وہاں کی پارلیمنٹ کو برخاست کر کے نئے انتخابات کا حکم دیا ہے اور اسی پر گفتگو کرنے کے لئے مسٹر ڈے ویلیرا ۱۵ جنوری کو لندن آئے۔ اس گفتگو کا نتیجہ ابھی تک معلوم نہیں ہوا ہے۔ لیکن انگریزی اخباروں نے تمہید کے طور پر یہ کہنا شروع کیا ہے کہ مسٹر ڈے ویلیرا السٹر اور "آزاد ریاست" کے اتحاد پر اصرار نہ کریں گے اور اس سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً وہ اصرار کریں گے۔

مسٹر ڈے ویلیرا ابھی ایک بڑے معاملے میں برطانوی سامراج کی ایک سیاسی رسم کو توڑ چکے ہیں۔ اٹلی نے جولائی ۱۹۳۷ء میں آئرلینڈ کی کونسولیٹ کو سفارت میں تبدیل کر دیا، یعنی آئرلینڈ کو آزاد اور برابر کی حیثیت رکھنے والی ریاست تسلیم کیا۔ اس تعظیم کے جواب میں مسٹر ڈے ویلیرا نے دسمبر میں فیصلہ کیا کہ آئرلینڈ بھی ایک سفیر اٹلی کے دربار میں بھیجے۔ سفیر اسی وقت بھیجا جا سکتا ہے جب آئرلینڈ اٹلی کے بادشاہ کو حبش کا شہنشاہ تسلیم کرے، جو کہ برطانیہ نے ابھی تک نہیں کیا ہے۔ اور انگریز اس پر بہت "افسوس" کر رہے ہیں کہ آئرلینڈ کے صدر نے ایسے معاملے کا برطانیہ سے مشورہ لئے بغیر فیصلہ کر لیا۔ لیکن آئرلینڈ کے صدر بہت ہوشیار

اور تجربہ کار آدمی ہیں اور برطانیہ کی سیاست کو خوب سمجھتے ہیں۔ ان کا مقصد انگریزوں پر اپنی آزادی اور اپنا اختیار جتانا ہے، اور اس کو جتا کر ہی وہ اپنا اصل مطلب حاصل کر سکیں گے۔

اسلامی دُنیا

عراق۔ ۲۳ دسمبر کو عراق کی نئی پارلیمنٹ کا پہلا اجلاس ہوا انتخاب میں موجودہ حکومت کے حامی ہی بیشتر کامیاب رہے ہیں۔ مرحوم بکر صدقی کے زمانہ میں جن سیاست دانوں نے جان کی سلامتی اسی میں سمجھی تھی کہ بغداد سے دُور دمشق اور قاہرہ میں اپنے آپ کو بچا کرے جائیں۔ انتخاب کی سُن کر وطن واپس لوٹے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ عراق کے بے تاج بادشاہ یٰسین کی بے وقت موت نے نوری سعید کے لئے راہ صاف کر دی ہے۔ اور اب عراق کی کشتی کے ناخدا یہی بزرگ ہوں گے۔ نوری سعید پاشا فیصل مرحوم کے پرانے ساتھیوں میں سے ہیں۔ اور نہایت اچھے قسم کے برطانیہ دوست واقع ہوئے ہیں۔ اس امید سے عراق کے برطانی حلقوں کو ڈھارس بندھی تھی ورنہ اگر بکر صدقی زندہ رہتے تو برطانی اعلیٰ افسر جو تمام شعبوں پر بری طرح چھائے ہوئے ہیں اب تک کبھی کے نکال دیئے گئے ہوتے۔

انتخابات ہوئے، نوری سعید پاشا بھی شرکت کے لئے دمشق سے پہنچ گئے۔ عام طور پر یہی سننے میں آتا تھا کہ نئی وزارت کے بنانے کا سہرا انہی کے سر رہے گا لیکن انتخابات کے فوراً بعد موصوف چپکے سے بغداد سے چلدیئے۔ اور لوگوں کو اس وقت آپ کے سفر کا پتہ چلا جب موصوف بخیر و سلامتی دمشق کے ہوائی اسٹیشن پر پہنچ گئے، کہتے ہیں نوری سعید بھی بکر صدقی کی طرح فوج کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش میں تھے۔ اور جب آپ نے راز افشا ہوتے دیکھا تو فرار کو غنیمت جانا۔

مصر میں اگر طلبا سیاست پر حاوی ہیں تو یہاں عراق میں فوج، زمانہ کچھ اس طرح تیز چل رہا ہے کہ قوم کا نوجوان عنصر پرانے سیاست دانوں کی گرفت سے باہر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ نوجوان اور پھر عرب نوجوان ان کی طبیعتوں میں قرار کہاں، جذبات کی رو میں جدھر بہہ نکلے کون ہے جو انہیں سنبھال سکے۔ نتیجہ یہ ہے

کہ مصر میں گڑبڑ ہے تو عراق میں بھی خیر نہیں۔ کسی کو کچھ نہیں معلوم کہ کل کیا ہونے والا ہے یٰسین پاشا کی ہر دلعزیزی مسلّم تھی لیکن نوجوانوں کی شوریدہ سری دیکھیئے کہ اس بیچارہ کو وطن سے دور موت کی آغوش میں پناہ لینی پڑی۔ نحاس پاشا کے "زعیم اُمت" ہونے میں کسے شک ہو سکتا تھا لیکن جامعہ مصریہ کے طلبار نے اُس کی وہ دُرگت بنائی کہ توبہ بھلی اور ایک سرپھرے نوجوان نے تو موصوف کو ٹھکانے ہی لگانے کی ٹھان لی تھی فلسطین کا معرکہ بھی انہی نوجوانوں کے دم سے گرم ہے۔ ورنہ رہنماؤں کا بس چلے تو وہ برطانیہ سے فوراً صلح کرلیں۔ ان کو ڈر یہ ہے کہ اگر صُلح کا ہاتھ بڑھایا اور انگریز کی شرطیں مان لیں تو ہماری جان کی خیر نہیں۔ الغرض مشرق قریب کے ملکوں کا سیاسی مستقبل سب ان نوجوانوں کے ہنگامہ ہائے ہوسے وابستہ ہے، اس بے سری فوج کو اگر کوئی صحیح معنوں میں حقیقی رہنما مل گیا تو سمجھ لیجئے کہ عربوں کے دن پھر رہے ہیں۔ ورنہ اندیشہ یہ ہے کہ یہ کہیں آپس میں کٹ کٹ کر فنا نہ ہو جائیں۔

نئی پارلیمنٹ کا افتتاح شاہ غازی کی تقریر سے ہوا۔ پچھلے دنوں کے شور وشر اور قتل وغارت کے مقابلہ میں موجودہ امن وامان کی تعریف کرتے ہوئے شاہ غازی نے ملک کی عام ترقی کو سراہا، آپ نے فرمایا کہ موصل کے تیل کے چشموں سے جو حق مالکانہ کے طور پر حکومت کو رقم ملتی ہے، اس سے زراعت اور تعلیم کو بہتر بنانے میں بہت مدد مل رہی ہے، نئے کام اتنے شروع ہو رہے ہیں کہ بے کاری تو کجا کام کرنے والوں کی کمی ہو رہی ہے، دریاؤں پر پُل بن رہے ہیں۔ زراعت کے لئے پانی کے بڑے بڑے بندھ بنائے جائے رہے ہیں۔ ایران سے سرحد کے متعلق جو جھگڑا اچل رہا تھا وہ خوش اسلوبی سے طے ہو گیا اور اب چار سلطنتوں (ایران، ترکی، افغانستان اور عراق) کے دوستانہ معاہدہ نے آپس کے تعلقات کو اور استوار کر دیا ہے۔

اب تک تو عراق میں فوج کے بعد مزدوروں کا زور ہے جس ملک میں اجنبی سرمایہ داروں کے ہاتھ میں تمام کاروبار ہوں وہاں کے مزدور کیوں مطمئن ہونے لگے۔ اب تک تو یہ آگ اندر ہی اندر سلگ رہی ہے اور سیاسی ہنگاموں اور حکومت کی سخت گیری نے اسے ابھی سر اٹھانے کی فرصت نہیں دی لیکن مزدوروں کا مسئلہ اور اشتراکیت کا ہوّا عراق کی دُکھتی ہوئی رگ ضرور ہے پچھلے دنوں پارلیمنٹ

میں ایک رکن نے تقریر کرتے ہوئے حکومت پر اشتراکیت کی تائید کا الزام لگایا۔ اشتراکیت کا نام سنتے ہی ۱۱۵ ارکان نے ایوان نہیں آسمان سر پر اٹھالیا جلسہ میں وہ کھنڈت پڑی کہ صدر پارلیمنٹ سے بھی یہ طوفان بدتمیزی نہ تھم سکا۔ گلے تھک گئے تو مکوں سے بے دریغ کام لیا گیا۔ ایوان کیا تھا اسی ہنگامہ نے اُسے اچھا خاصہ دنگل بنادیا، بارے جوش کم ہوا تو ارکان نے اس "گستاخ رکن" کو قرار واقعی سزا دینے کا فیصلہ کیا۔ اور یہ طے کیا کہ وزارت پر اس غلط الزام لگانے کی پاداش میں اسے پارلیمنٹ کے اجلاس میں پہنچنے کی اجازت نہ دی جائے۔ عراقی نمائندوں کا غصہ اس بلا کا تھا کہ معافی مانگنے اور اظہار افسوس کرنے کے بعد بھی اس فیصلہ کو برقرار رکھنے پر اصرار ہوا۔

برطانی عراقی معاہدہ میں برطانیہ کے سامراجی استحکام کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ عراق بدقسمتی سے برطانی مقبوضات کی ہوائی شاہ راہ پر واقع ہے۔ اس لئے معاہدہ میں انگریزوں نے اس سرزمین میں اپنے ہوائی مرکز بنانے کی اجازت لے لی تھی۔ پہلے تو بغداد کے قریب ہی برطانی ہوائی مرکز تھا لیکن چونکہ پایۂ تخت کے بالکل پڑوس میں اجنبی سلطنت کے شکوہ وجلال کا مظاہرہ عراق کے "غیور وطن پرستوں" کو گراں گزرتا تھا اور از بسکہ برطانیہ عظمیٰ اپنے حلیفوں کے نازک جذبات کی قدردان ہے اس لئے اُس کے ارباب اقتدار نے بغداد سے بہت دُور اپنے لئے ایک جگہ ڈھونڈلی نیا ہوائی مرکز نہایت وسیع پیمانہ پر بنایا گیا ہے، اسلحہ کے گودام، جہازوں کے قیام گاہ حفاظتی فوج اور کارکن عملہ کے لئے بہتر سے بہتر جو انتظام ممکن تھا کیا گیا ہے۔ عراق کی آزادی سے تو کوئی انکار نہیں کرسکتا اور نہ مصر کو آزاد ماننے میں کسی کو تامل ہوگا لیکن جب آزاد ملکوں کی فضا برطانی طیاروں کے لئے وقف ہو اور اس کے ساحل آہن پوش جنگی جہازوں کے رزم گاہ ہوں۔ حکومت کے دفاتر میں سب کرتا دھرتا انگریز ہوں، فوج کی تربیت اور تعلیم اور اسلحہ کی فراہمی بھی ان کے سپرد ہو تو اگر مرحوم بکر صدقی اور احمد حسین مصری کی (سبز پوش تحریک کے رہنما) قسم کے نوجوان اپنے رہنماؤں کو نجات دہندہ وطن کی بجائے وطن فروش کہنے کی جرأت کریں تو اسے جرأت بے جا کہنا کہاں تک درست ہو سکتا ہے۔

مصر - وفد اور بادشاہ کی کشاکش آخر رنگ لا کر رہی اور پچھلے چھ مہینوں کے ہنگاموں کا نتیجہ یہ نکلا کہ وفد کے رہنما مصطفےٰ نحاس وزارت سے برطرف کر دیئے گئے اور پارلیمنٹ کو ایک ماہ کی چھٹی مل گئی، نئی وزارت وفد دشمن جماعتوں پر مشتمل ہے۔ بھلا اسے پارلیمنٹ کی وفدی اکثریت کیوں قبول کرنے لگی۔ ظاہر ہے کہ ایک مہینے کے بعد یا تو یہ پارلیمنٹ بالکل ہی ختم ہو جائے گی۔ یا کوئی دوسری وزارت وجود میں آئے گی۔

وفدی وزارت کیوں ٹوٹی؟ کہنے کو تو بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ وفدی حضرات سمجھتے ہیں اور ان کا سمجھنا تعداد کے اعتبار سے زیادہ بے محل بھی نہیں کہ مصر عبارت ہے وفد سے اور وفد مصر سے، دوسری تمام جماعتیں غدار اور وطن فروش ہیں۔ اور ان کا مصر کے نام پر بولنا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا، کہتے ہیں کہ جب ۱۸۸۱ء میں مصری قوم پرستوں نے قصر شاہی کے سامنے مظاہرہ کیا تو خدیو توفیق جھلا کر محل سے نکلا اور مصری قوم پرستوں کے لیڈر اعرابی پاشا سے پوچھنے لگا کہ تم کون ہو اور اس مظاہرے سے تمہارا کیا مطلب ہے، اعرابی پاشا نے جواب دیا کہ "میں مصر ہوں"۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ اس سرزمین میں جہاں کے بادشاہ اپنے آپ کو مصر تو کیا بندوں کا "ربکم الاعلیٰ" کہلوانے کے عادی تھے۔ ایک عامی مصری نے "میں مصر ہوں" کہنے کی جرأت کی۔

۱۸۸۱ء کو زمانہ بیت گیا، نہ مصری قوم پرست رہے اور نہ خدیوؤں کا غلبہ و اقتدار رہا۔ برطانی سامراج نے سب کو پیس کر رکھ دیا لیکن "میں مصر ہوں" کا نعرہ ہر مصری کے دل کو برابر گرماتا رہا۔ ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء کے دن آئے تو سعد زغلول نے پھر اسی نعرہ کو بلند کیا، نتیجہ یہ نکلا کہ ایک طرف مرحوم کو انگریزوں سے بھڑنا پڑا اور دوسری طرف بادشاہ اور بادشاہ پرست جماعتوں سے، آج بھی نقشہ ہے، توفیق نہ ہوا، فاروق ہو گئے اور فواد نہ ہوئے ان کے فرزند ارجمند ہو گئے۔

انگریز جانتا ہے کہ اگر آج یہ مصری بادشاہ کو غیر مصری کہہ کر اس کے اقتدار کو ختم کریں گے، تو دوسری زد لامحالہ اُن پر ہی پڑے گی۔ کیونکہ بادشاہ تو کسی نہ کسی طرح مصری بن بھی سکتا ہے۔ لیکن "جان بل" کے لئے سینگ کٹوانا ناممکن ہے۔

وفد کی غلطی یہ ہے کہ وہ مہینوں کی راہ پلوں میں طے کرنا چاہتے ہیں چنانچہ دوسرے ملکوں میں

جو باتیں بحث و مباحثہ سے حل ہو جاتی ہیں۔ یہاں ان کے لئے فرانسیسیوں کی طرح انقلاب کرنا پڑتا ہے ۱۹۳۰ء میں بھی نحاس پاشا پر یہی گذر رہی تھی۔ پارلیمنٹ سرتاسر وفدی تھی۔ موصوف نے دستور سے بادشاہ کے اختیارات ختم کرنے کی کوشش کی۔ بادشاہ کا اقتدار تو کیا ختم ہوتا، وزارت ختم ہو گئی اور پارلیمنٹ توڑ دی گئی۔ اور پورے چار برس تک وفدی بری طرح پٹتے رہے۔ اس مار پیٹ سے کچھ حاصل ہو جاتا تو مضائقہ نہ تھا لیکن ہوا یہ کہ اس جگ ہنسائی کے بعد وہ سب کچھ مان لیا جن سے پہلے انکار تھا۔ اور سر تسلیم خم کر کے انگریزوں کے صدقہ میں وزارت پائی۔ عقل و تدبر کی جگہ جذبات کی کارفرمائی کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

رونا تو یہ ہے کہ ۹۵ فی صدی مصری آبادی کی کسی کو بھی فکر نہیں اور جس مصر کی نمائندگی کا ہر ایک کو دعوے ہے، اس کی کوئی خبر نہیں لیتا۔ بیشتر فلاحین کی زمینیں اجنبی بنکوں کے پاس رہن ہیں۔ اُمرا مال میں مست ہیں۔ پڑھا لکھا طبقہ (آفندی) روزی کے چکر میں سرگرداں ہے۔ اہل دین پریشان ہیں کہ نوجوان شراب و جوا کی بھینٹ چڑھ رہے ہیں، اور عورتیں اور لڑکیاں یورپ پرستی میں دھن دولت اجنبی مصنوعات کی نذر کر رہی ہیں، آپ کو تعجب ہوگا کہ یہ خلفشار اور مصریوں کی جذباتی طبیعت آخر انقلاب کیوں نہیں ہوتا؟ یہ سب برطانیہ کے دم قدم کی برکت ہے کہ جذبات کا کھولاؤ صرف آپس کی دھینگا مشتی تک رہ جاتا ہے اور تھوڑے سے قتل و خون سے یہ بلا ٹل جاتی ہے یوں بھی مصر میں "وضع احتیاط" کا یہ حال ہے کہ نہ کوئی عام جلسہ ہو سکتا ہے اور نہ کوئی مظاہرہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ ہر دو قانون کی نظر میں جرم ہیں۔ کبھی کبھی تو مخالف رہنماؤں کو بغیر کسی "عذر شرعی" کے قاہرہ سے باہر جانے سے روک دیا جاتا ہے، ہاں "وضع احتیاط" کی تعزیرات میں یہ خیال رکھا گیا ہے کہ کہیں لوگوں کا دم نہ رکنے لگ جائے اور مجبوراً گریباں کو چاک کرنے تک نوبت نہ پہنچ جائے چنانچہ زبان کی تو نہیں قلم کی پوری آزادی ہے۔ اس آزادی کا ثمرہ یہ ہے کہ اخبارات کے ہاتھ سے نہ کسی کی آبرو محفوظ ہے اور نہ عزت ایک دوسرے کے خلاف وہ وہ غلاظت اچھالی جاتی ہے کہ خاک روب کو گھن آئے، یہ ہیں کرشمے برطانوی سامراج کے!

نئی وزارت کے صدر محمد محمود پاشا ہیں اور ان کے دست راست صدقی پاشا، ان دونوں کے منہ کو پہلے ہی ڈکٹیٹری کا لہو لگ چکا ہے، اگر خلیفہ سلطنت (برطانیہ) کی طرف سے اذن مل گیا تو آپ عنقریب سُن لیں گے کہ پارلیمنٹ بالکل ختم ہوگئی اور نئی وزارت نے قانون سازی کا بار بھی خود ہی سنبھال لیا۔ بادشاہ بیچارا قانوناً بالغ سہی لیکن عقل کے اعتبار سے تو ابھی نابالغ ہی ہے، ہاں اس کو علی ماہر پاشا جیسا آدمی سرپرست مل گیا ہے۔ پاشائے موصوف سیاسی جوڑ توڑ میں بہت نام پیدا کر چکے ہیں اور رائے عامہ ان سے اتنی خفا بھی نہیں کیونکہ یہ پردے کی دوسری طرف آنے کے زیادہ قائل نہیں، ایک فریق تو یہ ہوا۔ دوسرا فریق محمد محمود اور صدقی کا ہے۔ ابھی زیادہ دن نہیں گذرے کہ ان میں سانپ اور نیولے کا بیر تھا لیکن اب تو یہ ایک ہی معلوم ہوتے ہیں، تیسرا فریق وفدیوں کا ہے۔ اب ہوگا یہ کہ ان تینوں میں رسہ کشی ہوگی اور ظاہر ہے اسی میں برطانیہ کا بول بالا رہے گا۔

ایران ۔ شیعہ اور سُنی کا جھگڑا کوئی آج کا تو ہے نہیں پر ہماری قوم کے دور انحطاط میں اس نے جو ناگوار شکل اختیار کی ہے کونسا سمجھدار مسلمان ہے۔ جو اسے اچھی نظر سے دیکھتا ہوگا۔ جب تک قوم میں زندگی تھی، اس قسم کے جھگڑے جنگ کے میدانوں میں نمٹ جاتے تھے۔ لیکن جب قوم اپاہج ہوگئی اور اقتدار کی باگ مسلمانوں کے پیشہ ور فوجی جماعتوں کے ہاتھ میں آگئی تو علماء نے شیعہ اور سنی کے اختلافات کو اپنا شغل خاص بنالیا۔ قوم کا اخلاقی معیار گر چکا تھا اور تہذیب خلوص نیت اور تزکیہ نفس کی بجائے محض ذاتی اغراض اور سیاسی دھڑا بندیوں کا آلہ کار تھا ہوا یہ کہ ان علمی بحثوں اور مذہبی مناظروں نے دلوں میں وہ ناسور پیدا کر دیئے کہ ان کا زہر ہمارے قومی جسم کی نخ نخ میں سرایت کر گیا۔ جب انیسویں صدی کے آخر میں یورپی سامراج کی لوٹ نے مسلمانوں کو چونکا دیا اور اپنی حالت کا جائزہ لینے کے لئے اپنے آگے پیچھے دیکھنے لگے تو اور قومی امراض میں انہیں شیعہ سنی کی دشمنی بھی نظر آئی، زمانہ کا تازیانہ سخت تھا، اور ملی مفاد کے لئے اتحاد امت ناگزیر، آخر دونوں طرف کے اہل تدبر کی طرف سے صلح و مودّت کی کوششیں کیوں نہ ہوتیں، وقت سازگار تھا، اختلاف کی خلیج آہستہ آہستہ پاٹی جانے لگی، جو گتھی تیرہ صدیوں کی علمی بحثوں اور جنگی معرکوں سے نہ سلجھی تھی اُسے مختصر سی مدت میں تقدیر

کے ناخن نے سلجھادیا، جنگ عظیم کے بعد عراق کے شیعہ اور سُنی بھائی بھائی بن کر اجنبی کے خلاف لڑے، اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ ایران بھی شیعہ اور سُنی کی تفریق کو مٹا رہا ہے۔

۱۹۳۱ء کے آخر میں یا ۱۹۳۲ء کے شروع میں بیت المقدس میں ایک موتمر ہوئی تھی جس میں تمام اسلامی ممالک کے نمائندے اور مقتدر رہنما شریک تھے۔ یہ اپنی قسم کی پہلی موتمر تھی جس میں مسلمانان عالم ایک ملت کی شکل میں نظر آئے۔ شیعی دنیا کے مجتہد اعظم بھی اس موتمر میں شریک تھے، ایک نماز میں دنیا نے دیکھا کہ مجتہد اعظم امام ہیں اور ان کے پیچھے تمام فرقوں کے علماء کبار کھڑے ہیں۔ اسی سے متاثر ہو کر ایک صاحب نظر مسلمان رہنما نے کہا تھا کہ جس اختلاف کی بنیاد اسلام میں آج سے تیرہ سو برس قبل پڑی تھی۔ آج اس کو ختم کرنے کی طرح ہم نے اس ارض پاک میں ڈال دی ہے،

ایران کی تازہ اطلاعات سے معلوم ہوا ہے کہ حکومت نے شیعہ سُنی کی تفریق قانوناً منع کر دی ہے اور یہ فرمان جاری کر دیا ہے کہ کوئی ایرانی اپنے آپ کو شیعہ یا سُنی نہ لکھے۔ تعزیہ داری کے سلسلہ میں جو بیہودہ رسوم داخل ہو گئی تھیں ان کو قطعی طور پر روک دیا ہے اور آئندہ سے ان کاموں کے لئے سرکاری خزانے سے امداد دینے کا طریقہ بھی منقطع کر دیا ہے، حکومت نے اعلان کیا ہے کہ ان رسوم پر جو اسراف ہوتا تھا وہ اب تعلیم کی مد میں صرف ہوگا، آل محمد صلعم کی محبت کا کون مسلمان ہے جو منکر ہو سکتا ہے لیکن اس محبت کا مظاہرہ گھناؤنے طریقوں سے ہوتا ہے ان کو نہ علماء شیعہ پسند کرتے ہیں اور نہ عام سمجھدار مسلمان،

اسلامی ممالک میں عموماً اور مصر میں خاص طور پر اہل علم کے حلقوں میں فقہ اسلامی کی اہمیت اور اس کی ضرورت پر غور و خوض ہو رہا ہے۔ اور خود دار قوم دوسروں کے بنائے ہوئے قوانین پر کب تک مطمئن رہ سکتی ہے پچھلے دنوں مصر میں ایک صاحب نے اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا کہ موجودہ زندگی کی ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے ہم جب فقہ اسلامی میں تہذیب و تجدید کی کوشش کریں تو فقہ کے اور مذاہب کے افکار و آثار کے ساتھ ساتھ اہل یمن کے زیدیوں اور اثنا عشریہ اول کی فقہ کو بھی پیش نظر رکھیں۔ قیاس غالب یہ ہے کہ ملت اسلامی کا یہ رجحان اسلامی فرقوں کی باہم آویزش کو بالکل ختم کر دے گا۔ اور مسلمان اپنی تاریخ کی عظمت اور اس کی قابل تقلید روایات کو ملی نقطۂ نظر سے دیکھنا

ہندوستان

ہندوستان کی مالیات کا مسئلہ ۔ ۲۰ اور ۲۱ جنوری ۱۹۳۸ء کو دہلی میں ہندوستان کے تمام فائنینس منسٹروں کی ایک خاص کانفرنس مرکزی حکومت کے وزیر مالیات کی صدارت میں منعقد ہوئی ۔ اس کانفرنس میں کچھ بحث ومباحثہ ہوا اس کی تفصیلی اور مستند روئداد تو اخباروں میں شائع نہیں ہوئی ۔ البتہ نمائندہ اخبار نے جب ایک وزیر مالیات سے ملاقات کی تو انہوں نے کانفرنس کے متعلق اپنے تاثرات بتائے کہا کہ ہم آپنے درمیان اختلاف رکھنا منظور کرلیا ہے ۔

یہ جواب بہت دلچسپ ہے لیکن پھر بھی یہ معلوم کرنے کو طبیعت چاہتی ہے کہ اس کانفرنس کی ضرورت کیوں پیش آئی اور اس میں کن باتوں پر ایسا شدید اور بنیادی اختلاف ہوا کہ بغیر کسی سمجھوتہ کے سب فریق اختلاف جاری رکھنے پر راضی ہوگئے اخبار کے نمائندے نے کچھ کھوج لگانے کی کوشش کی چنانچہ اس نے خبر دی کہ اختلاف اس بات پر تھا کہ مرکزی اور صوبجاتی حکومتوں کے کیا حدود ہونے چاہئیں ۔ نئے ایکٹ کے ماتحت پوزیشن مبہم ہوگئی ہے اور بہت ممکن ہے کہ دستور ہند کے نقشہ نمبر ۲ میں "اشیاء کی فروخت کے محاصل" کا جو فقرہ درج ہے اس کی صحیح تفسیر وتعبیر کے لیئے فیڈرل عدالت تک جانے کی نوبت آئے اسی طرح کچھ وزیروں نے اس بات پر زور دیا کہ جب تک صوبوں کو ٹیکسوں کی ان حدود میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی جو قانوناً مرکزی حکومت کے قبضہ میں ہیں اُس وقت تک صوبوں کی کوئی خاص آمدنی نہیں ہو سکے گی ۔ اس کے علاوہ کانفرنس میں بجلی اور تمباکو کے ٹیکس پر بھی غور کیا گیا اور چھوٹے چھوٹے صوبوں کی طرف سے مزید امداد کے لیئے مطالبہ پیش کیا گیا لیکن مرکزی حکومت کی طرف سے یہ بتایا گیا کہ اس مطالبہ کو منظور کرنا مشکل ہے ۔

اس مسئلہ کے بارے میں ہماری رہنمائی کا دوسرا ذریعہ وزیر مالیات صوبہ سرحد کی تقریر ہے آپ نے مقامی ہندو کالج کے ایک مباحثہ میں حصہ لیا جس کا موضوع تھا ۔ آیا نئے آئین کے ماتحت صوبجات کے مالی ذرائع قومی تعمیر کے کام کیلئے کافی ہیں یا نہیں آپ نے اپنی تقریر میں ان مالی مشکلات کا تذکرہ کیا ۔ جن کی موجودگی میں آپ کے لئے قومی تعمیر کا کام وسیع پیمانہ پر کرنا سخت مشکل ہے آپ نے قومی تعمیر کے لیئے روپیہ حاصل کرنے کے چار طریقے بتائے ۔ ان میں پہلا طریقہ تخفیف کرنے کا ہے دوسرا جدید ٹیکس لگانے کا تیسرا مرکزی حکومت سے گرانٹ حاصل کرنے کا اور چوتھا قرض حاصل کرنے کا ۔ آپ نے بتایا کہ تخفیف اس لیئے نہیں کی جاسکتی کہ سرکاری ملازموں کی تنخواہیں جدید آئین کی رو سے محفوظ ہیں نیا ٹیکس لگانا بھی سخت مشکل ہے ، کیونکہ لوگ غریب ہیں اور ملک میں اس وقت ٹیکس کا جو بوجھ ہے ۔ وہی بہت بھاری ہے ۔ اگر اور ٹیکس لگایا گیا تو سخت ایجی ٹیشن شروع ہوجائے گا ۔ مرکزی حکومت سے گرانٹ حاصل کرنے کا طریقہ بھی اختیار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ مرکزی حکومت ابھی تک غیر ذمہ دار ہے اور سر آٹو نیمیر کے ثالثی فیصلہ پر پانچ سال تک نظر ثانی نہیں کی جائے گی ۔ قرض البتہ لیا جاسکتا ہے لیکن قرضہ کے بھی حدود ہیں اور ایسا قرض دینے والا

کوئی نہیں ملتا جو دے کر بھول جائے اور سود اور اصل کا کبھی مطالبہ نہ کرے۔

اخبار کے نمائندہ کی قیاس آرائیوں اور زیر سرحد کے ان اشاروں سے تھوڑا بہت اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کانفرنس کے بحث و مباحثہ کی نوعیت کیا رہی ہوگی لیکن اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو سمجھنے کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں جدید دستور کی ان دفعات کا خلاصہ جو مالیات سے متعلق ہیں اور سر آٹو نیمیر کے ثالثی فیصلہ کے اہم اقتباسات کو یہاں پیش کر دیا جائے۔

دستور ہند میں مالی دفعات - سب سے پہلے ہم ٹیکسوں کی ان حدود کو لیتے ہیں جنھیں جدید دستور نے فیڈرل اور صوبوں کی حکومتوں کیلئے مقرر کیا ہے۔

فیڈرل ٹیکسوں کی فہرست میں مندرجہ ذیل عنوانات شامل ہیں:-

تمباکو اور دوسری ایسی اشیاء پر محصول جو ہندوستان میں بنائی یا پیدا کی جاتی ہیں۔ اکسایز کے محاصل لیکن ان میں مندرجہ ذیل شامل نہیں ہیں -

(i) آدمیوں کے استعمال میں آنے والی الکوہل کی شراب۔

(ii) افیون بھنگ اور دوسری نشہ لانے والی دوائیں اور اشیاء

(iii) ایسی دوائیں یا زینت کے سامان جن میں الکوہل یا کوئی اور چیز جس کا نمبر (ii) میں ذکر کیا گیا ہے ملی ہوئی ہوں کارپوریشن ٹیکس۔ نمک پر ٹیکس۔ آمدنیوں پر ٹیکس لیکن اسمیں زراعتی آمدنی شامل نہیں۔

پونجی کی سرمایہ دارانہ حیثیت پر ٹیکس جس میں افراد اور کمپنیوں کی زراعتی زمین شامل نہیں ہے -

کمپنیوں کے سرمایہ پر ٹیکس۔

زراعتی زمین کے علاوہ باقی سب جائداد کے ترکہ پر ٹیکس -

ہنڈیوں۔ پرامیسری نوٹوں، بیجکوں، اعتبار ناموں۔ بیمہ کی پالیسیوں، عرضی ناموں اور رسیدوں پر اسٹامپ کا ٹیکس

جو مال یا مسافر ریل یا ہوائی جہاز سے جائیں ان پر ٹرمنل ٹیکس -

ریلوے کے کرایہ اور آدمیوں اور مال کے کرایہ پر ٹیکس۔

صوبوں کے ٹیکسوں کی فہرست میں مندرجہ ذیل عنوانات شامل ہیں -

مالگذاری

صوبہ میں جو چیزیں بنائی یا پیدا کی جائیں ان میں حسب ذیل اشیاء پر اکسایز کا محصول:-

(i) آدمیوں کے استعمال کے لیئے الکوہل کی شراب۔

(ii) افیون بھنگ اور دوسری نشہ والی دوائیں اور چیزیں۔

(iii) ایسی دوائیں یا زینت کے سامان جن میں الکوہل یا کوئی اور چیز جسکا نمبر (ii) میں ذکر کیا گیا ہے ملی ہوئی ہوں۔

زراعتی آمدنیوں پر محصول۔
زمینوں عمارتوں، مکان میں لگی ہوئی انگیٹھیوں اور کھڑکیوں پر ٹیکس۔
زراعتی زمین کے ترکہ پر محصول۔
کان کنی کے حقوق پر محصول۔
کیپیٹیشن ٹیکس
علمی پیشوں، تجارتوں، پیشوں اور ملازمتوں پر محصول۔
جانوروں اور کشتیوں پر محصول۔
کسی مقامی علاقہ میں سال کے داخلہ پر محصول۔
تعیشات پر محصول جس میں لہو ولعب، تفریحات، جوا اور سٹہ پر بھی محصول شامل ہے۔
فیڈرل قانونی فہرست میں اسٹامپ کے جو محصول شامل ہیں ان کے علاوہ دستاویزوں پر اسٹامپ کا محصول
ملک کے اندر پانی کے راستہ سے جو مال یا مسافر جائیں ان پر محصول۔
ٹول

اس فہرست میں جتنے معاملات شامل ہیں ان سے متعلق فیس لیکن اس میں عدالت کی فیس شامل نہیں ہے۔

فیڈرل اور صوبہ کے ٹیکسوں کی ان فہرستوں کو دیکھنے کے بعد اب آیئے جدید دستور کی چند دفعات کا بھی سرسری مطالعہ کرلیں۔ یہاں اس دستور کی دفعات (۱۳۷) (۱۳۸) (۱۴۰) (۱۴۱) اور (۱۴۲) سے بحث کی جائے گی۔

دفعات (۱۳۷) (۱۳۸) اور (۱۴۰) میں چند خاص محصولوں کے بارے میں یہ بتایا گیا ہے کہ انھیں کون عاید اور وصول کرے گا اور وصول ہوجانے اور خرچ نکالنے کے بعد خالص آمدنی کی تقسیم کس طرح پر کی جائے گی۔

دفعہ (۱۳۷) میں مندرجہ ذیل محاصل کو پیش نظر رکھا گیا ہے:-

زراعتی زمین کے علاوہ دوسری زمینوں کے ترکہ پر محاصل۔
ایسے اسٹامپ کے محاصل جن کا ذکر فیڈرل ٹیکسوں کی فہرست میں کیا گیا ہے۔
ریلوے یا ہوائی جہاز سے جو مسافر یا سامان جاتا ہے اس پر ٹرمنل ٹیکس۔
ریلوے کے مسافروں اور مال پر کرایہ۔

ان سب کو فیڈریشن عاید اور وصول کرے گی اور ان سے جو خالص آمدنی حاصل ہوگی وہ صوبوں اور فیڈریشن میں شریک ریاستوں کے درمیان ان اصولوں کے مطابق تقسیم کردی جائے گی۔ جن میں فیڈریشن کی مجلس قانون ساز مقرر کرے گی۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ان مدوں سے جو زاید محصول (سور چارج) لگایا جائے گا اسکی حقدار فیڈریشن ہوگی۔

دفعہ (۱۳۸) میں زراعت کی آمدنی کے علاوہ باقی سب آمدنیوں کے محصول کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ انہیں بھی فیڈریشن عاید اور وصول کرے گی۔ لیکن خالص آمدنی کا ایک مقررہ تناسب فیڈریشن کی آمدنی میں شامل نہیں کیا جائے گا بلکہ صوبوں و فیڈریشن میں شریک ریاستوں کے درمیان طے شدہ اصول کے مطابق تقسیم کر دیا جائے گا۔

لیکن اس شرط کے ساتھ سورچارج کی پوری آمدنی فیڈریشن کو ملے گی۔

چونکہ اوپر کہا گیا ہے اس کے باوجود فیڈریشن کو اختیار ہوگا کہ ایک مقررہ مدت کے واسطے آمدنی کے اس تناسب کو بھی جو صوبوں اور فیڈریشن میں شریک ریاستوں کو دینے کے لئے مقرر کیا گیا ہے اپنے لئے ہی رکھ لے۔

دفعہ (۱۴۰) میں نمک کے محصول اور ایکسائز اور برآمد کے فیڈرل محصول کا تذکرہ ہے۔ انھیں بھی فیڈریشن ہی عاید اور وصول کرے گی۔ لیکن فیڈرل مجلس قانون ساز اگر چاہے تو اس مقصد کا ایک قانون بنا کر ان کی خالص آمدنی کے ایک حصہ یا کل کو ان اصولوں کے مطابق جو قانون میں موجود ہوں گے صوبوں اور فیڈریشن میں شریک ریاستوں کے درمیان تقسیم کر سکتی ہے۔

لیکن جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس کے باوجود جوٹ کے محصول برآمد میں سے نصف حصہ یا ملک معظم باجلاس کونسل اگر چاہیں گے تو اس سے زیادہ حصہ فیڈریشن کی آمدنی کا جز نہ بن سکے گا اور یہ حصہ ان صوبوں میں جہاں جوٹ پیدا کیا جاتا ہے۔ جوٹ کی پیداوار کے تناسب کے مطابق تقسیم کر دیا جائے گا۔

دفعہ (۱۴۱) میں بتایا گیا ہے کہ کسی ایسے ٹیکس کے بارے میں جس سے صوبوں کو دلچسپی ہے یا جس سے "زراعتی آمدنی" کے مفہوم میں تبدیلی ہوتی ہے کوئی قانون فیڈرل مجلس قانون ساز کے کسی ایوان میں پیش نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ اس کے پیش کرنے کی گورنر جنرل اپنے اختیار تمیزی سے پیشگی منظوری نہ دے دیں۔

دفعہ (۱۴۲) میں ہدایت ہے کہ فیڈریشن کی آمدنی میں سے ایسی رقوم جنھیں ملک معظم باجلاس کونسل مقرر کریں۔ ایسے صوبوں کو سالانہ امداد کے طور پر دی جائیں جن کے متعلق ملک معظم یہ فیصلہ کریں کہ ان میں مدد کی ضرورت ہے اور اس ذیل میں مختلف صوبوں کے لیے مختلف رقمیں مقرر کی جا سکتی ہیں۔

لیکن شرط یہ ہے کہ سوائے سرحدی صوبہ کے کسی اور دوسرے صوبہ کی امداد میں اس وقت تک اضافہ نہیں کیا جائے گا جب تک کہ فیڈرل مجلس قانون ساز کے دونوں ایوان اس اضافہ کے واسطے گورنر جنرل کے سامنے ملک معظم کی خدمت میں پہنچانے کے لئے ایڈریس پیش نہ کریں گے۔

یہ تو دستور ہند کی دفعات ہوئیں۔ ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب فیڈریشن قائم ہو جائے گی اس وقت بھی بہت سی باتیں مبہم رہیں گی اور اختلاف رائے کی صورت میں عدالت کی طرف فیصلہ کے لیے رجوع کرنا پڑے گا۔ اور جب تک فیڈریشن قائم نہیں ہوتی اسوقت تک مرکزی اور صوبہ کی حکومت کے تعلقات میں اور بھی

زیادہ گومگو کی کیفیت باقی رہے گی جس کے لئے فنانس منسٹروں کی کانفرنسیں بلانا پڑیں گی اور جو اختلاف کو قائم رکھنے پر راضی ہو کر منتشر ہو جایا کریں گی۔

جب جدید دستور ہند کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آیا تو سکرٹری آف اسٹیٹ نے سر آٹو نیمیر کو جو برطانیہ کے محکمہ مالیات کے قابل ترین افسر سمجھے جاتے ہیں۔ دستور ہند کی دفعات (۱۳۸) (۱۴۰) اور (۱۴۲) کی تحقیقات کے لئے مقرر کیا اور انہوں نے اپنی رپورٹ ۳۰ اپریل ۱۹۳۶ء کو شائع کی جس میں سر آٹو نے سفارش کی کہ صوبائی خودمختاری کو اپریل ۱۹۳۷ء میں شروع کیا جا سکتا ہے اور فیڈریشن کو اس کے ایک سال بعد اور انہوں نے بتایا کہ اگر مالیات کا انتظام دوراندیشی کے ساتھ کیا جائے تو جدید دستور کی وجہ سے جو خرچ پیدا ہو جائیں گے انھیں پورا کیا جا سکتا ہے۔

ان کی سفارشات انکم ٹیکس اور صوبوں کی امداد سے متعلق ہیں۔ سر آٹو نے انکم ٹیکس میں سے صوبوں کا حصہ ۵۰ فیصدی مقرر کر دیا۔ برما کو خارج کرنے کے بعد انہوں نے ہندوستان کے انکم ٹیکس کا تخمینہ ۱۲ کروڑ روپیہ سالانہ کا کیا۔ جس کا نصف یعنی ۶ کروڑ صوبوں کو دیا جائے گا لیکن پانچ سال تک یہ مرکزی حکومت کے پاس ہی رہے گا۔ چھٹے سال سے پانچ سال کی مدت میں آہستہ آہستہ ہر سال مساوی رقم کے اضافہ کے ساتھ صوبوں کا حصہ صوبوں کو منتقل کر دیا جائے گا۔ گویا دس سال میں صوبوں کو اپنا پورا حصہ مل جائے گا۔ لیکن اس میں بھی دستور ہند کی دفعہ (۱۳۸) کی شرط نمبر ۲ لگی ہوئی ہے جس کے ذریعہ فیڈریشن ایک مقررہ مدت کے واسطے انکم ٹیکس کے حصہ کو ادا کرنا ملتوی کر سکتی ہے۔ پھر ایک اور بھی شرط لگا دی گئی ہے۔ جس سے صوبوں کو انکم ٹیکس سے حصہ ملنا غیر متیقن ہو گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ انکم ٹیکس اور ریلوے کی آمدنی کو باہم منسلک کر دیا گیا ہے۔ جب تک انکم ٹیکس کے حصہ اور ریلوے کی آمدنی دونوں کو ملا کر حکومت کو ۱۳ کروڑ روپیہ حاصل نہ ہوں گے۔ اس وقت تک صوبوں کو انکم ٹیکس سے حصہ نہ دیا جائے گا۔

صوبوں کی امداد کچھ صوبوں کے لئے سر آٹو نیمیر نے تجویز کیا کہ صوبائی خودمختاری کے شروع ہوتے ہی انھیں فوری امداد دی جائے۔ کچھ امداد تو نقد کی صورت دی جائے کچھ اس قرضہ کو معاف کر کے جو اپریل ۱۹۳۶ء سے پہلے پہلے لیا گیا ہو۔ اور کچھ جوٹ ٹیکس میں سے ½ ۱۲ فی صدی اور زائد رقم نکال کر تقسیم کرنے سے

چنانچہ بنگال، بہار، آسام، سرحدی صوبہ اور اڑیسہ کا کل قرضہ معاف کر دیا گیا اور صوبہ متوسط میں ۱۹۳۶ء سے قبل کا تمام بقیہ قرضہ اور ۱۹۳۱ء سے قبل کے قرضہ کا تقریباً دو کروڑ روپیہ معاف کر دیا گیا۔

سالانہ نقد امداد حسب ذیل مقرر کی گئی۔ ممالک متحدہ پانچ سال تک پچیس لاکھ۔ آسام تیس لاکھ، اڑیسہ چالیس لاکھ سرحدی صوبہ ایک کروڑ جس پر پانچ سال کے بعد مزید غور کیا جائے گا۔ سندھ ایک کروڑ پانچ لاکھ جسے دس سال کی مدت میں آہستہ آہستہ کم کر دیا جائے گا۔

جس سالانہ امداد کو سر آٹو نے مقصد قرار دیا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

بنگال	۷۵ لاکھ
بہار	۲۵ "
صوبہ متوسط	۱۵ "
آسام	۴۵ "
سرحدی صوبہ	۱۱۰ "
اُڑیسہ	۵۰ "
سندھ	۱۰۵ "
صوبجات متحدہ	۲۵ "

مرکز پر اس کی وجہ سے ایک کروڑ ۹۲ لاکھ روپیہ سالانہ کا مزید خرچ بڑھ گیا ہے۔
اس کے علاوہ اڑیسہ کو ۱۵ لاکھ اور سندھ کو ۵ لاکھ بالمقطع دے دیئے جائیں گے۔
انکم ٹیکس میں سے صوبوں کو حسب ذیل تناسب کے ساتھ حصّہ ملے گا۔
مدراس ۱۵، بمبئی ۲۰، بنگال ۲۰، یو۔پی ۱۵، پنجاب ۸، بہار ۱۰، سی۔پی ۵، آسام ۲، سرحدی صوبہ ایک، اُڑیسہ ۲، اور سندھ ۲،

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ آیا مرکز اس زاید خرچ کو برداشت کر سکے گا یا نہیں سر آٹو نے بیان کیا کہ ان دو کروڑ روپیہ سالانہ کے علاوہ برما کے علیحدہ ہو جانے سے مرکزی حکومت کو پونے تین کروڑ کا اور بھی خسارہ برداشت کرنا پڑے گا۔ اس لئے اگر مرکزی حکومت کو اس تمام خسارہ کو فوراً صرف ایک سال کے مالی وسائل سے ۳۸-۱۹۳۷ء میں برداشت کرنا پڑتا تو بجٹ کی تیاری کا مسئلہ ایک ناقابل حل معمہ بن جائے۔ لیکن خوش قسمتی سے ۳۶-۱۹۳۵ء کی متوقع توفیر کی وجہ سے امداد کے سلسلہ کو ۳۸-۱۹۳۷ء سے ہی شروع کرنا ممکن ہوگیا ہے اور اس کے بعد کے سالوں کے لئے اعتماد کے ساتھ پیشین گوئی کی جاسکتی ہے کہ مرکزی حکومت کے وسائل کی ترقی میں کوئی خاص وقت واقع نہیں ہوگی۔ لیکن اخفائے حقیقت ہوگا اگر یہ بات بھی صاف صاف بیان نہ کردی جائے کہ آئندہ چند سالوں میں محاصل کے بوجھ میں کسی تخفیف کا امکان سوائے اس صورت کے کہ معاشی حالات میں توقع سے زیادہ بہتری پیدا ہو جائے بہت کم نظر آتا ہے۔

ان تمام واقعات کے پیش نظر سر آٹو اس نتیجہ پر پہنچے کہ دستور ہند کے حصہ سوم (یعنی صوبائی خودمختاری) کو ایک سال کے بعد شروع کیا جا سکتا ہے۔

نیمیر رپورٹ پر اعتراضات نیمیر رپورٹ کی اشاعت کے بعد ہندوستان میں اس پر ہر طرف سے خوب لے دے کی گئی سوائے صوبہ متوسط کے اور صوبوں نے اس کی تجویزوں پر اعتراضات کیئے اور ان کے ساتھ جو برا سلوک کیا گیا تھا اس کے خلاف سکرٹری آف اسٹیٹ سے احتجاج کیا صوبوں کی شکایات میں بڑی نفسانفسی کی کیفیت پائی جاتی تھی ہر صوبہ اپنے مطالبہ کو سب سے زیادہ ضروری اور جائز سمجھتا تھا اور مرکز سے زیادہ امداد کا طلبگار تھا۔ اور دوسری طرف حکومت ہند نے جو مراسلہ بھیجا اس میں یہ بتلایا گیا کہ اگر نیمیر رپورٹ کی فیاضانہ تجاویز کے مطابق صوبوں کی امداد کی گئی تو اس کے وسائل بہت تنگ اور ناکافی ہوجاینگے۔ لیکن لارڈ زٹلینڈ نے اپنے مراسلہ مورخہ ۱۲ مئی ۱۹۳۶ء میں حکومت ہند کو مطلع کیا کہ ملک معظم کی حکومت نے سر آٹو نیمیر کی تجاویز کو تمام وکمال قبول کرلیا ہے۔

اب سر آٹو کی رپورٹ کو سکرٹری آف اسٹیٹ اور حکومت ہند ایک ثالثی فیصلہ کے نام سے تعبیر کرتی ہیں اور جیسا کہ ثالثی فیصلوں کا قاعدہ ہے اس فیصلہ سے کوئی فریق مطمئن نہیں ہے۔ ہر فریق یہ سمجھتا ہے کہ مجھے اس فیصلہ سے نقصان ہوا ہے۔ متصادم اغراض ومقاصد اور مطالبات کے ہوتے ہوئے کسی ایسے فیصلے کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی جو سب کے لئے یکساں طور پر پسندیدہ ہو۔

بعض صوبوں کو خاص طور پر شکایت ہے۔ مثلاً اڑیسہ کو یہ شکایت ہے کہ سندھ کو تو ایک کروڑ ۵ لاکھ روپیہ دیا گیا اور مجھے صرف ۵۰ لاکھ۔ صوبوں کے استحقاق کو سامنے نہیں رکھا گیا بلکہ ان کی ضرورتوں کا خیال کیا گیا۔ جن صوبوں نے اپنی مالی حالت کو کفایت شعاری اور قابلیت سے درست حالت میں رکھا تھا وہ سب سے زیادہ نقصان میں رہے اور جو فضول خرچ اور نااہل تھے وہ بڑے مزے میں ہیں۔ مثلاً بمبئی کو یہ شکایت ہے کہ مسٹن کے غیر منصفانہ فیصلہ کی وجہ سے سولہ سال تک جس تکلیف دہ کفایت شعاری سے ہم کو کام کرنا پڑا اس کا کوئی لحاظ نہیں کیا گیا۔ اس کے علاوہ چونکہ ۲۵ فیصدی انکم ٹیکس بمبئی سے وصول کیا جاتا ہے اور بمبئی کو اپنی صنعتی آبادی کے لئے بہت خرچ کرنا پڑتا ہے اس لئے انکم ٹیکس میں سے زیادہ حصہ ملنا چاہیئے تھا۔ یہ صوبہ اپنا مقابلہ بنگال سے کرتا ہے جس نے اپنے میزانیہ میں توازن پیدا کرنے کی طرف بہت کم توجہ کی ہے۔ اسی طرح اور بھی صوبوں کو شکایتیں ہیں۔ پھر سب مل کر مرکزی حکومت سے شکایت کرتے ہیں کہ مرکزی حکومت کا خرچ بہت زیادہ ہے خصوصاً فوج کے محکمہ کا خرچ۔ مرکزی حکومت کو اپنے محکموں کا خرچ کم کرکے صوبوں کو قومی تعمیر کے کاموں کے لئے روپیہ دینا چاہیئے۔

غرضکہ یہ شکایتیں اور جھگڑیں ہیں جنکا مطالبہ بہت دلچسپ ہے اور غالباً انہی کا مظاہرہ فائنس منسٹروں کی کانفرنس میں بھی کیا گیا ہوگا۔

۱۹۳۷ء کا ریلوے بجٹ۔ گذشتہ سال ہندوستان کی ریلوں کے لئے بڑے صبر آزما تھے۔ اس دور میں جس

قدر خسارہ سرکاری ریلوں کو اٹھانا پڑا اس کی مثال ہماری تاریخ ریلوے میں کہیں نہیں پائی جاتی! اس خسارہ کی عظمت کا اندازہ ساڑھے کروڑ کی اس کثیر رقم سے کیا جاسکتا ہے جو اب تک سرکاری ریلوں پر واجب الادا ہے اور جس کے مہیا ہونے کی کوئی صورت مستقبل قریب میں نظر نہیں آتی۔ پھر بھی وزیر کامرس سر ظفر اللہ خاں کے اعلان نے جو گذشتہ بجٹ کے موقع پر انہوں نے کیا تھا، امید کی کرن چمکا دی۔ جہاں تقلیل اخراجات کا مرحلہ درپیش تھا، اور تخفیف ملازمان کی تیاریاں کی جا رہی تھیں وہاں ساڑھے چار کروڑ منافع کی پیشگوئی نے تن مردہ میں گویا جان ڈال دی۔ اخراجات کی محدود راہیں کھل گئیں۔ حکومت کی طرف سے ایک فیصدی حصے کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ ملازمین اجرت میں اضافہ کی امیدیں کرنے لگے۔ اور بیکاروں کے لئے اسامیاں قائم ہونے لگیں۔ غرض کہ نفع سے زیادہ منصوبوں کا مظاہرہ ہوا لیکن حقیقت حال کی طرف توجہ کیجائے تو معلوم ہوگا کہ سال رواں کے اخراجات کا پروگرام پوری دور اندیشی کے ساتھ وضع نہیں کیا گیا تھا اور بعض اہم مدوں کو تشنہ چھوڑ کر نسبتاً غیر ضروری مصارف عمل میں لائے جا رہے تھے۔

اس موقع پر سرکاری ریلوں کے اخراجات اور آمدنی کو قدرے وضاحت کیساتھ پیش کر دینا نامناسب نہ ہوگا ۳۷-۱۹۳۶ء کے ابتدائی چھ مہینوں میں (یعنی اپریل تا ستمبر) مسافروں سے حاصل کی ہوئی مجموعی آمدنی بمقابلہ سال گذشتہ کے (انھیں مہینوں کے) بہت بہتر تھی لیکن اکتوبر ۱۹۳۶ء میں یہ نقشہ بدلا ہوا نظر آیا ۳۷-۱۹۳۶ء کے جو اعداد اسوقت پیش نظر ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سال سرکاری ریلوں میں مسافروں اور مال کی مجموعی آمدنی ۴۳ کروڑ بڑھ گئی ہے اور برخلاف اسکے ریل چلانے کے اخراجات میں ٹوٹ پھوٹ اور مرمت کی مدیں بمقابلہ سال گذشتہ کے ۸۰ لاکھ کی کمی واقع ہوتی ہے۔ اسیطرح رقوم سود کی مد بھی قریب ۵۰ ہزار کے کم ادا کرنے پڑے ہیں۔ الغرض جملہ حسابات کے بعد ریلوے کی خالص آمدنی میں بمقابلہ سال گذشتہ اس سال ۴ کروڑ کا منافع رہا ہے۔ لیکن یہ نفع امید افزا ہونے کے باوجود اسقدر قابل اطمینان نہیں کہ ترقی آمدنی کی آئندہ کوششیں معرض التوا میں ڈال دی جائیں۔

اس لئے ورج ووڈ کمیٹی کو دعوت دی گئی کہ وہ ریلوے کے تمام کارخانوں کا معائنہ کریں اور اخراجات کو کم کرنیکی تدبیریں بتا دیں۔ اس میں شک نہیں کہ ریلوے (اور خصوصاً سرکاری ریلوے) کارخانوں پر ضرورت سے زیادہ رقم صرف کر رہی ہے۔ اگر سامان ریل تیار کرنیکی مشینوں اور کارخانوں کے اخراجات میں کمی کی جاسکے تو یقین ہے کہ مسافروں کے راحت و آرام کا زیادہ خیال ممکن ہوگا لیکن عام لوگ جو مشینوں کے ماہر نہیں ہیں اس مسئلہ پر زیادہ روشنی نہیں ڈال سکتے۔ پھر بھی جستہ جستہ مثالوں سے یہ اندازہ لگا لینا ناممکن نہیں ہے کہ ریلوے کے کارخانوں میں تخفیف اخراجات کی بڑی گنجائش ہے۔ تجربے کے لئے کوئی چھوٹا سا پرزہ ریلوے کے کسی کارخانے سے تیار کرایئے اور اس کی قیمت کا مقابلہ کسی دوسرے کارخانے کے تیار کردہ اسی پرزہ سے کیجیے۔ یقیناً دوگنے اور تگنے سے زیادہ کا فرق پایا جائے گا۔ ایسی صورت میں ورج ووڈ کمیٹی کا مشورہ قابل قدر ہونا چاہیے تھا لیکن بدقسمتی یا خوش قسمتی سے اس کمیٹی کی جولانگاہ ریلوے کے کارخانوں ہی تک محدود ہی نہ رہی۔ اسلئے جو رپورٹ انہوں نے حال میں شائع کی ہے اس میں کارخانوں کے علاوہ دیگر مخالف موضوع پر بھی بحث کی ہے۔ حکومت ہند اور عام پبلک ورج ووڈ کی ان سفارشوں پر غور کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ جن کا اثر ملک کی مالیات پر پڑنے والا ہے لیکن درحقیقت اخراجات کے کسی خاص شعبے پر بحث کرتے ہوئے ہم اکثر غیر متعلق شعبوں کو بھی فراموش نہیں کر سکتے کیونکہ بہرحال ایک کا اثر دوسرے پر پڑنا لازمی ہے اور خصوصاً جبکہ ہماری موجودہ آمدنی کی

ترقی نے ابھی تک قابل اطمینان صورت اختیار نہیں کی ہے اس لئے ورج ووڈ کمیٹی بھی تنظیم اخراجات پر سفارش کرے گی۔ وہ کارخانوں کے علاوہ اخراجات کی دیگر مدوں کو نظرانداز نہیں کر سکتی۔ اس سے ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ ورج ووڈ کمیٹی کی تمام سفارشوں کو آنکھ بند کرکے منظور کر لیا جائے لیکن ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ریلوے کی آمدنی کو اس طرح تقسیم کیا جائے کہ ریلوے کے کارخانوں کی کارکردگی میں بھی کمی نہ واقع ہو اور قرض اور دیگر واجب الادا رقموں کا بار بھی جلد سے جلد ریلوے کے سر سے اُتر جائے۔

واجب الادا رقموں کا انتظام اس وقت تیس کروڑ چوہتر ہزار کی کثیر رقم تقسیم مالیات کے معاہدے کی رو سے سرکاری ریلوں پر حکومت ہند کے حق میں واجب الادا ہے۔ اس کے علاوہ ریلوے کے خسارہ کی رقم جو بذریعہ قرض پوری کی گئی تھی۔ اکتیس کروڑ چونتیس لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ساڑھے چار کروڑ کا منافع ساٹھ کروڑ کے عظیم الشان قرض کے مقابلہ میں کیا حیثیت رکھتا ہے اور منتظمین ریلوے نے اس رقم کو ادا کرنے کی کیا تدبیر سوچی ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ حکومت ریلوے کو ساٹھ کروڑ کی چھوٹ دیدے تاکہ ریلوے کے اخراجات کی از سرنو تنظیم کی جاسکے؟ اس مسئلے پر جو مباحثے مرکزی مجلس قانون ساز میں ابتک ہوئے ان سے صاف ظاہر ہے کہ حکومت ایسی کثیر رقم کو ہاتھ سے جانے نہ دی گی۔ اب دوسری صورت سوائے اس کے اور کچھ نہ تھی کہ التوا کی درخواست کی جائے اور ادائیگی رقم کے لئے ۱۹۴۲ء تک مہلت حاصل کی جائے۔ ہونے کو تو یہ درخواست منظور ہوگئی لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ۱۹۴۲ء میں اتنی کثیر رقم کی ادائیگی کیونکر ممکن ہوگی خصوصاً جبکہ اس سال کے ریلوے بجٹ میں اس کے لئے کوئی رقم محفوظ نہیں کیگئی ہے۔

حالات سفر میں ترقی شاید اس موقع پر یہ کہا جائے کہ حالات سفر کو مزید اخراجات سے اس طرح بہتر بنایا جاوے گا کہ زاید آمدنی میں ایک معتدبہ رقم کا اضافہ ہوسکے۔ اب ایک نظر بعض ان اخراجات پر ڈالتے جو مسافروں کی تعداد اور ان سے حاصل کی ہوئی آمدنی میں اضافہ کرنے کے لئے عمل میں لائے جارہے ہیں ایک بہت بڑی رقم اوّل درجے کے ڈبوں کو نئے طریقے سے تعمیر کرنے میں صرف کی جارہی ہے تاکہ انکو موسمی اختلافات سے محفوظ کر دیا جائے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان ڈبوں سے فائدہ اٹھانے والوں کی تعداد کتنی ہے۔ اول تو اوّل درجہ کے مسافر یوں بھی بہت کم ہوتے ہیں۔ اس پر ان ڈبوں میں سفر کے مزید اخراجات برداشت کرنیوالے اتنے مسافر کہاں مل سکیں گے جن سے ریلوے کی خالص آمدنی میں کسی خاص ترقی کی امید کی جاسکے۔ اسی طرح نئی چند آسامیاں بھی قائم کی گئی ہیں جنکا مطلب شائد ریلوے کی کارکردگی کو بڑھانا ہوگا۔ یہی صورت مختلف دیگر تجاویز کی بھی ہے جو زیادہ تر مرمت اور معمولی تعمیرات سے تعلق رکھتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ فروعی تدابیر مسافروں کے تکلیفوں کا حل نہیں ہوسکتیں اور اگر ان کی مصیبتوں کا ازالہ نہ کیا گیا تو آمدنی میں اضافہ ہونا بھی محال ہے۔ موجودہ ریلوے ٹائم ٹیبل پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ ریلوں کی تعداد میں کمی اور کرایوں میں زیادتی کر دی گئی ہے۔ کیا ماہرین ریلوے اس تدبیر کو معاشی سمجھتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ اس صورت سے ان کی آمدنی میں اضافہ ہوسکے گا۔ مسافروں میں آمدنی کا سب سے بڑا عنصر تیسرا درجہ ہے۔ آج کئی سال کا زمانہ گذرا جب سے یہ وعدہ کیا جارہا ہے کہ اس درجے کے مسافروں کے لئے نئے قسم کے آرام دہ ڈبے تیار کئے جائینگے

اور کبھی کبھی یہ خبر بھی کانوں تک آتی ہے کہ اس قسم کے ڈبہ کا معائنہ ریلوے ممبر یا ریلوے بورڈ کے کسی ممبر نے دہلی میں کیا ہے۔ مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کون سا دن آئے گا جب تیسرے درجہ کے مسافر اس نئے ڈبے سے مستفید ہونگے ریل سڑک. ہوا اور پانی کا مقابلہ شاید اسوقت تک ہماری ریلیں یہ سمجھ رہی ہیں کہ آمد و رفت کے میدان میں ان کا مد مقابل کوئی نہیں ہے۔ اگر ایسا ہے تو انھیں معلوم ہو جانا چاہیئے کہ سڑک اور ہوا کا مقابلہ بہت جلد نا قابل برداشت طاقت حاصل کرنے والا ہے۔ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں پروازی کی گنجائش دنیا کے ہر ملک سے زیادہ امید افزا اور ریلوں کے لئے بہت تکلیف دہ ہے۔ اس کے علاوہ ریل کی متوازی سڑکیں دن بدن مقابلہ کو شدید بنا رہی ہیں ایسی صورت میں اگر اونچے درجہ کے مسافروں اور خاص قسم کے ضائع ہو جانے والے سامان تجارت ہوائی جہاز اچک لیں اور تیسرے درجے کے مسافروں پر موٹر لاریاں قابض ہو جائیں تو آخر ریلیں کیا کریں گی؟

گذشتہ سال کے ریلوے بجٹ میں ان حالات کو پس پشت ڈال کر مسافروں کی اکثریت کو کمنفعت کرنے کی صورت اختیار نہیں کی گئی تھی اور نہ رقوم واجب الادا کے پورا کرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ فروری کے بجٹ میں ان امور کا کافی خیال رکھا جائے گا ورنہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ریلوے کی آمدنی کم از کم مسافروں کی جانب سے ضرور گھٹ جائے گی اور اس وقت ریلوے کے پاس کوئی ایسی تدبیر نہ ہوگی جو گذشتہ نقصانات کی تلافی کر سکے۔

زیر ادارت :۔ ڈاکٹر سید عابد حسین ایم ۔ اے ۔ پی ایچ ۔ ڈی

نمبر ۳	مارچ ۱۹۳۸ء	جلد ۲۹

فہرست مضامین

سالانہ صہ ر فی پرچہ ۸ ر

(پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع برقی پریس دہلی)

ہندوستان میں بے روزگاری کا مسئلہ

ہندوستان میں بے روزگاری کا مسئلہ جس شکل میں پایا جاتا ہے، وہ کئی باتوں کی وجہ سے مغربی ملکوں کے مسئلہ سے مختلف ہے۔ اس کی اوّل وجہ تو یہ ہے کہ یہاں کی کثیر آبادی کا پیشہ زراعت ہے۔ کاشتکاروں کی جوت میں جو رقبے ہیں وہ بہت مختصر ہیں اور ویسے بھی زراعت کے پیشے کو چونکہ موسمی حالات کا پابند بننا پڑتا ہے، اس لئے ہندوستان کے اکثر کاشتکاروں کو سال کا خاصا بڑا حصہ یعنی ملک کے مختلف علاقوں میں پانچ سے نو مہینہ تک بے کاری میں صرف کرنا پڑتا ہے۔ اور اس زمانہ میں ان کے لئے کسی ضمنی پیشہ کے فراہم کرنے کی ضرورت بہت زیادہ محسوس کی جاتی ہے۔ پھر وقتاً فوقتاً مونسون کے دھوکہ دے جانے کی وجہ سے خشک سالی یا قحط سالی بھی پیدا ہوتی رہتی ہے جس کی وجہ سے تمام بارانی علاقوں کی کاشت کا سلسلہ مسدود ہو جاتا ہے اور بہت بڑے پیمانہ پر بے روزگاری پیدا ہو جاتی ہے۔ ہندوستان میں بے روزگاری کی قسم اپنے نتائج کے لحاظ سے سب سے زیادہ وسیع اور ہولناک ہوتی ہے۔

زراعت کے علاوہ جب اور دوسرے پیشوں کی طرف توجہ کی جاتی ہے تو دو قسم کی اور بے روزگاریاں نظر آتی ہیں۔ ایک تو وہ بے روزگاری ہے جو ہاتھ کا سخت کام کرنے والوں میں پائی جاتی ہے۔ اور دوسری وہ جو دماغی یا محرری یا ہاتھ کا ہلکا کام کرنے والے لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ اول الذکر صنعتی مزدوروں کا جہاں تک تعلق ہے ان کی بے روزگاری کے مسئلہ نے ابھی تک ہندوستان میں مغربی ملکوں کی طرح بہت زیادہ اہمیت حاصل نہیں کی ہے۔ ہندوستان صنعتی حیثیت سے پس ماندہ ہے۔ اس کی صنعتیں ابھی ابتدائی منزل میں ہیں۔ جو جدید صنعتیں موجود ہیں ان پر ضرور عالمگیر کساد بازاری کا اثر پڑا ہے اور صنعتی شہروں میں اس کی وجہ سے خاصی بے روزگاری پائی جاتی ہے۔ کچھ کارخانے بند ہو گئے ہیں۔ کچھ کام کرنے والے لوگوں کی تخفیف بھی کر دی گئی ہے۔ اور بہت سے ماہر اور غیر ماہر مزدور بے کار ہیں

لیکن ایسے لوگوں کی مجموعی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ اور چونکہ ہمارے صنعتی مزدوروں کا تعلق دیہات اور زراعت کے کام سے باقی رہتا ہے، اس لیے جب کبھی شہروں میں بے روزگاری پیدا ہوتی ہے تو وہ اپنے دیہات کے گھروں کو واپس چلے جاتے ہیں اور زراعت کے کام میں دوبارہ لگ جاتے ہیں۔ اور ان کی بے روزگاری کی وجہ سے جو بھی مصیبت اور پریشانی پیدا ہوتی ہے۔ اس کا خمیازہ شہروں کو نہیں بلکہ دیہاتوں کو ہی بھگتنا پڑتا ہے، اور شہر کے لوگ تنگی اور افلاس کے بھیانک مناظر دیکھنے سے محفوظ رہتے ہیں۔

فیکٹریوں کے علاوہ دستکاروں اور ذاتی طور پر کام کرنے والوں میں بھی بے روزگاری پائی جاتی ہے۔ ہندوستان میں جو سیاسی تجارتی اور صنعتی انقلاب ہوا ہے اور جس کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ اس کا نقصان اس طبقہ کو سب سے زیادہ اٹھانا پڑا ہے۔ فیکٹری کے بنے ہوئے سستے مال نے ان کے روزگار کو ختم کر دیا ہے۔ بہت سی صنعتیں مٹ چکی ہیں اور جو باقی ہیں وہ مٹتی جا رہی ہیں۔ جہاں کہیں دستکاری کا یہ طبقہ ابھی تک باقی ہے عام طور پر تباہ حالی کا شکار ہے۔ ورنہ اس طبقہ کے لوگوں نے بھی زراعت ہی کے پیشہ میں آکر پناہ لی ہے اور دیہات کی بے روزگاری کے مسئلہ کو اور بھی زیادہ پیچیدہ بنا دیا ہے۔

اس لئے آخری تجزیہ کے بعد ہندوستان کی بے روزگاری کے مسئلہ کو دو اہم عنوانوں کے تحت جمع کیا جا سکتا ہے۔

(۱) دیہی بے روزگاری اور
(۲) طبقۂ متوسط کی بے روزگاری۔

جہاں تک پہلے عنوان کا تعلق ہے وہ ہندوستان کے افلاس کے عام مسئلہ سے تعلق رکھتا ہے، اور اس کے حل کرنے کے لئے قومی تعمیر کے نہایت ہمہ گیر کاموں کو ہاتھ میں لینا پڑے گا۔ جن میں سے چند مثال کے طور پر ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:—

زراعت وصنعت کے پیشوں میں توازن پیدا کرنے کے لئے بڑے پیمانہ کی صنعتوں اور دیہی صنعتوں کو ترقی دینا اور اس مقصد کیلئے صنعتی تحفظ کی پالیسی اختیار کرنا۔ بنک کاری کو ترقی دینا۔ منصوبہ کے مطابق معاشی زندگی کی تشکیل کرنا۔ تعلیمی نظام کی اصلاح کرنا۔ صنعتی تحقیقات کی حوصلہ افزائی کرنا۔ مال کے فروخت

کرنے کے طریقوں کی اصلاح کرنا۔ فنی مشورے امداد اور حکومت کی سرپرستی حاصل کرنا۔ زراعت کی ترقی کے سلسلہ میں نفع بخش یا حفاظتی نہریں تعمیر کرنا۔ کنوئیں یا تالاب بنانا۔ امداد باہمی کی انجمنیں قائم کرنا پختہ سڑکیں اور پل بنانا جنگلات کے محکمہ کی پالیسی مقرر کرتے وقت کاشتکاروں کی ہمدردی کے پہلو کو سامنے رکھنا دیہات کے انتظام و انصرام میں دیہات کی فلاح و بہبود کو ہی مقدم سمجھنا۔ لگان۔ مالگزاری اور زمین کے عام مسئلہ کو حل کرنے کے لئے حکومت کی موجودہ پالیسی میں ایسی بنیادی تبدیلی کرنا جس سے کاشتکاروں کو اپنی پیداوار کے زیادہ سے زیادہ حصّہ زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا موقع مل سکے۔ کاشتکاروں کو ساہوکاروں کے پنجے سے چھڑانا۔ ان کے قرض کے بوجھ کو ہلکا کرنا اور آئندہ کے لئے ان کی مالی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے مناسب انتظام کرنا زراعتی محکمہ کی طرف سے زراعت کی ترقی کیلئے فنی معلومات بہم پہنچانا مناسب بیج، مناسب کھاد، مناسب اوزار مناسب مویشی فراہم کرنا۔ زراعت کے ساتھ ضمنی پیشوں کو ترقی دینا اور زراعتی مال کے فروخت کرنے کیلئے سہولتیں بہم پہنچانا۔ زراعت پیشہ آبادی کے معیار زندگی کو بلند کرنا انکی نگاہ میں وسعت انکے حوصلوں میں بلندی اور ان میں قدامت پرستی کی جگہ اصلاح پسندی کا جذبہ پیدا کرنا۔ انکے رقبہ زیر کاشت کو متحد اور وسیع کرنا۔ آبادی کے اضافہ کی رفتار میں کمی کرانا غرضکہ ایسے اور سینکڑوں کام ہیں جنکا اختیار کرنا ملک کے افلاس کے عام مسئلہ کو حل کرنے کیلئے ضروری ہے اور اس کے ساتھ ملک کی مستقل یا نیم مستقل بے روزگاری کے مسئلہ کا حل بھی وابستہ ہے۔

اب رہی تعلیمیافتہ طبقہ یا متوسط طبقہ کی بے روزگاری سو ہر چند یہ بھی ملک کے عام مسئلہ افلاس سے متعلق ہے اور عام افلاس کے دور کرنے کی کوششوں سے یقیناً اسکو بھی بہت بڑی حد تک حل کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ جو لوگ دماغی قابلیت رکھتے ہیں انہی سے ملک کے تعمیری اور تنظیمی کاموں میں مدد لی جا سکتی ہے اور اسطرح انکے لئے روزگار کی بہت سی نئی راہیں نکل سکتی ہیں لیکن چونکہ تعلیمیافتہ طبقہ نے تعلیم کے جس نظام کے ماتحت تعلیم پائی ہے۔ اس کے پیش نظر ملک کی اصلاح و ترقی کا مقصد نہیں تھا۔ اس لیے اس نظام نے بہت سے ایسے غیر موزوں لوگ پیدا کر دیئے ہیں جو غالباً اس کام میں لگنے کی اہلیت نہیں رکھتے اور تعلیم یافتہ طبقہ کی بے روزگاری کا مسئلہ دراصل انہی مجبوروں اور معذوروں کا مسئلہ ہے جنکی عمر کے بہترین سال ایک غیر ضروری

اور ناموزوں تعلیم کے حاصل کرنے میں صرف ہوئے ہیں اور جواب نہ اپنے کام کے رہے ہیں نہ ملک وقوم کے
کام کے تعلیمی نظام کی ہر منزل میں جس بنیادی اصلاح کی ضرورت ہے وہ تو مسلّم ہے ہی لیکن ان بے بسوں
کے ساتھ ہمدردی کرنا بھی سوسائٹی کا فرض ہے۔ کیونکہ ان میں سے بہت سے اپنی کسی ذاتی خرابی کی وجہ سے
اپنی موجودہ قابل رحم حالت میں مبتلا نہیں ہیں بلکہ جماعت کی ستم ظریفیوں کا شکار ہیں۔ ایسی درسگاہیں اور
یونیورسٹیاں موجود تھیں جن کو تعلیم دینے کے لئے سرکار کی طرف سے پروانے ملے ہوئے تھے جنھیں سرکار،
ریاستوں اور رئیسوں سے مالی امداد ملتی تھی، جن کا جماعت میں ساکھ اور اعتبار تھا اور جن میں تعلیم حاصل کرنا
عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ان درسگاہوں کو ملک کے نوجوانوں اور ان کے والدین نے تعلیم کے لیے
منتخب کیا۔ ملک کے نوجوانوں نے اپنا روپیہ اور اپنی زندگی کا نہایت قیمتی زمانہ صرف کرنے کے بعد ان کی
سندیں حاصل کیں یعنی جو جو یونیورسٹی والوں نے کہا اس کی پابندی اس طرح پر کی جو خود یونیورسٹی والوں
کو قابل اطمینان معلوم ہوئی۔ ان کے والدین نے سخت ایثار کئے۔ اپنا پیٹ کاٹ کر، اپنی ذات پر مصیبتیں
جھیل کر اپنی اولاد کی تعلیم میں بے دریغ روپیہ اس امید کے ساتھ لگایا کہ وہ ان کے لئے اور ان کے خاندان
کے لیئے کارآمد ثابت ہوگی لیکن جب یہ سب کچھ کیا جا چکا اور ان کے لگائے ہوئے پودے کے پھلنے پھولنے
کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ یہ بے برگ وبار درخت ہے۔ نہ خود اپنے وجود کو قائم رکھ سکتا ہے نہ دوسروں
کو سایہ اور آرام پہنچا سکتا ہے۔ اس سے والدین اور خاندان والوں کو جو مایوسی ہوتی ہے اس کا اندازہ
کرنا چاہیئے اور خود اس بدنصیب کی ذہنی الجھنوں کا بھی کرنا چاہیئے۔ جسے جماعت نے اپنی تنگ
نظری اور ناعاقبت اندیشیوں کی وجہ سے اس حالت پر پہنچا دیا ہمیں ہرگز اس بات پر تعجب نہ کرنا
چاہیئے۔ اگر ایسا شخص جماعت کے موجودہ نظام کے خلاف جس میں لوگوں کی زندگیوں کے ساتھ اس طرح
کا مذاق کیا جاتا ہے۔ بغاوت کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ ایسے شخص کے لئے انقلابی بن جانا اور دہشت انگیزی
کو اپنا پیشہ بنا لینا بالکل قابل معافی ہے۔ جماعت کا ایسا نظام جو افراد کی قدر و قیمت کو نہیں سمجھتا اور
ان کی فلاح و بہبود کی طرف سے مجرمانہ غفلت سے کام لیتا ہے۔ ہرگز افراد کی وفاداری کا مطالبہ
نہیں کر سکتا۔ تعلیم کے منتظمین اپنے ذاتی عروج، جاہ پسندی اور عیش پرستی میں اس قدر محو ہیں خطاب

حاصل کرنے، اخباروں میں اپنی قصیدہ خوانی کرانے اور اعلیٰ مرتبوں پر پہنچنے کا انھیں اتنا لالچ ہے کہ وہ سب کام اپنی ذاتی شہرت کے لئے کرتے ہیں۔ چالبازیوں اور مکاریوں سے کام لیتے ہیں اور نئی نسل کی مشکلات کا ایمانداری کے ساتھ کوئی حل نہیں سوچتے۔ زمانہ کے بدلے ہوئے حالات کے مطابق کوئی مناسب منصوبہ نہیں بناتے اور رٹہ مار کر نہ خود کام کرتے ہیں اور نہ دوسروں سے کام لینا جانتے ہیں۔ ساری ذمہ داری مدرسوں کے منتظموں کی ہے۔ سزا کے اگر مستحق ہیں تو یہ لوگ ہیں۔ بدنصیب تعلیمیافتہ بے روزگاروں کے ساتھ ہمدردی کرنا چاہیئے اور ان کی رہنمائی کرنا چاہیئے تاکہ جس طرح بھی ہو سکے وہ اپنی زندگی کو کچھ نہ کچھ کارآمد بنا سکیں۔

میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ تعلیمیافتہ بے روزگاروں کا مسئلہ اہل لوگوں کی بے روزگاری کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ نااہلوں کی بے روزگاری کا مسئلہ ہے۔ اپنی توقعات میں ناکام اور اپنی جگہ پر ٹھیک نہ بیٹھنے والوں کا مسئلہ ہے ورنہ تعلیمیافتہ لوگوں کی مانگ ملک میں اسوقت جتنی زیادہ ہے اتنی پہلے کبھی نہیں تھی۔ ہمارے ملک میں تعلیمیافتہ لوگوں کا قحط ہے۔ تعلیمیافتہ طبقہ ملک کا دل و دماغ ہوتا ہے۔ جب یہ اعضائے رئیسہ سالم اور تندرست ہوتے ہیں، اسوقت جسم کے تحفظ، بقا اور ترقی کی توقع قائم کی جا سکتی ہے، ورنہ جسم کا کمزور اور فنا ہونا لازمی ہے۔

ہندوستان میں قدرتی وسائل دولت غیر محدود مقدار میں موجود ہیں، مزدوروں کی بھی کثرت ہے سرمایہ کی بھی کمی نہیں ہے ضرورت ماہر اور تعلیمیافتہ مزدوروں اور منتظموں یعنی صنعتی رہنماؤں کی ہے۔ جو پیدائش دولت کے مختلف کاموں کو نفع بخش طریقہ پر تنظیم دے سکیں تنظیم تنظیم تنظیم۔ یہ وقت کی پکار ہے۔ سائنس اور ایجاد و اختراع نے قدرتی وسائل دولت کو منظم کرنے کے جو ڈھنگ دریافت کر لئے ہیں ان کے بعد آبادی کے کسی فرد کا خوش حالی سے محروم رہنا تعلیمیافتہ طبقہ کی کوتاہی اور فرض ناشناسی کی دلیل ہے۔ دنیا کے ذرہ ذرہ نے دولت کو اگلنا شروع کر دیا ہے۔ مناسب طریقوں کو اختیار کر کے مختلف قسم کی مٹیوں سے لوہا، فولاد، تانبا، پیتل، ٹین، شیشہ، چینی مٹی اور مختلف دھاتیں اور ان کی مصنوعات تیار کی جا سکتی ہیں مٹیوں کے ملانے سے ایسے مسالے بنائے جا سکتے ہیں جن سے نہایت مضبوط

اور خوبصورت بیسیوں منزلوں کی میلوں لمبی عمارتیں کھڑی ہوسکیں۔ پُل اور سڑکیں بنائی جاسکتی ہیں۔ پانی کی بہم رسانی اور اس کی نکاسی کے آرام دہ انتظامات کیئے جاسکتے ہیں۔ پھر نباتی اور حیوانی اشیاء کی لاتعداد مصنوعات تیار کی جاسکتی ہیں۔ ان پر کیمیاوی اور ردعمل سے ہزاروں قسم کی نئی نئی چیزیں تیار کی جاسکتی ہیں۔ جن سے زندگی کی سہولتوں اور آسائیشوں میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ غذا اور کپڑے کی رسد بڑھائی جاسکتی ہے۔ جب کولتار جیسی منحوس شکل والی چیز سے خوشنما رنگ، خوشبو دار سینٹ وغیرہ تیار ہوسکتے ہیں تو پھولوں، پتیوں، درخت کے گوندوں، چکنائیوں، بجوں جانوروں کی ہڈیوں۔ کھالوں۔ خون اور دودھ سے کیا کیا چیزیں تیار ہوسکتی ہیں۔ ان کا تو ذکر ہی فضول ہے، دنیا کی جس ذلیل سے ذلیل اور بدنما سے بدنما چیز پر تنظیم کا ہاتھ لگایا جاتا ہے، وہ سونا بن جاتی ہے۔ سائنس کی ان ایجادوں اور ترقیوں کے بعد بنی نوع انسان کے کسی طبقہ کے لئے مفلس رہنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی ہے۔ ہاں ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ تعلیم حاصل کی جائے۔ اور تعلیمیافتہ طبقہ دیانت اور فرض شناسی کے ساتھ اپنے جاہل بھائیوں کی صحیح رہنمائی کرے۔ تعلیم کی ضرورت جیسی اس زمانہ میں ہے۔ اس سے پہلے کسی زمانہ میں نہیں تھی اور تعلیم سے جو پھل آج میسر آتے ہیں وہ دنیا نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

ہمارا تعلیمیافتہ طبقہ اگر اپنے منصب کا صحیح طور پر مستحق ہوتا اور اپنے فرض کو ٹھیک طریقہ پر پورا کررہا ہوتا تو آج ہندوستان کی یہ تباہ حالت نہ ہوتی۔ اس کے دریاؤں کا پانی سیلاب پیدا کرکے آبادیوں کو تباہ اور ویران نہ کرتا۔ بلکہ ریگستانوں کو گل و گلزار بنا دیتے۔ پانی کے بہاؤ کی قوت سے قوت متحرکہ کے خزانے اکٹھے ہوجاتے۔ جن سے لاکھوں گھوڑوں کی طاقت کے انجن دن رات چلا کرتے اور لاکھوں مشینیں مسلسل گردش کرتی رہتیں۔ اور الہ دین کے چراغ کی طرح انسان کی خدمت پر ہمیشہ مامور نظر آتیں اور اُس کے اشارے پر ایک ایک رات میں جادو کے عشرت کدے تیار کرتی رہتیں اس کی کھیتیاں سر سبز ہوتیں، اس کے کھلیان معمور ہوتے۔ اس کے یہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہتیں پھل اور ترکاریوں کے انبار ہوتے، سبزے اور پھولوں کی کثرت ہوتی، رنگ و خوشبو کی ہولیاں

کھیلی جاتیں۔ لباس کے لیئے کپڑوں کی وہ کثرت اور تنوع ہوتا کہ ہر ممکن ذوق کی رعایت کی جاسکتی۔ آمدو رفت اور خبر رسانی کے وسائل کو بے انتہا ترقی ہوجاتی۔ تفریحوں، دلبستگیوں، فنون لطیفہ اور تعلیم و تہذیب کے اداروں کو بھی خوب فروغ حاصل ہوتا۔ غرضکہ زندگی ہر جہت سے مکمل اور مطمئن ہوتی۔ لیکن پھر بھی افلاس کی محرومی اور بدنصیبی نہیں بلکہ امارت کی سیرچشمی اس کو نئی نئی راہوں کے تلاش کرنے کے لئے مضطر اور بے چین رکھتی اور اس طرح تہذیب و تمدن کی ترقی کا سلسلہ برابر جاری رہتا۔

لیکن ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ کل قوم کی محرومیوں کو رفع کرنا تو بڑی بات ہے۔ خود اپنی ذاتی محرومیوں کو رفع کرنے سے قاصر ہے۔ ہمارے ادیب اور شاعر یہ نہیں جانتے کہ لفظوں میں بھی ایک جادو چھپا ہوتا ہے اور ان کے مناسب طریقہ پر ملا دینے سے سوئی ہوئی قوموں کو جگایا اور ملکوں کی قسمتوں کو بدلا جاسکتا ہے اگر وہ یہ جانتے ہوتے تو ملک میں یہ افسردگی جمود اور بے بسی ہرگز نظر نہ آتی، ہر شخص مضطرب اور بے چین ہوتا۔ نچلا بیٹھنا ننگ اور عار سمجھتا اور خدا کی دی ہوئی قابلیتوں اور نعمتوں کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینے کی کوشش کرتا۔ اپنا بھی بھلا کرتا اور قوم کو بھی فائدہ پہنچاتا۔ اس کا پیغام کھیت پر کام کرنے والا کسان پتھر پھوڑنے والا مزدور کشتی چلانے والا ملاح۔ غرضکہ قوم کا ایک ایک بچہ جوان اور بوڑھا سنتا اور اس کے ساز سے مست ہوکر اس جوش اور خروش کے ساتھ کام شروع کئے جاتے کہ صدیوں کے کام برسوں اور مہینوں کے کام لمحوں میں انجام پا جاتے۔ یہ کام ہمارے شاعروں، خطیبوں، مصوروں، بت سازوں کا تھا کہ وہ قوم کی ان خوابیدہ قوتوں کو بیدار کرتے اور اسے تیزی کے ساتھ آگے بڑھاتے۔

ہمارے تاریخ، فلسفہ، معاشیات اور سیاسیات کے ماہروں کا کام تھا کہ وہ معاشرتی زندگی کی تنظیم کی وہ راہیں نکالتے جن سے انفرادی خود غرضیوں، طبقوں اور جماعتوں کی کشمکش کے امکانات کم سے کم پیدا ہوتے اور ہم آہنگی یکجہتی اور امداد باہمی کے ساتھ تمام کام انجام پاتے رہتے۔ اور ہمارے سائنس کے گریجوئیٹوں کے کرنے کے لئے جو کام ہیں وہ تو لامحدود ہیں ؎

یزداں بہ کمند آور اے ہمت مردانہ

اس لئے تعلیمیافتہ طبقہ کی بے روزگاری کے مسئلہ کو مستقل طور پر حل کرنے کے لئے ہمیں

اپنے تعلیمی نظام میں ایک بنیادی انقلاب پیدا کرنے کی ضرورت ہے، اس سلسلہ میں ہم امریکہ، انگلستان جرمنی، فرانس اٹلی اور جاپان کی مثالوں سے بھی بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں لیکن سب سے زیادہ ہمیں روس سے سبق سیکھنا ہے۔ اپنے مقاصد اور اپنی کامیابیوں دونوں کے لحاظ سے روس کے تجربوں میں ہمارے لئے ایک زبردست سرمایۂ بصیرت موجود ہے، روس کو جن حالات میں کام کرنا پڑا وہ ہمارے حالات سے تمام باتوں میں مشابہ نہیں ہیں بعض باتوں میں روس ہم سے زیادہ خوش نصیب تھا اور بعض میں ہم روس سے زیادہ خوش نصیب ہیں۔ اگر ہماری مشکلات زیادہ ہیں تو ہمارے لئے کوشش کے وسائل زیادہ ہیں۔ اور اگر ہمیں سہولتیں زیادہ ہیں تو ہماری ترقی زیادہ یقینی ہے، روس کی زندگی قومی منصوبہ کی پابند ہے وہاں بے روزگاری نہیں ہے۔ وہاں ہر شخص کے لئے ایک کام ہے اور ہر کام کے لئے ایک شخص ہے، روس کے نظام میں خرابیاں بھی ہیں لیکن برائیوں کو چھوڑنا اور اچھائیوں کو اختیار کرنا ہمارا کام ہے، روس کی ہمت اور حوصلہ کی قدر نہ کرنا تعصب اور تنگ نظری ہے۔ مثلاً کسی محفوظ بحری راہ نہ ہونے کی وجہ سے قطب شمالی میں جہازوں کے لئے راستہ پیدا کرنا روس کا ایک ایسا کارنامہ ہے، جو زرّین حروف میں لکھے جانے کے لائق ہے۔

لیکن یہ تمام باتیں تو آئندہ سے متعلق ہیں۔ جو بے روزگاری تعلیمیافتہ طبقہ میں اسوقت پائی جاتی ہے۔ اس کا حل یہی ہو سکتا ہے کہ تعلیمیافتہ نوجوانوں میں حوصلہ اور امنگ پیدا کر کے ان کو نئی نئی راہیں نکالنے کی طرف مائل کیا جائے۔ انھیں تنظیم کے کاموں کی اہمیت سمجھائی جائے اور اصلاح و ترقی کے منصوبے بنانے اور ان کو عملی جامہ پہنانے کا سبق دیا جائے۔ انھیں جدوجہد کرنا چاہیئے۔ انھیں اپنی قوتوں کو بیدار کر کے موثر بنانا چاہیئے۔ جہاں عزم مصمم ہوتا ہے۔ وہاں راہیں بھی نکل آتی۔ انھیں بری یا بھلی جیسی بھی فی الحال ممکن ہو۔ زراعت، تجارت اور صنعت کی رہنمائی کرنا چاہیئے۔ تجربہ انھیں اپنی خامیوں سے آگاہ کر دے گا۔ اور ان کی مسلسل جدوجہد ترقی کی راہیں پیدا کرے گی۔ ان کی رہنمائی کسی نے نہیں کی اُنہیں اپنی رہنمائی خود کرنا پڑے گی تاکہ کم از کم آنے والی نسلوں کے لئے تو یہ راستہ ہموار ہو جائے۔ حکومت کے وزیروں افسروں اور جماعت کے دوسرے باقتدار لوگوں کو بھی چاہیئے کہ وہ مسئلہ کو اس روشنی

یں دیکھیں اور تعلیمیافتہ نوجوانوں کی فنی نااہلیت کو نظر انداز کرکے انھیں کام کے زیادہ سے زیادہ مواقع
دیں تاکہ وہ اہلیت پیدا کر سکیں اور اپنی قدرتی قابلیتوں کی نشو و نما کر سکیں ۔

جگر پارے

(از حضرت جگر مرادآبادی)

کچھ نہ زمان و مکاں کچھ نہ سفید و سیاہ
اشہد ان لا الہ۔ اشہد ان لا الہ

غنچہ و نسرین و گل، انجم و خورشید و ماہ
یہ بھی مری رہ گذر، وہ بھی میری گرد راہ

عشق نظر آفریں اور نظر معصیت
عشق تمنا نژاد۔ اور تمنا گناہ

حاصل صد عرض غم۔ مایۂ صد عرض شوق
اک مترنم سکوت۔ اک متبسم نگاہ

کون تجھے پا سکے کس کو ہے یہ دستگاہ
عشق سو گم کردہ ہوش عقل سو گم کردہ راہ

دور ازل تا ابد یہ بھی کوئی سیر گاہ
فاصلۂ یک قدم، دائرۂ یک نگاہ

اسکے سوا اور کیا پیش کش حسن دوست
ایک دھڑکتا سا دل، ایک لرزتی سی آہ

قصہ ناز و نیاز کیا کہیں ہوتا ہے ختم
حسن ترا بے اماں، عشق مرا بے پناہ

تو ہے خودی ناشناس تجھ کو خدا سے کیا غرض
دیکھ تو لے کر ذرا آئینۂ مہر و ماہ

جانب ملک حبیب پھر ہوں میں یوں گامزن
صبح ازل در نفس، شام ابد در نگاہ

اپنے بھی سایہ سے چل بچ کے رہ دوست میں
شوق سہی راہ نما۔ عشق سہی خضر راہ

اس کی وہیں تک حدود جسکی جہانتک سکت
اس کی وہیں تک ہے فکر جسکی جہانتک نگاہ

چیر کے دیکھوں اگر سینۂ ہستی عشق
توڑ کے رکھدوں ابھی آئینۂ مہر و ماہ

قطعہ

اے کہ تو ناواقف مصلحت حسن و عشق
اے کہ تو نامحرم سر ثواب و گناہ

درس حقیقت سمجھ۔ حاصل فرصت سمجھ
فرض محبت سمجھ۔ معصیت گاہ گاہ

(غیر مطبوعہ)

مولوی نذیر احمد

کسی قوم کا ادب اس قوم کی علمی اور سماجی زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ گویا "ادب" وہ کسوٹی ہے جس پر قوم کے ذہنی ارتقا اور معاشرتی ترقی کو پرکھا اور خیالات و احساسات کی بلندی کو جانچا جا سکتا ہے۔

اس لحاظ سے اگر ہم "اردو ادب" کی ابتدائی زندگی پر نظر ڈالیں تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ اس دور میں ہماری قوم ان تمام اوصاف سے محروم ہو چکی تھی جو سماجی اور قومی نشو و نما کے لئے بہت ضروری ہیں۔ ہماری سلطنت کا زوال اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی اس کی زندہ مثال ہیں۔ ممکن ہے بعض حضرات اس دور کی قابل قدر ادبی کاوشیں کچھ ایسی ڈھونڈھ نکالیں جو میرے خیال کو غلط ٹھیرا دیں۔ اور اس بنا پر وہ یہ کہیں کہ ہماری موجودہ حالت کے ذمہ دار ہمارے خیالات کی پستی نہیں بلکہ بعض دوسرے اسباب ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی یہ بات صحیح ہو۔ مجھے خود بھی اس سے انکار نہیں کہ ہماری خرابی میں ہماری ذہنی پستی کے علاوہ بعض دوسری چیزیں بھی شامل ہیں لیکن اس کے ساتھ میں یہ بھی کہوں گا کہ ہمارے یہاں جو کچھ ہوا اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ بلند خیال اور اعلیٰ اوصاف کے فقدان کا نتیجہ ہے۔

انیسویں صدی کے لگ بھگ اور خود اس صدی میں جو کچھ اردو کی خدمت کی گئی وہ اس لحاظ سے تو واقعی قابل ستائش ہے کہ ہماری زبان میں الفاظ کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع اور تحریر کا ایک مخصوص اسلوب قائم ہو گیا جس کی وجہ سے "اردو" ایک مستقل زبان بن گئی اور اس کے زندہ رہنے کے سامان پیدا ہو گئے۔ مگر اس سانچے میں جو کچھ ڈھالا گیا اس میں انفرادی رنگ غالب تھا۔ اس لئے اس سے قوم کی مجموعی بہتری کی اُمید نہیں کی جا سکتی تھی۔ کہنے کو ہمارے یہاں شاعر بھی پیدا ہوئے اور ادیب بھی، انہوں نے شاعری بھی کی اور زبان و بیان میں نکتہ آفرینی بھی، افسانے اور قصے بھی لکھے۔ لیکن بے جان اور مردہ۔ دور سے دیکھئے لہلہاتے باغات، شاداب چشمے، رنگ برنگ کی چڑیاں اور معلوم نہیں کیا کیا نظر آئے گا۔ میٹھے میٹھے

بول۔ سریلی راگ راگنیاں سنائی دیں گی۔ قریب گئے تو فریب نظر اور فریب گوش کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہ سب لوگ خیالی دنیا کے رہنے والے لوگ تھے، شہر کی زبان میں گفتگو کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ہماری یہ خیالی دُنیا ہی زندگی کی معراج ہے۔

اس فریب خوردہ نظریہ اور تصور کی اس جمی جمائی محفل کا بھرم جب فرنگی استبدادیت کے ہاتھوں کُھلا تو لوگوں کو دن میں تارے نظر آگئے۔ وہ مے و مینا کی ساغر نوازیاں، رقص و سرود کی ہم آہنگیاں، گل و بلبل کی عشق ریزیاں سب خاک میں مل گئیں۔ وہ سلطنت کا نشہ جس نے بہت دنوں میٹھی نیند سلایا تھا خمار بن کر رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ کیسا بھیانک منظر تھا۔ آنکھوں کے سامنے بزرگوں کی میراث لٹ رہی تھی اور اتنی ہمت نہ تھی کہ کم از کم زبان ہی سے روک دیں۔ ؏

"آشیاں اُجڑا کیا، ہم ناتواں دیکھا کئے"۔

ہندوؤں کے لئے یہ چیز کوئی نئی نہ تھی۔ ایسے اتار چڑھاؤ دیکھتے انھیں صدیاں گزر گئی تھیں۔ انھوں نے سمجھ لیا بازار کا بھاؤ ہے کبھی نرم کبھی گرم۔ چلو اس وقت یہی سہی۔ پھر کبھی دیکھ لیں گے۔ دھیلی بارہ آنے کا گھاٹا ہے ہونے دو۔ زندہ رہے تو کسر نکل جائے گی لیکن مسلمانوں کے لئے بازار کا سودا نہ تھا۔ قوم اور قومیت کے مٹ جانے کا سوال تھا جس کا مول تول مادی ٹکڑوں سے نہیں بلکہ روحانی اذیتوں جسمانی مشقتوں، اور خون کی ندیاں بہا کر کیا جاتا ہے۔ ان کے پیچھے ایک شاندار ماضی، اور ان کے پاس نظام ریاست اور نظام معاشرت کا زندہ اور غیر فانی نصاب موجود تھا۔ وہ یہ جانتے تھے کہ ان سب کو دُکھ پہنچانے والے ہم خود ہی ہیں۔ لیکن پھر بھی چین نہ آتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی شکست نے ان کی رہی سہی ہمتیں اور بھی پست کر دیں۔ ایک طرف فرنگی جو فروشوں کے ہاتھ بک جانے کا غم اور دوسری طرف ایک نئی حکومت اور انوکھی تہذیب سے سابقہ جو کسی طرح بھی ان کی زندگی سے کوئی مطابقت نہ رکھتی تھی انہیں کھائے جاتا تھا۔ ان کی غیرت ہرگز یہ گوارا نہ کر سکتی تھی کہ اپنے زندہ آئین کی موجودگی میں کسی ایسے آئین کے سامنے گردن جھکا دیں جس کی حقیقت کچھ بھی نہ ہو۔ مسلمانوں میں جو لوگ سمجھ دار تھے ان کی حالت بھی کچھ زیادہ اچھی نہ تھی ان کے پاس سوچنے والے دماغ تو موجود تھے۔ مگر اس افراتفری میں وہ بھی کوئی ایسی راہ نہ نکال سکے جو ان کی پوری قوم کو ایک مرکز

پر پہنچا دیتی۔ ان میں سے ہر ایک نے نیک دلی اور خلوص سے کام کیا۔ مگر ان کی کوششیں "جماعتی حیثیت" سے قوم میں کوئی زندگی نہ پیدا کر سکیں۔ ان کی مخلص کوششوں کی یادگار دیوبند کا اسلامی علوم کا مدرسہ اور علی گڈھ کا مغربی اور جدید علوم کا ادارہ ابتک موجود ہیں۔ اور اپنی وضع کو نبھائے جا رہے ہیں۔

فرنگی تسلّط سے جس طرح ہمارے دوسرے شعبوں میں تبدیلیاں ہوئیں اسی طرح ہمارا "ادب" بھی اس سے متاثر ہوا۔ مغربی ادب کی ملاوٹ ہمارے مشرقی "ادب" کی کینگی پر بڑی حد تک اثر انداز ہوئی۔ اس دور میں جو اہل تصنیف پیدا ہوئے۔ انہوں نے مغربی مصنفین کی تقلید میں قلم تو اٹھائے مگر اپنا بھرم بھی قائم رکھا ہے انھوں نے ایک نئی طرز نگارش کی بنیاد ڈالی اور اسے کمال کو پہنچا دیا۔ ان کی تقلید میں ایجاد کی شان نظر آتی ہے۔

مولوی نذیر احمد مرحوم کا زمانہ بھی یہی زمانہ تھا۔ اس دور کے مصنفین میں انھیں جو نمایاں حیثیت حاصل ہے اس کا اندازہ ان کے ان ادبی کارناموں سے بخوبی ہو سکتا ہے جنہوں نے مولوی صاحب کو نہ صرف شمس العلماء اور ڈپٹی بنا دیا بلکہ قوم میں انھیں وہ درجہ دیا جو اُن کے ہم عصر مصنفین میں سے شاید ہی کسی کو نصیب ہوا ہو۔ مولوی صاحب ایک ادیب تھے اور ادیب کی حیثیت سے انہوں نے اپنا فرض نہایت ایمانداری سے ادا کیا۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک طرف ان کا "ادب" اپنی زندگی کے دن پورا کر رہا ہے۔ اور دوسری طرف قوم چراغ سحری بنی ہوئی ہے۔ ادیب ہونے کی وجہ سے ان کا فرض تھا کہ بیک وقت دونوں کی دستگیری کریں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی قوم کا جائزہ لیا۔ اپنے تنزل پذیر تمدن پر گہری اور تنقیدی نظر ڈالی۔ اور ان کی خرابیوں کو کھود کھود کر باہر نکالا۔ اس سلسلہ میں مولوی صاحب نے بہت سے افسانے اور قصے لکھے جو ایسے مسائل کے سمجھنے سمجھانے میں بہت مفید ثابت ہوتے ہیں۔

افسانہ دراصل انسان کے دل کی گہرائیوں تک پہنچنے کا سب سے محفوظ راستہ ہے۔ اس کے ذریعہ نہایت آسانی سے نفس انسانی کی نامعلوم حقیقتوں کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ اور انسانی فطرت کی مرتب واقفیت بہم پہنچائی جا سکتی ہے۔ مولوی صاحب اچھی طرح سمجھتے تھے کہ آدمی قصہ کہانیوں میں وہ کچھ سیکھ لیتا ہے جو برسوں کی فلسفیانہ کوششیں نہیں سکھا سکتیں۔ اس نقطۂ نظر سے انہوں نے اپنی قوم کی معاشرتی اور تمدنی اصلاح کے سلسلہ میں جو افسانے لکھے ان میں سب سے زیادہ کامیاب "ابن الوقت" "مرآۃ العروس"

بنات النعش" اور توبتہ النصوح" سمجھے جاتے ہیں۔ یہاں میں ان میں سے دو ایک کا خلاصہ اور ان کے مقصدی پہلو کی تشریح کروں گا۔

ابن الوقت :۔ یہ افسانہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے زمانے سے متعلق ہے۔ قصہ یوں ہے کہ ابن الوقت دہلی کے ایک معزز خاندان کا فرد ہے۔ طالب علمی کے زمانے سے اسے انگریزی روش اور انگریزی طرز ماند و بود اچھی لگتی ہے لیکن اپنے گھر والوں اور دوسرے مسلمانوں کے خوف سے اس کا اظہار نہیں کر سکتا ایک دن گھر آتے وقت اتفاق سے سڑک پر اُسے ایک زخمی انگریز پڑا مل جاتا ہے۔ اس انگریز کے ملازم جاں نثار کی درخواست پر ابن الوقت اسے اپنے گھر اٹھا لاتا ہے۔ تیمار داری کرتا ہے۔ انگریز اچھا ہو جاتا ہے اسی اثنار میں آزادی کی جنگ چھڑ جاتی ہے۔ شہر میں لوٹ مار، اور قتل و غارت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس لئے انگریز ابن الوقت کے گھر میں چھپا رہتا ہے۔ ابن الوقت کی طبیعت تو بچپن سے انگریز پسند تھی۔ نوبل صاحب کی صحبت اس رنگ کو اور پختہ کر دیتی ہے۔ غرض جب دلی میں امن و امان قائم ہو جاتا ہے تو نوبل صاحب کی حفاظت اور خدمت کے صلہ میں ابن الوقت کو انگریزوں کی طرف سے جاگیر اور نوکری ملتی ہے۔ اس وقت ابن الوقت کو اپنے صحیح رجحان کے پورا کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اور وہ شہر سے باہر کوٹھی لے کر انگریزوں کی طرح رہنا شروع کر دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک طرف ابن الوقت نماز روزے اور دوسرے اسلامی ارکان سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اور دوسری طرف دلی والے اس سے بدگمان ہو جاتے ہیں۔ اسے کرستان سمجھنے لگتے ہیں، اور اس کے ساتھ کھانا پینا اٹھنا بیٹھنا سب کچھ حرام قرار دے دیتے ہیں۔ ادھر انگریز بھی "ابن الوقت" کی اس ہمسری سے خوش نہیں ہوتے۔ نوبل صاحب کی وجہ سے کچھ دن خاموش رہتے ہیں۔ مگر ان کے جانے کے بعد کھلم کھلا اس کے دشمن بن جاتے ہیں۔ ابن الوقت عجیب کشمکش میں پڑ جاتا ہے، ایک طرف برادری والے چھوٹ جاتے ہیں اور دوسری طرف جن کے لئے یہ برائی مول لی تھی وہ اسے غلام سمجھ کر دھتکار دیتے ہیں۔ غرض بعد از خرابی بسیار وہ راستے پر آتا ہے۔"

اس قصے کے پڑھنے والوں کو ایک ہی نظر میں معلوم ہو جاتا ہے کہ مولانا کس حد تک انگریزی

طرز معاشرت کو ہندوستانیوں کے حق میں مضر خیال کرتے تھے۔ اس سے نہ صرف ان کی غلامانہ ذہنیت کو تقویت پہنچتی ہے بلکہ ان کا مذہب بھی خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ مولوی صاحب لکھتے ہیں۔

"جب تک ابن الوقت سیدھا سادھا ہندوستانی تھا تو صوم وصلوٰۃ کا صدر بابند رہا لیکن جس روز سے انگریزی وضع اختیار کی اس روز سے ان سب باتوں میں فرق آنے لگا۔ ..... تبدیل وضع کے بعد بھی لوگوں نے اُسے مسجد میں جماعت سے تو نہیں بارہا اکیلے نماز پڑھتے دیکھا۔ یہاں تک کہ شروع شروع جن دنوں اس کو نماز روزے کی بہت پر حول تھی۔ کچہری کے عملے ہندو مسلمان سب قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ کیسے ہی کام میں مصروف ہوں۔ دیر سویر کی تو کہی نہیں جاتی مگر نماز ابھی تک نہیں چھوڑی۔ ہم تو روز پرائیوٹ روم میں ظہر کی بلکہ جس دن دیر تک کچہری رہتی ہے عصر کی نماز بھی پڑھتے دیکھتے ہیں لیکن انگریزی وضع کے ساتھ نماز روزے کا نبھانا تھا ذرا مشکل۔ کوٹ تو خیر اتار الگ کھونٹی پر لٹکا دیا۔ کم بخت پتلون کی بڑی مصیبت تھی کہ کسی طرح بیٹھنے کا حکم ہی نہیں۔ اُتارنا اور پھر پہننا بھی دقت سے خالی نہ تھا۔ اس سے کہیں زیادہ وقت طہارت کی تھی جو نماز کی شرط ضروری ہے۔ ..... غرض نماز پر انگریز سوسائٹی کا یہ اثر دیکھا کہ پہلے وقت سے بے وقت ہوئی۔ پھر نوافل، پھر سنن جا کر نرے فرض رہے۔ وہ بھی پانچوں وقت پہلی رکعت میں سورۂ عصر تو دوسری میں سورۂ کوثر، پھر جمع بین العصرین والمغربین شروع ہوا۔ پھر قضائے فائتہ۔ پھر بالکل چٹ ..... "

دوسری چیز جس پر انگریزی تہذیب نے اثر ڈالا وہ زبان تھی۔ انگریزوں کے اثر سے ہمارے پڑھے لکھے طبقہ کی مادری زبان کا جو حال ہوا مولوی صاحب اس کو اس طرح دکھاتے ہیں:۔

" انگریزی عملداری سے ہماری دولت، ثروت، رسم و رواج، لباس، وضع طور طریق، تجارت، مذہب، علم و ہنر، عزت، شرافت، سب چیزوں پر تو پانی پھرا تھا۔ ایک زبان تھی اس کا بھی یہ حال ہے کہ ادھر انگریزوں نے عجز واقفیت

کی وجہ سے اکھڑی اکھڑی، غلط، نامربوط اردو بولنی شروع کی ادھر "ہر عیب کہ سلطان پسند د ہنر است"۔ ہمارے ہی بھائی بند لگے اس کی تقلید کرنے۔ ایک صاحب کا ذکر ہے کہ اچھی خاصی ریش و بروت آغاز جوانی میں ولایت گئے تھے۔ چار پانچ برس ولایت رہ کر آئے تو ایسی سٹی بھولے کہ اردو میں بہ ضرورت اگر بات کرتے تو رُک رُک کر اور ٹھہر ٹھہر کر اور آنکھیں پیچ پیچ کر جیسے کوئی سوچ سوچ کر مغز سے بات اُتارتا ہے"۔

خیر یہ تو وہ زمانہ تھا جب انگریز ہندوستان میں آئے آئے تھے۔ اس وقت ان کا اثر بھی بہت زیادہ تھا۔ اور لوگ کچھ بدحواس بھی زیادہ ہو رہے تھے جو کچھ کرتے بلا سوچے سمجھے کرتے تھے۔ لیکن اب جب کہ زمانہ بہت بدل گیا ہے اور حالات بھی وہ نہیں رہے ہمارے پڑھے لکھے لوگوں کی زبان رونے کے قابل ہے۔

یہ تو معاشرتی، اور تمدنی باتیں ہوئیں۔ اب ذرا قوم کی معاشی حالت بھی سن لیجئے۔ اگرچہ مولوی صاحب انگریزوں اور انگریزی حکومت کی تعریفوں کے جابجا پل باندھتے چلے جاتے ہیں لیکن حقیقت بہرحال حقیقت ہوتی ہے۔ انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستانی صنعتوں اور زراعت اور تجارت کو جو نقصان پہنچا مولوی صاحب جیسا آدمی کیسے برداشت کرسکتا تھا اور برداشت کے قابل بات بھی نہ تھی۔ بھلا کسی کا گھر جلے اور وہ خاموش بیٹھا رہے؟ صاف نہیں کہا لفظوں میں لپیٹ کر کہا "ابن الوقت" کی زبان سے کہلوایا:۔

"..... اگر آپ صبر اور توجہ سے سننا چاہیں تو قبل اس کے کہ میں اپنی جگہ پر بیٹھوں۔ آپ صاحبان کو یقین کرادوں گا کہ ہندوستان کی رعایا پہلے کی نسبت بہت سقیم الحال ہوگئی ہے۔ ذرائع معاش کے اعتبار سے ہندوستان کے لوگ چار طرح کے ہیں۔ اول کسان دویم اہل حرفہ، سویم نوکری پیشہ چہارم تجارت پیشہ...... انگریزی عملداری سے پہلے نہ کوئی رقبہ کی پیمائش کرتا تھا اور نہ اقسام زمین دیکھتا تھا۔ پچھلی جمع پر نظر کرکے یا بہت سیانپت کی سرسری طور پر موقع حال دیکھ کر گاؤں کے پیچھے اٹکل پچو ایک جمع ٹھیرادی

چھٹی پائی۔ اس کے ہزاروں لاکھوں تحریری ثبوت موجود ہیں کہ ہندوستانی گورنمنٹوں میں طرح طرح کے ظلم ہوتے تھے۔ مگر سرکاری مال گذاری کے بارے میں ہمیشہ سرکار ہی مظلوم رہتی تھی۔ .... جمع کی وصولی کا یہ حال تھا کہ شاذ و نادر ہی کوئی بھلا مانس زمیندار وقت پر دیتا ہوگا۔ دو دو چار چار برس کی باقی داری تو ایک بات تھی۔ جب باقی بہت بڑھ جاتی تو آخر کو آدھی تہائی پر فیصلہ ہوتا تھا۔ رہے کاشتکاران کو یوں سمجھ لو گویا سرکار کی رعیت ہی نہ تھے۔ ان کے نیک و بد نفع و نقصان سب باختیار زمیندار۔ مگر چونکہ زمینداروں کا اپنا مفاد تھا۔ ہر زمیندار کاشتکار کو اپنی دولت سمجھتا تھا۔ ضرورت پڑے پر تخم و تقاوی سے اس کی مدد کرتا۔ خرید مویشی اور شادی بیاہ تک کے لئے اس کو قرض دیتا۔ پھر نقدی لگان کا دستور نہ تھا۔ فصل پک کر تیار ہوئی۔ زمیندار کاشتکار دونوں نے غلہ بانٹ لیا۔ کم ہوا تو کم زیادہ ہوا تو زیادہ۔ نہ حجت نہ تکرار۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ اب گورنمنٹ انگریزی کے انتظام کو دیکھنا چاہئے کہ اول تو مزروعہ، افتادہ، بنجر چپہ چپہ زمین کی پیمائش کرائی۔ پھر مٹی کی ذات اور کھاد اور آبپاشی کے لحاظ سے کھیت کھیت کی حیثیت دریافت کی اور پھر کاغذات دیہی اور لوگوں کی گواہی اور ذاتی تجربوں سے یہاں تک تحقیق کیا کہ اس کھیت میں یہاں تک پیداوار کی قابلیت ہے۔ اس طرح جزرسی کر کے گاؤں کی نکاسی نکال کر کہنے کو آدھا اور واقع میں اچھا خاصہ کسا ہوا دو تہائی حق سرکار ٹھیرا دیا۔ اور اتنی کاوش پر بھی ہمیشہ کے لئے نہیں بلکہ غایت درجہ صرف تیس برس کے لئے کہ اتنے میں زمیندار پھر پنپیں گے تو پھر نچوڑیں گے۔ .... بندوبست کا میعادی ہونا گروہ زمینداران کی سخت بے دلی کا موجب ہے اور اگر سچ پوچھئے تو ملکی ترقی کا مانع ....

"اہل حرفہ کی کیفیت کسانوں سے کہیں بدتر ہے۔ یہ سچ ہے کہ گورنمنٹ ان کے حال سے کم تعرض کرتی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ نہیں کرتی۔ مگر یورپ کی کلوں نے

ان کو مار پٹرا کر دیا۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے بہت سے عمدہ اور یافت کے پیشے معدوم ہو گئے اور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اب کہاں ہیں وہ ڈھاکے کی ململ۔ بنارس کی مشروع اور رنگ آباد کے کمخواب، بیدر کے برتن، کالپی کے کاغذ، کشمیر کی شالیں، لاہور کے ریشمی چوڑ ہیئے ۔ اہل یورپ کیا اس پر بند ہیں کہ جس چیز کی مانگ ہندوستان سے ہوئی بنا کر بھیجدی؟ نہیں وہ لوگ رات دن اس لڑہ میں لگے ہیں کہ ہندوستان میں کیا کیا چیز پیدا ہوتی ہے، اور وہ انسان کے کس مصرف کی ہے۔ اور اس ملک کے لوگوں کو کیا درکار ہے جو ہندوستان سے ہر طرح کی پیداوار ولایت ڈھلی چلی جاتی ہے۔ کچھ تو یورپ میں کھپی اور کچھ ہندوستان کے مصرف کی بن کر الٹی آگئی۔ ہندوستانی اہل حرفہ تھکے تو یوں تھکے کہ یہ جو کچھ کریں اپنے ہاتھوں سے اور انسان کی قوت کا اندازہ معلوم ہے آٹھ پہر میں آخر وہ دم بھی لے گا۔ آسائش بھی کرے گا۔ اور وہاں یورپ میں کلیں ہیں کہ سارے سارے دن، ساری ساری رات برابر بے تکان پڑی چل رہی ہیں ....،

اب مجھ کو صرف تجارت پیشہ لوگوں کی نسبت کچھ کہنا ہے۔ سو میں اسکو مانتا ہوں کہ انگریزی عمل داری میں ایسے پیشے کے لوگوں کو کسی طرح کی شکایت نہ ہونی چاہئے۔ اس میں کسی طرح کا تنزل نہیں، مال کی آمد و شد میں سہولیت یوماً فیوماً زیادہ ہوتی چلی جا رہی ہے۔ عدالت کی کارروائی قابل اطمینان ہے۔ تاجر کو اور چاہئے کیا۔ مگر تجارت کو چاہئے سرمایہ، اور سرمائے ہی کا بڑا رونا ہے۔ پھر یہ پیشہ ایک محدود پیشہ ہے جسکو ہندوستان میں صرف معدودے چند اختیار کر سکتے ہیں۔ ایک، دوسرے حرفہ اور اور صنعت کا کساد عین تجارت کا کساد ہے۔ اور میں ابھی تھوڑی دیر ہوئی ثابت کر چکا ہوں کہ ہمارے ملک کی صنعت پر اوس پڑتی چلی جاتی ہے.......؛"

اسی کے ساتھ ساتھ مولوی صاحب اس چیز پر بھی روشنی ڈالتے ہیں کہ یورپ کی ترقی کا اصل راز کیا ہے۔ جس طرح آج کل کے مفکرین اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ ہماری نجات صنعتی ترقی اور صنعتی تعلیم میں مضمر ہے۔ اسی طرح مولوی صاحب بھی اسی چیز پر زور دیتے ہیں۔ وہ ابتدا ہی سے ہماری تعلیم اور طریقۂ تعلیم سے بدظن نظر آتے ہیں چنانچہ ابن الوقت میں ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

"یورپ کی تمام ترقی کا اصلی اور حقیقی سبب علوم جدید ہیں۔ اس زمانہ میں تعلیم وہی مفید ہو سکتی ہے جس سے یہاں کے لوگ ان علوم سے آگاہی بہم پہنچائیں۔ اور ان کی طبیعتوں میں اس بات کا شوق پیدا ہو کہ واقعات کو سوچیں اور موجودات میں غور کریں سو سر رشتۂ تعلیم کا اتنا اثر تو ضرور دیکھنے میں آتا ہے کہ لکھنے پڑھنے کا چرچا پہلے سے بہت زیادہ ہو گیا ہے........ مگر اس تعلیم سے ملک کو فائدہ کے عوض الٹا نقصان پہنچنے والا ہے۔ لوگ صرف نوکری کی طمع سے پڑھتے ہیں۔ نوکری ہی ان کے نزدیک پڑھنے کی غرض و غایت ہے۔ نوکری ہی کے لئے ان کو تیار بھی کیا جاتا ہے۔ اور ان کا مبلغ علم بھی وہیں تک ہے...... اگر سچ پوچھئے تو سر رشتۂ تعلیم سے جیسا کہ اب ہے ملک کا الٹا علاج ہو رہا ہے۔ ہم کو درکار تھے وہ علوم جو صنعت و حرفت کو ترقی دیں۔ اور اب لوگوں کو ایسی پٹی پڑھائی جاتی ہے کہ معدنی اور آبائی پیشوں و حرفوں سے گریز اور نفرت کرتے ہیں۔"

غرض کہ "ابن الوقت" کے جس حصہ کو بھی لے لیجئے۔ پڑھے لکھے اور بے پڑھے لکھے ہر طبقے کے مسلمانوں کی معاشی اور معاشرتی، مذہبی اور اخلاقی خرابیاں دکھائی گئیں ہیں۔ قصہ کے ہر لفظ سے یہ ٹپکتا ہے کہ مولوی صاحب اپنی قوم کو اونچے سے اونچے درجہ پر لے جانا چاہتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ ان میں بھی وہ تمام اوصاف پیدا ہو جائیں۔ جو انھیں آج کل کی متمدن اور مہذب قوموں کے ہمسر بنا دیں۔ اپنے یہاں کی تجارت اور صنعت کو ترقی یافتہ اور اعلیٰ پیمانہ پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ موجودہ تعلیم کو جس کی مثال اس دیوار کی سی ہے جس میں اینٹوں

کے ساتھ روڑے اور گارے کے ساتھ چونا بھی بھر دیا گیا ہو اور جو ہوا کے ایک جھونکے اور بارش کے ایک چھینٹے کی مدافعت نہ کر سکتی ہو بدل ڈالنا چاہتے ہیں۔ اس کی جگہ مفید تعلیم جس کی واقعی ہندوستانیوں اور خصوصاً مسلمانوں کو ضرورت ہے ملک میں جاری کرنا چاہتے ہیں۔

ارادہ تو یہ تھا کہ باقی تین افسانوں کو بھی اسی طرح مع ان کے اقتباسات کے پھیلا کر بیان کیا جاتا۔ مگر خیال ہے کہ مضمون زیادہ طویل ہو جائیگا۔ اس لئے میں ان افسانوں کے مضامین کے خلاصہ ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔

مراۃ العروس اور بنات النعش ان دونوں میں ایک ہی قصہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتابیں عورتوں کی معاشرتی خرابیوں کی اصلاح کے سلسلہ میں لکھی گئی ہیں۔ ہمارے یہاں جس طرح مردوں کی حالت قابل افسوس ہے اسی طرح عورتوں کی حالت بھی قابل رحم ہے۔ ان میں مذہب اور ارکان مذہب سے بیگانگی، جہالت اوہام پرستی، رسم و رواج کی پابندی امور خانہ داری میں بے سلیقگی اور اسی قسم کی دوسری برائیاں ہیں جو انہیں اچھی مائیں بننے اور سلیقہ شعار بیوی ثابت ہونے سے روکتی ہے۔ "مراۃ العروس" میں انہی چیزوں کی اصلاح کی کوشش کی گئی ہے۔ اور بنات النعش میں ان چیزوں کے ساتھ ساتھ ایسی علمی معلومات کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے۔ جن کا خیال عام طور سے پردہ نشین عورتوں کی تعلیم میں نہیں رکھا جاتا۔

توبۃ النصوح:۔ یہ کتاب مذہب اور عقائد مذہب کا خلاصہ ہے۔ مسلمانوں میں عموماً اور مغرب زدہ طبقہ میں خصوصاً اسلام اور عقائد اسلام کے ساتھ جو نا روا برتاؤ کیا جا رہا ہے۔ اس کتاب سے اسی چیز کی اصلاح مقصود ہے۔ خدا، حشر و نشر، جنت، دوزخ اور محاسبۂ اعمال کی حقانیت کو اس پیرائے میں بیان کیا گیا ہے کہ معمولی قابلیت کے لوگ بھی آسانی سے ان سب چیزوں کو سمجھ سکتے ہیں۔ اور اپنی زندگی کو خدا اور خدا کے رسول کی منشا کے مطابق بنا سکتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ والدین کے فرائض کی بھی تشریح کی گئی ہے۔

مولوی نذیر احمد مرحوم کی شخصیت کو نمایاں کرنے والے ان کے یہی افسانے ہیں۔ ان میں سے خاص طور سے جو افسانے صنف نازک کی اصلاح کے سلسلہ میں لکھے گئے ہیں ان سے مولوی صاحب کے

اس صحیح رجحان کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ جس سے اصلاح کرنے والے میں ایک امتیازی شان پیدا ہو جاتی ہے انسان کی پہلی مکتب اور ابتدائی تربیت گاہ' اس کی ماں کی گود ہے۔ بچہ کی تعلیم اسی روز سے شروع ہو جاتی ہے جس روز وہ پہلی مرتبہ دنیا میں قدم رکھتا ہے۔ اگر اسی وقت سے اس کی صحیح تربیت اور خاطر خواہ نگرانی کا خیال رکھا جائے تو اس کی تمام زندگی سدھر جاتی ہے۔ بچہ کی فطرت سفید کپڑے کے مانند ہوتی ہے۔ اس پر جیسا رنگ چڑھایئے قبول کرلے گا۔ یہ چیز رنگریز کے مذاق پر منحصر ہے کہ وہ کس قسم کا رنگ انتخاب کرتا ہے۔ غرض بچہ کی زندگی کے بننے اور سنورنے کی ابتداً تمام ذمہ داری بچہ کی ماں پر ہوتی ہے اگر ہم اپنی قوم میں اعلیٰ تہذیب اعلیٰ اخلاق، سچے خدا پرست اور صحیح انسان دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں عورتوں کی اصلاح اور تربیت کا بہتر سے بہتر طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ مولوی نذیر احمد مرحوم اردو کے افسانہ نگاروں میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس راز کو سمجھا۔ اسی لئے تقریباً ان کے تمام افسانے عورتوں اور عورتوں کی معاشرت کی اصلاح سے بحث کرتے ہیں۔

مولوی صاحب سچے ادیب اور حقیقی افسانہ نگار تھے۔ فطرت کے متعلق عمیق مطالعہ، گہرا مشاہدہ حساس دل حُسنِ بیان۔ جودت طبع یہ سب وہ چیزیں ہیں جو افسانہ نگار کی زندگی کا اہم جزو ہیں۔ ان میں سے ایک چیز بھی کم ہو تو افسانہ نگار نامکمل اور اس کی ادبی کاوشیں تشنۂ تکمیل رہ جاتی ہیں۔ مولوی صاحب کے کسی افسانے کو بھی لے لیجئے۔ ان میں یہ سب باتیں بیک وقت پائی جائیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے دنیائے ادب میں بہت اونچے درجہ پر نظر آتے ہیں۔

قصہ نویس کے لئے سیرت نگاری کا فن بھی بہت اہم ہے دراصل قصہ کی خوبی اور خرابی اس کے کردار کی سیرت نگاری میں مضمر ہوتی ہے۔ جس رنگ میں قصہ نویس اپنے کردار کو پیش کرنا چاہتا ہے اس میں اس رعایت سے بعض ایسے فضائل پیدا کرتا ہے جو اس کو عام طور سے ممتاز کر دیتے ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ قصہ کسی خاص مقصد کے ماتحت لکھا جائے۔ اگر قصّہ لکھنے میں کوئی خاص مقصد افسانہ نگار کے سامنے نہ ہو۔ تو سیرت نگاری ناقص اور نامکمل رہجاتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص رزمیہ افسانہ لکھے تو ضروری ہے کہ اس کے کردار میں جنگ وجدل، حرب وضرب اور زدرقوت کے وہ

تمام اوصاف موجود ہوں جو اس کو عام بہادروں سے متمیز کردیں ۔ جیسے فردوسی کے یہاں "رستم" اور داستان امیر حمزہ میں "امیر حمزہ" کے کردار ۔ پھر یہ کہ جو کردار پیش کیا جائے خواہ وہ کسی قسم کا بھی ہو پڑھنے والے کو اس کی ذات سے ایک خاص قسم کی دلچسپی پیدا ہو جانی چاہئے ۔ اس کے علاوہ قصہ میں اپنے طرز بیان سے "کردار" کو اس طرح پیش کرے کہ "کردار" قصہ کی خیالی دنیا سے نکل کر پڑھنے والے کے ذہن میں ایک محسوس اور موجود بالذات شے کی طرح اپنے تمام احساسات اور وجود کے تمام لوازمات کے ساتھ سما جائے اور پڑھنے والے کو یہ معلوم ہونے لگے کہ جس شخص کا قصّہ میں پڑھ رہا ہوں وہ کوئی خیالی تصویر نہیں بلکہ ایک جیتا جاگتا آدمی ہے جس سے میں خود باتیں کر رہا ہوں ۔ یا خود پڑھنے والے کی شخصیت شعوری طور پر اس کے افسانوں کے کرداروں کا جزو بن جائے ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ اس لحاظ سے اگر مولوی صاحب کے افسانوں پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے افسانہ نگاروں میں مولوی صاحب کا رتبہ اس اعتبار سے بھی بہت بلند ہے ۔ ذیل میں ہم "توبۃ النصوح" کا ایک اقتباس درج کرتے ہیں ۔ جس سے آپ مولانا کی سیرت نگاری کا اچھی طرح اندازہ کر سکتے ہیں ۔

> "جب حضرت بی اپنے پڑھنے سے فارغ ہوئیں تو انہوں نے مجھ سے کہا بیٹا گو تم نے مجھ کو سلام نہیں کیا لیکن ضرور ہے کہ میں تم کو دعا دوں ۔ جیتے رہو ۔ عمر دراز ہو خدا نیک ہدایت دے ۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ میں غیرت کے مارے زمین میں گڑ گیا ۔ اور فوراً میں نے اٹھ کر نہایت ادب کے ساتھ سلام کیا ۔ تب حضرت بی نے فرمایا کہ بیٹا بُرا نہ ماننا یہ بھلے مانسوں کا دستور ہے کہ اپنے سے جو بڑا ہوتا ہے اس کو سلام کر لیا کرتے ہیں اور میں تم کو نہ ٹوکتی ۔ لیکن تم میرے بچّوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہو ۔ اس سبب سے مجھے جتا دینا ضروری تھا ۔"
>
> توبۃ النصوح صـ ۶۲

اس عبارت کے پڑھنے سے ایک بہت ہی خدار سیدہ اور بزرگ عورت کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی ہے جس میں بزرگی اور شفقت کے ساتھ وہ تمام اوصاف موجود ہیں جن کو ایک ایسی عورت

میں ضرور پایا جانا چاہیئے جسکو بچوں کی تربیت میں ملکہ حاصل ہو۔ اور جو تربیت کے اہم مقصد سے بھی اچھی طرح واقف ہو۔ پھر یہ کہ گفتگو کا انداز کچھ ایسا ہنچا تلا ہے کہ وہ ایک خاص قسم کی عورتوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس سے حضرت بی کی صحیح سیرت پڑھنے والوں کے سامنے آجاتی ہے اگرچہ خود مولوی صاحب نے اُن کے اوصاف کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

عام طور سے قصہ میں جو کردار پیش کئے جاتے ہیں تو قصہ نویس ان کی ظاہری شکل و صورت کا بھی خاکہ بیان کرتا ہے تاکہ اس سے ان کے اوضاع و اطوار اور دماغی اور اخلاقی کیفیت کا پتہ چل سکے۔ اگرچہ اس طریقہ کو فنی اعتبار سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے لیکن میرے خیال میں اس سے خود قصہ نویس کی قابلیت کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا شکل و شمائل کے متعلق چند خصوصیات ایسی تسلیم کر لی گئی ہیں۔ جن کو جان لینے کے بعد کچھ قصہ نویس ہی پر منحصر نہیں ہر شخص لوگوں کے متعلق کچھ نہ کچھ بتا سکتا ہے لیکن اگر قصہ نویس اپنے کردار کی اخلاقی اور دماغی کیفیت بیان کرے تو اس صورت میں اس کی قوت مشاہدہ اور تخیل کی بلندی کا پتہ چلایا جاسکتا ہے۔ مولوی نذیر احمد مرحوم اس اعتبار سے بھی ایک کامیاب افسانہ نویس نظر آتے ہیں "توبتہ النصوح" میں انہوں نے ایک ایسی لڑکی کا کردار پیش کیا ہے۔ جسکو ماں باپ کا لاڈ پیار اور دولت کی فراوانی نے بگاڑ دیا تھا جن الفاظ میں اس لڑکی کی سیرت پر روشنی ڈالی گئی ہے اس کا لطف کچھ وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جنہیں اس قسم کی باتیں دیکھنے کا خود اتفاق ہوا ہو۔ عبارت ملاحظہ ہو۔

> " ادھر تو نصوح اور سلیم دونوں باپ بیٹوں میں یہ گفتگو ہو رہی تھی ادھر اتنی ہی دیر میں فہمیدہ اور بڑی بیٹی نعیمہ میں خاصی ایک جھوڑ ہو گئی نعیمہ اس وقت دو برس کی بیاہی ہوئی تھی۔ پانچ مہینہ کا پہلونٹی کا لڑکا گود میں تھا۔ ناز و نعمت میں پلی۔ نانی کی چہیتی، ماں کی لاڈو۔ مزاج کچھ تو قدرتی تیز، ماں باپ کے لاڈ پیار سے وہی کہاوت ہے۔ کریلا اور نیم چڑھا، اور بھی چڑچڑا ہو گیا تھا۔ ساس نندوں میں بھلا اس مزاج کی عورت کا کیوں گزر ہونے لگا تھا۔ گھونگھٹ کے ساتھ منہ کھلا اور منہ کا کھلنا تھا کہ سسرال کا آنا جانا بند ہو گیا۔ اب چھ مہینے سے ماں کے گھر بیٹھی ہوئی تھی مگر

رسی جلی پر بل نہ گیا۔ باوجودیکہ اجڑی ہوئی میکہ میں پڑی تھی۔ مزاج میں وہی طنطنہ تھا۔ کنوارپنے ہی میں تو گز کی زبان تھی۔ کچھ یونہی سا لحاظ بڑی بوڑھیوں کا تھا۔ سو بیاہے سے ان کو بھی دھتکار بتائی۔ بیٹا جنے پیچھے اور بھی کھل کھیلی۔ مردوں تک کا لحاظ اٹھا دیا۔"

اچھے افسانہ نگار کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کی نظر چھوٹی بڑی، اہم غیر اہم سب باتوں پر رہتی ہے۔ یہ چیز بھی مولوی صاحب کے افسانوں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ ابن الوقت میں جہاں مولوی صاحب نے ہندوستان کی مفلسی کے اہم اسباب گنائے ہیں، وہاں ان کی نظر سے وہ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی نہیں بچ سکیں۔ جو ان بڑے اسباب سے زیادہ ہماری مفلسی پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔ ہندوستان میں قاعدہ ہے کہ جب لوگ کہیں سفر پر جاتے ہیں تو حقہ اور حقہ کے لوازمات سب ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ جب تک بیل گاڑیوں میں لوگ سفر کرتے تھے یہ وضع نبھ جاتی تھی۔ لیکن جب سے ریل جاری ہوئی۔ تو بڑی دقت کا سامنا ہوا۔ ریل میں آگ وغیرہ کا جلانا اور بھرنا یہ سب اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ لہذا اس کا بدل کوئی ضرور ہونا چاہئے۔ اس چیز کو مولوی صاحب اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"کم بخت حقہ کی کیا تدبیر کرنی ہوگی۔ سنا ہے کہ ریل میں تو پینا نہیں ملتا۔ چلتی گاڑی میں لوگ چوری چھپے کوئلہ سلگا کر اپنا کام کر لیتے ہیں۔ پر ایسے حقہ میں کیا خاک مزا ملتا ہوگا۔ سوکھا ہوا نیچہ، خالی حقہ اس پر گھبراہٹ کہ ایسا نہ ہو اسٹیشن آ جائے چرٹ سب سے اچھا کہ خاصی طرح دندناتے ہوئے پیتے چلے جا رہے ہیں۔ کسی کی مجال نہیں کہ ہوں تو کہے اور ساتھ کے بیٹھنے والے بھی جی میں کہتے ہوں گے کہ ہاں بھئی یہ بھی کوئی ہیں۔ پر چرٹ پر کڑک جانے کا بڑا عیب ہے اور کم بخت دھواں نہیں دیتا۔ سارا بکس لیں تو حفاظت سے رہے۔ بنچ کے نیچے بھی ڈال دو کچھ پروا نہیں۔ چھوٹے سے چھوٹا دیسی چرٹوں کا بکس آٹھ دس آنے کو آئے گا۔ کیا بڑی بات ہے۔ راستہ تو کٹے گا۔

دوسری مثال ملاحظہ فرمایئے۔ "توبۃ النصوح" میں نصوح بیمار پڑتا ہے۔ اگرچہ نصوح بہت زیادہ آزاد خیال اور بے پروا آدمی تھا موت زندگی دونوں میں کچھ فرق نہ کرتا تھا عموماً کہا کرتا تھا۔

"خدا کی شان ہے ایسے لوگ بھی ہیں کہ دنیا سے ان کا نکلنے کو جی ہی نہیں چاہتا نہیں معلوم دنیا کی کونسی ادا ان کو پسند ہوتی ہے۔ ورنہ استغفر اللہ یہ دار المحن انسان کے رہنے کے قابل ہے؟..... مرنا بھی ایک نعمت ہے"۔

مگر جب وہ خود بیمار پڑتا ہے اور زندگی سے مایوس ہو جاتا ہے تو اسوقت جو اس پر کیفیت طاری ہوتی ہے اس کو مولوی صاحب نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"جس جس پہلو سے غور کرتا تھا اپنا مرنا اُسے بے وقت معلوم ہوتا تھا۔ بیوی کو دیکھ دیکھ کر اپنے جی میں سوچتا تھا کہ بھلا کوئی عمر اس کی بیوہ ہونے کی ہے؟ نہ تو اس کے میکے میں کوئی اتنا ہے کہ اس کا متکفل ہو نہ بیٹوں میں کوئی اس قابل ہے کہ گھر کو سنبھالے اندوختہ جو ہے سو واجبی ہے۔ کب تک اکتفا کرے گا۔ دو ناکتخدا بیٹیاں اُس کے آگے ہیں۔ کچا ساتھ، خالی ہاتھ۔ بچّوں کی پرورش کیسے ہوگی۔ کہیں سے کوڑی کی آمد کا آسرا نہیں۔ کیا ہوگا اور کیونکر یہ پہاڑ زندگی اس کی کاٹے کٹے گی"۔

غرض جس پہلو سے نظر ڈالئے مولوی صاحب کے افسانے نہ صرف فنی اعتبار سے بلکہ اپنے مقصد کے اعتبار سے نہایت اہم اور اردو ادب کے لئے قابل ناز سرمایہ ہیں۔

ان افسانوں کے علاوہ مولوی صاحب نے مذہب پر بھی بہت سی کتابیں لکھیں۔ جن میں قرآن پاک کا ترجمہ اور "الحقوق والفرائض" خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ قرآن کے ترجمے میں بھی مولوی صاحب کے سامنے علمار اور فصحا رنہیں بلکہ عام لوگ رہتے ہیں جنھیں اپنے مذہب اور اپنی زندگی کے دستور العمل کے متعلق کچھ نہ کچھ جاننا نہایت ضروری ہے۔ اسی لئے قرآن کا ترجمہ بہت سیدھی سادھی زبان میں کیا گیا ہے جو عام طور سے بولی اور سمجھی جاتی ہے تاکہ معمولی قابلیت کے لوگ بھی آسانی سے سمجھ لیں کہ قرآن کیا ہے اور ہم سے کیا چاہتا ہے۔

الحقوق و الفرائض میں "حقوق اللہ" اور "حقوق العباد" کی تشریح کی گئی ہے۔ اس کے پہلے حصہ میں عبادت کے تمام ارکان اور ان کے جزئیات پر روشنی ڈالی ہے اور دوسرے حصہ میں آپس کے تعلقات پر بحث کی گئی ہے۔ مثلاً بچوں کا تعلق والدین کے ساتھ اور والدین کا بچوں کے۔ ہمسایہ کے ساتھ، رعایا کا راعی کے ساتھ اور راعی کا رعایا کے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ان چیزوں کے بعد مولوی صاحب کی تقاریر کا نمبر آتا ہے۔ یہ تقریریں، طبیہ کالج دہلی۔ انجمن حمایت الاسلام لاہور اور مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے جلسوں میں مختلف موقعوں پر کی گئی ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر بھی وہی مسلمانوں کی اصلاح اور مسلمانوں کی بہبودی ہے۔ زیادہ تر ان میں مسلمانوں کی مذہبی پستی کا گلہ کیا گیا ہے چنانچہ ایک تقریر میں اس چیز پر روشنی ڈالی ہے کہ تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم کا ہونا بھی ضروری ہے فرماتے ہیں۔

"تعلیم کیسی ہی مکمل کیوں نہ ہو۔ مارلز کے بدون کچھ بھی فائدہ نہیں دے سکتی اور مارلز بدون مذہب کے درست نہیں ہو سکتے۔ بیشک سوسائٹی کو مارلز کے فارمیشن میں دخل عظیم ہے لیکن جو مارلز صرف سوسائٹی کے انفلونس پر مبنی ہوں راسخ نہیں ہو سکتے۔۔۔۔۔ اگر دین و مذہب سے الگ رہ کر لوگوں کو تعلیم دی جائے تو میرے نزدیک اس کی مثال ایسی ہوگی کہ چلبلے اور شریر لڑکے کو راجز کا چاقو کھیلنے کے لئے پکڑا دیا جائے۔ وہ ضرور اپنا ہاتھ کاٹ کر رہے گا۔ اگرچہ تعلیم کا ایورج تھوڑا ہے۔ مگر اب بھی ایسی مثالیں بہت ہیں کہ کالج یا اسکول سے نکل کر لوگ آفس لایف میں تعلیم سے راحت کی جگہ طرح طرح کی ایذائیں پاتے ہیں۔ اور ان کا یہی سبب ہوتا ہے کہ مارلز کی خبرگیری نہیں کی گئی۔ بیشک مذہب میں ایسی بھی بہت سی باتیں ہیں جن کو تمدن سے کچھ علاقہ نہیں۔ لیکن واقع میں مذہب اور خاص کر مذہب اسلام ایسا جامع دستور العمل ہے کہ کسی حالت کا آدمی ہو۔ مرد اور عورت، عالم اور جاہل، تونگر اور مفلس۔ تندرست اور بیمار، مقیم اور مسافر، حاکم اور محکوم، لاولد اور صاحب اولاد مجرد اور متاہل، اس کو تمام زندگی میں جو کچھ کرنا ہے۔ اس دستور العمل میں اس کے

لئے ہدایت موجود ہے۔"

لکچروں کا مجموعہ جلد اول ص ٦٥-٦٦

موجودہ تعلیم سے ہندوستان کی طبیعت پر جہاں اور برے اثرات مرتب ہوئے ہیں وہاں ایک اثر یہ بھی پڑا ہے کہ ہمارے قیام وطعام کے طور طریق بھی انگریزوں سے ملتے جلتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ ہم میں طالب علموں کی خو بو ہے اور نہ ہمیں طالب علم بنایا جاتا ہے۔ ایک تقریر میں مولانا نے اس پر تنقید کی ہے:۔

"ایک رنگ اسکولوں اور کالجوں کے طالب علموں کا ہے کہ ان کو دو وقت کے کھانے کے علاوہ کہ وہ بھی انگریزی ہو تو ہڑپ اور ہندوستانی ہو تو تھو تھو دوزخ شکم بھرنے کے لئے چاہیئے۔ بریک فاسٹ، اور ٹفن، اور ٹی اور ایگز اور فروٹس اور ہاٹ نوٹ۔ ہماری میٹرل اور نیٹل طالب علمی میں ستر عورت اور دفع حر و برد کے لیئے، موٹا جھوٹا کپڑا میسر آگیا تو کافی سمجھا جاتا تھا۔ اب کچھ نہ ہو تو شرٹ، پتلون اور کوٹ، ہینڈ کرچیف، سٹاکنگز، گلوز، فر، اور پھر مصیبت یہ کہ کھانے کے کپڑے اور، ہوا خوری کے کپڑے اور، اور کالج آورز کے اور، سونے کے اور، کھانسنے اور چھینکنے کے اور۔ ایک پاکٹ میں بزاز، ایک پاکٹ میں درزی۔ تو یہ ہے یار دوسروں کی کمائی پر یہ شتر غمزے۔ کیا فرق ہے ان طالب علموں میں اور ان سولجروں میں جو گرمی بھر خس خانوں میں پڑے اینڈیں۔ سولجر اور اس قدر آرام طلبی، اور طالب علم اور اس میں اس درجہ بناؤ سنگار۔ اے وہ انگریزی طور کا سہی۔ یہ سنس کے طور جو سکھائے جاتے ہیں۔ ہیں تو خوش لیکن یہ لوگ کالج کا سا ہموار صحن اپنے گھر میں کہاں پائیں گے۔"

لکچروں کا مجموعہ جلد اوّل ص ۲۵۳

تقریریں دلچسپ ہیں۔ اگرچہ لمبی ہوتی ہیں۔ اور عربی اور انگریزی لفظوں کی بھرمار اور فلسفیانہ

نکتوں کے درمیان میں آجانے کی وجہ سے عام لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہو جاتی ہیں۔ مگر انداز بیان ایسا دلچسپ ہے کہ سننے والے اکتاتے نہیں ہوں گے۔ اس کے علاوہ مولوی صاحب جوش تقریر میں جس پر بہت کم مقررین قابو پا سکتے ہیں۔ اصل موضوع سے ہٹ کر ادھر ادھر نکل جاتے ہیں اور کہیں آخر میں جا کر اصل موضوع کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے تقاریر ضرورت سے زیادہ لمبی ہو گئی ہیں۔

آیئے آخر میں ایک نظر مولوی صاحب کی زبان پر بھی ڈال جائیں۔ یوں تو مولوی صاحب کا اصل وطن بجنور تھا لیکن بچپن سے دلی میں رہتے رہتے یہیں کے ہو رہے تھے۔ اسی لئے جو کچھ کہتے تھے یہیں کی بولی میں کہتے تھے اور یہیں کے محاورے استعمال کرتے تھے۔ اپنے افسانوں میں جہاں جہاں مولانا نے عورتوں کی زبان میں باتیں کی ہیں۔ اس سے دلّی کی مرحوم زبان کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ وہ گھریلو محاورے جو مولوی صاحب استعمال کر جاتے ہیں۔ شاید اب دلی کے کسی گھر میں بھی سننے نصیب نہ ہوں گے۔ دلی والے مر گئے اور ان کے ساتھ ان کی زبان بھی دفن ہو گئی لیکن اگر بحیثیت مجموعی مولانا کی زبان پر نظر ڈالی جائے تو اس میں جہاں بہت سی خوبیاں ہیں وہاں خامیاں بھی ملینگی۔ مولوی صاحب نے اپنی عبارتوں میں بیشتر عربی کے جملے اور عربی کے بڑے بڑے الفاظ استعمال کئے ہیں جن سے اکثر جگہ زبان کی سلاست باقی نہیں رہی۔ اس کے علاوہ مولانا نے بعض ایسے محاورے بھی استعمال کئے ہیں جو دلی سے باہر کسی دوسری جگہ سننے میں بھی نہ آتے ہوں گے۔ ایک جگہ مولوی صاحب نے اپنی زبان کے متعلق خود لکھا ہے:۔

> "میری زبان اُردو ہے اور میں اردو ہی بولتا ہوں مگر اس میں...... عربی کے الفاظ ہوتے ہیں۔ اس واسطے کہ میں مسلمان ہوں اور چاہتا ہوں کہ سب میری طرح کے مسلمان ہوں اور کم سے کم اتنی عربی جانیں جتنی مجھ کو آتی ہے۔"

کلام اللہ کے ترجمے میں مولانا نے بہت سی ایسی غلطیاں کی ہیں جس کی وجہ سے ترجمہ ایک حد تک غیر مستند سمجھا جاتا ہے۔ ترجمے کو سہل اور قریب الفہم بنانے کی غرض سے انہوں نے اردو کے ایسے الفاظ اور محاورے استعمال کئے جو اصل کے الفاظ یا جملوں کی صحیح ترجمانی کرنے سے قاصر ہیں۔

زبان کی ایک خاص خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس کے ذریعہ جس واقعہ یا جس کیفیت کو بیان کیا جائے اس کی تصویر ہو بہو پڑھنے والوں کے سامنے کھنچ جائے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ بیان کرنے والوں کو زبان پر پوری پوری قدرت حاصل ہو تاکہ وہ موقع اور محل کی مناسبت سے ایسے جنچے تلے الفاظ استعمال کر سکے جو سننے یا پڑھنے والوں کے سامنے اس کی صحیح ترجمانی کرنے سے قاصر نہ رہیں۔ مولوی صاحب کے یہاں یہ بات خاص طور سے پائی جاتی ہے۔ جیسا بھی مضمون ہو اس کے ادا کرنے کے لئے ان کے یہاں الفاظ کی کمی نہیں معلوم ہوتی۔ مثال کے طور پر ایک عبارت پیش کرتا ہوں۔

"اب سے دو رایک سال دہلی میں ہیضے کا اتنا زور ہوا کہ ایک حکیم بقا کے کوچے سے ہر روز تیس تیس چالیس چالیس آدمی چھپنے لگے۔ ایک بازار موت تو البتہ گرم تھا۔ ورنہ جدھر جاؤ سناٹا اور ویرانی جس طرف نگاہ کرو وحشت و پریشانی جن بازاروں میں آدھی رات تک کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ ایسے اجڑے پڑے تھے کہ دن دوپہر جاتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا تھا۔ کٹوروں کی جھنکار موقوف، سودے والوں کی پکار بند، ملنا جلنا۔ اختلاط و ملاقات، آمد و شد، بیمار پرسی و عیادت، بازدید و زیارت، مہمانداری و ضیافت کل رسمیں لوگوں نے اٹھادیں۔ ہر شخص اپنی حالت میں مبتلا۔ مصیبت میں گرفتار، زندگی سے مایوس۔ کہنے کو زندہ پر مردے سے بد تر۔ نہ دل میں ہمت نہ ہاتھ پاؤں میں سکت۔........"

عبارت بالکل سادہ ہے کہیں کوئی ایسا لفظ نہیں آیا جس سے ہیضے یا وبا کی ہیبت ٹپکتی ہو۔ مگر پھر بھی پڑھنے والے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ بات یہ ہے کہ الفاظ میں اگرچہ زور و شور نہیں لیکن موقع اور محل کی مناسبت بدرجہ اتم موجود ہے۔

بعض لوگوں نے مولوی صاحب کی زبان پر بازاری ہونے کا الزام لگایا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ کتابی زبان اور عام بول چال کی زبان میں فرق برتا جاتا ہے۔ مگر مولوی صاحب نے اس کا خیال نہیں رکھا۔ اور وہ بے سوچے سمجھے ایسے جملے اور لفظ استعمال کر گئے ہیں جو بے پڑھے لکھے لوگ بولتے ہیں شاید

ان حضرات کا یہ اعتراض صحیح ہوتا اگر وہ مولانا کے مقصد کو اچھی طرح سمجھ لیتے۔ مولوی صاحب نے جو کچھ لکھا وہ اپنی قوم کی اصلاح کے لیئے لکھا۔ اس لئے ضروری تھا کہ مولانا انہیں اسی زبان میں مخاطب کرتے جسے وہ خود بھی اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ زبان کا سرچشمہ عام لوگوں کی بولی ہوتی ہے۔ اور اسی ٹکسال میں زبان کا کھرا کھوٹا پرکھا جاتا ہے اور یہیں نئے الفاظ وجود میں آتے ہیں۔ اہل تصنیف کا کام صرف اس قدر ہے کہ وہ اُن الفاظ کی صحیح ترتیب اور ان کے معنی کا جو مفہوم قرار پا چکا ہے اس کو ایک نہج پر قائم رکھیں۔ اور صنعت کی قلم کاری سے ان میں وہ حسن پیدا کر دیں جو زبان کو شُستہ رفتہ، اور پختہ بنا دے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا عام محاوروں اور لفظوں کے استعمال سے کبھی گریز نہ کرتے تھے۔

غرض جس اعتبار سے بھی دیکھا جائے مولوی نذیر احمد مرحوم اپنے ہی زمانے کے نہیں بلکہ آنے والے زمانے کے لئے بھی ایک باکمال افسانہ نگار اور ایک کامیاب مصلح ثابت ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو باغ انہوں نے لگایا ہے اس کی بہار عارضی نہیں بلکہ دائمی ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ جو کچھ مولانا مرحوم کر گئے وہ بہت کافی ہے اور آگے اب کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ قومی اعتبار سے ہماری حالت ابھی تک بہت پست ہے اس کے لئے ہمیں جان توڑ کوشش کرنی چاہیئے۔ اگر ہمارے یہاں کے مصنف اور افسانہ نگار صحیح معنوں میں مصنف اور افسانہ نگار بننا چاہتے ہیں تو انہیں چاہئے کہ وہ اپنی قوم کے درد کو محسوس کریں۔ اور نذیر احمد کی طرح اس درد سے بے تاب ہو کر اس کے علاج کی صحیح اور کارگر تدبیریں ڈھونڈھ نکالیں۔

حیاتِ نو

انقلاب روس کا ایک منظر

افراد:- وسجا - ایک نوجوان کسان
فیجا - ایک سپاہی
جنکویو - ایک فوجی عہدیدار
وانچ - فوج کا افسر
کٹچا - ایک انقلاب پسند عورت
نتاشا - وسجا کی بہن - دیہاتی لڑکی
بہت سے سپاہی

منظر:- [جولائی ۱۹۱۹ء۔ سویٹ روس کے علاقہ لاڈ میر کے ایک غیر آباد کٹیا میں پولٹیکل پولیس کا ایک دستہ مقیم ہے اس کٹیا کا ایک کمرہ دفتر کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اس کی پچھلی طرف ایک دروازہ کھلتا ہے جس کا رخ گاؤں کی طرف ہے۔ کٹیا کے سامنے فیجا ایک ادھیڑ عمر کا سپاہی بیٹھا لکھ رہا ہے۔ دیوار کے پاس وسجا ایک بائیس سالہ نوجوان بیٹھا سپاہی کا کوٹ سی رہا ہے۔ اور گا رہا ہے۔]

فیجا - وسجا۔ تم بھی عجیب آدمی ہو۔ کل تمہیں گولی سے اُڑا دیا جائے گا۔ اور آج تم گا رہے ہو۔

وسجا - بہت اچھا۔ اور تمہاری حالت کیا ہے؟ کیا تم بھی میری طرح قیدی نہیں۔ اور میں تمہاری غلامی کا نشان تیار کر رہا ہوں۔ لو اب میں گانا بند کر دیتا ہوں۔ کیا میری وجہ سے تمہارے کام میں کچھ خلل پیدا ہوتا ہے؟

فیجا - وہ کیسے؟

وسجا - میرے گانے سے۔

فیجا - ہاں یہ میرے کام میں خلل ڈالتا ہے۔ اس تکلیف دہ کام میں ہر چیز مخل ہوتی ہے۔ میں نے اُستاد

سے لکھنے کا ڈھنگ نہیں سیکھا۔ ان الفاظ کو تحریر کرنے سے تو پتھر توڑنا زیادہ آسان ہے۔ اور پھر پیٹ سے بھوکے رہ کر۔ لیکن تم ہو کہ گائے جا رہے ہو!

وسجا۔ آخر دل بہلا دے کے لئے کچھ تو کرنا چاہئے [اٹھ کر میز کی طرف بڑھتا ہے] لاؤ میں تمہاری مدد کروں تمہارا خط اتنا خراب نہیں لیکن تم لکھ کیا رہے ہو؟

فیجا۔ گاؤں کے ان نوجوانوں کے نام جو سترہ سال سے بڑے ہیں۔ اور جو آنے والی جنگ میں کام دے سکتے ہیں۔

[وسجا سر ہلا کر واپس اپنی جگہ پر جا بیٹھتا ہے] واہ! میں تو سمجھا تھا۔ کہ تم اس کام میری مدد کروگے اور تم میز پر جا بیٹھے ہو۔

وسجا۔ میں اس کام میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ جانتے ہو میں نے فوج میں اپنا نام کیوں نہیں لکھوایا؟

فیجا۔ اس لئے کہ تم گولی چلانا نہیں چاہتے؟ لیکن نام لکھنا اور گولی چلانا ایک ہی بات نہیں؟ اچھا جاؤ میرے کوٹ کی مرمت کر دو۔ اور اگر تم گانا چاہو تو گائے جاؤ۔

وسجا۔ تم نہیں سمجھتے کہ ان لڑکوں کے نام لکھنا اور گولی چلانا برابر ہے۔ جن لڑکوں کے نام تم لکھ رہے ہو ان کو گولی چلانی پڑیگی۔

فیجا۔ تم کتنے بیوقوف ہو۔ ان کے نام تو میں لکھ رہا ہوں۔ پھر تم خواہ مخواہ کیوں مرے جاتے ہو۔

وسجا۔ مجھے اس سے دکھ ہوتا ہے۔ اگر تم ان کے نام نہ لکھو تو اس میں کیا ہرج ہے؟

فیجا۔ تو پھر تمہاری طرح مجھے گولی کا نشانہ بنا دیا جائے گا۔

وسجا۔ بہت کچھ اور پھر ــــــ

فیجا۔ یہ تم اسوقت پوچھنا جب تمہیں گولی کا نشانہ بنایا جائے گا۔

وسجا۔ فیجا خدا را ذرا سوچو اگر تم یہ نام نہ لکھو تو پھر اور کون لکھ سکتا ہے؟

فیجا۔ اس سے ہمیں بہت نقصان ہوگا۔ یہاں میرے سوا اور کوئی دوسرا شخص نہیں لکھ سکتا! نہیں کسی شخص کو ماسکو سے منگوانا پڑے گا۔

وسجا۔ اگر یہ شخص بھی ان موت کے حکمناموں کو کمل نہ کرے تو پھر؟۔

فیجا۔ تو پھر ہمارے مخالفین کا پنجہ ہماری گردنوں پر ہوگا۔ اور ہم نیست و نابود کر دیئے جائیں گے۔ تم ڈینکن اور کاپجک کو نہیں جانتے۔

وسجا۔ کون؟

فیجا۔ وہی خونخوار کتے!

وسجا۔ ہاں یہ دو شخص ہیں اور ہمارے بچوں کو تباہ کر دیں گے!

فیجا۔ یہ دو شخص نہیں بلکہ اُن کی بے انتہا فوج اور سامان جنگ۔

وسجا۔ اگر ان کے سپاہی لڑنے سے انکار کر دیں۔ اور اُن کے افسر جبری بھرتی نہ کریں۔ تو پھر؟

فیجا۔ یہ فضول بات مت کہو۔ بھلا ڈینکن کے سپاہی اور گولی نہ چلائیں کیا تم نے انہیں بھی اپنی طرح کاٹھ کا الو سمجھ رکھا ہے۔ کہ جو ملا اس کی خدمت کر دی! وہ تو ڈاکوا ور قاتل ہیں۔ تمہاری طرح نرم دل نہیں۔

وسجا۔ مجھ میں خاص کیا بات ہے۔ میں ایک معمولی درزی ہوں ـــــ لو اپنا کوٹ [فیجا کا کوٹ اس طرف پھینکتا ہے]

فیجا۔ شکریہ۔ اس کی مزدوری کیا لوگے؟

وسجا۔ کاغذ اور پنسل۔ مجھے اپنی ماں کو ایک خط لکھنا ہے۔ کیا مجھے کچھ دیر اور انتظار کرنا پڑے گا؟

فیجا۔ قاصد ابھی جا رہا ہے۔

وسجا۔ لیکن شاید تھوڑی دیر میں میرا قصہ ہی تمام ہو جائے۔

فیجا۔ ایسا نہ کہو تم بہت اچھے نوجوان ہو۔ تم بائبل پڑھ سکتے ہو اور خط لکھ سکتے ہو۔ میرا کہنا مانو اور اپنا نام لکھو۔ لڑائی میں گولی نہ چلانا۔ بھلا وہاں تمہیں کون دیکھے گا؟۔

وسجا۔ میں انہیں دکھانا چاہتا ہوں۔ کہ ایک ایسا بھی شخص ہے۔ جو انسانوں کو گولی کا نشانہ نہیں بنانا چاہتا۔ تم مجھے کاغذ دو۔ میں لکھنا چاہتا ہوں۔ [فیجا اس کو کاغذ اور پنسل دیتا ہے وسجا

لکھنے لگتا ہے۔ کہ جیکب جو پولیس کا نوجوان افسر ہے اندر داخل ہوتا ہے]

جیکب۔ فیجا۔ کیا وہ ناموں کی فہرست تیار ہو گئی ہے؟

فیجا۔ ہاں کامریڈ فہرست تیار ہے۔ میں تو یہاں بھوکا پیاسا پڑے رہنے اور تمام دن فہرستیں تیار کرتے کرتے تنگ آگیا ہوں۔

جیکب۔ فضول باتیں مت کرو۔ مجھے ان فہرستوں کی فوری ضرورت ہے۔ ریزرو فوج میں کوئی بھرتی نہیں ہوگی۔ اور تم اپنا دکھڑا رو رہے ہو۔

فیجا۔ روٹی کے بغیر تو میں کچھ نہیں کر سکتا۔ اور تم جانتے ہو کہ لکھنا میرے لیئے آسان کام نہیں۔ میں نے وسجا کی طرح کسی استاد سے لکھنا پڑھنا نہ سیکھا تھا۔

وسجا۔ بھائی خوب گاؤ۔ تمہارے دکھ کا یہی علاج ہے [جیکب کو خندہ پیشانی سے مخاطب کرتا ہے] کامریڈ خوش آمدید۔ میرا یہ خیال درست نہیں کہ گانے سے انسان بھوک کو بھول جاتا ہے؟

جیکب۔ ہاں زندہ دلی اسی کا نام ہے۔ وسجا! کیا تم لکھنا جانتے ہو؟ ہم تم سے محرر کا کام لے سکتے ہیں تمہیں جنگ میں جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔ لیکن تم کچھ عجیب آدمی ہو۔ میں تمہیں سمجھ نہیں سکا۔

وسجا۔ اگر تم مجھے نہیں سمجھ سکے۔ تو پھر مجھے عجیب کہنے سے کیا مطلب؟

جیکب۔ یہ لمبی چوڑی باتیں مت کرو۔ تم بہت اکھڑ آدمی ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں سپاہی بن کر بہت خوش ہوں؟

وسجا۔ تمہیں کس بات نے مجبور کیا۔ کہ تم سپاہی بنو۔

جیکب۔ زمانے کی ضرورت۔ کیا تم پرانے نظام کو پھر قائم کرنا چاہتے ہو؟ یعنی زار۔ اس کے نواب، تازیانہ کی سزا۔ اور پانچ برس کی جبری فوجی ملازمت؟ لو وہ کٹچا بھی آگئی ہے [کٹچا فوجی لباس پہنے اندر داخل ہوتی ہے]

کٹچا۔ ذرا ایک کر میرے لیئے کچھ کھانا لاؤ۔ میں بہت تھک گئی ہوں، اور میرے پاؤں

درد کر رہے ہیں۔ وسجا ذرا میرے بوٹ تو اُتار دو، اور ان کو تیل لگا کر نرم کر دو۔ تاکہ مجھے چلنے میں تکلیف نہ ہو۔

وسجا۔ تمہارے پاؤں تو بہت خراب ہو گئے ہیں۔ کامریڈ میں تمہیں موزے سی دوں گا۔ تمہاری جرابیں بھی تو اچھی نہیں ہیں [وہ بوٹ اتارتا ہے۔ اور پھر جیکب کی طرف متوجہ ہوتا ہے] مجھے اجازت دیجئے کہ میں تھوڑی دیر باہر جا کر بوٹوں کو تیل لگا آؤں۔ [جیکب مڑتا ہے۔ گویا وہ بےچین ہے]

جیکب۔ فیجا تم اس کے ساتھ جاؤ۔

وسجا۔ کامریڈ کیوں؟ تم جانتے ہو کہ میں بھاگنے والا شخص نہیں۔

جیکب۔ اور اگر تم بھاگ جاؤ تو میں تمہیں الزام نہیں دوں گا۔

کٹجا۔ اس کے برخلاف تم بہت خوش ہو گے۔ اگر تمہارے جیسے نوجوان کو گولی کا نشانہ نہ بنا جائے تو یہ تمہارے لئے باعث مسرت ہو گا۔

جیکب۔ کٹجا! اس کا مطلب؟ میں اپنے ضمیر کے خلاف کوئی بات نہیں کرتا۔ بلکہ صرف اپنا فرض ادا کرتا ہوں۔

وسجا میں ڈرتا ہوں نہ میں بھاگ جاؤں گا۔

کٹجا۔ یہ تو ہم بھی جانتے ہیں لیکن جو کچھ ہم تمہاری نسبت خیال کرتے ہیں وہ درست ہے؟

وسجا۔ [مسکرا کر] کامریڈ تمہارا خیال درست ہے۔

جیکب۔ تم اکیلے جا سکتے ہو۔ [وسجا جانے لگتا ہے]

کٹجا۔ کیا تم کچھ کھاؤ گے نہیں؟ [وہ اسے روٹی اور سبنوسہ دیتی ہے۔ وسجا مسکراتا ہے۔ اور ذرا ہچکچاتا ہے]

وسجا۔ شکریہ۔ اس کی کیا ضرورت ہے؟ میں چھ بجے تک گزارا کر سکتا ہوں۔ شکریہ [روٹی لے لیتا ہے] صرف یہی، میں گوشت نہیں کھاتا [وہ جاتا ہے]

جیکب۔ جہاں دیکھو وسجا کا ذکر ہے۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ یہ کیا بات ہے۔ ہر جگہ اس کے نام کی قصیدہ خوانی ہو رہی ہے، اور ادھر ڈنیکن سر پر آ رہا ہے۔ [باہر سے گانے کی آواز آتی ہے۔ وسجا گا رہا ہے۔ پھر اور آوازیں بھی اس کے ساتھ مل کر گاتی ہوئی سنائی دیتی ہیں] یہ کیا ہے؟

گویا ہم کسی میلہ میں ہیں؟

فیجا۔ کامریڈ انہیں گانے دو۔ اس طرح وہ بھوک کی تکلیف کو بھول جاتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوشی یہی ہے۔

جیکب۔ ہمیں ماننا پڑے گا۔ کہ وسجا بہت بیباک شخص ہے۔

کٹجا۔ کامریڈ ہم اسے بچا سکتے ہیں۔ یہ دیکھو میں ماسکو سے کیا لائی ہوں؟ [وہ جیب سے ایک دستاویز نکالتی ہے] حکمنامہ لینن واقعی بہت بڑا آدمی ہے۔ انہوں نے ایسے لوگوں کے لئے جو جنگ کرنا یا جنگ میں مدد دینا گناہ خیال کرتے ہیں۔ ایک کونسل بنائی ہے۔ جس کا صدر طالسطائی کی کتابوں کا ناشر چرخوف ہے۔

فیجا۔ طالسطائی کتنا اچھا نام ہے۔ وسجا مجھ سے اکثر اس کے متعلق باتیں کرتا رہتا ہے وہ کسانوں الیسی زندگی بسر کرتا تھا لیکن گوشت نہ کھاتا تھا۔ اور یہ کوئی اچھی بات نہ تھی۔

جیکب۔ فیجا تم اپنا کام کرو [وہ حکمنامہ کو پڑھتا ہے] معاملہ بہت اہم ہے۔ ایسا شخص جو نہایت خلوص سے اپنے مذہبی خیالات کی بنا پر فوج میں بھرتی نہیں ہوتا اُسے فوراً رہا کر دیا جائے۔ یہ خبر تو بہت اچھی ہے۔ فیجا! ذرا وسجا کو تو بلانا۔

کٹجا۔ نہیں۔ ہرگز نہیں!

جیکب۔ پھر کیا! معاملہ بہت اہم ہے۔ شام کے چھ بجے اس کی مہلت ختم ہو رہی ہے۔

کٹجا۔ میں جانتی ہوں کہ معاملہ اہم ہے لیکن ہمیں نہایت شرافت سے کام کرنا ہوگا۔ سنو! کیا اس میں شک ہے کہ وہ مذہب پر راسخ الاعتقاد نہیں ہے؟ پھر کونسل کی کیا ضرورت ہے؟ اسے رہا کر دو، تاکہ وہ اپنی ماں کے پاس چلا جائے۔ اور کھیت میں کام کرے۔

جیکب۔ یہ نہیں ہو سکتا یہ قانون کے خلاف ہے۔ کونسل کی منظوری لینا چنداں ضروری ہے۔

کٹجا۔ لیکن وہ خود تو کبھی نہیں لکھیگا۔

جیکب۔ کیوں نہیں۔ وہ لکھنا جانتا ہے۔

کتیجا۔ میں نے جو تمہیں کہہ دیا۔ وہ نہیں لکھے گا۔ وہ بہت ضدی ہے۔ وہ قربانی دے کر مثال قائم کرنا چاہتا ہے تاکہ ہم پر اس کا گہرا اثر ہو۔

جیکب۔ تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ وہ مذہبی دیوانہ اور اپنے ضمیر کی نجات کے درپے ہے۔ جبتک ہم اُسے اپنے حال پر رہنے دیں۔ وہ ہمارے ساتھ تو کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔

کتیجا۔ کامریڈ بعض اوقات تم عقل کو جواب دے بیٹھتے ہو۔ میری بات مانو اور اسے چھوڑ دو۔

جیکب۔ تم جاکر اسے ترغیب دو۔ شاید وہ تمہارا کہنا مان جائے۔

کتیجا۔ وہ کسی کی خاطر کوئی کام نہیں کرتا۔ جسے وہ حق بات خیال کرتا ہے اسی پر ڈٹا رہتا ہے۔

[نتاشا، وسجا کی چھوٹی بہن جس کی عمر سات سال ہے۔ دروازہ میں نمودار ہوتی ہے] اندر آجاؤ! تم کیا چاہتی ہو؟ تمہارا کیا نام ہے؟ [نتاشا ایک شرمیلی لڑکی ہے۔ اور جھٹ پیچھے ہٹ جاتی ہے] فیجا! یہ لڑکی کیا چاہتی ہے؟

فیجا۔ پیاری لڑکی! ڈرو مت، [نتاشا بندوقوں کی طرف اشارہ کرتی ہے جو ایک کونے میں رکھی ہیں] اچھی لڑکی وہ تمہارے لئے نہیں۔ بلکہ گیدڑوں کے لئے ہیں۔

جیکب۔ بالکل ٹھیک! بالخصوص ڈومانگ والے گیدڑوں کے لئے۔

کتیجا۔ ذرا اپنی زبان کو لگام دو۔ نو عمر کامریڈ تم کیا چاہتی ہو؟

نتاشا۔ کیا وسجا کو ہلاک کر دیا گیا ہے؟ وہ میرا بھائی ہے۔

فیجا۔ اوہو! یہ تو وسجا کی چھوٹی بہن ہے۔ ہم نے اُسے خط لکھنے کی اجازت دے دی تھی۔ اس لئے یہ لڑکی اُسے ملنے آئی ہے۔

جیکب۔ بہت اچھا پھر اُسے بلا لو۔ [فیجا جاتا ہے۔ اور لڑکی رونے لگتی ہے]

کتیجا۔ تمہارا بھائی زندہ ہے، اپنی ماں سے کہنا کہ ہم اُسے زندہ رکھیں گے۔ لیکن وہ خود مشکلات پیدا کر رہا ہے۔

[نتاشا بہت خوش ہو جاتی ہے]

نٹاشا۔ [خوشی کے لہجہ میں] اماں جان کہتی ہیں کہ وسجا کی بات ہمیشہ سچی ہوتی ہے وہ خدا کی آواز سنتا ہے۔
[وسجا نمودار ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں کنٹچا کے بوٹ ہیں۔ نٹاشا بھائی کو دیکھ کر اس کی طرف لپکتی ہے] وسجا!

وسجا۔ کامریڈ یہ لو اپنے بوٹ۔ [نٹاشا سے] اماں جان کیسی ہیں؟ کیا تم نے گھاس اکٹھی کر لی؟
[نٹاشا جواب دینے کے بجائے جیکب اور کنٹچا کی طرف شرمیلی نگاہ سے دیکھتی ہے]

کنٹچا۔ [جیکب سے] آؤ چلیں [دونوں جھونپڑی سے باہر چلے جاتے ہیں]

وسجا۔ یہ لو خط۔ اسکو احتیاط سے رکھو۔ کہیں یہ راہ میں خراب نہ ہو جائے۔ کیونکہ بارش ہونے والی ہے۔ چھوٹے بھیا سے کہنا کہ لکھنا پڑھنا سیکھے۔ اور تم بھی سبق یاد کرتی رہنا۔

نٹاشا۔ ہاں! بھائی جان ہمارے ہاں ایک استاد آیا ہوا ہے۔ اور وہ دالان میں بیٹھا تختہ سیاہ پر لکھ رہا تھا۔

وسجا۔ سبق پڑھتی رہو۔ دیکھنا ماں کو زیادہ کام نہ کرنا پڑے۔ اس کا خیال رکھنا۔ [نٹاشا چیخ مارتی ہے] نٹاشا! رو مت۔ اماں جان سے کہنا کہ میں بہت خوش ہوں۔ مجھے اس کی یاد ہر وقت رہتی ہے۔ چھوٹے بھیا کا خیال رکھنا۔ جب کھانے کا وقت آئے۔ تو سب سے پہلے اماں کو کھانا کھلانا۔ پھر تم لوگ کھانا۔ گائے کا بچھڑا فروخت کر کے گزارہ کرنا۔ چھوٹے بھیا کو سبق کے بعد باقی وقت کے لئے بڑھئی کے پاس کام سیکھنے کے لئے بھیج دینا۔

نٹاشا۔ اگر وہ چھوٹے بھیا کو بھی پکڑنے کے لئے آ گئے تو پھر؟

وسجا۔ وہ نہیں آئیں گے۔ حالات بہت جلد بدل جائیں گے۔ تم جانتی ہو کہ اسوقت جنگ بپا ہے اور وہ بھی مجبور ہیں۔ لیکن بہرحال وہ زار سے بہتر ہیں۔ جنگ بہت جلد ختم ہو جائے گی۔ اور چھوٹے بھیا کو گھر پر رہنے دیا جائے گا۔

نٹاشا۔ بھائی جان۔ اماں تو کہتی تھیں کہ جنگ بہت دیر تک جاری رہے گی [چلاتی ہے] اور اگر وہ چھوٹے بھیا کو لے گئے؟

وسجا۔ خدا ہماری مدد کرے گا [ہنستا ہے] میرا چھوٹا بھائی سپاہی نہیں بنے گا۔ وہ اُسے نہیں لے جا سکتے۔ کیونکہ وہ ابھی ایک بچہ ہے۔

نتاشا۔ وہ اُسے لے جائیں گے۔ اور تم یہاں بیٹھے باتیں بناتے رہوگے۔ وہ بھلا کسی کو چھوڑتے بھی ہیں۔ جوزف لنگڑا تھا۔ وہ اسے بھی لے گئے۔ چھوٹے بھیّا پوچھتے تھے۔ کہ وہ اگر اُسے پکڑنے آجائیں تو وہ کیا کرے؟

وسجا۔ میں کیا بتاؤں۔ پیٹر ابھی بچہ ہے۔ وہ کیا کر سکتا ہے۔ اُسے بس یہی کہنا کہ خوب لکھے پڑھے۔ جو کام کرے اُسے ذرا سوچ لیا کرے۔ وہ ہوشیار بہت ہے۔ اسے کہنا کہ انجیل مقدّس اور طالسطائی کی کتابوں کا زیادہ مطالعہ کرے۔ اور —— [نتاشا گھبرا جاتی ہے]

نتاشا۔ بھائی جان تم اسے بھی اپنے جیسا بنانا چاہتے ہو۔ تاکہ اُسے بھی گولی سے اُڑا دیا جائے۔

وسجا۔ تم فکر نہ کرو۔ وہ میری طرح نہیں ہوگا۔ شاید وہ دوسروں کی طرح سپاہی بن کر اوروں کو گولی کا نشانہ بنائے۔

نتاشا۔ یہ بھی بڑی بات ہے۔

وسجا۔ خوب کہی تمہیں بھی یہ پسند نہیں۔ گھبراؤ نہیں۔ جنگ جلد ختم ہو جائے گی۔ اور چھوٹے بھیّا کو پکڑنے کی نوبت ہی نہ آسکے گی۔ تم بھی اس وقت تک جوان ہو کر گائے کی حفاظت کر سکو گی۔ رات ہونے سے پہلے گھر لوٹ جاؤ۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔ الوداع ——

[لڑکی کو دروازہ تک لے جاتا ہے۔ اور خود واپس آکر تختہ پر بیٹھ جاتا ہے۔ وسجا کا چہرہ کسی خیال سے سفید ہو جاتا ہے] خداوند یسوع مسیح! [وہ بیٹھا ہوا دعا مانگ رہا ہے کہ کٹجا داخل ہوتی ہے]

کٹجا۔ وسجا! وسجا!! [وہ چند لمحے رکتی ہے۔ اور پھر بے صبری سے] وسجا سنو! ایک نہایت ضروری بات ہے۔ دعا بعد میں مانگ لینا۔ یہ دعا، مانگنا کتنی واہیات بات ہے! [وسجا خاموش ہے اور جواب نہیں دیتا۔ کٹجا آہ بھر کر میز پر جا بیٹھتی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ متوجہ ہوتا ہے]

وسجا۔ کامریڈ۔ بھلا یہ بھی کوئی اچھی بات ہے۔ کہ کسی کی دعا میں خواہ مخواہ دخل جائے۔

کٹجا۔ تم تو نرے احمق ہو۔ تمہیں مذہب کا جنوں ہے۔ اور ہم لوگ عذاب میں پڑے ہوئے ہیں۔ اگر معاملہ اتنا اہم نہ ہوتا۔ تو میں تمہیں سمجھاتی بھی؟ اب وقت تھوڑا ہے۔ ذرا اپنی زبان کو روکو۔ اور سنو۔ [اس کا طرز گفتگو تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور وہ نہایت نرمی سے بات شروع کرتی ہے] تمہیں معلوم ہے کہ میں ماسکو گئی ہوئی تھی۔ اب یہ کاغذ پڑھو۔ [وسجا حکمنامے کو لے کر پڑھنا شروع کرتا ہے]

وسجا۔ خوب۔ لینن واقعی ایک بڑا آدمی ہے۔ زار کے عہد میں حالات اس سے بہت مختلف تھے۔ کامریڈ اب تو گویا دنیا ہی بدل گئی ہے [کٹجا اس کی باتیں غور سے سنتی ہے]

کٹجا۔ وسجا تمہیں اپنا بھی خیال ہے؟

وسجا۔ اپنا خیال؟ ہاں ذرا اسے دوبارہ پڑھ لوں۔

کٹجا۔ تم کونسل کو درخواست لکھو۔ وہ تمہیں چھوڑ دیں گے۔

وسجا۔ وہ میری بات پر کیسے اعتبار کریں گے؟ میں یہاں ہوں۔ اور وہ ماسکو میں ہیں۔

کٹجا۔ اس کی فکر مت کرو۔ صرف درخواست لکھ دو کہ تم مذہبی آدمی ہو اور تم نے طالسطائی کی کتابوں کا خوب مطالعہ کیا ہے۔ شیر ٹکوف ضرور تمہاری باتوں پر یقین کریگا۔ وہ طالسطائی کا گہرا دوست تھا اور تمہاری مدد کرے گا۔

وسجا۔ میں اپنی مدد آپ کر سکتا ہوں۔ حکمنامہ میں لکھا ہے کہ "جس کے متعلق یقین ہو جائے کہ اس کے خیالات مذہب پر پختہ ہیں تو اس کو رہا کر دیا جائے گا۔" بھلا تمہیں یا کسی شخص کو کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ میرے خیالات پختہ ہیں؟ کوئی میرا سینہ پھاڑ کر نہیں دیکھ سکتا کہ میں سچ بول رہا ہوں — لیکن اب تو یہ جدوجہد ہی فضول ہے۔ کیونکہ چھ بجے میرا کام تمام کر دیا جائے گا۔

کٹجا۔ تم نے تو مجھے دیوانہ بنا دیا ہے۔ تم پرلے درجے کے ضدی اور ہٹ دھرم ہو۔ تمہیں شہید ہونے کا شوق ہے۔

وسجا۔ کامریڈ یہ حکمنامہ بہت عمدہ ہے۔ اور میں تمہاری ہمدردی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

وسچا۔ تم نے میرا مطلب نہیں سمجھا۔ اس حکمنامہ سے تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ روس کے مزدوروں اور کسانوں کی جمہوریت کے عہد میں حالات بہتر ہیں۔ اور ماسکو کے بڑے لوگوں کے دل میں آزادی ضمیر کا احترام ہے۔ یقین ہمارے دل کی آواز سن سکتا ہے۔ جو درحقیقت خدا کی آواز ہے۔ یہ واقعی نئے حالات ہیں میرے جیسے دوسرے لوگ جو انسانوں کا خون بہانا نہیں چاہتے۔ وہ بھی اس اعلان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ٹیریٹکوف ان لوگوں کے دلوں کو دیکھ سکتا ہے۔

کتیا۔ خواہ کچھ ہو ہمارے لیئے ضروری ہے کہ ہم تمہیں ماسکو بھیجیں وہاں تمہیں عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ تاکہ وہ تمہارے دل کے اندر نظر ڈال سکیں۔

وسچا۔ [غمگین ہوکر] کامریڈ یہ مت کرنا۔ مجھے اس سے دُکھ ہوگا۔ میں اسکو پسند نہیں کرتا۔

کتیا۔ وسچا کیا تمہیں کوئی تکلیف ہے؟ یا کسی عورت سے محبت ہے۔ کہ تم اسقدر بے دل ہوئے جاتے ہو۔ [وسچا اشارے سے اسے روکتا ہے] تم ابھی باغ زندگی کے نوخیز درخت ہو۔ تمہیں کیا خبر ہے کہ زندگی کیا ہوتی ہے۔ محبت۔ کتابیں اور راگ یہ ہے زندگی۔ اے کاش تم نے ماسکو کی کسی بزم نشاط میں شرکت کی ہوتی۔ یا کسی حسینہ کے لب لعلین کا گرم بوسہ تمہارے خون کو گرماتا۔ اور تم اس کی لذت محسوس کرتے۔ تم نہیں جانتے کہ تم کس چیز کو رد کر رہے ہو۔ اگر آج تمہیں گولی سے اڑا دیا گیا۔ تو یہ ایک ستم ہوگا۔ [وہ رکتی ہے] لیکن وسچا تم زندگی سے بیزار کیوں ہو؟

وسچا۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ سورج کی کرنیں۔ پرندوں کے نغمے اور بھوک یہ بھی زندگی ہے۔ اپنے گھر کو چھوڑنا بہت مشکل ہے۔ کامریڈ گھر کا تمام بوجھ مجھ پر ہے۔ اور ان کو میری ضرورت ہے۔

کتیا۔ تو پھر یہ کاغذ لو اور اپنی درخواست لکھ دو۔

وسچا۔ نہیں۔ میری نجات کا ذریعہ وہ افسر ہے۔ جو چھ بجے آئے گا۔ اگر وہ مجھے کہہ دے۔ کہ "وسچا اب تم آزاد ہو۔ ہم تمہیں لوگوں کو ہلاک کرنے پر مجبور نہیں کرتے؟

کتیا۔ وسچا تم بیوقوف مت بنو۔ کیا ہم لوگ قاتل ہیں؟

وسچا۔ جو کسی شخص کا خون بہائے۔ وہ قاتل ہے۔ جو شخص سپاہی بھرتی ہوگا۔ وہ گویا قتل کرنا سیکھیگا۔

کٹجا۔ یا وہ قتل کو روکے گا۔ کامریڈ کیا تم یہ چاہتے ہو۔ کہ ہم قتل کر دئے جائیں۔ اور وہ حیات نو مٹ جائے جس کا تصور ابھی ابھی تم قائم کر رہے تھے؟ کیا تم چاہتے ہو کہ ہم پر پھر تازیانے برسیں؟

وسجا۔ جو شخص فوج میں بھرتی ہوتا ہے۔ تازیانہ خود بخود اس کے سر پر نازل ہو جاتا ہے۔ کامریڈ ذرا سوچو زار کا عہد کیا تھا؟ تازیانہ۔ فوج۔ جنگ۔ پادری۔ اب یہ سب چیزیں دور ہو گئی ہیں۔ زار کی جگہ لینن نے لی ہے۔ اور وہ اس سے بہتر ہے لیکن یہ کیا کہ اب پھر وہی کشت و خون کا سلسلہ جاری کر دیا جائے؟ اسے میں "نئی زندگی" نہیں کہتا۔ یہ تو وہی پرانی داستان ہے۔

کٹجا۔ کیا ہم جنگ کرتے ہیں؟ تم تو بڑے بیوقوف ہو۔ ہم تو امن کے متمنی ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہوا اور غذا ہمارے لئے ضروری ہے۔ یہ ظالم سرمایہ دار تو ہمیں جینے نہیں دیتے کیا تم چاہتے ہو۔ کہ وہ ہمیں نیست و نابود کر دیں۔ تم خود ہی اسکا حل بتاؤ۔

وسجا۔ میں کیا حل بتا سکتا ہوں۔

کٹجا۔ تم پھر بھی سوچو۔ اگر سب دُنیا تمہاری طرح ہو جائے تو اس کا انجام کیا ہو گا؟ [وسجا مسکراتا ہے]

وسجا۔ مجھے تم سے اتفاق نہیں۔ اگر میں آج ماسکو لکھ دوں۔ تو شاید تمہارے کہنے کے مطابق مجھے چھوڑ دیا جائے لیکن اس سے فرق کیا پڑے گا۔ مجھے گھر بھیج کر ایک دوسرے نوجوان کو پکڑ کر فوج میں بھرتی کر لیا جائے گا۔ جو عمر بھر مجھ پر لعنتیں بھیجتا رہے گا۔ کہ میں نے خود آزادی خرید کر اس کو فروخت کر دیا لیکن اگر مجھے گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ تو یہ معاملہ اور ہو گا۔ شاید لوگ اس واقعہ سے عبرت حاصل کریں۔

کٹجا۔ تم بفکر رہو۔ ہم تمہاری موت کو مشتہر نہیں کریں گے۔

وسجا۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ کیا مجھ پر گولی چلانے والوں کی زبان کو بند کر لو گی؟

کٹجا۔ واہ! ان کی کیا بات ہے۔ وہ تو اس کام کے عادی ہیں۔

وسجا۔ یہ درست ہے لیکن انہوں نے اس سے قبل میرے جیسے انسان پر گولی نہیں چلائی۔

جوان کا دوست ہے۔ میرا جرم صرف اسقدر ہے کہ میں دوسرے انسانوں کو قتل کرنا گناہ سمجھتا ہوں یہ بات ان کے لئے یقیناً نئی ہوگی۔ اور وہ اس سے سمجھ جائیں گے کہ تمام انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

کٹجا۔ اپنی زبان کو بند کرو۔ میں یہ وعظ سننا نہیں چاہتی

وسجا۔ غالباً تم میرا مطلب سمجھ گئی ہوگی۔

کٹجا۔ چپ رہو۔ تم نے تو مجھے دیوانہ بنا دیا ہے۔

[جیکوبو داخل ہوتا ہے]

جیکوبو۔ کیا اب تار دے دیا جائے؟

کٹجا اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ وسجا تم بیوقوف ہی نہیں بلکہ ظالم بھی ہو۔

وسجا۔ کامریڈ معاف کرنا۔ شاید تم بھی میری ہی طرح ہو۔ اچھا۔ اب مجھے ذرا کھلے میدان میں چند منٹوں کے لئے جانے کی اجازت دیجئے۔ میں ابھی واپس آ جاؤنگا۔ آپ فکر نہ کیجئے گا [باہر نکل جاتا ہے]

جیکوبو۔ یہ تو بڑا ہی ضدی نکلا۔ اب کیا ہو سکتا ہے؟ اب مجھے افسر اعلیٰ کو اطلاع دینی ہوگی لیکن۔

کٹجا۔ اچھا۔ یہ حکمنامہ لے لو۔ شاید اس کے ذریعہ اس کی موت رک جائے۔ مگر۔

جیکوبو۔ مگر کیا؟

کٹجا۔ اس کو اپنے ارادہ سے باز رکھنے کی کوشش میں میرا ارادہ بھی متزلزل ہو رہا ہے۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔ اور چاہتی ہوں۔ کہ ذرا آرام کر لوں۔ میں نیند سے تازہ دم ہو جاؤں گی۔ اور افسر اعلیٰ بھی اس وقت تک پہنچ جائے گا۔

[وہ باہر چلی جاتی ہے۔ جیکوبو حکمنامہ کو دوبارہ پڑھ رہا ہے۔ کہ والنج افسر اعلیٰ داخل ہوتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں، افسر اعلیٰ میز پر بیٹھ کر لکھنا شروع کر دیتا ہے۔ اور جیکوبو اس کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے]

والنج۔ کیا کوئی نئی بات ہے۔ جس پر ہم غور کریں۔

جیکوبو کچھ نہیں؟ صرف وسجا کا معاملہ زیر غور ہے۔

[والنج گھڑی دیکھتا ہے]

والنج۔ چھ بجنے میں دس منٹ باقی ہیں۔ کیا وہ نہیں مانتا؟

جیکوبو۔ بالکل نہیں۔ وہ تو چٹان کی طرح مضبوط ہے۔

والنج۔ اچھا۔ پھر سوا چھ بجے اس کو گولی سے اڑا دو۔

جیکوبو۔ [جوش میں] کامریڈ! لیکن ایک بات ہے [وہ اپنے جوش کو ضبط کرنا چاہتا ہے] یہ دیکھو کٹیا یہ کاغذ ماسکو سے لائی ہے۔ یہ ایک تازہ فرمان ہے۔

[حکمنامہ اس کی طرف بڑھا دیتا ہے]

والنج۔ کیا یہ کوئی اہم دستاویز ہے؟ میں تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔ ساڑھے چھ بجے مجھے واپس جانا ہے اور سوا چھ بجے اس کا فیصلہ کرنا ہوگا۔

جیکوبو۔ معاملہ بہت اہم ہے۔ اس کی رو سے ثابت ہوتا ہے کہ سزا کا حکم قانون کے خلاف دیا گیا ہے۔

[والنج کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار ہیں وہ جلدی سے مڑتا ہے]

والنج۔ یہ کیا فرمان ہے؟ مجھے دکھاؤ؟ [وہ حکمنامہ کو دیکھتا ہے] یہ ایک لغو چیز ہے [پھاڑ کر اسے پھینک دیتا ہے] معلوم ہوتا ہے کہ ماسکو میں ان لوگوں کو اب کوئی کام نہیں رہا۔ اس لئے اس قسم کی فضول حرکتیں شروع ہوگئی ہیں ان کو کھانے اور سونے کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں۔ اسی لئے وہ یہ معافی نامے جاری کرنے لگے ہیں میں اس حکمنامہ کو لغو سمجھتا ہوں۔ اور کوئی بات؟

جیکوبو۔ لیکن۔

والنج۔ جانے بھی دو۔ میں اس معاملہ کو خود سمجھ لوں گا۔ اگر آج اس کو چھوڑ دیا گیا۔ تو کل کوئی اور طالسطائی کا چیلہ باہر نکل پڑے گا۔ اور بوڑھا فیجا بھی اپنا زہد دکھانے لگے لگا۔

جیکوبو۔ لینن تو اپنے افعال کو خوب سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک لوگوں میں انقلاب کی روح پیدا ہونا۔ فوجیوں کی تعداد میں اضافہ کرنے سے بہتر ہے۔

والنج۔ شاید ایسا ہی ہو۔ لیکن ہم ایسے لوگوں کو نہیں چھوڑ سکتے جن کے نزدیک انقلاب کوئی چیز نہیں۔

جیکوبو۔ کامریڈ۔ تم انقلاب کی اصل روح کی توہین کر رہے ہو۔

والنج۔ انقلاب کا ناکام رہنا اس کی توہین ہوگا۔

جیکوبو۔ فوج میں بھرتی نہ ہونے والوں کو تو زار کے عہد میں بھی گولی کا نشانہ نہیں بنایا جاتا تھا۔

والنج۔ زار کو لوگوں کی پروا نہ تھی۔ لیکن ہمیں تو ان سے کام لینا ہے [جیکوبو خاموش ہو جاتا ہے] اب زیادہ بحث کا وقت نہیں۔ تم جا کر گاؤں کا ایک چکر لگاؤ۔ اور ٹھیک ساڑھے چھ بجے واپس آ جانا۔ ہاں تو کٹجا کہاں ہے؟

جیکوبو۔ وہ دالان میں سو رہی ہے۔ وہ سفر کی وجہ سے تھکی ہوئی تو تھی ہی۔ وسجا کو سمجھاتے سمجھاتے اور بھی زیادہ تھک گئی۔

والنج۔ وہ اس کو کیا سمجھاتی رہی؟

جیکوبو۔ وسجا کو اس حکمنامہ کا علم ہے لیکن وہ اپیل نہیں کرنا چاہتا۔

والنج۔ [زیادہ دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے] وہ کیوں؟

جیکوبو۔ وہ اپنے اصول کا پکا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ کہ جب لوگ اپنے اصول کی خاطر لوگوں کو قتل کرتے ہیں اور خود قتل ہوتے ہیں تو پھر وہ اپنے اصول پر کیوں جان نہ دے؟

والنج قتل کرتے ہیں اور قتل ہوتے ہیں!۔ کیا بیہودہ بات ہے۔ ہم تو کام کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ہے خوب دلچسپ نوجوان۔ اِسے دیکھکر مجھے اپنا بھانجا یاد آتا ہے۔ جو زار کے عہد میں اسی جرم کے لئے قتل کر دیا گیا۔

جیکوبو۔ تو پھر کیا تم اس کا بدلہ لینا چاہتے ہو۔

والنج۔ جانے بھی دو۔ میں دماغی عشرت کا قائل نہیں۔ اب جاؤ۔ اور پورے ساڑھے چھ بجے یہاں پہنچ جانا۔ [جیکوبو جاتا ہے] فیجا! ذرا فیجا کو اندر بھیج دو۔ میں کٹجا کو نیند سے بیدار کرنا نہیں چاہتا [وہ لکھنے لگتا ہے۔ چند لمحوں کے بعد فیجا داخل ہوتا ہے] تمہارے پاس اسوقت کتنے آدمی ہیں؟

فیجا۔ وسجا سمیت آٹھ۔

والنج پانچ منٹ کے بعد اپنے آدمیوں کو تیار کرو۔ بندوقوں میں گولیاں بھر لو۔ اور وسچا کے دونو ہاتھ باندھ دو۔

فیجا۔ یہ مجھ سے نہ ہوگا!

والنج۔ مگر کیوں؟

فیجا۔ میں اس کے ہاتھ نہیں باندھوں گا۔ اور نہ اُسے گولی کا نشانہ بناؤں گا۔

والنج۔ [ہنستے ہوئے] گویا وہ اب بھی تبلیغ کر رہا ہے۔ [اپنا پستول نکال لیتا ہے] بوڑھے کھوسٹ اگر تم گولی نہ چلاؤ گے۔ تو میں خود یہ کام کر سکتا ہوں۔ اس میں ابھی وہ گولیاں بھری ہوئی ہیں،

فیجا۔ کامریڈ اسے جانے دیجئے۔ یہ میرے گاؤں کا رہنے والا ہے اور میں اِسے خوب جانتا ہوں۔

والنج۔ [مایوسی سے] ان لوگوں کے ذریعہ ہم نئے دور کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں۔

فیجا۔ کامریڈ میرا یہ مطلب نہ تھا۔ میں اس کو اپنی گولی کا نشانہ نہیں بنانا چاہتا۔ اس لئے میں ہوائی فائر کردوں گا۔ باقی چھ گولیاں اس کو ہلاک کرنے کے لئے کافی ہیں۔

والنج۔ دور ہو جاؤ اور پانچ منٹ میں وسچا زندہ نہ رہے۔

[فیجا باہر چلا جاتا ہے۔ والنج اپنے پستول کو کھول کر گولیوں کو دیکھتا ہے۔ اور پستول دوبارہ بھر کر میز پر رکھ دیتا ہے۔ باہر سے کسی کی آواز سنائی دیتا ہے۔ وسچا نہایت سریلی آواز میں کہتا ہے۔ بھائیو! ادھر آؤ۔ کہاں پھر رہے ہو۔" والنج لکھنے میں مصروف ہے۔ پھر وہ ازسرِ حکمنامہ نکال کر گھڑی کو دیکھتا ہے]

[سپاہی قطار باندھ کر کھڑے ہو چکے ہیں۔ اور فیجا اُن کے دائیں طرف کھڑا ہے۔ والنج ان کا فاصلہ درست کرتا ہے اور وسچا اس کی طرف گھور رہا ہے۔ وہ دروازے کی طرف اشارہ کر رہا ہے اور وسچا فوراً دروازہ بند کر کے اس کے سہارے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اُس کی آنکھیں روشن ہیں۔ لیکن اُن میں اضطراب نمایاں ہے۔ وہ والنج سے پوچھتا ہے" کیا اب بالکل بندوبست ہو چکا ہے؟ والنج سر ہلاتا ہے اور پھر سپاہیوں کی طرف متوجہ ہوتا]

والنج۔ ریڈی [سپاہی فوراً تیار ہو جاتے ہیں۔ والنج کے ہاتھ میں سزا کا حکم ہے اور وہ پڑھتا ہے] حکومت روس کی انقلابی عدالت کے سامنے۔ ۳ جون ۱۹۱۹ء کو وسچا ٹارکن نامی شخص کا مقدمہ ہوا۔ اس پر

فوجی خدمت سے انکار کرنے کا الزام ہے۔ کیونکہ وہ اُسے مذہبی عقائد کے خلاف سمجھتا ہے۔ اس کے اس سنگین جرم کی پاداش میں اُسے گولی سے اڑا دینے کی سزا دی گئی ہے۔ اُسے ۴۸ گھنٹے کی مہلت دی گئی تھی۔ کہ وہ اچھی طرح غور و خوص کرے۔ اگر وہ فوجی خدمت پر آمادہ ہو جائے۔ تو اس کو معاف کر دیا جائے لیکن اس نے فوج میں بھرتی ہونے سے انکار کر دیا ہے۔ اب اُسے اس جگہ بھیجا گیا ہے۔ تاکہ سزا کے حکم کی تعمیل کی جائے۔ اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی گئی۔ لیکن بے سود۔ اس لئے اب حکم کی تعمیل کی جاتی ہے [وسجا سے] وسجا کیا تم سمجھ گئے؟

وسجا۔ اب آپ درست فرماتے ہیں۔ معاملہ بالکل صاف ہے

والنج کیا تم اب بھی انکار کئے جاتے ہو۔

وسجا۔ ہاں۔

والنج۔ [سر ہلاتا ہے] کیا تمہاری کوئی خواہش ہے؟ [وسجا اُس سے ہاتھ ملاتا ہے۔ سپاہیوں سے] تیار ہو جاؤ۔ [سپاہی بندوقوں کو کندھوں تک لے جاتے ہیں۔ اچانک وسجا کا چہرہ متغیر ہو جاتا ہے۔ اس کے پٹھے تن جاتے ہیں] اس کی آنکھیں باہر نکل آتی ہیں۔ اور وہ ہر ایک کے چہرے کو دیکھتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ پُر درد لہجہ میں کہنا شروع کرتا ہے۔

وسجا۔ بھائیو! میرے جسم کو گولی کا نشانہ بنانے سے مجھے کوئی دکھ نہ ہوگا۔ میرا جسم ایک قمیص کی طرح ہے۔ جسے آج یا کل ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا تھا۔ اور یہی حال آپ سب کے جسموں کا ہے۔ لیکن میری موت کس قدر خوبصورت موت ہے میں محبت اور امن کی قربان گاہ پر اپنی جان کا چڑھاوا پیش کر رہا ہوں۔ لیکن مجھے تم پر افسوس ہے۔ تم مجھے قتل نہیں کرتے۔ بلکہ اپنی ضمیر کا خون کر رہے ہو [اس کا جسم ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ اور وہ مسکراتا ہے] میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔

والنج۔ [غصے سے حکم دیتا ہے] فائر۔ [سپاہیوں کی بندوقیں خود بخود نیچے ہو جاتی ہیں۔ اور سب کے لبوں سے آہ کی آواز سنائی دیتی ہے۔ فیجا صرف ایک فائر کرتا ہے۔ اور اس کا نشانہ دروازہ پر لگتا ہے] بدمعاش لوگ بزدل!! فیجا! ادھر آؤ اور اس شخص کی آنکھوں پر پٹی باندھ دو۔

وسجا۔ کامریڈ اس کی کیا ضرورت ہے؟ کیا تمہیں ان کو دیکھنے کی جرأت نہیں؟
[وانچ پستول سے فائر کرتا ہے۔ وسجا زمین پر گر پڑتا ہے۔ سپاہی اس کی لاش اٹھا کر ایک تختے پر ڈال دیتے ہیں۔ وانچ گنگناتا ہے۔ اور اندر سے کٹجا نکلتی ہے۔
کٹجا۔ یہ فائر کیسا تھا؟ (وسجا کی لاش دیکھ کر) وسجا! [وہ کرسی پر گر پڑتی ہے۔ پھر اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور لاش کی طرف بڑھتی ہے۔ اس کا چہرہ ہاتھ سے چھو کر] یہ اب سرد ہو چکا ہے۔ وسجا! وسجا!! افسوس [وانچ سے] کیا یہ بات ضروری تھی؟
وانچ۔ بہت ضروری۔ معاملہ بہت نازک ہو چکا تھا۔ آخری وقت اس نے فوجیوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ انہوں نے گولی چلانے سے انکار کر دیا۔ اس لئے مجبوراً مجھے فائر کرنا پڑا۔
کٹجا۔ تم بھی کتنے جوانمرد ہو! گویا وہ تم سے طاقتور تھا۔ وہ ایک قمیص پہنے ہوئے تھا۔ اور تم فوجی وردیوں میں ملبوس۔ بندوق اور برچھیوں سے مسلح۔ خوب! اب تو تمہیں ان باغی سپاہیوں کو بھی گولی کا نشانہ بنانا پڑے گا۔
وانچ۔ اس کی فکر مت کرو۔ یہ کام زیادہ مشکل نہیں لیکن وہ واقعی ایک بہت اچھا نوجوان تھا۔ وہ مرتے دم تک مسکراتا رہا۔ اس کے آخری الفاظ کتنے پیارے تھے۔ یہ جنگ ختم ہو جائے تو میں فرصت کے وقت اس کے آخری الفاظ یاد کروں گا۔ اچھا خدا حافظ۔
[وانچ چلا جاتا ہے۔ جیکوبو داخل ہوتا ہے۔ وہ لاش کی طرف نہیں دیکھتا۔ بلکہ میز پر بیٹھ جاتا ہے کٹجا ادھر اُدھر کمرے میں پھر رہی ہے]
کٹجا۔ وہ ٹھیک کہتا تھا قتل کرنا انسانیت کو ذلیل کرنا ہے ہتھیار انسانیت کے دامن پر ایک بدنما دھبہ ہیں۔ تم لوگ ان بندوقوں اور تلواروں کے ساتھ اب میری آنکھوں میں ذلیل ہو چکے ہو۔ مجھے ان چیزوں سے نفرت ہے۔
[جیکوبو کٹجا کی کمر سے لٹکے ہوئے پستول کی طرف اشارہ کرتا ہے] مجھے اس سے بھی نفرت ہے۔ کیا اس کا نام انقلاب ہے؟ یہ تو اسی پرانی داستان کا اعادہ ہے۔ یہ قتل رّدِ عمل کا پیش خیمہ ہوگا۔

جیکوبو۔ ہاں۔ یہ ایک عظیم الشان انقلاب کا باعث ہوگا۔

کیٹجا۔ یہ الفاظ اب بے معنی ہیں لیکن یہ لاش ایک حقیقت ہے۔ اس نوجوان نے اپنی جان دے کر فتح حاصل کی ہے اور اُس نے مرتے دم تک مساوات کی روح کو ذلیل نہیں ہونے دیا۔ خدا حافظ۔

[کمر سے پستول نکال کر اور سینے سے فوجی تمغے اتار کر میز پہ رکھ دیتی ہے۔ اور دروازے کی طرف بڑھتی ہے]

جیکوبو۔ کامریڈ! تم کہاں جا رہی ہو؟

کیٹجا۔ حیاتِ نو کی تلاش میں۔

پردہ

جگر پارے

(از حضرت جگر مرادآبادی)

تھی جو بنیاد شادی و غم کی
دل نے وہ انجمن ہی برہم کی

اس نے شانوں پہ زلف برہم کی
خیر یارب نظامِ عالم کی

آہ کی ہے صدا نہ ماتم کی
کیا طبیعت بدل گئی غم کی

تیری نسبت سے، تیری بخشش سے
اللہ اللہ راحتیں غم کی

اتنے ہی مجھ سے وہ قریب ہوئے
میں نے جتنی ہی آرزو کم کی

یوں تو پیاسے ہیں سبزہ و گل بھی
کس نے دیکھی ہے پیاس شبنم کی

کوئی دیکھے تو کیا ہنسی آئے
ہائے رے بدحواسیاں دل کی

آئی تھی آج بھی نسیمِ سحر
آگ بھڑکا گئی جہنم کی

عشق کو کہیئے کس طرح معراج
یہ تو فطرت ہے ابنِ آدم کی

اس سے پوچھو جمال شبنم کا
جس نے خود آرزوئے شبنم کی

اک خطا پر سزائے بے میعاد
ہائے تقدیر ابنِ آدم کی

تو نے ناصح! یہ کس کا نام لیا
چھا گئیں دل پہ بدلیاں غم کی

جسکا جھکنا محال تھا سو آج
عشق نے وہ نگاہ بھی کم کی

عشق کا راز غیر کیا سمجھیں
پڑ نہ جائے نگاہ محرم کی

شانِ رحمت برس پڑی کیا کیا
اس خطا پر کہ پھر خطا کم کی

دھن ہی اب ورہے یہاں ناصح
تجھ کو سوجھی ہے شادی و غم کی

حسن آیا تھا خود منانے کو
سو توجہ ہی عشق نے کم کی

خاطرِ حسن تھی ہی کچھ برہم
دل نے دانستہ اور برہم کی

فروری ۱۹۳۸ء

مسلم عوام کی تعلیم

مسلم لیگ کا کوئی ممبر ہو یا کانگریس کا کوئی قوم پرست مسلمان، کوئی آزاد خیال اخبار ہو یا کوئی فرقہ پرور جریدہ، ہر ایک کی زبان و قلم سے یہی سننے میں آتا ہے کہ ہندوستان کی حالت دن بدن گر رہی ہے۔ زمانہ ترقی کر رہا ہے اور یہ تباہ و برباد ہو رہے ہیں، یہ آواز کچھ نئی نہیں ہے، بہت پہلے یہی فسانہ جمال الدین افغانی اور سرسید کی زبان سے بھی سنا جا چکا ہے۔ اور آج بھی ملک کا ہر گوشہ اس صدا کو اس کثرت سے سُن رہا ہے کہ اب اس کے لئے اس کے اندر کوئی جاذبیت اور کوئی تحریک یا عملی ترغیب محسوس نہیں ہوتی، گذشتہ دور میں جو کچھ کہا گیا اس کے اندر درد تھا۔ ایک تڑپ تھی اور یہی وجہ ہے کہ عہد ماضی کے زعمار کے ہاتھوں، غلط یا صحیح۔ تعمیری کاموں کی عظیم الشان بنیادیں بھی پڑیں جو اپنی بساط حدود کے اندر قومی فوائد کے کام انجام دے رہی ہیں لیکن آج کل کی چیخ پکار میں کوئی خلوص، کوئی ہمدردی، اور کوئی صحیح بےچینی نہیں پائی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً ربع صدی کی مسلسل ہنگامہ پروری اور ان گنت انجمن سازیوں کے باوجود قوم وہیں کھڑی ہے جہاں پہلے تھی بلکہ اب تو قوم پر مایوسی و اضمحلالِ قومی کے آثار بھی نمودار ہونے لگے ہیں لیکن جیسا کہ فطرت کا دستور ہے۔ ہر تاریکی کے بعد روشنی نمودار ہوتی ہے۔ رات کے بعد دن ضرور آتا ہے۔ مجھے بھی اس ہجوم مایوسی میں اُمید کی کچھ کرنیں نظر آ رہی ہیں، جدید قانون کے نفاذ کے بعد سے ہر مسلم جماعت اس بات کی کوشش میں مصروف نظر آ رہی ہے۔ کہ مسلمانوں میں جلد سے جلد سیاسی قوت آ جائے اور وہ اپنی موجودہ پستی سے نکل کر کسی بلند مقام پر پہونچ جائیں، میں کسی خاص سیاسی فرقہ سے تعلق نہیں رکھتا، اور نہ مجھے مسلم لیگ اور کانگریس کی جنگ میں کوئی خاص لطف آتا ہے، میرے سامنے تو صرف وہ چیزیں ہیں جنکو عملی جامہ پہنائے بغیر نہ مسلم لیگ مسلمانوں کے درد کا صحیح علاج

کرسکتی ہے اور نہ کانگریس کے شیدا و ہمنوا مسلمان، میں چاہتا ہوں کہ آج ناظرین "جامعہ" بھی میرے ساتھ ان چیزوں پر ایک نظر ڈال لیں۔

میں نے اس مضمون کا عنوان "مسلم عوام کی تعلیم" رکھا ہے۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ مسلم ادارے جبری تعلیم نافذ کریں، ہر مسلمان لڑکے اور لڑکی کو تعلیم یافتہ بنا کر رہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی قوم کی حقیقی ترقی کے لئے عام و لازمی ابتدائی تعلیم بنیادی حیثیت رکھتی ہے لیکن جبری تعلیم کا اجرا کسی قومی ادارے کا کام نہیں۔ اس کی عام اشاعت کے لئے حکومت کے دست و بازو کی ضرورت ہوتی ہے، قانون و آئین سے مدد لینی پڑتی ہے۔ یہ کام ہمیشہ طاقت و قوت کے بل پر ہوا ہے۔ اور ہوگا۔ قومی انجمنیں اور جمعیتیں اس کے حق میں رائے عامہ کو استوار و ہموار کر سکتی ہیں، حکومت کا ہاتھ بٹا سکتی ہیں۔ مگر جبر و زور نہیں کر سکتیں۔ یہ کام ان کی دسترس سے باہر ہے پس اس نظریہ کے ماتحت میری مراد اس عنوان سے صرف یہ ہے کہ ہر بالغ مسلم کو اس کی ضروریاتِ زندگی و مسائل حاضرہ سے واقف کیا جائے، تعلیم کا مفہوم صرف یہی نہیں ہے۔ کہ اسکول اور یونیورسٹی کی حدود اور چہار دیواری کے اندر کتابوں کی ورق گردانی کی جائے، بڑے بڑے فلسفیانہ نظریات حل کئے جائیں اور سائنس کے حیرت انگیز تجربات سے دنیا کو استعجاب میں ڈال دیا جائے۔ بلکہ تعلیم کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ ایک شہری کو زندگی کی ضرورتوں سے واقف کیا جائے، دنیا کی رفتار سے آشنا کیا جائے، ملک کے مصائب سے آگاہ کیا جائے، عمرانی زندگی کے اصول سے باخبر کیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں اسکو بتایا جائے کہ وہ کیا ہے؟ اور اسے کیا کرنا ہے؟ یہ وہ تعلیم ہے کہ اس سے مستفید ہونے کے لئے بڑی کتابوں کے گہرے مطالعہ اور کسی یونیورسٹی میں باقاعدہ داخلہ لینے کی مطلق ضرورت نہیں۔ یہ چیز تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ گھر گھر اشاعت پا سکتی ہے۔ جس چیز کی ضرورت ہے، وہ خلوص ایثار اور محنت ہے۔ سیاسی سربلندی کی خواہش چھوڑ دی جائے، اور جو محنت و مشقت شہرت اور نام و نمود کے لئے کی جاتی ہے، اگر وہ سب کی سب خاموش قومی تعمیر میں صرف کی جائے تو آج ہی ایک نئی مسلم قوم —— طاقتور اور قوی —— پیدا ہو جائے اور ہندوستان کو ہلا کر رکھدے۔

اس عام تعلیم کے سلسلہ میں ایک مشکل ضرور سامنے آتی ہے، اور وہ یہ کہ ہندوستان ایک وسیع ملک

ہے، ہر صوبہ کی۔ ہر صوبہ کے ہر مغربی و مشرقی، ہر جنوبی و شمالی حصہ کی بلکہ ہر ضلع کی مشکلات، ضروریات زندگی و مسائل حیات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ کسی "آل انڈیا" جمعیت کے لئے کوئی یکساں تعلیمی پروگرام تمام ہندوستان میں رائج کرنا سخت دشوار امر ہے، یہ چیز بڑی حد تک صحیح ہے اور اس دشواری کو مقامی لیڈر بڑی حد تک دور کرسکتے ہیں لیکن پھر بھی بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو "آل انڈیا" حیثیت رکھتی ہیں اور جن کی تعلیم تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے یکساں طور پر ضروری ہے، میں انہی عام مسائل کو عنوانات ماتحت کے ساتھ ناظرین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

مذہب۔ مسلمانوں کے ایک گروہ کو شکوہ ہے کہ ان کے ہم مذہب آزادی کی جنگ سے جی چراتے ہیں۔ کانگریس میں بلا شرط شریک ہو کر ملک کی آزادی کی جنگ میں دوسری قوموں کے دوش بدوش حصہ نہیں لیتے۔ اسلام کی عزت پر دھبہ لگاتے ہیں، اپنی غلامانہ ذھنیت سے اسلام کو بدنام کرتے ہیں، دوسرا گروہ جمہوری حکومت کے اصول و آئین کو دیکھتا ہے، ڈرتا ہے کہ اقلیت میں ہونے کی وجہ سے اس کی قوم کے حقوق اکثریت کے ہاتھوں نیست و نابود نہ ہو جائیں، بحث اس سے نہیں کہ کون گروہ حق بجانب ہے، اس ذکر سے صرف یہ واضح کرنا ہے کہ اگر آج ہندوستان کا مسلمان اپنے مذہب کی صحیح تعلیم سے اپنے دین کی صحیح روح سے واقف ہوتا تو نہ کسی کو کوئی شکایت ہوتی اور نہ کسی کو کوئی خوف اور ڈر، وہ آزادی کے لئے بیچین ہوتا۔ غلامانہ زندگی کو گناہ سمجھتا، اور ہر آن غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر حریت و استقلال حاصل کرنے کی فکر میں بے قرار رہتا۔ ہندو راج کا بھی اس کو ڈر نہ ہوتا۔ وہ سمجھتا کہ وہ دنیا میں صرف اس لئے پیدا ہے کہ حکومت کرے خدا کی خلافت قائم کرے۔ اسی کے بتائے ہوئے قانون پر دنیا کو چلائے۔ مگر مدت ہوئی کہ مذہب کی صحیح تعلیم نہ صرف ہندوستان سے بلکہ دنیا سے مفقود ہو چکی ہے۔ یہ مذہبی جہالت ان پڑھ جماعت ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ اس معاملۂ خاص میں ہندوستان کے چوٹی کے مسلم زعما بھی ویسے ہی کورے ہیں جیسے دیہات کا الھڑ جاہل، یقین نہ ہو تو خالص اسلامی یونیورسٹیوں کالجوں اور اسکولوں کی سیر کیجئے، ہربرٹ اسپنسر کانٹ اور ہیگل کے بیان کردہ پیچیدہ مسائل ازبر ہیں۔ مگر جو چیز ان کو نہیں آتی وہ اپنے مذہب کی تعلیم و ہدایات ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ مذہب کو حقارت کی نظر سے دیکھتے اور اسکو قابل اعتنا نہیں سمجھتے ہیں۔

آج مسلمانوں کو یا دوسرے لفظوں میں مذہب اسلام کو جتنا خطرہ اور شدید خطرہ اپنی مذہبی جہالت سے ہے اتنا خطرہ نہ کسی اور طاقت سے ہے اور نہ کسی اور قوم سے آج اگر مسلمان اپنے مذہب کی صحیح قدر و قیمت سے واقف ہوتا تو نہ وہ آج غلام ہوتا اور نہ اسکو کسی قسم کا خوف و خطر ہوتا۔ وہ اپنی شریعت کو، اپنے اصول کو اپنے قانون کو، اپنی تہذیب کو، اپنے تمدن کو اور اپنی ہر چیز کو جان سے زیادہ عزیز سمجھتا، اور انگلی دکھانے والے کا سر قلم کر لیتا۔ جمعیۃ العلماء مسلمانوں میں سیاسی قوت پیدا کرنے کے لئے قربانیاں کر رہی ہے۔ مصیبتیں اٹھا رہی ہے مشقتیں برداشت کر رہی ہے۔ مگر افسوس کہ اتنی معمولی سی چیز اس کے ذہن میں نہیں آتی۔ کاش وہ اپنی ساری توجہ اسی عام مگر صحیح مذہبی تعلیم کی طرف صرف کرتی۔ تو آج نقشہ ہی دوسرا ہوتا۔ یاد رہے کہ جب تک ذہن میں انقلاب پیدا نہیں کیا جاتا جب تک دماغوں کو مذہبی بنایا نہیں جاتا۔ جب تک گھر گھر دینی تعلیم کا چرچا نہیں ہو جاتا۔ اسوقت تک چاہے ہندوستان ہزاروں مرتبہ آزاد ہو مگر مذہب سربلند نہیں ہو سکتا اسلام کو عظمت نصیب نہیں ہو سکتی۔ اسلام نام افراد کا نہیں ہے، بلکہ ایک مخصوص تعلیم و ہدایت کا ہے جب یہی چیز ذہنوں سے ناپید ہوتی جا رہی ہے، تو میں نہیں سمجھتا کہ آزاد ہندوستان میں وہ کون سا اسلام ہوگا۔ جس کے حقوق کی حفاظت مسلم لیگ کرے گی اور جس کے سر پر جمعیۃ العلماء تاج رکھ کر اپنے مذہبی فرائض سے سبکدوش ہونے کے شادیانے بجائے گی۔ ضرورت ہے کہ ہر انجمن اور ہر جمعیۃ چاہے وہ کسی سیاسی نظریہ کی مالک ہو اپنے عملی پروگرام میں سب سے پہلے مذہبی تعلیم کی عام اشاعت کو جگہ دے۔ ورنہ پھر اسے کوئی حق نہیں کہ وہ مسلمانوں کی رہنمائی و ہدایت کا دعویٰ کرے۔

جغرافیہ۔ اس سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ مسلم عوام کو جغرافیہ کی باقاعدہ تفصیلی تعلیم دی جائے، ان کو براعظم کی تعریف یاد کرائی جائے۔ ان کو یہ بتایا جائے کہ جزیرہ کس کو کہتے ہیں، اور جزیرہ نما کس چیز کا نام ہے بلکہ اس سے میرا مقصد یہ ہے کہ وہ ضروری جغرافیائی حالات ان کے سامنے پیش کئے جائیں۔ جن کے علم کے بغیر موجودہ دنیا میں زندگی تاریکی میں گذرتی ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات اخباری خبروں کے متعلق ہم خود اپنی کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے اور مجبوراً اخبار نویس کے مقالہ افتتاحیہ پر اعتبار کرنا پڑتا ہے۔ میرا مقصود جغرافیہ کی تعلیم سے یہ ہے کہ سرسری طور پر عوام کو یہ بتایا جائے کہ دنیا کی وسعت

کیا ہے؟ کس کس حصۂ ملک میں کون کون سی قومیں آباد ہیں؟ ان کے کیا کیا رسم و رواج اور عادات و خصائل ہیں؟ خود ہندوستان کی وسعت کیا ہے؟ ہر ہر صوبہ میں کیا طبعی اختلافات موجود ہیں؟ ہندوستان کی خاص خاص پیداوار کیا ہے؟ کون کون سی چیزیں یہاں بہت کم پیدا ہوتی ہیں؟ کن کن چیزوں میں ہندوستان غیر ممالک کا دست نگر ہے؟ ابھی کن کن اور چیزوں کی پیداوار کے امکانات یہاں موجود ہیں؟ زراعت اور صنعت و تجارت کے معاملہ میں مسلمانوں کی کیا دشواریاں ہیں؟ وہ کیوں کر دور ہو سکتی ہیں؟

اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا جائے کہ کون کون سے اسلامی ممالک ہندوستان کی حدود کے قریب واقع ہیں؟ ان کے طبعی حالات کیا ہیں؟ ان کا کوئی باہمی سلسلہ قائم کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اگر قائم ہو سکتا ہے تو اس کا مسلمانوں کی عام اقتصادی حالت اور سیاسی قوت پر کیا اثر پڑے گا؟ اس قسم کی جغرافیائی تعلیم کا سب سے بڑا اثر یہ پڑے گا۔ کہ عامۂ مسلمین کی نظر میں وسعت پیدا ہوگی۔ اور اس وسعت سے جو عام فوائد مرتب ہوں گے۔ وہ کسی اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ افسوس ہے کہ اس مضمون میں اتنی گنجائش نہیں کہ اُن کو شمار کیا جائے۔ مجھے ڈر ہے کہ کیا خود مصلحین میں بھی اتنی وسعت نظر موجود ہے؟ کیا وہ ان تمام تفصیلات سے واقف ہیں جنکا خاکہ مذکورہ بالا تحریر میں پیش کیا گیا ہے؟

اہم تاریخی واقعات۔ کسی قوم کی ترقی کے لئے، عروج کے لئے، با حوصلہ اور بلند ہمت بنانے کے لئے ضروری ہے کہ گذشتہ تاریخ سے اسکو واقف کیا جائے۔ اس کی عظمت و رفعت، اس کی شان و شوکت اس کی جاہ و جلال اس کے دماغ میں تازہ کئے جائیں، اس کی فتوحات اور اسکی کشور کشائیاں اس کو یاد دلائی جائیں۔ اس کے بزرگوں کی ہمتوں اور شجاعتوں کی داستانیں اس کو سنائی جائیں، ان کو بتایا جائے کہ ان میں وہ کیا خوبیاں تھیں جن کی بدولت چار دانگ عالم میں وہ کوس لمن الملک بجا رہے تھے، اور آج ان میں وہ کیا خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں جنکے ہاتھوں آج وہ ہر جگہ ذلیل و خوار ہیں۔ رسوا و بدنام ہیں؟ ان تعلیمات کا یہ اثر ہوگا کہ عوام اپنے حالات کا جائزہ لیں گے، اسلاف کے کارنامے سن کر ان کے قلوب میں نئے نئے ولولے پیدا ہوں گے، جوش پیدا ہوگا۔ ہمت و قوت پیدا ہوگی۔ عزم و ارادہ پیدا ہوگا۔ اور اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ واپس لانے کی نہ ختم ہونے والی تمنا و آرزو پیدا

ہوگی، اسلامی تاریخ ہزار سال کی وسعت میں پھیلی ہوئی ہے۔اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ ہر ایک جز ییے کو سامنے لایا جائے، بلکہ یہ کیا جائے کہ وقت و حالات کے مناسب اہم تاریخی واقعات چن لئے جائیں اور انہیں کو اس کثرت سے دہرایا جائے کہ اس عہد کی جیتی جاگتی تصویر سامنے آجائے۔اور کبھی دماغوں سے محو نہ ہو،

سیاسی تعلیم۔ دنیا کے مختلف ممالک کی سیاسی رفتار کیا ہے؟ خود دنیا مجموعی حیثیت سے کن سیاسی مصائب میں مبتلا ہے؟ ان سوالات کو نظر انداز کیجئے، ہندوستان کا دیہاتی بلکہ شہری مسلمان بھی اپنے ملک کی سیاسیات تک سے ناواقف ہے۔اسکو نہیں معلوم کہ اسی ملک کی دوسری اقوام کے ساتھ اس کا باہمی توازن کیا ہے؟ کون کون سے سیاسی حقوق ہیں جنکو اسے حاصل کرنا ہے اور وہ کون کون سے سیاسی فرائض ہیں جنکو اسے انجام دینا ہے؟ انگریزی حکومت ہندوستان کو آزاد نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی بتاتی ہے کہ ملک سیاسی حیثیت سے ابھی بہت پیچھے ہے، اپنے سیاسی جہل کی وجہ سے اس میں اتنی صلاحیت موجود نہیں کہ وہ جمہوریت کی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہو سکے اور اس کی ذمہ داریوں کو سبنھال سکے۔کم سے کم مسلمانوں کو، اگر وہ کوئی سیاسی ترقی چاہتے ہیں تو جلد سے جلد اپنی جہالت کو دور کرنا چاہیئے ۱۹۳۵ء کے قانون نے ہندوستان کو کسی قدر جمہوری اختیارات تفویض کئے ہیں۔ان اصلاحات سے وہی قوم بہرہ اندوز ہو سکتی ہے جو اپنے حق انتخاب کی اہمیت سے واقف ہو، اس میں اخلاقی جرأت ہو کسی بڑی شخصیت سے مرعوب ہونا نہ جانتی ہو اپنے ووٹ کا استعمال دیانتداری سے کرے۔کسی پروپگنڈے سے دھوکہ میں نہ آجائے بلکہ اپنے سیاسی مفاد کا اس کو اچھی طرح علم ہو۔اور اپنا ووٹ اسی کو دے جس سے اس کا سیاسی مفاد وابستہ ہو۔اور جس سے کسی سیاسی خدمت کی توقع ہو۔اس معاملہ میں برادرانِ وطن کی حالت مسلم عوام کے لحاظ سے کہیں بہتر ہے۔ایک ہندو کسان اپنا ووٹ اسی کو دیتا ہے۔جس سے اسکو توقع ہوتی ہے۔کہ وہ اس کی زراعتی مشکلات کو دور کرانے کی ان تھک کوشش کرے گا۔ایک ہندو مزدور ووٹ اسی کو دے گا جس کو وہ سمجھتا ہے کہ وہ محض کسی عزت کے حاصل کرنے کے لئے اسمبلی کی کوئی نشست حاصل کرنا نہیں چاہتا ہے۔بلکہ اس کے دل میں مزدوروں کا حقیقی درد موجود ہے اور

وہ واقعتہً مزدوروں کو ان کے مصائب سے نجات دلانے کے لئے یہ ساری جدوجہد کر رہا ہے۔ بخلاف اس کے مسلم عوام کے اندر ووٹ دیتے وقت اس قسم کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ وہ کسی نہ کسی غیر متعلق چیز سے متاثر ہوکر ووٹ دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے امیر اور زمیندار مسلم نمائندے کونسلوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ جنکو عوام کی صحیح مشکلات کا احساس تک نہیں ہوتا۔ ضرورت ہے کہ مسلمانوں میں زیادہ سے زیادہ سیاسی بیداری پیدا کی جائے۔

اخلاقی تعلیم :۔ مسلمانوں کی اخلاقی زندگی تباہ کن حد تک گر چکی ہے، انکی معاشرت سے انسانی خصائل ختم ہوچکے ہیں۔ کوئی ایسا عیب نہیں جو ان کی فطرتِ ثانیہ نہ بن چکا ہو۔ کوئی ایسی برائی نہیں جس میں یہ مبتلا نہ ہوں۔ شراب یہ پیتے ہیں، جوا یہ کھیلتے ہیں، . . . . . یہ کرتے ہیں، اسراف اور فضول خرچ یہ ہیں، شادی بیاہ میں تمام کی تمام ہندوانہ رسوم کو یہ ادا کرتے ہیں۔ جھوٹی شان وشوکت اور نام ونمود کے لئے مہاجنوں کے قرض کے بار سے یہ دبے ہوتے ہیں، الغرض کوئی ایسی اخلاقی خرابی نہیں جو ان کی قومی بنیادوں کو کمزور نہ کر رہی ہو۔ ضرورت ہے کہ رہنمایان وقت مسلمانوں کی اس کمزوری کی طرف فوری توجہ کریں، ان کو اخلاقی تعلیم دیں۔ عاداتِ بد کے خوفناک نتائج سے ان کو واقف کریں، آزاد ہندوستان میں اس قوم کا کوئی حصہ نہ ہوگا۔ جو اخلاقی حیثیت سے سرفراز نہ ہو، جس کی معاشرتی زندگی نقائص سے پاک اور مکمل نہ ہو ایک شراب خوار، ایک قمار باز، ایک . . . . آزاد ہندوستان میں کسی عہدہ، کسی منصب اور کسی بلند مقام کا مستحق نہیں ہوسکتا، ایک مقروض قوم، تجارت میں، صنعت وحرفت میں کوئی ترقی نہیں کرسکتی زراعت کے کھیتی باڑی کے تمام راستے اس پر مسدود ہوں گے۔ جو قوت آج آپس کی گالی گلوچ میں صرف کی جاتی ہے۔ کاش وہ مسلمانوں کے اس سدھار اور اصلاح وہدایت میں لگائی جاتی۔

تعلیم اصول حفظان صحت :۔ اسی اخلاقی تنزل کا نتیجہ ہے کہ مسلم قوم دن بدن کمزور ہوتی جارہی ہے۔ اس کے نوجوانوں کے چہرہ پر کوئی سرخی اور کسی قسم کی شگفتگی نظر نہیں آتی۔ یاد رہے کہ ایک تندرست جسم ہی کے اندر ایک تندرست دماغ پیدا ہوسکتا ہے، ہمت وشجاعت کے زیور سے آراستہ وہی شخصیت ہوسکتی ہے۔ جس کے قوٰی مضبوط ہوں۔ اعضار درست ہوں، اور عناصر میں اعتدال

ہو، ایک مدقوق کے دل میں کوئی ولولہ نہیں پیدا ہو سکتا، ایک دائم المریض اپنے اندر کوئی حوصلہ نہیں پاتا جسکی صحت درست نہیں ہوتی اس کے اندر امنگوں کی کوئی چنگاری نہیں ہوتی، قلب میں کوئی تمنا نہیں ہوتی دماغ میں کوئی بلند تخیل موجود نہیں ہوتا۔ ہمارے عوام صحت کے موٹے موٹے اصولوں سے بھی ناواقف ہیں۔ زندہ قوموں کو دیکھ لو، ان کی صورت ہی دیکھ کر دل مرعوب ہو جاتا ہے۔ کیا اپنی قوم کو صحیح، توانا اور تندرست بنانے کے لئے بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ سب سے پہلے مسلم لیگ اور کانگریس کے جھگڑے کو چکا لیا جائے، یا نقطۂ نظر کے ہر اختلاف کے موجود ہوتے ہوئے بھی اس کی ضرورت محسوس کی جا سکتی ہے۔ اور اس پروگرام کو عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے؟

اقتصادی تعلیم۔ آخر میں اس چیز کو پیش کرنا چاہتا ہوں کہ جس کے بغیر ہم کوئی سیاسی، اصلاحی اور تعلیمی قدم نہیں اٹھا سکتے۔ مسلمانوں کی اقتصادی تباہ حالی کا یہ عالم ہے کہ آج ہم کوئی قومی کام مؤثر طریقہ پر انجام نہیں دے سکتے، قومی غربت کا اثر ہماری تعلیم پر، ہماری صحت پر، ہماری سیاست پر، ہر چیز پر پڑ رہا ہے۔ آج وقت کی سب سے بڑی اور پہلی پکار یہ ہے۔ کہ اپنے افلاس کو دور کرو۔ ہندوستان کی سب سے بڑی دولت زراعت ہے، اکثر آبادی کی روزی کا انحصار اسی ذریعہ کے عروج و زوال پر ہے مسلمان بھی اسی ملک کے باشندے ہیں، ان کا ذریعۂ معاش بھی یہی ہے، ضرورت ہے کہ زراعت کے تمام اصول سے ان کو واقف کیا جائے، جدید آلات زراعت سے ان کو روشناس کیا جائے، اور ان کے استعمال کے طریقے ان کو بتلائے جائیں، ماہرین زراعت نے موجودہ زمانہ میں جو خاص خاص تحقیقات کی ہیں، ان سے ان کو مستفید ہونے کا موقع دیا جائے، اور اس سلسلہ میں ہر وہ تجویز جو حکومت یا کسی اور جانب سے زراعتی ترقی کے لئے سامنے آئے اس کی ہمیشہ ان کو اطلاع دی جاتی رہے، اس کے علاوہ خاص خاص گھریلو دستکاریاں جو کسی زمانہ میں صرف مسلمانوں کی ملکیت رہ چکی ہیں، اس کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی جائے، معماری اور دوسرے فرنیچر وغیرہ کے کاموں کی اہمیت ان کے ذہن نشین کی جائے اور ان کو یہ بتایا جائے کہ اپنی روزی کمانے کے لئے جو پیشہ بھی دیانت داری کے ساتھ اختیار کیا جائے وہ بیکار بیٹھے رہنے یا خیرات و ذلت کی زندگی گذارنے سے حد درجہ بہتر ہے، کوئی پیشہ خواہ

وہ کسی قسم کا موذلیل نہیں ہے - ہر پیشہ اپنی جگہ پر معز زا ور اختیار کئے جانے کے قابل ہے ، جو چیز ذلیل ہو قابل نفرت و ملامت ہے وہ بیکاری کی زندگی اور کسی فیاض کی آس اور امید ہے ، اس پر و پگنڈا کو اگر اپنی زندگی کا ایک جز بنا لیا جائے اور عوام کے اندر پورے زور کے ساتھ پھیلایا جائے تو آج بڑی حد تک قوم کی غربت اور مالی مصیبت کم ہو جائے ،

مضمون ختم کرنے سے پہلے آخر میں ایک مرتبہ پھر گذارش ہے ، کہ مسلم عوام کی عام تعلیم کا مسئلہ وقت کا اہم مطالبہ ہے جسکو کوئی انجمن نظر انداز کر کے زندہ نہیں سکتی - آپ مسلمانوں کو جنگ حریت میں شریک کرنا چاہتے ہوں یا آپ تحفظ حقوق مسلمین کے حامی ہوں - ہندوستان کی تمام انجمنیں ، سیاسی ہوں یا اصلاحی ، مذہبی ہوں یا علمی ، اور اپنے اغراض و مقاصد کے لحاظ سے باہم کتنی ہی متصادم ہوں ، اگر آپ کو یا ان کو مسلمانوں کی واقعی کوئی خدمت انجام دینا ہے ، اگر واقعی ان میں زندگی پیدا کرنا ہے ، اگر واقعی ان کو سربلند بنانا اور بام رفعت پر پہونچانا ہے تو سب سے پہلے مذکورہ بالا خاکہ کے مطابق ان کے ذہن کو بیدار اور ان کے قلب کے کو روشن کرنا پڑے گا ، ورنہ بغیر اس کے نہ ان میں باہمی معاونت کا جذبہ پیدا ہوگا - اور نہ اپنے اندر وہ کسی قومی خدمت و آزادی کے لئے کوئی تڑپ محسوس کریں گے - خدا سے دعا ہے کہ میری گذارشات رہنماؤں کی توجہ خاص کی مستحق ثابت ہوں ،

یارانِ نجد سے خطاب

(ایک مشاعرے کی دعوت کے جواب میں)

ابتک جسے منزل کا مقصود سمجھتے ہو
آغاز میں میرے بھی یہ رہگذر آیا تھا

میں نے بھی تخیل کی پرواز دکھائی تھی
تاروں سے پرے جاکر میں سیر کر آیا تھا

دنیا کے دھندلکے میں الفت کی کرن لیکر
محفل کا ہر اک گوشہ پُرنور کر آیا تھا

اک شاہد محبوبی، اک پیکر رنگینی
ارمانوں کے رستے سے دل میں اُتر آیا تھا

جلووں کی فراوانی، تابانی و عریانی
عاشق کو محبت میں کیا کیا نظر آیا تھا

جچتا مری آنکھوں میں کیا حسن حقیقت کا
میں خواب کی دنیا میں پرواز کر آیا تھا

پہنائے دو عالم میں بس ایک تجلی تھی
ہر وادی و صحرا میں ایمن نظر آیا تھا

باقی تھا سرو را بتو مر مر کے جئے جاتا
میں کوچۂ جاناں میں جاں نذر کر آیا تھا

وہ جان حزیں جسکی قوموں کو ضرورت تھی
ہستی کے لئے جسکی ہر سانس ودیعت تھی

ہندوستان

ہری پورہ کانگریس

پچھلے مہینے ہری پورہ میں کانگریس کا اکیاونواں اجلاس منعقد ہوا۔ نصف صدی کی سیاسی جدوجہد کے نتائج کا ایک عجیب مظاہرہ تھا۔ جو کام منفرد شخصیتوں نے شروع کیا تھا اور جس سے عرصہ تک کسی تعطیل کے زمانہ میں لوگوں کو تقریریں کرنے اور تجویزیں منظور کرنے کا دلچسپ مشغلہ ہاتھ آجاتا تھا۔ ہوتے ہوتے ایک عظیم الشان سیاسی ادارہ بن گیا ہے۔ اسوقت اس کے ڈیڑھ کروڑ کے قریب ممبر ہیں، گویا تعداد اراکین کے اعتبار سے یہ دنیا کا سب سے بڑا سیاسی ادارہ ہے۔ برطانوی ہندوستان کے ایک بڑے حصہ میں آج اس کی وزارتیں حکومت کر رہی ہیں۔ اور یہ محض پردیسی حکومت پر تنقید و نکتہ چینی کی جرات طلب مگر پھر بھی آسان کام سے آگے بڑھ کر مہمات امور کو طے کرنے اور ملکی زندگی میں عملی دخل کی ذمہ داری اٹھانے کی کٹھن منزل میں پہنچ گئی ہے۔ تمنا کی بے تابیوں سے نکل کر عمل کی صبر طلبی سے دوچار ہے۔ لیکن یہ تغیر کشاکش سے خالی نہیں۔ ہری پورہ کانگریس اس کشاکش کا ایک مظاہرہ تھی۔

انتظامات کی وسعت، اور خوبی، صحت اور صفائی، اہتمام، جزئیات تک میں خوش سلیقگی ہزار ہا رضاکاروں کی خاموش خدمت، جلسوں میں بیک وقت دو دو تین تین لاکھ انسانوں کا خاموشی سے بیٹھنا۔ ان چیزوں کا اندازہ بھی اس شخص کے لئے مشکل ہے۔ جس نے اپنی آنکھوں سے یہ سب دیکھا نہ ہو۔ مگر اس کا یقین بھی باہر والے مشکل سے کر سکتے ہیں کہ انسانوں کے اس ٹڈی دل میں جوش اور وارفتگی کی کیفیت کا مشکل ہی سے کہیں پتہ چلتا تھا۔ نہ نعرے تھے۔ نہ جیکارے، پرانے مشاق کبھی کبھی نعرے لگاتے تھے۔ تو کوئی مصرعہ نہ اٹھاتا تھا۔ کام کرنے والے خاموش کام میں لگے تھے۔ دیکھنے والے ان کے کام کے نتائج پر بس تحیر کے عالم میں تھے۔ کچھ لوگ ضرور تھے جو اس اطمینان اور خاموشی میں بے وقت

کی راگنی الاپتے تھے۔ مگر وہ کم تھے، اور یہ صاف محسوس ہوتا تھا کہ دوسرے لوگ یعنی بڑی اکثریت کو ان کا یہ انداز کھلتا ہے۔ بار بار یہ سننے میں آتا تھا کہ "یہ لوگ کام نہیں کرنے دیں گے"۔ ہری پورہ کانگریس کا غالب رنگ یہی تھا کہ "کام کرنے دو۔ باتیں کم کرو"۔ یہ خود اعتمادی کا رنگ ہے۔ اور جن لوگوں کی وجہ سے ہری پورہ پر یہ رنگ غالب تھا۔ وہ واقعی اپنے پر بڑا اعتماد رکھتے ہیں لیکن اس میں ایک خطرہ بھی ہے۔ یہی رنگ قناعت کا رنگ بن سکتا ہے، اطمینان کا روپ لے کر بالآخر جمود کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ خصوصاً ایک ایسی قوم کے لیئے جو اپنی آزادی کے حصول میں کوشاں ہیں اور جس کی آخری منزل ابھی بہت دور ہے۔ یہ خطرہ بڑا سخت خطرہ ہے۔ اس سے پہلے بھی کانگریس میں "عملی" "معتدل مزاجوں" اور "خیالی" "انتہا پسندوں" کی ٹکر ہو چکی ہے۔ پہلے کے "عملی" لوگ اس سے بہت کم پر "کام کرنے" کو آمادہ تھے۔ جتنے پر آج ہیں لیکن فرق یہی تھا۔ ایک گروہ چاہتا تھا کہ جس درمیانی منزل تک پہنچنے کے لئے اتنے دن جد وجہد کی ہے اور راہ کی کلفتیں برداشت کی ہیں اس پر کچھ تو ٹھہریں۔ دوسرا گروہ اس ٹھہرنے سے ڈرتا تھا کہ کہیں عارضی منزل کا آرام خواب آور نہ ثابت ہو۔ پہلے ایسے موقعوں پر کانگریس میں ہمیشہ انتہا پسندوں کی جیت رہی۔ اس دفعہ ملک بظاہر معتدلین کے ساتھ ہے۔

ہری پورہ کی ساری کارروائی میں اعتدال کی یہ جھلک پائی جاتی ہے۔ وفاق کا مسئلہ پیش ہوا معتدلین بھی وفاق کے مخالف ہیں۔ مگر انتہا پسند جانتے ہیں کہ یہ کیسا اختلاف ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وفاق کو بروئے کار نہ آنے دینے کے لیئے بھی شاید وہی تدبیر کی جائے جو صوبوں میں دستور کو "ختم" کرنے کے لئے کی جارہی ہے، یعنی یہ کہ اسے پوری قوت اور انہماک سے چلایا جائے! انھیں اندیشہ ہے کہ وفاق کو قابل قبول بنانے کے لیئے ہندوستانی ریاستوں کے شامل ہونے پر کچھ ایسی شرائط لگ گئیں جو کانگریس والے چاہتے ہیں تو شاید وفاق کو لوگ "ختم" کرنے کی خاطر قبول کرلیں گے۔ وہ اس لیئے بات کی وضاحت چاہتے تھے۔ سب کچھ کھول کر جتانا چاہتے تھے۔ مگر معتدلین نے یہی طعنہ دیا کہ تم کو ہم پر نہیں خود اپنے پر اعتماد نہیں، کانگریس پر اعتماد نہیں، قوم پر بھروسہ نہیں۔ دراصل اپنے چھیٹے پن کا احساس تم کو بہکاتا ہے۔ وقت آنے دو۔ ہم تم سے پیچھے نہ رہیں گے، لیکن اس وقت بات اسی طرح کہی جائے گی۔ جیسے ہم

کہتے ہیں۔ کانگریس نے ان معتدلین کی خود اعتمادی پر بھروسہ کیا اور بات اسی طرح کہی گئی۔ جیسے یہ چاہتے تھے،

دیسی ریاستوں میں کانگریس کی شاخیں قائم کرنے کا مسئلہ آیا۔ کچھ دن پہلے وردھا میں کانگریس کی جماعت عاملہ نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ یہ شاخیں نہ قائم کی جائیں۔ لوگ اس بات پر بہت برہم تھے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسہ سے پہلے عام گفتگوؤں سے یہی ظاہر ہوتا تھا۔ کہ اس مسئلہ پر معتدلین کو شکست ہوگی، اشتراکی جماعت، ریاستوں کے لوگ، اور بہت سے غیر متعلق لوگ سب یہی کہتے تھے کہ یہ تو ریاستوں کے آگے سپر ڈالنی ہے، اپنے کروڑوں ہم وطنوں سے قطع تعلق کرنا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ جب معاملہ بحث کے لیئے آیا اس وقت بھی مخالفت کا اظہار بڑی شد ومد کے ساتھ ہوا۔ مگر بالآخر فیصلہ یہی ہوا اگر شاخیں قائم ہوں تو وہ سیاسی کام نہ کریں!۔ گویا تعمیری کام میں کانگریس کا ہاتھ بٹائیں تو بٹائیں۔ مگر کسی سیاسی پیچیدگی میں کانگریس کو نہ مبتلا کریں۔ انتہا پسند کہتے ہیں کہ یہ ریاستوں سے کوئی سودا ہو رہا ہے۔ چرخے اور کھدر کے کام، دیہی صنعتوں کے احیاء، اور قومی تعلیم کے تجربہ میں ریاستوں کی مدد حاصل کرنے لیئے یا اور آئندہ وفاق میں انھیں ساتھ رکھنے کے لیئے ڈورے ڈالے جارہے ہیں۔ معتدل کہتے ہیں، تم نہ کام کرتے ہو نہ کام کو سمجھتے ہو۔ ہم خالی نام نہیں چاہتے۔ بقول مولانا ابوالکلام کھلونوں سے دل بہلانا، ہمیں منظور نہیں۔ ہمارے ہاتھ میں ہمیں بہت کام ہے۔ ساری قوت اسی کے نمٹانے میں صرف کرنی ہے، ہم ریاستوں کے جھگڑوں میں پڑکر اپنا دھیان بٹانا نہیں چاہتے۔ ریاستوں میں بھی کام کو واقعی بڑھانے کا یہی طریقہ ہے۔" کانگریس نے بڑے بحث و مباحثہ کے بعد معتدلوں کی رائے ہی کو مانا۔

خیال تھا کہ ہری پورہ کانگریس کی فضا میں عام ٹھنڈک کچھ اس وجہ سے بھی ہے کہ کوئی خاص مسئلہ جوش دلانے والا سامنے نہیں۔ لیکن کانگریس شروع ہونے سے پہلے خبر پہنچی کہ صوبجات متحدہ اور بہار کی کانگریس وزارتوں نے استعفیٰ دیدیا۔ اس سے گو حرارت بڑھتی نظر آئی مگر یہ بھی دھوکا تھا۔ اس خبر پر جوش سے زیادہ ہری پورہ میں ہر طرف افسوس کا اظہار ہونے لگا۔ ان صوبوں کے وزراء

جب ہری پورہ پہنچے تو یہ کہنے والے کم تھے۔ کہ شاباش تم نے پھر مورچہ جما دیا۔ اور یہ کہنے والے بےشمار تھے کہ "یہ کیا کیا؟ کہیں ایسا بھی ہوتا ہے"۔ "کام کہیں اس طرح کیا جاتا ہے؟"۔ وزیر غریب اپنی نجی گفتگوؤں میں سب کو یہی سمجھاتے ہوں گے۔ کہ بھائی ہم نے کچھ نہیں کیا ہم کو جو ہدایت مجلس عاملہ نے دی تھی اس پر کاربند ہونے کے گنہگار ہیں۔ خاصے ذمہ دار حلقوں میں اس واقعہ سے یہ اثر تھا کہ انتہا پسند لوگوں نے وزرار کی جان عذاب میں کر رکھی تھی۔ اور آخر کو استعفیٰ دینے پر مجبور ہی کر دیا۔ "کام کہیں اس طرح چلتا ہے؟" لیکن باوجود اس کے یہ ضرور ہے کہ کانگریس کا اندرونی ڈسپلن اتنا اچھا ہے کہ سب نے سب کی بات اپنے اوپر لے لی۔ ورکنگ کمیٹی نے کہا ہم نے کہا تھا۔ گاندھی جی نے کہا ٹھیک کیا، جواہرلال نے کہا میں نے حکم دیا تھا۔ اور گووند ولبھ پنت نے کہا میں تنہا ذمہ دار ہوں۔ میں نے اپنی ذمہ داری پر سب کچھ کیا اور میں سمجھتا ہوں کہ ٹھیک کیا۔ بہرحال ذرا خیال کیجئے کہ کانگریس کے اس اجلاس کا مزاج وہ ہوتا جو معمولاً پچھلے اجلاس کا رہا ہے تو اس واقعہ کا نتیجہ کیا نکلتا۔ ایک دن نہ گذرنے پاتا اور تمام وزارتیں ساتوں کانگریسی صوبوں میں مستعفی تو ہو ہی جاتیں۔ پھر جو ہوتا سو ہوتا۔ اس مرتبہ خطیبوں نے باربار کہا کہ بڑا سخت معرکہ درپیش ہے۔ برطانوی سامراج سے پھر ٹکر ہے۔ جنگ کے لئے کمر باندھو وغیرہ وغیرہ مگر نہ اس پر کوئی نعرہ ہوتا تھا نہ جے۔ اس کے لئے زیادہ تر لوگ یہی سوچتے تھے کہ کام کہیں ایسے ہوتا ہے چنانچہ یہی ہوا کہ کام کی تدبیر نکالی گئی۔ معاملہ وہیں کا وہیں ختم ہو گیا اور آج یہ دونوں وزارتیں پھر اپنا کام کر رہی ہیں۔

غرض ہری پورہ کی ساری کاروائی میں معتدل مزاج کام کرنے والوں کی فتح رہی۔ اس پر انتہا پسند گروہ جسقدر خفا ہو کم ہے۔ اور وہ واقعی خفا ہے بھی۔ اسے اندیشہ ہے اور یہ اندیشہ بالکل خیالی نہیں، کہ اگر کام سے بھی دلچسپی رہی تو موجودہ دستور کی گتھیوں میں قومی تحریک الجھ کر رہ جائے گی۔ اور "بنیادی" تعمیر نو کا کام شروع ہی نہ ہو سکے گا۔ ان کے اس خیال میں شخصی شبہ کی آمیزش بھی ہے۔ مگر سیاسی تحریکوں کے نشیب و فراز سے واقفیت بھی اس اندیشہ میں شامل ہے۔ دوسری طرف اعتدال پسندوں پر نظر ڈالیئے تو وہ تن آسان اور آرام دوست اعتدال پسند نہیں۔ جن سے کانگریس

کی پچھلی تاریخ ناآشنا نہیں۔ بلکہ سب کے سب آزمودہ کار سپاہی ہیں۔ ہر طرح کی تکلیفیں جھیل چکے ہیں۔ اور اس کے بظاہر کوئی آثار نہیں کہ آئندہ تکلیفوں سے جی چراتے ہیں۔ ہاں وہ واقعی سمجھتے ہیں کہ کچھ مفید کام کرنے کا موقع ہے۔ قومی تحریک کی بنیادیں مضبوط کرنے کا وقت ہے۔ اسے ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہئے۔ سب سے زیادہ گاندھی جی کی شخصیت سے اس جماعت کی ساکھ قائم ہے۔ اس لیئے کہ اگر ایک طرف گاندھی جی کا بالطبع اعتدال پسند ہونا مسلم ہے تو دوسری طرف اس سے بھی کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ کوئی بڑا سے بڑا انتہا پسند اپنے خواب کی تعبیر کے لیئے اس معتدل مزاج "رجعت پسند" سے زیادہ عملی کام نہیں کرسکا ہے۔

اس مرتبہ کانگریس میں یہ سوال بھی ہر زبان پر تھا کہ "گاندھی جی کے بعد کیا ہوگا۔ ان کو انتہا پسند بُرا بھلا کہہ لیتے ہیں مگر جانتے ہیں کہ ان کے بغیر گاڑی آگے نہیں چلتی اس لیئے ان کی مان لیتے ہیں۔ مگر ان کے بعد اس سوال کا بھی کچھ کچھ جواب پچھلی کانگریس میں ملتا ہے۔ جواہر لال نہرو جنھیں عام طور انتہا پسندوں کا سالارِ کارواں سمجھا جاتا ہے تقریباً ہر معاملہ میں اعتدال پسندوں کے ساتھ رہے عجب نہیں کہ یہ کانگریس کے دونوں گروہوں میں مفاہمت کا وہ کام کامیابی سے انجام دے سکیں جو اب تک گاندھی جی کو کرنا پڑا ہے۔

(ا۔ ر)

ممالکِ غیر

فرانس۔ وسط جنوری میں موسیو شوتان کی وزارت نے، جو پچھلے سال جون میں قائم ہوئی تھی، استعفا دیدیا، اور پانچ دن کی گفت وشنید کے بعد موسیو شوتان ہی نے ایک نئی وزارت بنائی، فرانسیسی دارالعوام میں کسی ایک پارٹی کی تعداد اتنی نہیں ہے کہ وہ زیادہ عرصہ تک حکومت کر سکے اور وہاں کی سیاسی زندگی میں وزارتوں کا بننا اور ٹوٹنا وہی حیثیت رکھتا ہے جو تاش کے کھیل میں ایک بازی کا ختم اور دوسری کا شروع ہونا۔ لیکن اسوقت فاشزم اور جمہوریت کے مقابلے نے فرانسیسی وزارتوں کے معاملات اور مدبروں اور پارٹیوں کے داؤں پیچ کو ایک خاص اہمیت دیدی ہے۔ حکومت پر قدامت پسند فرقے قابض ہو جائیں تو فاشسٹ انقلاب ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں اور انتہا پسندوں کو موقع ملا تو وہ روس کی تقلید کئے بغیر نہ مانیں گے۔

فرانس کی اندرونی سیاست نٹوں کے تماشے سے بہت ملتی ہے۔ قومی بینک، سینیٹ اور دارالعوام تین کھمبے ہیں ہر وزارت کی پالیسی ایک تجویز ہوتی ہے کہ اس اس طرح سے رسے باندھے جائیں تو بہت مضبوط رہیں گے اور پھر ہر وزارت ان پر نٹوں کی طرح اپنے کرتب دکھاتی ہے۔ پبلک تماشا دیکھتی ہے اور شور مچاتی ہے۔ مگر جب کسی طرف لوگ اپنے پاس والے کھمبے کو ذرا جھکتے یا ہلتے دیکھتے ہیں تو وہ جھٹ سے رسا ڈھیلا کر دیتے ہیں اور وزیر قلابازیاں کھاتے دھڑام دھڑام زمین پر آگرتے ہیں۔

فرانس کا قومی بینک سرمایہ داروں کا مورچہ ہے۔ سینیٹ قدامت پسندوں کا اور ایوان عام مدبروں کا۔ وزیر ایوان عام کے اراکین ہی ہوتے ہیں اور میزانیہ بھی وہی تیار کرتے ہیں لیکن سینیٹ

کی مخالفت بڑی رکاوٹ ہوسکتی ہے اور قومی بینک کے ڈائرکٹر جب چاہیں ذرا سے اشارے پر وزارت کے گھروندے کو توڑ سکتے ہیں۔ قوم اخبار پڑھتی ہے۔ ووٹ دیتی ہے۔ مگر چونکہ اس کا سرمایہ قومی بینک کے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے بینک کے ڈائرکٹروں اور بڑے حصہ داروں کے مقابلے میں وہ کسی کی خطابت اور قابلیت کو نہیں مانتی۔ پچھلے سال جون میں موسیو بلوم کی وزارت قومی بینک کی ٹکر سے ٹوٹی۔ اس لئے کہ فرنیک کی قیمت مقرر کرنے کے جو اختیارات موسیو بلوم چاہتے تھے وہ قومی بینک انھیں دینے پر تیار نہ تھی۔ اور موسیو شوتان کی وزارت میں جو کایا پلٹ ہوئی وہ بھی اسی بینک اور ان سرمایہ داروں کا کرشمہ ہے جو بینک پر حاوی ہیں۔ اب تک قومی بینک صرف یہ طے کرتا تھا۔ کہ عام خوشحالی اور مدبروں کی کامیابی کا وہ اپنی پالیسی میں کہاں تک لحاظ رکھ سکتا ہے۔ اب اس کے فیصلوں پر جمہوریت کی بقا کا دار و مدار ہے۔ وہ مان جائے تو فرانس اشتراکی ہوسکتا ہے، اور زور لگائے تو فاشسٹ ہو جائے گا۔

جمہوریت کی جان بچانے کے لئے اشتراکی اور اشتراکیت کی طرف مائل پارٹیوں نے "قومی محاذ" کے نام سے اشتراک عمل کا ارادہ کیا۔ اور موسیو بلوم کی وزارت اسی کی کارپردازی کا پہلا نمونہ تھی۔ لیکن قومی بینک کو سیاسی مصلحتوں اور حوصلوں سے کوئی مطلب نہیں۔ "قومی محاذ" کو وہ اپنے خالص معاشی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ اور اگر قومی سرمائے کو محفوظ رکھنے میں "قومی محاذ" کے ٹوٹ جانے اور فاشسٹ حکومت قائم ہونے کا اندیشہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اشتراکیوں کو سرمائے پر اختیار نہیں دیا جاسکتا اس لئے موسیو بلوم کو حکومت سے علیحدہ ہونا پڑا۔ اب بڑے سرمایہ داروں نے دیکھا کہ شوتان وزارت میں چند لوگ ایسے ہیں جنھیں الگ کر دیا جائے تو بہتر ہے۔ چنانچہ موسیو شوتان نے قلابازی کھائی اور اب نیا تماشا شروع کرنے پر تیار ہوئے ہیں۔

وزارت کی یہ کایا پلٹ ایوان عام کی ایک دلچسپ واردات بھی ہے۔ اس وقت ایوان میں بائیں طرف سے شمار کیجئے تو ۷۲ کومیونسٹ، ۱۴۶ سوشلسٹ، ۱۱۱ ریڈیکل سوشلسٹ (جو دراصل ریڈیکل یعنی انتہا پسند نہیں بلکہ محتاط یعنی ڈرپوک سوشلسٹ ہیں)، ۹۵ وسطی (یعنی بیچ میں بیٹھنے اور دائیں بائیں

دونوں طرف جھکنے اور جھانکنے والے) اور ۱۲۷ دائیں جانب کے، یعنی شاہی پرست سے لے کر ہر قسم کے قدامت پسند ہیں۔ موسیو بلوم کی وزارت کا دار و مدار کومیونسٹ، سوشلسٹ اور بعض ریڈیکل سوشلسٹ نائبوں پر تھا۔ شوتان کی مرحوم وزارت میں گیارہ سوشلسٹ تھے۔ نئی وزارت میں دو وزیر دائیں طرف کے ہیں۔ باقی سب ریڈیکل ہیں۔ سوشلسٹوں نے موسیو شوتاں سے وعدہ کیا ہے کہ انھیں کام چلانے کا موقع دیں گے۔ کومیونسٹوں نے کہا ہے کہ ہم ابھی کوئی وعدہ نہیں کرتے۔ جیسا موقع ہوگا ویسا رویہ اختیار کریں گے۔ یہ وزارت اقلیت کی ہے اور قائم اس لئے ہوسکی کہ اس کے سوا "قومی محاذ" کا نام باقی رکھنے کی کوئی صورت نہ تھی۔

موسیو شوتان کی پچھلی وزارت ٹوٹی اس سبب سے کہ ان کی کومیونسٹوں سے لڑائی ہو گئی تھی۔ ۲۹ ردسمبر کو، خاص اسوقت جب وزارت اس کوشش میں لگی تھی کہ مزدوروں اور کارخانہ داروں میں مصالحت ہوجائے۔ پیرس میں ہڑتال کرادی گئی۔ اس کی ذمہ داری سراسر کومیونسٹوں پر آتی ہے اور موسیو شوتاں کے ساتھ سوشلسٹ نائبوں نے بھی کہا کہ جھگڑے کے لئے موقع اور طریقہ دونوں بہت نامناسب ہیں۔ دوسری طرف یہ بات بھی کھلی ہوئی تھی کہ بڑے سرمایہ دار مصالحت کے لئے تیار نہیں تھے، وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ موسیو بلوم کے بنائے ہوئے قانون پر جس کے مطابق ہر جھگڑے میں مزدور اور سرمایہ دار فوراً معاملے کو پنچوں کے سپرد کرنے پر مجبور تھے۔ عملدرآمد ہو اور موسیو شوتان کی جو تجویز تھی کہ ایک طرف سرمایہ داروں کو قانون کی پیروی پر مجبور کیا جائے اور دوسری طرف مزدوروں کو اشتعال انگیزوں سے بچانے کی کوشش کی جائے وہ بھی انھیں منظور نہ تھی۔ کومیونسٹوں کے جو مطالبے تھے ان پر بھی وزارت کوئی توجہ نہیں کر رہی تھی۔ اور صنعت اور تجارت کو فروغ دے کر عام حالت درست کرنے اور فرنیک کا نرخ قائم کرکے موجودہ گرانی کو دور کرنے کی جو تدبیریں اس نے سوچی تھیں۔ ان میں اصلاحوں کا ذکر بھی نہ تھا جنھیں کومیونسٹ اصولاً لازمی یا عملاً مفید سمجھتے ہیں۔ لہذا وہ ہڑتالیوں کو اکساتے رہے۔ ہڑتالوں کی ایک وباسی پھیل گئی۔ اور فرنیک کی قیمت کچھ گر گئی۔ موسیو شوتان نے یہ دیکھکر اپنے دل میں طے کرلیا کہ کومیونسٹ محض اپنی غرض

سے ان کی وزارت کی حمایت کرتے ہیں، اور اس طرح کا احسان لینا انھیں گوارا نہ ہوا۔ انھوں نے صاف صاف کہدیا کہ وہ ایسی وزارت نہیں چاہتے جو سوشلسٹ حضرات کے کرم پر گذر کرتی ہو، اور ان کی وزارت کے سوشلسٹ اراکین نے استعفا دیدیا یعنی وزارت لوٹ گئی، یا یوں کہئے کہ دوسرا جنم لینے کی خاطر موسیو شوتان نے خودکشی کرلی۔

سرمایہ دار اور بہت سے قدامت پسند چاہتے بھی تھے کہ وہ اس طرح خودکشی کریں، اور ان کی خواہش کا یہی ایک سبب نہیں تھا کہ حکومت مزدوروں کو ان کا حق دینا چاہتی تھی۔ پچھلے سال فرانس میں دو اطالوی قتل ہوئے، اور یہ جرم سیاسی معلوم ہوتا تھا۔ پھر ستمبر میں ایک بڑے دفتر میں بم پھٹنے کی واردات بھی ہوئی، شوتان کے سابق وزیر داخلہ موسیو دوموآ نے تحقیقات شروع کرائی، اور ایسی مستعدی سے کہ کئی جگہ مختلف قسم کے سامان جنگ کے گودام ڈھونڈ نکالے۔ اور سراغ رسانی نے معاملے کو فرانس کے باہر اٹلی کی خفیہ وحشت انگیز فاشسٹ جماعتوں تک پہنچا دیا۔ یہی زمانہ نیون کانفرنس کا تھا۔ جب شوتان وزارت ہسپانیہ کے معاملے میں ذرا سختی کرنے یعنی باغیوں کی علانیہ مخالفت کرنے کا ارادہ رکھتی تھی، بڑے سرمایہ دار، جو سوشلسٹ جماعت کے اثر کو بڑھنے نہیں دینا چاہتے، اور اکثر قدامت پسند جنھیں فاشزم، پرولتاری حکومت سے زیادہ قابل برداشت معلوم ہوتی ہے۔ سمجھ گئے کہ اگر ذرا اور ڈھیل دی گئی تو بڑا نقصان ہوجائےگا۔ فرنیک ذرا سا گرا دینا اور ریل پیل میں وزارت کا تختہ پلٹ دینا تو بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

جرمنی

جرمنی کی داخلی سیاست کا رنگ دو واقعات سے ظاہر ہوتا ہے۔ جن کا بھید ابھی تک پورا پورا کھلا نہیں ہے۔ ان میں سے ایک تو وزیر مال اور سرکاری بنک کے صدر ڈاکٹر شاخت کا استعفیٰ ہے جو انہوں نے پچھلے نومبر میں داخل کیا اور دوسرا موقعہ جنرل بلومبرگ کی معزولی اور ہٹلر کا محکمہ فوج کو براہ راست اپنے ماتحت کرلینا ہے۔ ڈاکٹر شاخت نے اتنی مدت سے جرمنی کی مالیات کو سنبھالے رکھا ہے اور ایسی قابلیت کے آدمی ہیں کہ ان کی علیحدگی سے یقیناً جرمنی کی تجارت کو نقصان پہنچے گا۔ لیکن نازی لیڈر اس نقصان سے ڈرنے کی جگہ اس بات پر خوش ہیں کہ اب ملک کی معاشی پالیسی بالکل ان

کے ہاتھ میں آگئی ہے۔ بڑے سرمایہ دار اس پر کہاں تک مطمئن یا خفا ہیں۔ اس کا اندازہ ابھی نہیں کیا جا سکتا یہ تو آہستہ آہستہ ظاہر ہوگا۔ مالیات کی طرح فوج پر نازیوں کا پورا قبضہ ہوگیا ہے۔ اور اس معاملے میں فوج کی رائے معلوم نہیں ہو سکی ہے۔ نازی حکومت نے پروپگینڈا اور سنسر شپ کا ایسا مکمل انتظام کیا ہے کہ مخالفت کا پتہ نہیں اسی طرح چلے گا۔ جیسے شب برات کا آتشبازی سے۔

معاشی پالیسی میں دو رائیں تھیں۔ ایک ڈاکٹر شاخت کی تھی کہ صنعت کو جہاں تک ہو سکے سہارا دیا جائے اور موجودہ صورت حال میں بیرونی تجارت کو بڑھانے کی جو تدبیریں بھی ہو سکیں اختیار کیجائیں لیکن کاروبار اپنی اور پرائی ضرورت کو سمجھنے اور کمی کو پورا کرنے سے بڑھتا ہے، اور نازی فلسفہ سیاست میں اصل چیز یہ ہے کہ قوم اپنی تمام ضروریات پوری کر سکے، اور ایسے خام مال کے لئے کسی دوسرے کے دست نگر نہ ہو۔ جس کے بغیر لڑائی جاری نہیں رکھی جا سکتی۔ نازی مدبر ڈاکٹر شاخت کے مقابلے میں دوسری رائے پر عمل کر رہے ہیں۔ جو چار سال کے منصوبے کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ جرمنی کی جنگی تنظیم مکمل کی جائے، اور ترقی میں جو رکاوٹیں کمزوری اور صلح پسندی نے ڈالی ہیں وہ دور کی جائیں۔ اس تنظیم نے ایک سامان جنگ، جہاز، ہوائی جہاز، آب دوز، سڑکیں اور فوج کے متعلق اور تمام چیزیں تیار کرنے میں اتنا سرمایہ لگایا ہے کہ کاروباری زندگی میں چہل پہل نظر آنے لگی ہے لیکن اس تنظیم سے اصل دولت میں اضافہ نہیں ہوتا، جرمنی میں اسوقت خاصی گرانی ہے اس لئے کہ باہر سے اناج وغیرہ جیسی ضرورت کی چیزیں کم آتی ہیں اور حکومت کا قرضہ برابر بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ ابھی تک نازی پروپگینڈا لوگوں سے کہلوا رہا ہے کہ "ہمیں توپیں چاہئیں مکھن نہیں چاہیئے"۔ اور جب مکھن کے خیال سے لوگوں کے منہ میں پانی آنے لگتا ہے تو پروپگینڈا ذرا شدید کر دیا جاتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس طرح کب تک کام چل سکے گا۔

محکمۂ فوج میں جو انقلاب ہوا ہے۔ اس کا ملک کے مستقبل پر شاید اتنا اثر نہ ہو جتنا کہ نازیوں کی معاشی پالیسی کا۔ ایک زمانہ تھا جب فوج خاص قیصر کے ماتحت تھی اور جرمن چانسلر کو بھی اس کے معاملات میں دخل دینے کی مجال نہ تھی۔ جنگ کے بعد جو انقلاب ہوا اس نے فوج کی

سیاسی حیثیت بہت گھٹا دی اور صلحنامہ ورسائی نے اس کی تعداد اتنی کم کردی کہ وہ بڑا مرتبہ رکھنے کا دعویٰ
بھی نہیں کرسکتی تھی۔ اندرونی سیاست میں پھر بھی کسی پارٹی کے لئے فوج کو اپنے ساتھ ملالینا بڑی کامیابی تھی۔
اور فوج کی مخالفت یعنی ان عہدہ داروں کی جو فوج میں ہردلعزیز سمجھے جاتے تھے۔ ایک بڑی رکاوٹ تھی۔
لیکن ۱۹۳۵ء میں ہٹلر نے فوجی خدمت جبری کردی، اور اب فوج بھی اس حد تک ان تحریکوں کے اثر میں آگئی ہے
جو ملک میں پھیلی ہوئی ہیں کہ اسے اپنی الگ رائے رکھنے والی جماعت سمجھنا صحیح نہ ہوگا۔ اصل میں ہٹلر نے اپنے
لئے اسی وقت میدان صاف کرلیا تھا جب ۱۹۳۴ء میں فون شلائشر قتل ہوا۔ ہٹلر کے سپہ سالار بن جانے اور
ایک کمیٹی کے ذریعے سے فوج کا انتظام کرنے کے یہ معنی ہیں کہ اختلاف رائے کی جو ذراسی گنجائش تھی وہ
بھی اب نہ رہی ہے،

جرمنی۔ آسٹریا اور اٹلی جب سے روم برلن اور لندن پیرس سیاست کے دو محور بنے ہیں۔ ہر فریق
اس کوشش میں لگ رہا ہے کہ اپنی رفتار کی تعداد اور اپنی کفالتی معاشی
خودمختاری کا حلقہ بڑھائے، اٹلی کو حبش کی جنگ کے دوران میں بندشوں کا جو تجربہ ہوا اسکے بعد سے اس نے
جنوب مشرقی یورپ میں اپنی پالیسی بدل دی اور پرانی عداوتوں کو مٹا کر اب یوگوسلاویا سے صلح کرلی ہے کہ
جنگ کے وقت دشمن پشت پر حملہ نہ کرسکیں۔ اور خام مال اور خصوصاً اناج کی کمی اٹلی کو بے دست و پا
نہ کردے۔ یوگوسلاویا سے اس طرح کی مفاہمت ممکن نہ تھی۔ جب تک کہ جرمنی کو اس کے معاوضے میں کچھ
دے کر راضی نہ کیا جائے۔ کیونکہ جرمنی کو وہی ضرورتیں جو اٹلی کی ہیں، جنوب مشرقی یورپ کی سیاست
میں الجھائے رہتی ہیں۔ اور جرمنی نے حبش اور ہسپانیہ کی جنگ میں اٹلی کا ہمدرد اور حامی بن کر معاوضہ
وصول کرنے کا حق بھی حاصل کرلیا تھا۔ اسی سبب سے اٹلی نے جرمنی کو اختیار دے دیا ہے کہ آسٹریا
کی سیاست کو اپنے اثر میں لائے۔

ہٹلر اور آسٹریا کے چانسلر ڈاکٹر شُشنگ کی حال میں جو ملاقات ہوئی اس میں مسولینی کا ہاتھ
تھا، اور صرف اسی قدر نہیں کہ اس نے ٹیلیفون کے ذریعے سے ملاقات طے کرائی۔ پچھلے سال اپریل
میں ڈاکٹر شُشنگ نے یہ دیکھ کر کہ ہٹلر کو بہت ڈھیل دی جارہی ہے مسولینی سے ملاقات کرکے

اسے اپنی پالیسی کا حامی بنانے کی کوشش کی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ آسٹریا کو ایک طرف نازیوں اور دوسری طرف ان فرقوں سے بچایا جائے جو ہاپسبرگ خاندان کی حکومت دوبارہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس ملاقات اور گفتگو کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اور اس وقت ہٹلر سے جو ملاقات ہوئی اس میں جرمن فوج اور ان مسلح سپاہیوں کا جو کہا جاتا ہے ڈاکٹر شُشنگ کو گھیرے کھڑے تھے جتنا دباؤ پڑا اتنا ہی اثر مسولینی کی سرد مہری کا تھا۔

مضمون لکھنے کے وقت تک ان مطالبات کی تفصیل معلوم نہیں ہوئی جو ہٹلر نے منظور کرائے ہیں، لیکن اس میں تو کوئی شک نہیں کہ آسٹریا کی حکومت پر نازیوں کا قبضہ ہو جائے گا۔ اور وہ موقع کو دیکھ کر جرمنی اور آسٹریا کو ایک قوم، ایک ملک، اور ایک مورچہ، بنانے کی تمام تدبیریں کرینگے، اس کا یورپ کی سیاست پر کیا اثر پڑے گا؟ انگلستان اور فرانس یہ کہیں گے کہ معاہدوں اور خصوصاً سٹریزا میں ۱۹۳۴ء میں جو محاذ بنا تھا اس کے رو سے وہ آسٹریا کا الگ وجود قائم رکھنے کا وعدہ کر چکے ہیں اور اب تک جو کچھ حال کھلا ہے اس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ یہی رویہ اختیار کریں گے لیکن جرمنی اور آسٹریا کے مل جانے سے ان کا کوئی فوری نقصان نہیں جو انھیں اس پر آمادہ کرے کہ بات کو لڑائی تک پہنچائیں۔ جرمنی کی اس چال سے چکوسلواکیا بے شک گھر جاتا ہے، اور اس سے بھی انگلستان اور فرانس کا پرانا عہد و پیمان ہے۔ لیکن چکوسلواکیا رہا تو کیا فائدہ اور نہ رہا تو کیا نقصان؟ جمہوری حکومت، آزادی، خود مختاری، یہ جمہوریت کے جلوس میں نکالنے کے لئے بڑے شاندار جھنڈے ہیں لیکن لڑائی اور پروپگنڈا میں بڑا فرق ہے خصوصاً جب لڑائی صرف کسی دوسرے کی خاطر ہو۔ برطانوی اور فرانسیسی مدبر جہاں یہ سوچیں گے کہ چکوسلواکیا اور آسٹریا کے جرمنی میں فنا ہو جانے سے ان کی ناک کٹے گی۔ وہاں وہ یہ بھی سوچیں گے کہ جرمنی سے لڑائی مول لی جا سکتی ہے یا نہیں۔ اور جرمنی کے حوصلے ادھر پورے ہوئے تو عالمگیر جنگ بیس پچیس برس کے لئے ٹل سکتی ہے یا نہیں۔

بہرحال لیگ پر کمزوروں کو اعتبار نہیں رہا ہے۔ وسطی اور جنوب مشرقی یورپ کی ریاستیں

اس پر بھروسا کرنے کی جگہ اپنے درمیان اتحاد اور اشتراک عمل کی تدبیریں سوچنے پر مجبور ہو گئی ہیں۔ اگر ان تمام ریاستوں میں ایک نازی پارٹی نہ ہوتی اور جرمنی یا اٹلی کی سرپرستی اسے ریاست کے اندر ریاست اور قوم کے اندر قوم نہ بنا دیتی تو امن اور ترقی کی یہ صورت لیگ جیسے ڈھونگ سے بہتر ہی ہوتی۔ لیکن حال یہ ہے کہ سیاست اور معیشت میں جو قدم وہ رکھتی ہیں وہ فاشسٹ سیاست کے جال میں پڑتا ہے اور ہر قدم ان کے پاؤں کے لئے ایک نئی زنجیر بن جاتا ہے۔ ان ریاستوں کی آزادی اور خودمختاری کا اگر اب کوئی سہارا رہ گیا ہے تو جرمنی اور اٹلی کی رقابت ہے۔ ان کے بچنے کی امید انھیں کی کھٹ پٹ میں ہے۔

جرمنی اور اٹلی کی سیاست کا برطانیہ پر یہ اثر ہوا ہے کہ مسٹر ایڈن کو استعفیٰ دینا پڑا۔ اب ہم دیکھیں گے کہ برطانیہ لیگ اور بین الاقوامی قانون جمہوریت اور اخلاق کا پردہ پھاڑ کر انگریزی سیاست بے حجاب ہو جائے گی۔ اور فاشسٹ ریاستوں کے ساتھ مل کر اپنی حفاظت اور ترقی کی تدبیریں کرے گی۔ جب عدالت اور قیدخانہ کا ڈر نہ ہو تو مجرم ہونا تھانے دار ہونے سے واقعی بہتر ہے۔

لیگ کا سرپرست اور بین الاقوامی معاہدوں اور اخلاقی اصولوں کا محافظ ہونے۔ یا یوں کہئے سمجھے جانے۔ کے سبب سے حبش کے معاملے میں انگلستان بہت نقصان میں رہا۔ اور اگرچہ چین کے مسئلے میں ویسی غلطیاں نہیں کی گئیں۔ لیکن وہاں جاپان کی بے باکی اور ادھر بحر روم میں اٹلی کے تیغے جھاڑ کر پیچھے پڑ جانے سے برطانوی تجارت اور سرمایہ کو خاصا صدمہ پہنچا۔ اب جو ظاہر ہو گیا ہے کہ اٹلی اور جرمنی مل کر ایک دوسرے کے فائدے کی صورتیں نکال رہے ہیں، اور انھیں زیادہ کامیابی ہوئی تو ان کا اتحاد بہت پختہ ہو جائیگا۔ تو برطانوی مدبروں نے اپنا رویہ بدلنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ پچھلے سال ہمارے سابق وائسرائے لارڈ ہیلیفکس، جن کا معمولاً اللہ والوں میں شمار ہوتا ہے۔ جرمنی بھیجے گئے تھے کہ لین دین کی بنا پر کوئی سمجھوتا ہو سکے تو کریں اور جرمنی اور اٹلی کی دوستی میں رخنہ ڈالیں۔ اس کی کوئی صورت نہ نکلی۔ اور ادھر اٹلی ہر معاملے پر گفتگو کرنے پر تیار تھا۔ اس لئے کہ اس کی دھونس آگے نہیں چلتی اور برطانیہ نے آبرو کی خاطر اور زیادہ نقصان اٹھانا نہیں چاہا۔ مسولینی کا مطالبہ تھا کہ ایڈن کو درمیان سے ہٹاؤ تو بات چیت شروع ہو۔

اور اب کئی مہینے ہچکچانے اور بغلیں جھانکنے کے بعد وزیر اعظم کو اس کا موقع ملا ہے کہ مسٹر اڈین کا استعفیٰ منظور کریں اور برطانیہ کے خلوص کا ثبوت دیں۔

برطانیہ اور اٹلی کے درمیان کئی جھگڑے ہیں جنھیں چکانے سے دونوں کا فائدہ ہوگا۔ برطانیہ اٹلی کا حبش پر قبضہ تسلیم کرے گا۔ اٹلی انگریزوں کو اس کا موقع دے گا کہ حبش میں اپنا سرمایہ لگائیں۔ ریڈیو پر اٹلی جو پروپگینڈا برطانیہ کے خلاف مشرق قریب کے ملکوں میں کر رہا ہے وہ بند ہو جائے گا۔ انگریز نہر سوئیز کو اٹلی والوں کے لئے محفوظ کر دیں گے۔ اور اٹلی والوں کو اطمینان ہو جائے گا کہ مالٹا میں انگریزوں کی بحری اور ہوائی قوت کا کوئی بڑا مرکز نہ بنے گا۔ اسی طرح ہسپانیہ میں دونوں فرینکو سے سمجھوتا کریں گے جنوبی ہسپانیہ کے جزیرے اطالوی قبضے میں نہ آئیں گے اور ہسپانیہ اور شمالی افریقہ کی تجارت انگریزوں کے ہاتھ سے نہ جائے گی۔

اٹلی اور انگلستان کے درمیان سمجھوتا ہونے کے معنی یہ ہیں کہ چکوسلوواکیا، پولینڈ اور روس کی سرحد کو محفوظ رکھنے کا ذمہ انگلستان کے سر سے ہٹا۔ اور اسے اس طرح فاشسٹ قوتوں سے ملتے ہوئے دیکھ کر نا ممکن ہے کہ فرانس بھی ایسا ہی رنگ اختیار نہ کرے۔ اب فرانس اور بلجیم کا سہارا ہٹلر کے وعدے اور جرمنی کی دوستی ہوگی۔ باقی ملکوں کا اللہ مالک ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زیر ادارت:- ڈاکٹر سیّد عابد حسین ایم اے، پی ایچ ڈی

نمبر ۴	اپریل سنہ ۱۹۳۸ء	جلد ۲۹

فہرست مضامین

اسلامی نظام

قرآن کریم نے ملّتِ اسلامیہ کا نظام وحدتِ اطاعت پر رکھا ہے۔ یعنی اس کو سوائے اللہ کے کسی دوسرے کا مطیع نہیں بنایا۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا[2] اِلَّآ اِيَّاهُ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۴۰/۱۲)[1]

کسی کا فرمان نہیں سوائے اللہ کے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ تم سوائے اس کے کسی کے بندے نہ بنو۔ یہی ہے سیدھا دین۔ مگر اکثر آدمی نہیں جانتے۔

وہی بلا شرکت غیرے اصلی حاکم اور مطاع ہے۔

وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ۲۵/۱۸

اور وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں بناتا۔

اُس نے بندوں کی انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کی ہدایت اور اُن کی عقلوں کو صحیح راستہ پر لگانے اور اپنی رضامندی اور نارضامندی کے اعمال کو واضح کرنے کے لیے ایک ناقابلِ تغیر و تبدل کتاب اور مکمل دستورالعمل قرآن کریم کو اتار دیا تاکہ اس کے مطابق عمل کرکے لوگ اس کی خالص بندگی کی سعادت حاصل کریں اور دنیا جہان کی غلامی سے آزاد ہو جائیں۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (۱۵۵/۶)

اور یہ کتاب جس کو ہم نے اتارا ہے مبارک ہے۔ اس کی پیروی کرو اور پرہیزگاری اختیار کرو۔ امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائیگا۔

---

[1] ہر ایک آیت کے آخر میں اوپر آیت کا شمارہ ہے، نیچے سورۃ کا۔

[2] اردو میں اس لفظ کا ترجمہ "پوجنے" کے ساتھ صحیح نہیں ہے کیونکہ اس سے ذہن صرف شرعی عبادات کی طرف جاتا ہے حالانکہ قرآن کی متعدد آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبدیت کا مفہوم انسان کی زندگی کے تمام اعمال پر حاوی ہے خواہ وہ دینی ہوں یا دنیاوی۔ اس کی توضیح کسی مناسب موقع پر کرونگا۔ یہاں صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ اس کے معنی محکومیت کے ہیں یعنی مسلمان سوائے اللہ کے کسی کا محکوم نہیں۔ آیت کا یہ ٹکڑا کہ "اکثر آدمی نہیں جانتے" بہت توجہ کے قابل ہے کیونکہ مدتہائے دراز سے اشخاص پرستی کی وجہ سے آج یہ حقیقت خود حاملین قرآن کے ذہنوں سے بھی محو ہو چکی ہے۔

اللہ کی اطاعت کے معنے یہی ہیں کہ اُس کی کتاب کی پیروی کی جائے۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا (۶ ع۱۴) کیا اللہ کے سوا میں کسی اور کو حاکم بناؤں حالانکہ اللہ تو وہ ہے جس نے تمہاری طرف مفصل کتاب اُتاری ہے۔

اس کتاب کے سوا کسی دوسرے کی پیروی ممنوع ہے۔

اِتَّبِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ (۷ ع۱) اُسی کی پیروی کرو جو تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے اُتارا گیا ہے اور اُس کے سوا دوسرے آقاؤں کی پیروی نہ کرو

چنانچہ جن لوگوں نے دنیا میں اپنے سرداروں اور بزرگوں کی اطاعت نجات کا ذریعہ سمجھ کر کی ہے وہ قیامت میں جب نتیجہ برعکس دیکھینگے تو جل کر کہینگے :۔

رَبَّنَاۤ اِنَّاۤ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا۠ . رَبَّنَاۤ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا (۳۳ ع۸) اے ہمارے رب! ہم نے اپنے رئیسوں اور بزرگوں کی اطاعت کی سو اُنہوں نے ہم کو گمراہ کر دیا۔ اے ہمارے رب! اُن کو دگنا عذاب دے اور اُن پر بڑی لعنت کر۔

رسالت | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں تھیں :۔

(۱) پیغمبری۔ یعنی پیغام الٰہی کو لوگوں کے پاس بے کم و کاست پہنچا دینا۔ اس حیثیت سے آپ کی تصدیق کرنا اور آپ کے اوپر ایمان لانا فرض کیا گیا۔

(۲) امامت۔ یعنی اُمت کا انتظام، اُس کی شیرازہ بندی، اُن کے باہمی قضایا کے فیصلے، تدبیر مہمات۔ جنگ و صلح وغیرہ اجتماعی امور میں ان کی قیادت اور قائم مقامی وغیرہ۔ اس حیثیت سے آپ کی اطاعت اور فرمانبرداری لازم کی گئی۔

پہلی حیثیت یعنی پیغمبری کے لحاظ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی سے مشورہ لینے کا حکم نہ تھا بلکہ فریضۂ تبلیغ اللہ کی طرف سے آپ کے ذمہ لازم کر دیا گیا تھا۔

يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ (۵ ع۱۰) اے رسول جو تجھ پر اُتارا گیا ہے اُس کو پہنچا دے اور اگر تو نے نہ کیا تو اللہ کے پیغام کی تبلیغ نہیں کی۔

لیکن بحیثیت امام لوگوں سے مشورہ لینے کے لیے مامور تھے

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۴/۱۹)   اور امر (حکومت) میں اُن سے مشورہ لیا کرو۔[1]

یہ امامتِ کبریٰ جو آپ کی ذات سے بنی نوع انسان کی ہدایت و رہنمائی و صلاح و فلاح کے لیے قائم ہوئی قیامت تک مستمر ہے۔ جو آپ کے زندہ جانشینوں کے ذریعے سے ہمیشہ رہنی چاہیئے[2]۔ قرآن میں جو احکام رسول کی اطاعت کے لیے ہیں وہ آپ کی ذات اور زندگی تک محدود نہیں ہیں بلکہ منصب امامت کے لیے ہیں جس میں آپ کے خلفا بھی داخل ہیں۔

یہ رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے:۔

وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (۴/۸۰)   اور جو رسول کی اطاعت کریگا اُس نے اللہ کی اطاعت کی۔

خلفاء رسول کی اطاعت اللہ اور رسول دونوں کی اطاعت ہے۔ چنانچہ مرکز کے لیے یہی لفظ قرآن نے استعمال کیا ہے:۔

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ (۸/۲۰)   اے مومنو! اطاعت کرو اللہ اور اُس کے رسول کی۔ اور اس سے مُنہ نہ موڑو جس حال میں کہ تم سُن رہے ہو۔

اس آیت میں "عنہ" کی ضمیر مفرد ہے جس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ "اللہ و رسول" دونوں سے ایک ہی شئے مُراد ہے یعنی مرکز[3]۔ ورنہ قاعدہ کے مطابق یہاں "عنہما" ہونا چاہیے تھا۔ اور "جس حال میں کہ تم سُن رہے ہو" کی قید سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ اطاعت بالمشافہہ ہے۔ اور عربی میں اطاعت کے معنی ہی ہیں زندہ کی فرمانبرداری۔

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (۸/۲۴)   اے مومنو! اللہ و رسول کی بات مانو جب وہ تم کو ایسے کام کے لیے بلائے جس میں تمہاری زندگی ہو۔

---

[1] "شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ" نیز دوسری آیت "وامرھم شوریٰ بینھم" دونوں میں ھم کی ضمیر کا مرجع افراد امت ہیں جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اُمت کے معتمد علیہ اکابر کی جماعت مرکز کی مشیر ہوگی۔

[2] چنانچہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے اس سلسلہ کو خلافت کے نام سے قائم رکھا مگر افسوس ہے کہ متغلبین نے اس کو تیس سال سے زیادہ چلنے نہ دیا۔

[3] خلیفہ یا امام کا لفظ تاریخی لحاظ سے اس قدر بگڑ چکا ہے کہ صحیح مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہے۔ اس وجہ سے میں نے مرکز کا لفظ اختیار کیا ہے۔ رسول یا اُس کے جانشین امام کی حیثیت سے اللہ ہی کے احکام نافذ کرینگے۔ اس لیے مرکز کی اطاعت اللہ و رسول دونوں کی اطاعت ہے۔

یہاں بھی "دعا" کا صیغہ مفرد ہی اللہ و رسول دونوں کے لیے مستعمل ہوا ہے۔ اور یہ حکم بھی صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ ہمیشہ کے لیے ہے۔ جو آپ کے تمام آنے والے خلفا پر مشتمل ہے۔

جنگ اُحد میں ہزیمت اُٹھانے کے بعد دوسرے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ غنیم کے تعاقب میں نکلیں۔ یہ حکم چونکہ بحیثیت امام کے تھا اس لیے قرآن میں "اللہ و رسول" دونوں کا حکم کہا گیا۔

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ (۳/۱۷۲)	جنہوں نے حکم مانا اللہ و رسول کا اپنے زخم اُٹھانے کے بعد۔

اسی طرح حج اکبر کے دن مشرکوں سے برات کا اعلان جو مرکز اسلام کی طرف سے ہوا وہ "اللہ و رسول" دونوں کے نام سے ہوا۔

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَرَسُوْلُهٗ (۹/۳)	اور اعلان ہے اللہ اور اُس کے رسول کی جانب سے لوگوں کی طرف حج اکبر کے دن کہ اللہ اور اُس کا رسول مشرکوں سے بری ہے۔

باغیوں اور ڈاکوؤں کو جو مرکز کے مجرم ہیں "اللہ و رسول" دونوں کا محارب قرار دیا گیا۔

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا۔ الآیہ (۵/۳۳)	جو لوگ اللہ اور اُس کے رسول سے لڑتے اور روئے زمین میں فساد پھیلاتے ہیں اُن کی سزا بس یہی ہے کہ مار ڈالے جائیں الخ

ان مجرموں کی یہی سزا ہمیشہ کے لیے ہے۔ کچھ عہد رسالت ہی تک محدود نہ تھی۔

الغرض بیسیوں آیات ہیں جن میں "اللہ و رسول" کا لفظ مرکز کے معنے میں مستعمل ہوا ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اجتماعی لحاظ سے مرکز کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔

دستور العمل جس طرح اُمت اسلامیہ کی انفرادی زندگی کی اصلاح کے لیے قرآن اُتارا گیا ہے اسی طرح اُس کی اجتماعی زندگی کا بھی دستور العمل وہی ہے۔ وہ ایسی کامل کتاب ہے کہ ہر زمان و مکان اور ہر ماحول میں افراد کی ہدایت اور ملت کی رہنمائی کے لیے کافی ہے۔ اسی لیے جہاں ہر شخص کو ہدایت کی گئی ہے کہ قرآن کی پیروی کرے وہاں مرکز کو بھی یہی حکم دیا گیا ہے کہ قرآن ہی کے مطابق لوگوں کے درمیان حکومت کرے۔

إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ بِٱلْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ ٱلنَّاسِ بِمَآ أَرَىٰكَ ٱللَّهُ (۴/۱۰۵)

ہم نے تیرے اوپر حق کے ساتھ کتاب اُتاری ہے کہ جو کچھ اللہ تجھ کو سمجھائے اُس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلے کر۔

قرآن کے سوا کسی دوسرے کی طرف رخ کرنے کی ممانعت کی گئی۔

فَٱحْكُم بَيْنَهُم بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ ۖ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ ٱلْحَقِّ (۵/۴۸)

اور ان کے درمیان اسی کے مطابق فیصلے کر جو اللہ نے اُتارا ہے اور اس حق کو چھوڑ کر ان کی خواہشوں کے پیچھے نہ چل۔

شدید تاکید کی گئی کہ مرکز کو قرآنی تعلیمات سے ذرا بھی غفلت روا نہیں ہے اور نہایت حزم و احتیاط کے ساتھ اس پر کاربند رہنا چاہیے۔

فَٱحْكُم بَيْنَهُم بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَآءَهُمْ وَٱحْذَرْهُمْ أَن يَفْتِنُوكَ عَنۢ بَعْضِ مَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ إِلَيْكَ (۵/۴۹)

اور یہ کہ تو فیصلے کر ان کے درمیان اسی کے مطابق جو اللہ نے نازل فرمایا ہے اور ان کی خواہشوں کے پیچھے نہ جا۔ اور احتیاط رکھ کہ اللہ کے اُتارے ہوئے کسی حکم سے وہ تجھ کو ہٹا کر فتنہ میں نہ ڈال دیں۔

یہاں تک کہ یہ وعید بھی کی گئی۔

وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ فَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْفَٰسِقُونَ (۵/۴۷)

اور جو اللہ کے اُتارے ہوئے کے مطابق حکم نہ دیں گے وہ فاسق ہیں۔

فریضۂ اُمت اسلام کے معنے ہی اطاعت کے ہیں۔ اُمت اسلامیہ کو یہی حکم دیا گیا ہے کہ وہ اللہ و رسول یعنے مرکز کی مطیع رہے۔

قُلْ أَطِيعُوا۟ ٱللَّهَ وَأَطِيعُوا۟ ٱلرَّسُولَ ۖ فَإِن تَوَلَّوْا۟ فَإِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُم مَّا حُمِّلْتُمْ ۖ وَإِن تُطِيعُوهُ تَهْتَدُوا۟ (۲۴/۵۴)

کہہ دو کہ اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اگر تم روگردانی کروگے تو اس کی ذمہ داری اس کے اوپر ہے اور تمہاری ذمہ داری تمہارے اوپر ہے۔ اور جو تم اسکی اطاعت کروگے تو سیدھے راستہ پر رہوگے۔

مرکز کے وفادار رہو اور اُس سے غداری اور مفوضہ فریضہ میں خیانت کاری نہ کرو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ — اے مومنو! اللہ و رسول سے غداری اور جانتے ہوئے اپنی
وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۸/۲۷) — امانتوں میں خیانت نہ کرو۔

مرکز ہی کی اطاعت کامیابی کا ذریعہ ہے۔

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى — مومنوں کا قول جب وہ اللہ و رسول کی طرف بلائے جائیں کہ
اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا — انکے درمیان فیصلہ کرے بس یہی ہے کہ کہہ دیں کہ ہم نے سنا اور مان
وَاَطَعْنَا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۲۴/۵۱) — لیا۔ اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

مرکز کے احکام سے سرتابی کرنے والے سب سے زیادہ ذلیل ہونگے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اُولٰٓئِكَ — جو لوگ اللہ اور رسول سے مخالفت کرینگے وہ سب سے زیادہ ذلیل
فِى الْاَذَلِّيْنَ (۵۸/۲۰) — لوگوں میں سے ہونگے۔

مرکز کا حکم قطعی اور آخری ہے۔ کسی مسلمان کو نہ اس سے انکار کا حق ہے نہ اس کا کہیں مرافعہ ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ — کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو اپنے معاملہ میں اختیار باقی نہیں
وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ (۳۳/۳۶) — رہتا جبکہ اللہ و رسول کسی امر کا فیصلہ کر دے۔

یعنے مرکز ہر دینی یا دنیاوی امر میں آخری اور بالاترین اختیار ہے جس کی اطاعت کے سوا مسلم کے لیے کوئی چارہ نہیں۔ اور جس کی نافرمانی گمراہی ہے۔

اطاعت | یہ پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے کہ قرآن سوائے اللہ کے کسی دوسرے کی اطاعت کا حکم نہیں دیتا۔ یہاں تک کہ والدین کا بھی جہاں جہاں ذکر کیا ہے اُن کے ساتھ سلوک اور احسان ہی کی وصیت فرمائی ہے، اطاعت کا حکم نہیں دیا ہے۔ دینی اطاعت خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی صرف اکیلے اللہ کی ہے۔ انفرادی لحاظ سے قرآن کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے اور اجتماعی لحاظ سے مرکز کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ جب تک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اُمت میں موجود تھے اُنکی اطاعت اللہ کی اطاعت تھی اور آپ کے بعد اس امامت کبریٰ پر آپ کے زندہ جانشینوں کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے جن کا فریضہ یہ ہے کہ کتاب الٰہی کے مطابق احکام نافذ کریں اور اُمت کے منتخبہ افراد کو مشاورت کے لیے ساتھ رکھیں۔ یہ احکام قطعی اور حتمی

ہونگے جن سے سرتابی کرنے والا اللہ اور رسول کا دشمن ہوگا

الغرض دینِ اسلام محض ایک کتابی مذہب نہیں ہے بلکہ زندگی کا ایک مکمل عملی نظام ہے جو بدقسمتی سے مدتہائے دراز سے مسلمانوں کے ہاتھوں سے کھویا گیا ہے۔ اور اسی باعث سے وہ غارت ہوئے ہیں۔ کیونکہ کسی ملت کی زندگی جب تک کہ اُس کا زندہ مرکز نہ ہو سخت دشوار ہے۔

اجتماعی نظام کی پوری شکل اس آیت میں ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ ۖ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ (۴-۵۹)

اے مومنو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی۔ اور تم میں سے جو امراء ہوں اُن کی اطاعت کرو۔ اگر کسی بات میں تم تنازع کر بیٹھو تو اُس کو اللہ و رسول کی طرف لوٹاؤ۔

یعنی اصل مطاع اللہ ہے، اس کی اجتماعی اطاعت ہوگی رسول یعنی مرکز یا مرکز کے مقرر کئے ہوئے اور اختیار دیے ہوئے مسلم امراء کے ذریعہ سے۔ ان امراء کا کوئی فیصلہ یا حکم اگر مسلمانوں کو قرآن کے خلاف معلوم ہو تو اُس میں ان کو امراء کے ساتھ منازعت کا حق حاصل ہے۔ اس قسم کے نزاعی امور میں مرکز کی طرف رجوع کرنا ہوگا جو ان کا فوراً قطعی فیصلہ کردیگا[1]۔

اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ ملت کا سارا اجتماعی اختیار مرکز کے ہاتھ میں ہے۔ اسی کی طرف سے ہر شعبہ کے امراء کا تقرر ہوگا۔ مثلاً امراء ملک، امراء فوج، امراء عدل۔ امراء حج و ائمۂ صلوٰۃ و تعلیم و ارشاد وغیرہ۔ نیز اُس کا یہ بھی فریضہ ہوگا کہ افرادِ ملت اور امراء ملت کے تنازعات کو مٹاتا رہے اور ان میں باہم کسی قسم کا اختلاف و افتراق پیدا نہ ہونے دے۔ اس انتظامی سلسلہ سے اُمت کا کوئی فرد باہر نہیں نکل سکتا۔

اس نظام میں اربابِ علم و عقل کو فکر کی پوری حریت اور اجتہاد کی مکمل آزادی کے علاوہ قرآن نے درجاتِ عالیہ کی سربلندی بھی عطا کی ہے لیکن اُن کو مطاع یا متبوع نہیں قرار دیا ہے۔ ان کی تحقیق و اجتہاد کے نتائج امت کے لیے اسی وقت حجت ہونگے جب مرکز سے مسلم ہو کر اُس کو ملینگے۔ اسی طرح واعظوں کو وعظ اور مرشدوں کو

---

[1] عام مفسرین نے اللہ و رسول سے کتاب و سنت کو مُراد لیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے مطابق امیر کے ساتھ تنازع کی صورت میں ہر دو فریق قرآن و حدیث کو لے کر بحث کے لیے بیٹھینگے اور تجربہ شاہد ہے کہ قیامت تک فیصلہ نہ ہوسکیگا۔ یہ زندہ مرکز ہی ہے جو اس قسم کے جملہ اختلافی امور کا فیصلہ کریگا اور اُمت کو متحد رکھیگا۔

رہنمائی کی اسی وقت اجازت ہوگی جب وہ مرکز کا پروانہ رکھتے ہونگے۔

آخر میں پھر تصریح کر دیتا ہوں کہ یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں مرکز کو اللہ و رسول کہتا ہوں۔ بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ اجتماعی لحاظ سے مرکز ہی کی اطاعت کو قرآن اللہ و رسول کی اطاعت قرار دیتا ہے بشرطیکہ مرکز قرآن کے مطابق ہو۔

اللہ و رسول میں قرآن کی تشریح کا خود قرآن ہی سے قائل ہوں۔ اسی بنا پر اللہ و رسول کا یہ مفہوم کہ اس سے مراد مرکز یعنے امام وقت ہے۔ چند آیات ہی سے واضح کیا ہے جو اہل بصیرت کے لیے کافی ہیں۔ اور اگر ضرورت داعی ہوئی تو اور بھی متعدد آیات سے تفصیل پیش کرنے کی گنجائش ہے۔ مگر عام اہل اسلام قرآنی الفاظ کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال کی بھی سند چاہتے ہیں اور مدتہائے دراز سے اس کے خوگر ہو رہے ہیں۔ اس لیے ان کی تسکین خاطر کے واسطے چند ائمہ تفسیر کے اقوال بھی نقل کیے دیتا ہوں جنہوں نے اللہ و رسول کے معنی امام وقت ہی کے لکھے ہیں۔

امام ابن جریر طبری سورۂ انفال کی پہلی آیت "قل الانفال للہ والرسول" کی تفسیر میں مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد اپنا فیصلہ یہ لکھتے ہیں۔

"واولی ہذہ الاقوال بالصواب فی معنی الانفال قول من قال ہی زیادات یزیدہا الامام لبعض الجیش او جمیعہم"

انفال کے معنی کے متعلق ان تمام اقوال میں سے قرین صواب ان لوگوں کا قول ہے جنہوں نے کہا ہے کہ یہ وہ اضافے ہیں جو امام وقت بعض یا کل فوج کے لیے کرتا ہے۔

یہاں انفال کے معنی سے مجھے بحث نہیں۔ مدعا صرف یہ ہے کہ اللہ و رسول کی تفسیر اُنھوں نے امام وقت لکھی ہے۔

امام رازی نے آیت ۳۳/۵ یعنی "انما جزآء الذین یحاربون اللہ ورسولہ" کے تحت میں امام ابوحنیفہ کا یہ قول نقل کیا ہے:-

"قال ابوحنیفۃ اذا قتل واخذ المال فالامام مخیر فیہ بین ثلاثۃ اشیاء"

امام ابوحنیفہ نے فرمایا ہے کہ اگر باغی یا ڈاکو نے قتل بھی کیا ہے اور مال بھی لیا ہے تو امام کو اختیار ہے کہ تینوں سزاؤں (قتل قطع اور صلیب) میں سے جو سزا چاہے اس کو دے۔

اسی آیت کی تفسیر میں علامہ جلال الدین سیوطی الدرالمنثور میں یہ روایت درج کرتے ہیں۔

"عن سعید بن المسیب والحسن والضحاک قالوا الامام مخیر فی المحارب یصنع به ما یشاء"

سعید بن مسیب، حسن بصری اور ضحاک نے کہا ہے کہ محارب کے معاملہ میں امام کو اختیار ہے جو چاہے کرے۔

یہی امام محی السنۃ بغوی نے معالم التنزیل میں لکھا ہے۔ اور فتح البیان میں نواب صدیق حسن خاں مرحوم لکھتے ہیں۔

"قال ابن عباس وسعید بن المسیب ومجاہد وعطاء والحسن البصری وابراہیم النخعی والضحاک وابوثور من شہر السلاح فی قبۃ الاسلام واخاف السبیل ثم ظفر به وقدر علیه فامام المسلمین فیه بالخیار"

حضرت ابن عباس، سعید بن المسیب، مجاہد، عطاء، حسن بصری، ابراہیم نخعی، ضحاک اور ابو ثور نے کہا ہے کہ جس نے اسلامی محروسہ میں ہتھیار اٹھایا اور راستوں کو پرخطر کر دیا پھر وہ گرفت میں آیا اور پکڑا گیا اس کے بارے میں مسلمانوں کے امام کو اختیار ہے (جو سزا چاہے دے)

ان اقوال سے دو باتیں ظاہر ہوگئیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ و رسول سے مراد امام وقت ہے اور دوسری یہ کہ یہ احکام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات یا زندگی تک محدود نہیں تھے بلکہ دائمی ہیں۔ اور یہی دونوں باتیں میں نے آیات سے واضح کی ہیں۔

اقبال کا تصورِ حیات

یہ مضمون ۹ جنوری ۱۹۴۶ء کو حیدرآباد میں اس جلسہ میں پڑھا گیا تھا جو یوم اقبال کے سلسلے میں مسلم کلچرل سوسائٹی کے زیرِ اہتمام منعقد ہوا تھا۔ جلسہ کی صدارت والاشان نواب اعظم جاہ بہادر پرنس آف برار ولیعہد سلطنت آصفیہ نے فرمائی تھی۔

اقبال کی شاعری کی ابتدا اس زمانہ میں ہوئی جبکہ مسلمانانِ ہند مغربی تعلیم و تمدن سے پورے طور پر مرعوب ہو چکے تھے اور ان کی حیات اجتماعی پر "اعترافِ شکست" کی ذہنیت نے غلبہ پا لیا تھا۔ انیسویں صدی کے آخر میں مسلمانانِ ہند کے اربابِ فکر کے سامنے سوائے اس کے کوئی نصب العین نہ تھا کہ وہ اپنے ہم مذہبوں کے لئے سرکاری خدمات حاصل کرنے کی کوشش کریں اور انگریزی حکومت کو راضی رکھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانانِ ہند نے اپنے غیر ملکی آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے ہر بات میں ان کی نقالی شروع کر دی۔ نہ صرف وضع و قطع میں بلکہ طرزِ خیال میں بھی وہ اپنے تمدن اور اپنی شائستگی سے بیگانہ ہو گئے اور اس بات کو موجبِ فخر سمجھنے لگے۔ نقالی قوموں کے خد و خال کو مسخ کر ڈالتی ہے۔ چنانچہ اس پر تعجب نہ ہونا چاہیئے کہ اس زمانہ کے مسلمانوں کے مقاصد بالکل پست اور ان کی فکر کا معیار بہت ادنیٰ ہو گیا۔ اقبال نے اس ماحول میں آنکھیں کھولیں جبکہ مغرب پرستی کا سیلاب پورے زور شور پر تھا۔ اس کی حساس طبیعت پر گرد و پیش کے حالات نے ردِ عمل کا اثر پیدا کیا۔ اس نے قوم کو خود اعتمادی کا سبق دینا شروع کیا لیکن اس کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ کچھ دنوں بعد ایسے واقعات پیش آئے جن کی وجہ سے مسلمانانِ ہند کی آنکھیں ذرا کھلیں۔ جنگِ بلقان اور جنگِ طرابلس میں حکومت نے جو روش اختیار کی اس سے انھیں معلوم ہوا کہ کوئی قوم کسی قوم کی دوست نہیں ہوتی اور اگر ہوتی ہے تو خاص اغراض کے تحت۔ آستانہ حکومت سے مایوس ہونے پر انھوں نے اپنی ملت سے ربط و ضبط بڑھانا شروع کیا۔ اب گویا اقبال کے پیغام کے لئے سازگار فضا پیدا ہو گئی۔ جنگِ عظیم کے دوران میں

اور اس کے بعد جو سیاسی حالات ہندوستان میں پیدا ہوئے ان کے متعلق یہاں ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ۔ لیکن ان کا نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ مسلمانان ہند سوتے سے چونک پڑے اور انھوں نے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا عزم کر لیا ۔ اقبال نے جس زمانہ میں مثنوی " اسرار خودی " لکھی تھی اس وقت سارے ہندوستان میں مشکل ہی سے اس کے چند ہم نوا تھے ۔ چنانچہ شاعر نے مثنوی کے آخر میں ذات باری سے اس کا گلہ کیا ہے کہ میرا درد دل سمجھنے والا کوئی نہیں ۔ مثنوی کا یہ حصہ آرٹ کے نقطہ نظر سے دنیا کے ادب عالیہ کے بہترین نمونوں میں شمار ہونے کے لائق ہے ۔ ان اشعار میں فکر موسیقی اور خلوص کے ساتھ حل ہو کر جذبہ بن گئی ہے وہ کہتا ہے :-

منکہ بہر دیگراں سوزم چو شمع ؎ بزم خود را گریہ آموزم چو شمع
دل بدوشش و دیدہ بر فردا ستم ؎ درمیان انجمن تنہا ستم
در جہاں یارب ندیم من کجاست ؎ نخل سینایم کلیم من کجاست
شمع را تنہا تپیدن سہل نیست ؎ آہ یک پروانۂ من اہل نیست
انتظار غمگسارے تا کجا ؎ جستجوئے رازدارے تا کجا
ایں امانت بازگیر از سینہ ام ؎ خار جوہر برکشش از آئینہ ام
یا مرا یک ہمدم دیرینہ دہ ؎ عشق عالم سوز را آئینہ دہ

پھر شاعر نہایت والہانہ انداز میں شکوہ کرتا ہے کہ دنیا میں ہر ایک کا مونس و غمخوار موجود ہے لیکن میری زبان سمجھنے والا جسے میں اپنا رازدار بنا سکوں کوئی نہیں ۔ وہ کہتا ہے :-

موج در بحر است ہم پہلوئے موج ؎ ہست با ہمدم تپیدن خوئے موج
بر فلک کوکب ندیم کوکب است ؎ ماہ تاباں سر بزانوئے شب است
ہستیٔ جوئے بہ جوئے گم شود ؎ موجہ بادے ببوئے گم شود
ہست در ہر گوشۂ ویرانہ رقص ؎ می کند دیوانہ با دیوانہ رقص
من مثال لالۂ صحرا ستم ؎ درمیان محفلے تنہا ستم

خواہم از لطفِ تو یارے ہمدمے ؎ از رموزِ فطرتِ من محرمے
ہمدمے دیوانۂ فرزانۂ ؎ از خیالِ این و آن بیگانۂ
تا بجانِ او سپارم ہوئے خویش ؎ باز بینم در دلِ او روئے خویش

لیکن کسے معلوم تھا کہ بیس پچیس سال کے عرصے ہیں ملک کے ہر گوشہ میں اقبال کی آواز کو سمجھنے والے اور اس پر لبیک کہنے والے ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد میں پیدا ہو جائیں گے اور اُسے ایسی مقبولیت حاصل ہوگی جو شاید ہی کسی دوسرے شاعر کو اپنی زندگی میں حاصل ہوئی ہو۔ اب ہمارے شاعر کو اپنی بزم میں تنہائی کا گلہ باقی نہیں رہا کہ خود اس نے خود اعتمادی کے ساتھ اعتراف کیا ہے:۔

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں ؎ یہاں اب میرے راز داں اور بھی ہیں

جہاں تک مجھے علم ہے کسی دوسرے شاعر نے اپنے دلآویز نغموں سے اتنی بڑی جماعت پر جیسی کہ مسلمانانِ ہند کی جماعت ہے اتنا گہرا اثر نہیں چھوڑا جیسا کہ اقبال نے۔ اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ اقبال نے زندگی کے ان مہتم بالشان حقائق کو اپنی شاعری کا موضوع قرار دیا ہے جو قوموں کی سیرت کی تشکیل میں ممد و معاون ہوتے ہیں اور انھیں فلاح و سعادت کی طرف لے جاتے ہیں۔ اگرچہ وہ خود "زمین مردہ" میں پیدا ہوا جیسا کہ اس نے "پیامِ مشرق" میں اپنا اور المانوی گوئٹے کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

او چمن زادے چمن پروردۂ ؎ من دمیدم از زمینِ مردۂ

لیکن اس نے اپنے پیغام سے ایک پوری قوم کی رگوں میں زندگی کی لہر پیدا کر دی۔

اقبال شاعر بھی ہے اور حکیم بھی۔ اس نے شاعری میں اپنی راہ دوسروں سے بالکل الگ نکالی ہے۔ اگرچہ وہ قدیم اسالیبِ بیان اور تشبیہوں اور استعاروں کو اپنے دقیق اور حکیمانہ مطالب ادا کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے لیکن اس کو اپنی ملت سے شکایت ہے کہ:۔

او حدیثِ دلبری خواہد زمن ؎ رنگ و آبِ شاعری خواہد زمن

کم نظر بیتابیٔ جانم ندید ؛ آشکارم دید و پنہانم ندید

اس کی یہ شکایت اپنے ہم مشربوں سے ٹھیک معلوم ہوتی ہے کہ وہ تو انھیں شاہین بچہ کی کہانی سنانا چاہتا ہے اور وہ اس سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ بھی دوسروں کے مثل گل و بلبل کی داستان سرائی کرے۔ اقبال آرٹ (صناعی) کو آرٹ کی خاطر نہیں بلکہ زندگی کے سنجیدہ اور اہم حقائق کا ایک وسیلہ تصور کرتا ہے اور اس کے نزدیک اعلیٰ ترین آرٹ وہ ہے جو ہمارے دل میں اخلاقی اقدار کا احساس و توازن پیدا کرے۔ آرٹ کے ذریعہ احساسات اور کیفیات شعوری کی ساری منتشر قوتیں شخصیت کی گہرائیوں میں سموئی جاتی ہیں اور پھر وجدانی وحدت بن کر ظاہر ہوتی ہیں۔ شاعر کا لمحۂ فکر ابدی زمانہ میں ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے پھول میں صدہا بہاروں کی خوشبوئیں پنہاں ہوتی ہیں۔ اقبال چاہے "رنگ و آب شاعری" کی طرف سے کتنا ہی بے نیاز کیوں نہ ہو لیکن اس کو کیا کیجئے کہ فطرت نے اُسے شاعر پیدا کیا ہے۔ اس کی شاعری میں جو حکیمانہ خیالات آتے ہیں وہ اس کے صحیح اور دور رس وجدان کا نتیجہ ہیں۔ وہ کوئی پیشہ ور فلسفی نہیں جو بال کی کھال نکالنے کی کوشش کرے یا ان پر اصول موضوعہ کی تدوین میں منطقی ضابطوں کا پابند ہو۔ وہ عقل کی دور کی راہ اختیار کرنے کے بجائے وجدانی طور پر حقائق حیات کا ادراک و مشاہدہ کرتا ہے۔ وہ اپنا نظریۂ علم "بال جبریل" میں یوں بیان کرتا ہے:-

مشام تیز سے ملتا ہے صحرا میں نشاں اس کا ؛ ظن و تخمین سے ہاتھ آتا نہیں آہوئے تاتاری

اقبال نے مشرقی و مغربی فلسفے کا نہایت دقت نظر سے مطالعہ کیا ہے اس ضمن میں جو بات قابل لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ اس نے مختلف فلاسفہ کے نظریوں اور تصورات میں صرف انھیں کو اپنا ذہنی سرمایہ بنایا جو اس کی طبیعت کے ساتھ سازگار تھے اس نے ان منتشر تصورات میں اپنی شخصیت کی قوت سے وحدت اور یک جہتی پیدا کی۔ اس میں شبہ نہیں کہ مغربی فلاسفہ میں وہ نطشے اور برگسوں سے متاثر ہوا ہے لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ اور دوسرے فلسفیوں کو چھوڑ کر وہ اُنھیں دونوں سے کیوں متاثر ہوا؟ دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں فلاسفہ کے نظریوں سے اقبال کو اپنے مخصوص خیالات کی تائید حاصل ہوئی۔ نطشے نے مسیحی فلسفہ اخلاق اور مغربی تہذیب کی خوب دھجیاں اُڑائیں ہیں۔ وہ خدا کا

منکر تھا لیکن اس کے تصورات سے جو اخلاقی نتائج مرتب ہوتے ہیں وہ اسلامی تعلیمات سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں۔ اس نے "فوق البشر" کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ شیخ عبدالکریم ابن ابراہیم الجیلی کے "انسان کامل" کے نظریے سے بہت مشابہ ہے۔ نطشے کا "فوق البشر" نئی تہذیب قائم کرے گا اور کمزور عصبیت کے گرد ہوں پر غلبہ و استیلا حاصل کرے گا۔ نطشے کے متعلق اقبال کا یہ خیال ہے:-

نیشتر اندر دل مغرب فشرد ٭ دستش از خون چلیپا احمر است
آنکہ بر طرح حرم بتخانہ ساخت ٭ قلب او مومن دماغش کافر است

برگسون کا تخلیقی ارتقا کا نظریہ بھی ان اصول سے بہت قریب ہے جو اقبال کو عزیز ہیں۔ برگسون کے نزدیک حیات ایک مستقل اور مسلسل تخلیق ہے جو بعض مخصوص قوانین و نوامیس کی پابند ہے۔ تعینات وکثرت او مکان وزمان متناقض حقائق نہیں ہیں۔ عقل اشیاء کو فرداً فرداً تحلیل کر سکتی ہے لیکن حقیقت کا مکمل علم اس کی دسترس سے باہر ہے۔ علم کا حقیقی سرچشمہ وجدان ہے۔ برگسوں زمانے کو ایک استمرار یا دوران سے تعبیر کرتا ہے جو دائمی حرکت میں ہے۔ ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ اس تخیل کو اقبال نے کس کس طور پر بیان کیا ہے اور کس قدر لطیف انداز میں اپنے مخصوص نتائج اخذ کئے ہیں۔

اقبال کے فلسفہ حیات کا سنگ بنیاد اثبات خودی میں مضمر ہے اس کے نزدیک کائنات مدرکہ کی اعلیٰ ترین قدر و قیمت فرد کے شعور ذات میں پوشیدہ ہے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ اس کا یہ تخیل مغربی فلسفۂ انفرادیت کا رہین منت ہے۔ دراصل اگر ہم اقبال کے فلسفہ خودی کے سرچشمہ کا سراغ لگانا چاہیں تو ہمیں خالص اسلامی روایات کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ قرآن کریم میں انفرادی شخصیت کی فضیلت اور عظمت کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا گیا ہے۔ ذات باری کا فرشتوں کو یہ حکم کہ آدم کو سجدہ کرو محض استعارہ نہیں ہے بلکہ اس کے اندر ایک زبردست حقیقت کی طرف اشارہ ہے اقبال نے میلادِ آدم کا منظر اس طرح کھینچا ہے:-

(۱) نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد ؎ حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
(۲) خبرے رفت ز گردوں بہ شبستان ازل ؎ حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شد
(۳) فطرت آشفت کہ از خاک جہان مجبور ؎ خودگرے۔ خودشکنے۔ خودنگرے پیدا شد
(۴) آرزو بے خبر از خویش بہ آغوش حیات ؎ چشم وا کرد و جہان دگرے پیدا شد
(۵) زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر ؎ تا ازیں گنبد دیرینہ درے پیدا شد

اسلام سے قبل مذہب عیسوی میں انسانی زندگی سرتاپا گناہ تصور کی جاتی تھی۔ خواہشات نفسانی اور احساس خودی اس لغزش کا نتیجہ قرار پائے جو آدم سے شیطانی وسوسہ کی بنا پر سرزد ہوئی تھی۔ انسان کے اس گناہ کا کفارہ اس کے اعمال سے ممکن نہیں۔ چنانچہ حضرت مسیح کے مصائب و قربانی نے اس کے گناہ کا کفارہ کیا اور انسانی نجات کی راہ نکالی۔ مسیحی تعلیم نے انسان کو ذلیل و حقیر قرار دیا جو کسی قسم کی اخلاقی ذمہ داری کا اہل نہیں۔ اسی طرح بدھ مت اور ہندو دھرم میں تناسخ کے لامحدود سلسلے اور شخصی وجود کو فنا کرنے کے خیال نے زندگی کی ذمہ داریوں کو معدوم کر دیا اور انسانی عظمت کو خاک میں ملا دیا۔ اس کے برخلاف اسلام انسانی عظمت کو خوب اجاگر کر کے پیش کرتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنَاہُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ یعنی انسان فی الحقیقت نیک نہاد ہے اور اس کی شرافت و فضیلت مسلم ہے لیکن برے اعمال کی وجہ سے اس کا ازلی کمال زائل ہو سکتا ہے۔ شر انسانی وجود کے ساتھ لازمی نہیں بلکہ انسان اپنے اعمال کا مختار ہے۔ لیس للانسان الا ما سعیٰ اور لھا ما کسبت وعلیھا ما اکتسبت کہکر ہر فرد کی اخلاقی ذمہ داری مکمل طور پر متعین کر دی گئی اور اس کے اعمال کو تشکیل حیات کا ذمہ دار ٹھیرا دیا۔ قرآن کی آیہ کریمہ انا عرضنا الامانت علی السموات والارض فابین ان یحملنہا و اشفقنا منہا وحملہا الانسان انہ کان ظلوما جھولا۔ کی اقبال نے اپنے ایک لکچر میں یہ تفسیر کی ہے کہ جس امانت کا بوجھ آسمان اور زمین نے اٹھانے سے انکار کیا وہ شخصیت اور احساس ذات کی ذمہ داری تھی جسے انسان نے جوش وجدان میں قبول کر لیا اسی سے اس کی ساری فضیلت پیدا ہوئی اور اسی کی بدولت اس نے نظام عالم کو تسخیر کیا۔ آتش، آب و باد کو اپنا غلام بنایا، پہاڑوں

کے سینے چاک کئے، ویرانوں کو آباد کیا اور اپنے وجود کا سکہ کائنات فطرت کے ہر گوشہ پہ بٹھایا۔

اقبال کے پیغام کا لب لباب یہ ہے کہ انسان کا اخلاقی نصب العین اثبات خودی میں مضمر ہے فرد، حیات کا واحد اور کافی بالذات مرکز ہے۔ زندگی کا اصل محرک احساس ذات ہے۔ زندگی ایک مسلسل حرکت ہے جو نت نئی خواہشات کی تخلیق کرتی رہتی ہے اور اسی طرح اپنی توسیع و بقا کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔ خودی کی تکمیل میں سب سے بڑی رکاوٹ فطرت ہے جس پہ غلبہ پانا ضروری ہے۔ جو چیز خودی کو مستحکم کرتی ہے وہ خیر ہے اور جو اس کو ضعیف کرے وہ شر ہے۔ خودی کو مستحکم کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ عشق ہے۔ اقبال عشق کو نہایت وسیع معنوں میں استعمال کرتا ہے۔ اور اکثر اوقات اس کو عقل کا مد مقابل بنا دیتا ہے۔ عشق سے اس کی مراد وہ جوش وجدان ہے جو تکمیل ذات کے لئے جذب و تسخیر پہ عمل پیرا ہوتا ہے اور موانع پر قابو پاتا ہے اسی کی بدولت ایمان کی قوت پیدا ہوتی ہے جس کے آگے کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہتی۔ عشق کی خصوصیت خاصہ پیہم آرزو ہے اور اسی کے باعث انسان کو فرشتوں پہ فضیلت ملی:۔

بگو جبریل را از من پیامے ؎ مرا آں پیکر نوری نداند
ولے تاب و تب ما خاکیاں بیں ؎ بنوری ذوق مہجوری نداند

اقبال نے خودی کے اسرار بے نقاب کرنے میں اپنے وجدان کے پورے وسائل استعمال کئے ہیں۔ چنانچہ اس کا دعویٰ ہے کہ:۔

پیکر ہستی ز آثار خودی است ؎ ہر چہ می بینی ز اسرار خودی است
خویشتن را چوں خودی بیدار کرد ؎ آشکارا عالم پندار کرد
قطرہ چوں حرف خودی از بر کند ؎ ہستی بے مایہ را گوہر کند

بال جبریل" میں اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے:۔

ہر چیز ہے محو خود نمائی ؎ ہر ذرہ شہید کبریائی
بے ذوق نمود زندگی موت ؎ تعمیر خودی میں ہے خدائی

رائی زورِ خودی سے پربت ٭ پربت ضعفِ خودی سے رائی
ایک تو ہے کہ حق ہے اس جہاں میں ٭ باقی ہے نمودِ سیمیائی

دوسری جگہ وہ کہتا ہے :-

اگر آگاہی از کیف و کمِ خویش ٭ یمے تعمیر کن از شبنمِ خویش
دلا دریوزہ مہتاب تا کے ٭ شبِ خود را برافروز از دمِ خویش
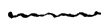
خودی تعمیر کن در پیکرِ خویش ٭ چو ابراہیم معمارِ حرم شو
تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش ٭ براہِ دیگراں رفتن حرام است

"جاوید نامہ" میں اقبال نے وہ پیغام بیان کیا ہے جو حلاج نے اسے فلکِ مشتری پر دیا تھا :-

ز خاکِ خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست ٭ تجلّیٔ دگرے درخورِ تقاضا نیست
تو رہ شناس نۂ و ز مقامِ بے خبری ٭ چہ نغمہ ایست کہ در بربطِ سلیمیٰ نیست
مرید ہمت آں رہروم کہ پا نگذاشت ٭ بہ جادۂ کہ درو کوہ و دشت و دریا نیست

استحکامِ خودی کا راز حلاج ان الفاظ میں بتاتا ہے :-

بے خلش ہا زیستن نا زیستن ٭ باید آتش در تہِ پا زیستن
زیستن ایں گونہ تقدیرِ خودی ست ٭ از ہمیں تقدیر تعمیرِ خودی ست
ذرۂ از شوقِ بے حد رشکِ مہر ٭ گنجد اندر سینۂ او نہ سپہر

اقبال نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ اس کو مولانا جلال الدین رومی سے روحانی فیض حاصل ہوا۔ مولانائے روم نے اپنی معرکتہ الارا مثنوی میں اثباتِ خودی' نارسائی عقل' اور عظمتِ عشق کے موضوعوں پر اپنے مخصوص حکیمانہ انداز میں طبع آزمائی کی ہے۔ انسانی فضیلت پر مولانا روم کہتے ہیں :-

پس بصورت آدمی فرعِ جہاں ٭ در صفت اصلِ جہاں را ایں بداں
ظاہرش را پشہ آرد بہ چرخ ٭ باطنش باشد محیطِ ہفت چرخ

جانہا در اصل خود عیسیٰ دم اند ﴿ یکزماں زخمم اندو دیگہ مرہم اند

گر حجاب از جانہا بر خاستے ﴿ گفت ہر جانے مسیح آساستے

~~~~~~~~

مرد خدا شاہ بود زیر دلق ﴿ مرد خدا گنج بود در خراب

مرد خدا نیست زباد وز خاک ﴿ مرد خدا نیست ز نار و ز آب

مرد خدا زاں سوئے کفرست و دین ﴿ مرد خدا را چہ خطا و صواب

~~~~~~~~

مولانا کے اس شعر کے مضمون کو اقبال نے متعدد جگہ اپنے انداز میں بیان کیا ہے :۔

بہ زیر کنگرہ کبریاش مردانند ﴿ فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

زندگی کی قوت محرکہ طلب اور آرزو ہے جسے برگسوں "جوش حیات" کہتا ہے اس مضمون کو

مولانا یوں بیان کرتے ہیں :۔

پس کمند ہستہا حاجت بود ﴿ قدر حاجت مرد را آلت بود

پس بیفزا حاجت اے محتاج زود ﴿ تا بجوشد از کرم دریائے جود

عشق کی اصطلاح کو مولانا نے بھی نہایت وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے :۔

عشق بحرے آسماں بروے کفے ﴿ چوں زلیخا در ہوائے یوسفے

دور گردوں باز موج عشق داں ﴿ چوں نبودے عشق بفسردے جہاں

کے جمادی محو گشتے در نبات ﴿ کے فدائے روح گشتے نامیات

روح کے گردے فدائے آں دمے ﴿ کز نسیمش حاملہ شد مریمے

~~~~~~~~

لاابالی عشق باشد نے خرد ﴿ عقل آں جوید کزاں سودے برد

"انسان کامل" کا تصور مولانا کے ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے :۔
~~~~~~~~

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر ؎ کز دیو و دو ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہان سست عناصر دلم گرفت ؎ شیر خدا و رستم دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما ؎ گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

اقبال کے کلام میں "انسان کامل" کے متعلق مختلف پیرایوں میں ذکر ملتا ہے۔ اس کے "انسان کامل" کے تصور میں عبدالکریم جیلی کے خیالات کی کبھی کبھی جھلک نظر آجاتی ہے۔ جیلی نے اپنی کتاب "الانسان الکامل فی معرفتہ الاواخر والاوائل" میں یہ تخیل پیش کیا ہے کہ انسان بجائے خود ایک عالم ہے جو خدا اور فطرت دونوں کا مظہر ہے۔ ہماری ہستی ذات باری کی خارجی شکل ہے۔ بغیر انسانی وجود کے ذات مطلق اور عالم کائنات میں رابطہ نہیں قایم ہو سکتا۔ "انسان کامل" تخلیق کائنات کا اصلی مقصد ہے ذات انسانی کے توسط سے ذات مطلق خود اپنا مشاہدہ کرتی ہے اس لئے کہ اس سے صفات الٰہیہ کا ظہور ہوتا ہے۔ حضرت محمدؐ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے انسان کامل کا اعلیٰ ترین نمونہ دنیا کے لئے پیش کیا۔ حقیقت محمدیؐ ہر زمانے میں مختلف ناموں اور لباسوں کے تحت جلوہ گر ہوتی ہے "انسان کامل" ذات باری کی شان سرمدیت میں شریک نہیں ہو سکتا۔ جیلی عقیدہ حلول کا قائل نہیں۔ وہ ذات الٰہی کی ماورائیت کے تصور کو اسلامی عقائد کے مطابق قایم رکھتا ہے۔ دراصل نطشے کے "فوق البشر" مولانائے روم کے "مرد خدا" جیلی کے "انسان کامل" اور اقبال کے "سوار اشہب دوراں" میں بہت کم فرق ہے۔ ان اصطلاحوں کی تہہ میں یہ تصور کارفرما ہے کہ فرد حیات کا مستقل اور کافی بالذات مرکز ہے۔ وہ اثبات خودی کے ذریعہ جذب و تسخیر کی تخلیقی قوتیں بروے کار لا سکتا ہے اور اپنی ذات کے آئین مضمر کے مطابق منازل وجود طے کر سکتا ہے۔ اس کی زندگی کا سفر مثل ایک تخلیقی بہاؤ کے ہے۔

ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی ؎ اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

دوسرے انفرادیت پسند فلسفیوں کے برخلاف اقبال اپنے تصور کی منطقی حدود سے اپنے شاعرانہ وجدان کے سہارے بچ کر نکل جاتا ہے۔ انفرادیت پسندی کے ڈانڈے سیاسی نقطۂ نظر سے

نزاع سے جا کر مل جاتے ہیں۔ چنانچہ نطشے کی نزاجیت اس کے تصور حیات کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے۔ انفرادیت کے قایل حریت کے علمبردار ہوتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر فرد کے حلقۂ عمل کو پورے طور پر وسعت حاصل کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ اقبال نے بھی خودی کی پرورش اور نشو ونما کے لئے حریت کو ضروری بتایا ہے۔ فلسفیانہ نقطۂ نظر سے حریت اور مساوات کے اصول ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ چنانچہ دونوں اصولوں کا تصادم ہمیں اس وقت یورپ کی موجودہ تہذیب میں نظر آرہا ہے۔ ایک طرف تو جمہوریت کے انفرادیت پسند ادارے اشخاص کو اپنی صلاحتیں آزادی کے ساتھ بلا کسی روک ٹوک کے بروئے کار لانے کا پورا موقع دے رہے ہیں جس کا نتیجہ موجودہ سرمایہ داری کی تہذیب ہے جو پیدائش دولت کی راہ میں کسی قسم کی رکاوٹ کو گوارا نہیں کرتی یا یوں کہئے کہ معاشی نقطۂ نظر سے اثبات خودی کی تکمیل چاہتی ہے۔ چنانچہ اس میں کسی کو شبہ کی گنجایش نہیں ہونی چاہئے کہ سرمایہ داری کی تہذیب کا سنگ بنیاد فلسفۂ انفرادیت ہے جس کی بدولت یورپ میں قرون وسطیٰ کے اجتماعی اداروں کی دھجیاں اڑائی گئیں۔ سرمایہ داری کے اصول کے مقابلہ میں اشتراکیوں کا اصول مساوات ہے جو انسانیت اور اجتماعی اخلاق کی دہائی دے دے کر اشخاص کو ضبط وآئین کا پابند کرنا چاہتا ہے۔ اقبال کی نظر سے موجودہ تہذیب کی یہ شدید اندرونی کشمکش پوشیدہ نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے "اسرار خودی" بے نقاب کرنے کے ساتھ "رموز بے خودی" بھی بتائے ہیں اسواسطے کہ بغیر ان کے سمجھے ہوئے تکمیل ذات ادھوری رہتی ہے یہاں پھر یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اقبال نے یورپ کے انفرادیت کے فلسفے سے صرف وہ عناصر جذب کئے ہیں جو اس کے لئے ضروری تھے۔ وہ اس فلسفے کے منطقی نتائج کو روندتا ہوا بے تکلف آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اور بالکل ایک متناقض اصول کی حمایت شروع کر دیتا ہے۔ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ اس ظاہری تضاد کو اقبال اپنی ذہنی اور وجدانی وحدت میں سمو کر رفع کر دیتا ہے۔ باوجود اثبات ذات کے انفرادیت پسند اصول پیش کرنے کے اس نے زندگی کی ہیئت عمرانی کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ اس کو خودی کی تکمیل کا ذریعہ بتایا۔ "رموز بے خودی" میں اس نے ایک ماہر عمرانیات کی طرح یہ ثابت کیا ہے کہ ہیئت اجتماعی کے ربط وضبط کے بغیر انسان اپنی ذات کی تکمیل نہیں کر سکتا۔

انفرادیت اور اجتماعیت کے حامی اپنے اصول موضوعہ کے ذریعہ قدیم زمانے سے انسانوں کی جماعتی زندگی کے دو مختلف مسلک پیش کرتے رہے ہیں۔ افلاطون نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "ریاست" میں فرد کو کلیتہً جماعت کا تابع بنا دیا ہے۔ اس کے برخلاف ارسطو نے فرد کو حیات اجتماعی کا مرکزی نقطہ تصور کیا۔ جماعت اس کے نزدیک تجریدی وجود رکھتی ہے اور مقصود بالذات نہیں کہی جا سکتی۔ اگرچہ وہ یہ کہتا ہے کہ مملکت کا وجود افراد کی زندگی کے لئے لابدی ہے، لیکن عمرانی نقطۂ نظر سے اصل حقیقت فرد ہے نہ کہ جماعت۔ ازمنۂ وسطیٰ میں یورپ میں یہ دونوں مسلک موجود رہے لیکن انفرادیت پسند خیالات کو کلیسا کے نظام نے بتدریج بالکل کچل دیا۔ نشأۃ ثانیہ کے بعد سے انفرادیت پسندی کا زور دن بدن بڑھنے لگا اور بالآخر صنعتی انقلاب میں اُسے انتہائی عروج نصیب ہوا۔ انیسویں صدی میں پھر یہ سوال اٹھایا گیا کہ آیا افراد کے ماسوا جماعت اپنا کوئی علیحدہ وجود رکھتی ہے یا نہیں؟ آیا انسانی چلن انفرادی اُپج کا نتیجہ ہوتا ہے یا ہیئت اجتماعی کے ضابطوں اور ماحول کا رہین منت! صنعتی انقلاب، جمہوریت اور قومیت کی تحریکیں انفرادیت کے اصول موضوعہ کے شاخسانے ہیں۔ لیکن ان تحریکوں کے خلاف ردعمل کچھ عرصے سے رونما ہے اور وجود اجتماعی اپنے عناصر یعنی اشخاص کو مخصوص ضابطوں کا پابند کر رہا ہے۔ اقبال نے وجدانی طور پر اجتماعی مسائل کا حل خالص اسلامی نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے۔ اقبال کے نزدیک وجود اجتماعی محض تجریدی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ وہ ایک زندہ حقیقت ہے جو نمو کی ساری صلاحیتیں رکھتی ہے۔ فرد کی صلاحیت بغیر جماعت کے وجود کے اجاگر نہیں ہو سکتی چنانچہ وہ کہتا ہے:-

فرد را ربط جماعت رحمت است ٭ جوہر اُو را کمال از ملت است

فرد تا اندر جماعت گم شود ٭ قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

چوں اسیر حلقۂ آئیں شود ٭ آہوئے رم خوئے او مشکیں شود (رموز بیخودی)

اسی خیال کو شمع و شاعر میں وہ اس طرح ادا کرتا ہے:-

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں ٭ موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

فرد اور جماعت کی ہم آہنگی کو وہ کس خوبی سے بیان کرتا ہے:-

زندگی انجمن آرا و نگہبان خود است ✤ اے کہ در قافلہ بے ہمہ شو با ہمہ شو

~~~~~~~~~

جس طرح احساس ذات ارادہ اور حافظہ کے ذریعہ اپنی گہرائیوں کی تہ تک پہنچتا ہے اسی طرح جماعتیں اپنی تاریخ کے ذریعہ اپنی اجتماعی خودی کو مستحکم کرتی ہیں۔ تاریخ کی بدولت ماضی اور حال کا رشتہ استوار ہوتا ہے اور وجود عمرانی تجرید کی تاریکی سے نکل کر حقیقت کی روشنی میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

زندہ فرد از ارتباط جان و تن ✤ زندہ قوم از حفظ ناموس کہن

اقبال کے نزدیک کسی قوم کی تاریخ ہی اس کے مسائل اجتماعی کو سمجھنے میں مدد دیکتی ہے۔ تاریخ واقعات و حوادث کا بے معنی انبار نہیں۔ نہ اس کو قصہ کہانی سمجھ کر پڑھنا چاہئے بلکہ حقیقت میں وہ ذریعہ ہے جماعت کی سیرت کو قوی بنانے اور اس کو آمادۂ عمل کرنے کا۔ تاریخ عالم ایک مسلسل تخلیقی حرکت ہے۔ جو گروہ اپنے تئیں اس تخلیقی رو کے ساتھ وابستہ کر لیتے ہیں وہ سرفراز ہوتے ہیں اور جو اس کی اہمیت کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں پستی میں پڑ جاتے ہیں۔ اس کا تاریخ کا تصور یہ ہے:۔

چیست تاریخ اے ز خود بیگانۂ ✤ داستانے 'قصۂ' افسانۂ ؟

ایں ترا از خویشتن آگاہ کند ✤ آشنائے کار و مرد راہ کند

روح را سرمایہ تاب است ایں ✤ جسم ملت را چو اعصاب است ایں

شعلۂ افسردہ در سوزش نگر ✤ دوش در آغوش امروزش نگر

شمع او بخت امم را کوکب است ✤ روشن از وے امشب و ہم دیشب است

بادۂ صد سالہ در مینائے او ✤ مستی پارینہ در صہبائے او

ضبط کن تاریخ را پائندہ شو ✤ از نفسہائے رمیدہ زندہ شو

اسی مضمون کو اقبال نے اپنی نظم " نوائے وقت " میں فلسفیانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ روح عصر یا تاریخ عالم انسان کو یوں مخاطب کرتی ہے:۔

چنگیزی و تیموری مشتے ز غبارے من ✤ ہنگامۂ افرنگی یک جستہ شرارے من
~~~~~~~~~

انسان وجہان او از نقش و نگار من ✤ خون جگر مردان سامان بہار من
من آتش سوزانم من روضۂ رضوانم

آسودہ و سیارم، این طرفہ تماشا بین ✤ در بادۂ امروزم کیفیت فردا بین
پنہاں بہ ضمیر من صد عالم رعنا بین ✤ صد کوکب غلطاں بین، صد گنبد خضرا بین
من کسوت انسانم پیراہن یزدانم

تقدیر فسون من تدبیر فسون تو ✤ تو عاشق لیلائے من دشت جنون تو
چوں روح رواں پاکم از چند و چگون تو ✤ تو راز درون من، من راز درون تو
از جان تو پیدا ام، در جان تو پنہانم

ہم نے اقبال کے تصور حیات کا جو تجزیہ اوپر پیش کیا ہے اس سے دو بنیادی حقائق آپ کے سامنے آگئے ہوں گے۔ ایک یہ کہ اثبات ذات زندگی کا لازمی تقاضا ہے۔ دوسرے یہ کہ خودی کی پرورش حیات ملی کے وسیع لیکن موثر ضبط و آئین کے بغیر ممکن نہیں۔ ملت بیضا کے ربط و تنظیم کے بنیادی اصول عقیدہ توحید اور رسالت ہیں۔ ان اصولوں کے مطابق جو اسلامی تہذیب وجود میں آئی وہ اقبال کے نزدیک اجتماعی زندگی کے لئے بہترین نمونہ پیش کرتی ہے اس لئے کہ اس میں ایک طرف تو فرد اور جماعت کے حقوق و فرائض کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے اور دوسری جانب اس میں روحانیت اور مادیت دونوں کا اس خوبی سے امتزاج کیا گیا ہے جو فطرت انسانی کے عین مطابق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تہذیب میں لازول قوت حیات پیدا ہو گئی ہے۔ اس میں فطرت نے ایسی صلاحیت ودیعت کر دی ہے کہ وہ گر کر اٹھ سکتی اور پست ہو کر پھر سربلند ہو سکتی ہے۔ اس کی مثالیں تاریخ اسلام کے ہر ورق پر ملتی ہیں۔ ایک جگہ جواب شکوہ میں اقبال کہتا ہے :-

تو نہ مٹ جائیگا ایران کے مٹ جانے سے ✤ نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے
ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے ✤ پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

اسی خیال کو " رموز بیخودی " میں یوں پیش کیا ہے :-

آتش تاتاریاں گلزار کیست ؟ ؛ شعلہ ہائے او گل دستار کیست ؟
از تہ آتش برانداز یم گل ؛ نار ہر نمرود را سازیم گل
شعلہ ہائے انقلاب روزگار ؛ چوں بباغ مارسد گردد بہار
او میاں را گرم بازاری نماند ؛ آں جہانگیری جہانداری نماند
شیشۂ ساسانیاں درخوں نشست ؛ رونق خمخانۂ یوناں شکست
مصر ہم در امتحاں ناکام ماند ؛ استخوان او تہ اہرام ماند
در جہاں بانگ اذاں بود ست و ہست ؛ ملت اسلامیہ بود ست و ہست
عشق از سوز دل ما زندہ است ؛ از شرار لاالہ تابندہ است
گرچہ مثل غنچہ دلگیریم ما ؛ گلستاں میرد اگر میریم ما

اقبال نے ایک اور نہایت اہم تاریخی مسئلہ کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ جماعتوں کے عروج و زوال کا کیا سبب ہے ! یہ مسئلہ قدیم زمانہ سے لیکر آج تک علمائے تاریخ و عمرانیات کے پیش نظر رہا ہے اور ہر زمانہ میں مختلف رجحانوں کے مطابق اس کے حل پیش کئے گئے ہیں ۔ اس باب میں اقبال کا تصور ابن خلدون کے نظریہ سے بہت کچھ مشابہ ہے ۔ اس کا خیال ہے کہ جب کسی جماعت میں عصبیت اور احساس ذات باقی نہیں رہتا تو وہ کسی دوسری جماعت میں جو اس سے زیادہ جاندار اور قوی سیرت کی مالک ہوتی ہے ضم ہو جاتی ہے ۔ یا غلام بن جاتی ہے. چونکہ خود تنہا زندگی کے انقلابوں اور کشمکش کا مقابلہ کرنے کی سکت اس میں باقی نہیں رہتی اور اس کے قوائے عملیہ شل ہو جاتے ہیں اس لئے وہ چاہتی ہے کہ خود آسائش میں رہے اور دوسرے اس کے وجود کی نگہبانی کریں ۔ لیکن ایسا تاریخ میں کبھی نہیں ہوا ۔ زندگی کی دشواریوں سے گریز کرنے والی اقوام کا مقدر ہی یہ ہے کہ وہ اپنے وجود کو آزاد اکائی کی حیثیت سے کھو دیں ۔ قوموں کے مقدر کی توجیہہ وہ ایک حکیمانہ اور دائمی حقیقت پیش کر کے بیان کرتا ہے ؛-

میں تجھکو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے ؛ شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

اقبال نے افلاطون کے فلسفہ کو مسلک گوسفندی سے تعبیر کیا ہے۔ افلاطون کے نزدیک دنیا کے حقایق اصلی نہیں ہیں۔ اقبال اس کے "اعیان نامشہود" کو توہمات سے زیادہ وقیع نہیں سمجھتا اور "ہنگامہ موجود" ہی کو اصل حقیقت سے تعبیر کرتا ہے جس کے اسباب وعلل کو سمجھے بغیر کوئی قوم زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس نے یونانی تصورات عمرانی کو سکونی کہہ کر رد کر دیا ہے اور وہ اسلامی تہذیب کو کلاسکی تہذیب کے خلاف ردعمل خیال کرتا ہے۔ افلاطون کے "اعیان نامشہود" ذہن انسانی کے لئے چاہے قابل قبول ہوں لیکن ان کی حقیقت اس قدر تجریدی ہے کہ وہ کسی جماعت کے تخلیقی قویٰ کو متحرک نہیں کر سکتے اور بے مقصدی کے باعث انسانوں کو آگے بڑھانے اور آمادۂ عمل کرنے کی ان میں مطلق صلاحیت نہیں۔ جماعتوں کو زوال اور جمود سے بچانے اور اُن کے ممکنات زندگی کو اجاگر کرنے کے لئے اسلامی تہذیب نے معروضی حقایق ہی کو بطور مقاصد پیش کیا تاکہ ظاہر اور موجود میں انہماک کے باوجود زندگی کا حرکتی عنصر برقرار رہے اور جماعت میں نئے خارجی حالات کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کی قوت زائل نہ ہو۔ قرآن نے عالم خارجی کی حقیقت اور اہمیت کو واضح کیا ہے۔ اس کے متعلق غور کرنے کی تاکید کی ہے۔ قران بار بار کائنات فطرت کے مظاہر کا ذکر کرتا ہے جیسے سورج کا نکلنا اور غروب ہونا، سائے کا بڑھنا گھٹنا اور دن اور رات کا وقوع پذیر ہونا۔ مسلمان حکما نے استقرائی طریق تحقیق کو کائنات فطرت کے سمجھنے کے لئے اپنا رہنما بنایا اس لئے کہ اس طور پر تسخیر فطرت میں زیادہ مدد ملتی ہے۔ عالم محسوس کے حقایق پر قابو پانے کے لئے انھوں نے مشاہدہ، تجربہ اور پیمائش کو ظن وتخمین کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت دی اور اس طرح جدید سائنس کی بنا ڈالی۔ لیکن باوجود اس عملی نقطۂ نظر کے انھوں نے مادی زندگی کی مبالغہ آمیز قدر وقیمت سے احتراز کیا اور انسان کو فطرت کا تابع نہیں قرار دیا بلکہ اس کا مسخر کرنے والا۔ مادی زندگی ایک بالاتر روحانی زندگی تک پہنچنے کا ایک زینہ قرار پائی جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ افلاطون یونانی نے مسلمانوں کے تصوف اور ادبیات پر جو اثر ڈالا اس سے اقبال کے خیال کے مطابق اُن کے تخیل اور عمل میں مجہولیت پیدا ہوگئی :-

راہب دیرینہ افلاطوں حکیم ؎ از گروہ گوسفندان قدیم

رخش او در ظلمت معقول گم ٭ در کہستان وجود افگندہ سم
آنچناں افسون نامحسوس خورد ٭ اعتبار از دست و چشم و گوش برد
بر تخیلہائے ما فرماں رواست ٭ جام او خواب آور و گیتی رُباست
فطرتش خوابید و خوابے آفرید ٭ چشم ہوش او سرابے آفرید
بسکہ از ذوق عمل محروم بود ٭ جان او وارفتۂ معدوم بود
منکر ہنگامہ موجود گشت ٭ خالق اعیان نامشہود گشت

کلاسکی تہذیب نفس انسانی کی جدجہد اور نشو نما کے تصورات سے عاری تھی۔ اس کی ہر چیز اور ہر ادارہ مقررہ اصول کے مطابق معین حیثیت رکھتا تھا۔ گویا انسان فاعل مختار کی حیثیت حاصل نہیں بلکہ خارجی قوتوں کا پابند ہے۔ اسی تخیل سے متاثر ہو کر افلاطون نے حقیقی زندگی سے گریز اختیار کیا اور " اعیان نامشہود " کے آغوش میں پناہ لی۔ ارسطو نے ویسے تو افلاطون کے خیالات پر سخت تنقیدیں کیں لیکن انسانی عمل کی آزادی پر اس نے مطلق زور نہیں دیا۔ چنانچہ اپنی مشہور کتاب " ریاست " میں وہ بھی سیاسی اداروں کو ایک معینہ چکر کا پابند قرار دیتا ہے۔ برخلاف ان کلاسکی تصورات کے اسلامی تہذیب تمام تر حرکت، تغیر اور آزادی عمل کے تصورات پر مبنی ہے۔ کلاسکی تہذیب کی تصویر اقبال نے ان الفاظ میں کھینچی ہے:-

آہوش بے بہرہ از لطف خرام ٭ لذت رفتار بر کبکش حرام
ذوق روئیدن ندارد دانہ اش ٭ از طپیدن بے خبر پروانہ اش

اقبال کا یہ اعتراض افلاطون کی " عینیت " پر صحیح ہے کہ وہ تخلیق اقدار و مقاصد کی تعلیم دینے کے بجائے حقیقی مادی زندگی سے گریز سکھاتی ہے اور انسانی ممکنات حیات کی منکر ہے۔ برخلاف اس کے اسلامی تہذیب تسخیر فطرت، 'عمل پیہم' اور حرکت دوام کی تعلیم پیش کرتی ہے۔ اس نقطۂ نظر کی بدولت اسلامی جماعت میں بدرجہ اتم یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ تاریخ عالم کی تخلیقی قوتوں کے ساتھ اپنا ربط قائم کرے۔ اسلامی تہذیب ان مقاصد حیات کی حامل ہے جس میں کل انسانیت کا

بقا و استحکام مضمر ہے۔ اقبال اسلام کو مذہب انسانیت تصور کرتا ہے اور جب وہ مسلمانوں سے خطاب کرتا ہے تو درحقیقت اس کا روئے سخن تمام انسانوں سے ہوتا ہے۔

اقبال کا فلسفیانہ رجحان "معروضی عینیت" کی طرف ہے جو بعض عہد حاضر کے فلاسفہ کا مسلک ہے اور جو فلسفہ کی اخلاقی اقدار کو بہ نسبت مابعد الطبیعی پہلو کے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ افلاطون کے فلسفے کے خلاف اسلام میں عینیت اور حقیقت پسندی دونوں کا امتزاج موجود ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اس باب میں اقبال کا نقطۂ نظر ایک حد تک حکیم فارابی کے تصورات سے متاثر ہوا ہے۔ حکیم موصوف نے بھی "الجمع بین الرائین" میں افلاطون اور ارسطو کے مختلف فلسفوں کو ملانے اور ان میں ایک طرح کا ذہنی امتزاج پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ دراصل اسلامی تہذیب کی یہ خصوصیت خاصہ رہی ہے کہ اس نے انسانی معاملات میں ہمیشہ درمیانی راستہ اختیار کیا اور انتہا پسندی اور غلو سے احتراز کیا اس لئے کہ ایسا کئے بغیر تمدنی ہم آہنگی محال ہے۔ اقبال نے اپنے ان لکچروں میں جو چند سال ہوئے اس نے مدراس میں دیے تھے یہ بات ثابت کی ہے کہ یورپ کی موجودہ سائنس کی بنیاد اس دن پڑی جب مسلمان حکمار نے استقرائی طریق تحقیق کے مطابق افلاطون کی "عینیت" کو چھوڑ کر عالم محسوس اور کائنات فطرت کی حقیقت کو سمجھنے اور اس پر قابو پانے کی طرف توجہ کی۔ یہ حقیقت پسندی آپ کو اسلامی تہذیب کے تمام اداروں میں نظر آئے گی۔ اسلامی تہذیب کے اس نقطۂ نظر سے اہل یورپ متاثر ہوئے۔ اندلس کی جامعات کے توسط سے اسلامی علوم یورپ میں پھیلے اور اہل یورپ کی مخفی قوتوں اور صلاحیتوں کو بیدار کرنے میں ممد و معاون ہوئے۔ اقبال ایک حد تک یورپ کی تہذیب کو اسلامی تہذیب کا تکملہ سمجھتا ہے۔ وہ موجودہ یورپ کی زندگی کے حرکتی عنصر اور سائنٹفک ایجادات کو جو تسخیر عالم کی ضامن ہیں بہ نظر استحسان دیکھتا ہے لیکن اس کے ظاہری طمطراق اور چمک دمک کو وہ مذموم خیال کرتا ہے۔ موجودہ یورپی تمدن میں مادی زندگی کی قدر و قیمت میں جو غلو برتا جا رہا ہے اس کو وہ اسلامی روح کے منافی تصور کرتا ہے۔ اسلام نے "کلید دین" سے "در دنیا" کھولنے کی کوشش کی اس لئے وہ انسانی زندگی میں توازن اور ہم آہنگی قائم کر سکا۔

لیکن یورپ نے مادی زندگی میں اپنے تئیں ایسا منہمک کر لیا کہ وہ بجائے خود مقصود بالذات بن گئی۔ اقبال کے نزدیک اس سے انسانیت کے شرف کو بٹہ لگتا ہے۔ اس کو اہلِ یورپ سے شکایت ہے کہ انھوں نے ذہنی تربیت کے ساتھ دل کی تربیت کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ ظاہر پر نظر ایسی جمی کہ باطن نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تہذیب فرنگی مادی آسایشوں پر ایسی فریفتہ ہوئی کہ روحانی زندگی کے تقاضے پس پشت ڈال دیئے گئے۔ اقبال یورپ کی انتہائی عقلیت کو تاریخ کی تخلیقی رو کا مخالف سمجھتا ہے اور اس کا عقیدہ ہے کہ خالص مادیت کی بنیادوں پر کسی تہذیب کو استحکام نہیں حاصل ہو سکتا۔ چنانچہ وہ پیشین گوئی کرتا ہے:۔

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی ؎ جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپایدار ہو گا

اس نے یورپ کی تہذیب کے مختلف اداروں پر اپنے کلام میں سخت تنقید کی ہے۔ یہاں ہم چند مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں:۔

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے ؎ حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت ؎ پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس ؎ کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم ؎ حد اُس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

مشرق اور مغرب کی موجودہ ذہنیت کا نقشہ وہ ان الفاظ میں کھینچتا ہے:۔

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے ؎ یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہے صہبا
لبالب شیشۂ تہذیب حاضر ہے مے لا سے ؎ مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ الّا

یورپ میں اخلاقی اقدار کی پامالی کے باعث جو زندگی میں عدم توازن پیدا ہو گیا ہے اس کا وہ اس طرح ذکر کرتا ہے:۔

تہی وحدت سے ہے اندیشۂ غرب ؎ کہ تہذیب فرنگی بے حرم ہے

اقبال قوموں کے لئے بھی اخلاق کا پابند ہونا اسی طرح ضروری سمجھتا ہے جیسا کہ افراد کے لئے۔

اس نے یورپی استعمار کی جو خالص دنیاوی اور مادی اغراض کے لئے وقف ہے خوب قلعی کھولی ہے۔ وہ کسی زبردست قوم کے اس حق کو تسلیم نہیں کرتا کہ وہ کمزوروں کو اپنا غلام بنائے۔ وہ کہتا ہے:-

آ بتاؤں تجھکو رمز آیۂ ان "الملوک" ؎ سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے کوئی محکوم اگر ؎ پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشم ایاز ؎ دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں ساز دلبری
خون اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں ؎ توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسم سامری
سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے ؎ حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آذری

(باقی)

ایران کی حالت جنگ عظیم کے بعد

جنگ عظیم کے خاتمے پر "ممالک محروسہ ایران" کی حالت ایک کیمپ کی سی تھی جس پر غیر ملکی فوجوں کا پہرہ قائم تھا۔ خاندان قاچار (جس سے بدتر دنیا میں کوئی حکمراں خاندان نہ گذرا ہوگا) کے زیر حکومت اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں ایران کی قوت مدافعت زائل ہوگئی اگرچہ جنگ کے شروع ہونے کے بعد احمد شاہ نے غیر جانب داری کا اعلان کردیا تھا لیکن محاربین نے ایران کی سرحد کا جو ملک کی فوجی کمزوری کی وجہ سے برابر پیچھے ہٹتی جاتی تھی، مطلق احترام نہیں کیا۔ سرزمین ایران ایک اہم میدان جنگ بن گئی جہاں ایک طرف جرمنی، ترکی، اور دوسری طرف انگریزی، روسی فوجیں تیل کے علاقے اور ہندوستان کے خشکی کے راستے پر قبضہ کرنے کی خاطر لڑ رہے تھے۔ آگے چل کر ایک انگریز جنرل نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ برطانوی فوجوں سے ایران کو جو نقصان پہنچا تھا اس کی تلافی اُن سڑکوں سے جو برطانیہ نے (اپنی فوجی مصلحتوں سے) بنائیں اور اُن کثیر رقموں سے جو ایران میں خرچ کی گئیں بہ خوبی ہوگئی۔ اب اس کا تعین کرنا فضول ہے کہ محاربین میں سے کس نے ایران کو زیادہ نقصان پہنچایا (اگرچہ اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں) یہاں تو ہمیں صرف یہ بتانا ہے کہ ایران کو یہ شدید نقصانات محض اس وجہ سے اٹھانا پڑا ہے کہ انگلستان اور روس کی گلا گھوٹنے والی سیاست نے پہلے ہی سے اُسے "حلقہ ہائے اثر میں تقسیم کرکے" نیم جان کردیا تھا۔

اخبار بہارستان کا نامہ نگار لکھتا ہے:-

"ایران پر خارجی سیاست کی حکومت تھی، اور غیر ملکی اثرات نے اُسے ہر طرف سے گھیر رکھا تھا۔ سیاست کے ذمہ دار وہ حضرات تھے جو ایران کے کسی مقام سے واقف نہ تھے اور جنھیں ایرانیوں کی غریب اور پسماندہ قوم کے آلام و مصائب کا مطلق احساس نہ تھا۔"

"قزاقوں کے جتھے کے جتھے سڑکوں کو روکے ہوئے تھے اور تجارت کا جو مال ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا تھا اُسے لُوٹ لیتے تھے۔ اکثر شہروں کا یہ حال تھا کہ باغی قبیلوں کے حملوں سے دم بھر چین نہ لینے پاتے تھے، چونکہ غیر ملکیوں کی مزاحمت کرنے والا کوئی نہ تھا اس لئے بیرونی طاقتوں نے آکر جو چاہا وہ کیا۔ بے شمار شہر اور صوبے، گاؤں اور قصبے، خانہ جنگی اور غیر ملکیوں کی لڑائی کے بدولت جل گئے اور برباد ہو گئے۔ اُن کے باشندے گروہ در گروہ بھاگ کر صحراؤں میں چلے گئے"۔

"ایران کے اکثر صوبوں میں غیر ملکی فوجوں نے پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ آزادی کا نام بھی سُنائی نہیں دیتا تھا اور کسی کی مجال نہ تھی کہ یہ پوچھے کہ آخر اس غلامی کا سبب کیا ہے نہ گاؤں میں مقدم تھے اور نہ صوبوں میں صوبے دار۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ سرحد کہاں ہے۔ سرحدی صوبوں کو یہ خبر نہ تھی کہ وہ کس ملک سے تعلق رکھتے ہیں"۔

"اُن دنوں ایرانی فوج کی کل کائنات یہ تھی۔ ایک کاسکوں کا ٹرپ جو زارِ روس کے افسروں کے ماتحت تھا۔ ایک دیہاتی رضاکاروں کا ٹرپ جو ایک سوئڈی جنرل گیلرپ کی کمان میں ذلت و مصیبت کی زندگی بسر کرتا تھا۔ ایک مرکزی "بریگیڈ" اور ایک بے قاعدہ لشکر جس کے پاس "شیر و خورشید" کے علم کے سوا اور کچھ نہ تھا اور جسے اپنا پیٹ بھرنے کے لئے لکڑیاں کاٹنا، کوئلے بیچنا، بھیک مانگنا اور خدا جانے کیا کچھ کرنا پڑتا تھا۔ جو فوج طہران سے جتنی دُور تھی اسی نسبت سے اس کا لباس خستہ، ہونٹ خشک، جسمانی اور ذہنی قوے کمزور اور حالت تباہ تھی۔ بعض اوقات چھ چھ، سات سات آٹھ آٹھ مہینے تک سپاہیوں کو تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ ظاہر ہے کہ بھوکا پیاسا سپاہی اپنے وطن کی حفاظت کیا خاک کرے گا۔ دور و دراز صوبوں مثلاً کرمان اور شیراز میں بجز مٹھی بھر بھوکے اور شکستہ حال سپاہیوں کے ایرانی فوج کا نشان

تک نہ تھا۔ بعض اور صوبوں، مثلاً سیستان، بلوچستان، اور خوزستان کے بڑے حِصّہ میں حکومت میں کوئی نمائندہ نظر نہیں آتا تھا۔ سرحدی علاقے میں غیر ملکیوں کا اثر اور ان کی فوجوں کا قبضہ تھا۔ کرمان اور فارس کے صوبوں میں بجائے "ممالک محروسہ ایران" کے لشکر کے وہ فوج تھی جس کی کمان غیر ملکی افسروں کے ہاتھ میں تھی"۔

غرض ایران کے پاس مدافعت کی کوئی قوت نہ تھی۔ پولس، دیہاتی رضا کاروں کا ترپ، اور کاسک لشکر جن پر ایران کی فوج مشتمل تھی، غیر ملکی افسروں کے ماتحت تھے۔ کاسک لشکر (جو ابتدا میں صرف ایک بریگیڈ تھا) روسی فوج کے نمونے پر ترتیب دیا گیا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ شاہان قاچار اور زارِ روس کے ائتلاف کی، جو ایران کی قومی تحریک کو دبانے کے لئے کیا گیا تھا، حفاظت کرے۔ اس کی کمان روسی افسروں کے ہاتھ میں تھی۔ ان کا تقرر ایرانی حکومت کرتی تھی مگر ان کا مقرر کرنا سہل تھا اور معزول کرنا مشکل۔ ایک بار حکومت ایران نے اس لشکر کے اسٹاف کمانڈر کو برخاست کر دیا مگر اس نے اس حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا آخر اسے زبردستی طہران کے فوجی ہیڈ کوارٹر سے نکالنا پڑا۔ حکومت نے اپنے فرمان کا نفاذ ایک جری اور مستقل مزاج افسر کے ذریعے سے کرایا اس کی نظر انتخاب اس لشکر کے ایک ایرانی افسر رضا خاں پر پڑی جس کی ہمت اور بہادری کی ساری فوج معترف تھی۔ اس شخص نے حکومت کے فرمان کی تعمیل اس شان سے کی کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ اس وقت طہران میں کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ بہادر فوجی افسر ایک دانشمند مدبر ثابت ہوگا اور حکمران خاندان کو معزول کر کے رہے گا۔

جن دنوں غیر ملکی فوجیں ایران پر مسلط تھیں رضا خاں اپنے وطن کی آزادی کا خواب دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے اس کے دل پر کیا گذرتی ہوگی جب وہ عالم تنہائی میں شمالی ایران کے حال پر غور کرتا ہوگا جہاں پچھلی صدی میں روس نے ایک ایک کر کے بہت سے صوبے ایران سے چھین لئے تھے۔ جس وقت وہ دنیا میں آیا ایران کا ستارہ ڈوبنے کے قریب تھا۔ یورپ کے مورخ ایران کے بارے میں لکھتے تھے کہ یہ رجعت و استبداد کا ملک ہے اور تاریکی کے دور میں مبتلا ہے۔ ان کی پیشین گوئی تھی کہ تھوڑے دن میں روس سارے

ملک پر قبضہ کرلے گا۔ گرجستان، آرمینیا، آذربائیجان یکے بعد دیگرے شمالی ریچھ کے دہان آز کا لقمہ بن چکے تھے، دو ہزار برس پہلے دارائے اعظم نے روس پر چڑھائی کی تھی۔ اب کوئی دن میں زار روس ایران پر چڑھائی کرنے والا تھا۔ اگر جنوب اور جنوب مغرب میں انگلستان کا دخل نہ ہوتا اور وہ اپنے ہندوستانی مقبوضات کے تحفظ کے لئے ایران کی آزادی کی حمایت نہ کرتا تو انیسویں صدی کے ختم ہونے سے پہلے روس اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا۔

پہلے یہ دونوں درندوں کی طرح شکار کے لئے لڑتے رہے اور بہت کچھ کشمکش کے بعد اُنھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس کے ٹکڑے کر کے آپس میں بانٹ لیں۔ یہ تقسیم جس میں برطانیہ کسی قدر گھاٹے میں رہا ابھی ہوئی رہی تھی کہ جنگ عظیم چھڑ گئی اور اس نے نقشہ ہی بدل دیا۔ یوں تو اس جنگ نے ایران کو اور زیادہ مصیبت میں مبتلا کر دیا مگر اسی کے ساتھ اس نے قومی احساس کو زندہ کر دیا۔ اور ایرانیوں پر یورپ کی اندرونی کمزوری کا پردہ فاش کر دیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے اُس شخصیت کی تعمیر کی جسے قوم نے مدد کے لئے پکارا اور تقدیر نے مادر وطن کی نجات کے لئے چن لیا۔

۱۹۱۷ء کے انقلاب کی بدولت روسی فوجوں کے ہٹ جانے سے ایران کی حالت میں تغیر تو ہوا لیکن اس کی شکل آسان نہیں ہوئی۔ اُدھر سفید اور سرخ روسی خانہ جنگی میں مصروف ہو گئے اور ادھر برطانوی فوج نے شمالی ایران کی طرف بڑھ کر ان کی جگہ لے لی۔ ایک ایرانی مورخ طنزیہ انداز میں لکھتا ہے "فائدہ کا بند یہ تھا کہ پہلی بار ایران کو ان دونوں طاقتوں میں سے ایک سے سابقہ پڑا جو ایک صدی سے اس ملک میں اپنا اقتدار قائم کرنے کی خاطر لڑ رہی تھیں۔ ملک کی اندرونی حالت بے حد ابتر تھی۔ شمال مغربی مغربی اور جنوبی صوبے تباہ ہو گئے تھے اور جو علاقہ لڑائی کے بلا واسطہ اثرات سے بچ رہا تھا وہ خانہ بدوش اقوام اور بڑے پیمانے کے قزاقوں کے حملوں کا شکار بن گیا تھا جنھوں نے مرکزی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر شاہراہوں پر قبضہ کر لیا تھا اور رستہ چلنا مشکل کر دیا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں شدید قحط پڑا۔ اور اسی کے ساتھ ایک قسم کا بخار پھیل گیا جس کی وجہ سے سارے ملک میں موت کا بازار گرم ہو گیا۔ طہران میں اینٹیں ڈھونے کی گاڑیوں میں چھ چھ مردے ایک ساتھ بھر بھر کر قبرستان میں پہنچائے جاتے تھے۔

باقاعدہ شمار اس وقت تک نہیں ہوتا تھا لیکن اندازہ کیا گیا ہے کہ دارالسلطنت کے پانچ لاکھ باشندوں میں سے کم سے کم پچاس ہزار وباکی نذر ہو گئے۔"

اس مصیبت اور قحط کے زمانے میں احمد شاہ نے غلے کا اجارہ لے لیا تاکہ اپنی فاقہ کش رعایا کے ہاتھ گراں قیمت پر بیچے اور اس کے نفع سے اپنی جیبیں بھرے۔ اس حرکت کی وجہ سے لوگوں کو اس سے قلبی نفرت ہو گئی اس کے علاوہ اس نے اپنے ملک کو اس نازک حالت سے نجات دینے کے لئے ایک قدم بھی نہیں اٹھایا بلکہ جب اُسے وہاں ٹھہرنا دشوار ہو گیا تو وہ چند درباری اور کروڑوں روپیہ ساتھ لے کر پیرس پہنچ گیا اور فرانس کی پُرتکلف صحت گاہوں کے دورے میں مصروف ہو گیا۔

اس کے پیچھے کمزور حکومت اور صوبوں کے عمال نے ملک کی مشکلات کو کچھ آسان کرنے کی کوشش کی۔ انگلستان کی فوجیں ملک کے ہر حصے میں پھیلی ہوئی تھیں اور رعایا ان کے بوجھ سے دبی جاتی تھی۔ اس کی وجہ سے کبھی کبھی انگلستان کے خلاف مظاہرے بھی ہوتے تھے۔ برطانوی مدبروں کا تو یہ خیال تھا کہ ان کی فوجیں ایک "دوست" سلطنت کے علاقے میں نقل و حرکت کر رہی ہیں لیکن غیر جانبدار دیکھنے والے کو یہ نظر آتا تھا کہ برطانوی فوج اس لشکر کی طرح ہے جو دشمن کے ملک میں قبضہ مخالفانہ کر لیتا ہے۔ اس سرے سے اس سرے تک ایک مقررہ فصل کے ساتھ ان کے باقاعدہ پڑاؤ تھے۔ برطانوی افسر سڑکوں کی نگرانی کرتے تھے۔ پرووسٹ مارشل کے ایجنٹ ہر بڑے مقام پر موجود تھے اور خود ان کی رپورٹوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایرانی رعایا پر ان کا حاکمانہ تسلط تھا۔

ایرانی قوم اس صورت حال سے عاجز آ گئی تھی اور جب پیرس میں امن کانفرنس منعقد ہوئی تو وہ مدد کی امید پر اس کی متوجہ ہوئی۔ وہ سمجھتی تھی کہ جو چیز تلوار سے حاصل نہیں کر سکی وہ تدبر سے حاصل کرے گی۔

جنگ عظیم کے دوران میں اتحادیوں کے شدید پروپاگنڈا نے دنیا کو یہ یقین دلا دیا تھا کہ جرمنی کی بڑھتی ہوئی قوت کو کچل ڈالنے کے بعد دنیا میں امن و آزادی کا دور دورہ ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ وعدہ خاص طور پر ان ملکوں کے لئے تھا جنہوں نے جرمنی کو شکست دینے میں فاتحوں کی مدد کی تھی۔ ایران ان میں

شامل تھا۔ پھر بھی اس نے اس امن کی کانفرنس سے بہت کچھ اُمیدیں باندھ رکھی تھیں جو ۱۹۱۹ء میں پیرس میں ملیس صلح نامہ (بلکہ حکم نامہ) ورسائی کی تیاری کے لئے منعقد ہوئی تھی اس لئے کہ جنگ کے خاتمے پر سیاسی قوتوں کا جو تناسب ہے اسے بجنسہٖ قائم رکھا جائے۔

وزیر خارجہ مشاور الممالک کی سرکردگی میں ایرانی مدبروں کا ایک وفد پیرس گیا تاکہ کانفرنس سے اُن نقصانات کی تلافی کا مطالبہ کرے جو اُن کے غیر جانبدار ملک کو محاربین کی دست اندازی کی وجہ سے پہنچے تھے اور آیندہ کے لئے یہ وعدہ لے کہ اس کی آزادی باقی رکھی جائے گی۔ ایران کے مطالبات سراسر اُس اعلیٰ نصب العین کے مطابق تھے جو کانفرنس نے اپنے سامنے رکھا تھا۔

مگر پیرس پہنچتے ہی ایرانی نمایندوں کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا انگلستان کے وزیر خارجہ نے وفد کی پذیرائی میں تامل کیا اور لارڈ ہارڈنگ نے ادھر ادھر کی دو چار باتیں کر کے انھیں سوکھا ٹال دیا۔ کانفرنس کے دوسرے ممبروں نے بھی ایران کی جائز درخواست کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ وہاں تو قوموں کی آزادی سے شطرنج کھیلی جارہی تھی اور لوگ مالِ غنیمت کی تقسیم میں منہمک تھے غریب مظلوم قوموں کی کون سُنتا تھا جس عدالت عالیہ نے جرمنی کو مجرم قرار دیا اس نے ایران کی درخواست کو اس بنا پر ٹھکرا دیا کہ اس نے جنگ میں اتحادیوں کا ساتھ نہیں دیا تھا اس لئے اُسے جرمنی سے تاوان پانے کا کوئی حق نہیں۔ ایران کو یہ ہدایت کی گئی کہ اپنے جنوبی ہمسائے سے براہِ راست گفت وشنید کرے حالانکہ اسی ہمسائے نے اُسے نقصان پہنچایا تھا اور اب تک سارے ملک پر اُس کا فوجی قبضہ قائم تھا۔ آخر میں ایرانی نمایندوں سے یہ وعدہ کیا گیا کہ آگے چل کر وہ مجلس اقوام میں مدعو کئے جائیں گے۔ بھلا اُس قوم کو جس کی زندگی عین اُسوقت انتہائی خطرہ میں تھی اس سے کیا تسکین ہوتی۔ ایرانی وفد کا یہ مطالبہ بھی تھا کہ ایران کی پُرانی سرحد دوبارہ قائم کی جائے اور غیر ملکی مداخلت کا خاتمہ کر دیا جائے اس سے انگلستان کی کور دبتی تھی۔ غیر ملکی مداخلت کو ختم کرنے کی درخواست میں اُن معاہدوں کی طرف ایک گستاخانہ اشارہ تھا جو جرمنی، آسٹریا اور ہنگری سے کئے گئے تھے۔

اس اثنا میں اُن انگریزی مدبروں میں جو پیرس آئے ہوئے تھے اور سفیر انگلستان مقیم طہران، سر پرسی کاکس میں زور شور سے تار بازی ہو رہی تھی۔ ایک دن دفعتہً انگریزی مدبروں نے ایرانی نمائندوں کی سند سفارت کی اصلیت میں شبہ ظاہر کیا اور ممبران وفد سے کہا کہ حکومت طہران سے تار کے ذریعہ اس کی تصدیق کراؤ۔

مشاور الممالک نے تصدیق کی درخواست کی، مگر جواب نہ آج آتا ہے نہ کل۔ وفد کے جانے کے بعد طہران کی حکومت نے سفیر انگلستان سر پرسی کاکس سے گفت و شنید شروع کر دی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ برطانیہ اور ایران میں اب براہ راست معاہدہ ہو جائے۔ "جنوبی ہمسائے" سے یہ گفت و شنید بالکل خفیہ طور پر ہو رہی تھی۔ اگست سنہ ۱۹۱۹ء میں معاہدہ پر دستخط ہو گئے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ دوستی کے پردے میں برطانیہ کا اقتدار ایران پر تسلیم کر لیا گیا۔ سارے ملک پر برطانوی فوجوں کا قبضہ تھا اس صورت واقعہ کو قانونی حیثیت دے دی گئی۔ انگلستان نے ایرانی حکومت کو ایک بڑی رقم قرض دینے کا وعدہ اس شرط پر کیا کہ فوج، مالیات اور محصولات کی نگرانی برطانوی "مشیروں" کے ذمہ ہو۔ اصل میں ان مشیروں نے پہلے ہی سے کام شروع کر دیا تھا صرف ان کے دائرۂ عمل و اختیارات ابھی صاف طور پر متعین نہیں ہوئے تھے۔ معاہدے پر دستخط ہونے کے بعد انگلستان میں اُن ایرانی مدبروں کو جنھوں نے اس میں مدد دی تھی بڑی بڑی رقمیں دیں۔ اس کی وجہ سے آگے چل کر اُن پر رشوت کا الزام لگایا گیا۔ اور ازالۂ حیثیت عرفی کا وہ مشہور مقدمہ دائر ہوا جس کا فیصلہ برطانوی مشیر مالیات کے نائب اول کے خلاف اور وثوق الدولہ وزیر اعظم کے حق میں ہوا۔

ایرانی دستور اساسی کے مطابق خفیہ معاہدے جو حکومت کسی غیر ملک سے کرتی ہے اُسی وقت تک سند رکھتے ہیں جب تک وہ ظاہر نہ ہونے پائیں لیکن اگر وہ ظاہر ہو جائیں تو مجلس ملی سے ان کی تصدیق کرانا لازم ہو جاتا ہے۔ یہ اب تک نہیں معلوم ہو سکا کہ آیا ایرانی مدبروں کو یہ گوارا نہیں ہوا کہ اپنی قوم کو دھوکا دیں۔ یا ان کا پہلے سے یہ قصد تھا کہ معاہدے کو ظاہر کر دیں گے اور وہ اچھی طرح جانتے تھے

کہ پارلیمنٹ اِسے منظور نہیں کرے گی۔ (گویا یہ انگلستان کو کچھ دن تک باتوں میں اُلجھائے رکھنے کی ایک چال تھی) یا انگلستان کو اپنی قوت اور ایران کی کمزوری پر اس قدر وثوق تھا کہ وہ اپنا مقصد کھُلم کھُلا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ بہرحال ہوا یہ کہ خفیہ معاہدہ شائع کر دیا گیا اور ایرانی قوم میں طیش و غضب کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔

اس عرصہ میں شمالی ایران میں ایک نیا خطرہ اُٹھ کھڑا ہوا تھا، روسی فوجیں بالشویک بن کر پھر واپس آگئی تھیں اور صوبہ قفقاز پر قبضہ کرنے کے بعد شمالی ایران کی سرحد تک آپہنچی تھیں۔ انگریزوں کی فوج انھیں آگے بڑھنے سے روکے ہوئے تھی۔ انگلستان یہ خدمت مفت میں انجام نہیں دینا چاہتا تھا۔ اُس نے طہران کی حکومت پر دباؤ ڈالا کہ معاہدہ کو مجلس ملّی میں منظور کرائے۔ اِدھر انگریزوں کا دباؤ بدحواس حکومت پر پڑ رہا تھا اور حکومت کا سر پھری پارلیمنٹ پر جو کسی طرح اپنا اجلاس کرنے پر راضی نہیں ہوتی تھی۔ انگلستان نے یہ دھمکی دی کہ وہ اپنی فوجیں واپس بلائے گا اور ایرانی حکومت کو جو رقم دے رہا ہے وہ بند کر دے گا۔

ایران کے سامنے دو صورتیں تھیں ایک طرف بالشویکوں کا طوفان بے تمیزی اور دوسری طرف برطانیہ کا تسلط۔ دوسری صورت ایسی تھی جو اُس کے قومی احساس کو اس حد تک مجروح نہیں کرتی تھی لیکن ایرانیوں کو اُمید تھی کہ ایک تیسری صورت بھی نکل سکتی ہے۔ یعنی کامل آزادی۔

وہی مشاور الممالک جو پیرس کی صلح کانفرنس سے اس قدر مایوس ہو کر لوٹا تھا اور جس کے ساتھ اس کے رفیقوں نے دغا کی تھی جولائی ۱۹۲۰ء میں سفیر خاص کی حیثیت سے طہران گیا تاکہ بغیر انگریزوں کی مدد کے بالشویکوں کے خطرے کو اس کے سر چشمے پر روک دے۔ وہ بہت اچھے وقت پر ماسکو پہنچا۔ یہی زمانہ تھا جب سوویٹ کے ارباب حل و عقد اپنی خارجی سیاست کی تشکیل کر رہے تھے اور مشرق اقصیٰ اور مشرق ادنیٰ کی سیاست میں اس دعوے کے ساتھ داخل ہونا چاہتے تھے کہ وہ ایشیا کی قوموں کو سرمایہ داری اور شہنشاہیت کے پنجے سے چھڑانے کے لئے آتے ہیں۔ مشاور الممالک اور چیچرل نے مل کر شطرنج کی وہ چالیں سوچیں جن سے ایران کی بساط پر انگلستان کو مات دی جا سکے۔ احمد شاہ نے اس گفت و شنید کو پسند کیا۔ وہ اس بات سے بہت متاثر تھا کہ کابل میں انگریزوں کی سیاست ناکام رہی اور امیر افغانستان نے روس سے معاہدہ کر لیا۔ ایرانی مدبّروں نے اپنی یہ پالیسی قرار دی کہ ان پرانے حریفوں یعنی انگلستان اور روس میں جو مخالفت پیدا ہو گئی ہے اُسے اور بڑھائیں۔ اُنھوں نے نہایت دانشمندی سے کام لیکر انگلستان کو جو معاہدے کے لئے تقاضا کر رہا تھا اتنے دن تک ٹالا کہ ماسکو میں ان کی کوششیں کامیاب ہو گئیں۔ اس طرح ان کے ملک کو جو بالکل بیدم ہو چکا تھا سانس لینے کا موقع مل گیا اور اس عرصہ میں قومی آزادی کی قوتیں بیدار اور مجتمع ہو گئیں۔ (از کتاب "رضا شاہ پہلوی" مصنفہ ہربرٹ میلنش۔ جرمنی)۔

پنجاب کے زمینداروں کا قرضہ اور اس کے متعلقات

(یہ مقالہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ کی پنجاہ سالہ جوبلی کے اجلاس میں شعبہ معاشیات و اصلاح معاشرت کے زیر اہتمام پڑھا گیا تھا)۔

ہندوستان میں سلطنت برطانیہ کے قیام و استحکام کے ساتھ ہمارے ملک کی معاشی زندگی میں ایک انقلاب بپا ہوگیا۔ زراعت و صنعت میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں اور ملک کی عام معاشی حالت میں ایک تغیر آگیا۔ کاشتکار اور اس کی مشکلات کو ابتدا ہی سے ایک نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے اور حکومت نے بھی بظاہر کاشتکاروں کی زبوں حالی اور پریشان خاطری کو ہمیشہ بضرورت محسوس کیا اور ان کی آسودگی اور آسائش کے اہتمام کی کوشش کی ہے لیکن ان کوششوں کی فرومائیگی اور بے دلی نے انھیں ہمیشہ بڑی حد تک بے نتیجہ رکھا ہے۔ گذشتہ نو دس سال سے ملک عالمگیر اور اندوہناک کساد بازاری کی گرفت میں ہے اور اس کے نتائج سے کوئی پیشہ اور کوئی جماعت محفوظ نہیں لیکن کاشتکار کے سر سے پانی گذر چکا ہے اور آج وہ جن مصائب سے دوچار ہے اور جس تنگ دستی اور فاقہ سے زندگی بسر کر رہا ہے غالباً اس شدت و تسلسل کے ساتھ اسے ان حالات سے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔

میں نے اس مختصر مقالہ میں صرف پنجاب کے حالات پر چند گذارشات پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ وہ صوبہ ان چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں کا وطن ہے جو اپنی محنت۔ جفاکشی

جہالت۔ سادہ لوحی۔ جسمانی طاقت اور مصائب کو بلا شکوہ برداشت کرنے اور اسی قسم کے دوسرے عیوب و محاسن کے لئے۔ اور سرکار دولتمدار کی سر فروشانہ خدمات کے لئے ہندوستان بھر میں ایک خاص مرتبہ رکھتے ہیں۔ گذشتہ جنگ عظیم میں پنجاب نے پانچ لاکھ نوجوان ہندوستان اور سلطنت برطانیہ کی حفاظت کے لئے سر بکف میدان میں اتارے اور سلطنت برطانیہ کے "بازوئے تیغ دار" کا لقب حاصل کیا۔

قرضہ کے اسباب | قوموں کی معاشرت۔ طریق زندگی۔ رسم و رواج اور عام عادات کا ان کی معاشی حالت پر ایک گہرا اثر ہوا کرتا ہے۔ اس لحاظ سے اسباب کی تلاش ایک ضروری امر اور ان کی وضاحت لازمی چیز ہے۔ اسباب کی جستجو کو تشخیص مرض کا مرتبہ حاصل ہے جس سے تجویز علاج میں آسانی ہوتی ہے اور نتیجہ کے متعلق اطمینان۔ لیکن نادار۔ اَن پڑھ۔ بند رسم و رواج میں جکڑا ہوا۔ دنیا کے طور طریقوں سے ناواقف کسان اسباب قرضہ کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔ وہ نادار ہے اس لئے کہ پیداوار کو بڑھانے کے ڈھنگ نہیں جانتا یا اس کی ناداری ان کے اختیار کرنے میں مانع آتی ہے۔ ہم سب کہتے ہیں وہ جاہل ہے۔ مفلس ہے فضول خرچ ہے۔ ناعاقبت اندیش ہے۔ وہ ضرور ایسا ہے لیکن شہروں کے بسنے والے جن کے علم و فضل پر دنیا کی شہادت آفتاب و ماہتاب سے زیادہ درخشاں ہے۔ فضول خرچی اور ناعاقبت اندیشی میں اس سے دو ہاتھ بڑھے ہوئے ہیں۔ کم از کم مسلمانوں میں تو آسودہ اور تعلیم یافتہ طبقہ میں یہ مرض پورے زوروں پر ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بڑے نوابوں جاگیرداروں اور رئیسوں کی اولاد اپنے ہاتھوں اپنا گھر لٹا دیتی ہے اور مفلس و نادار ہو جاتی ہے۔ ع

ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

اگر دس پندرہ ہزار روپیہ ماہوار کمانے والا مسلمان پارٹیوں، دعوتوں۔ سیر و سیاحت۔ جھوٹی نمائش اور دوسری بیہودہ فضول خرچیوں کی بدولت اپنی اولاد پہ دو لاکھ قرضہ کا بوجھ چھوڑ جاتا ہے تو ہمیں ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے کہ کاشتکار بھی تو ایک انسان ہے۔ بری بھلی

اپنے درجہ کے موافق کچھ آبرو رکھتا ہے۔ خوشی اور غمی سے اس کا دل بھی متاثر ہوتا ہے۔ پس ہمیں ایک جاہل کی ناپسندیدہ حرکات پر غم و غصہ کے بجائے دلسوزی اور ہمدردی کے جذبات پیدا کرنے چاہئیں۔

میں اسباب کی بحث میں الجھنا نہیں چاہتا۔ انہیں سے بعض امور مسلمات میں سے ہیں۔ کسان کے پیشہ کی نوعیت ضرورت قرض کی مقتضی ہے۔ مالیہ کی ادائیگی ایک ایسا سبب ہے جس پر اختلاف رائے ہے۔ حکومت اور اس کے دوست یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ آج مالیہ کا بوجھ جس قدر ہلکا ہے کم از کم ہندوستان کی تاریخ میں ایسا ہلکا کبھی نہیں تھا۔ ایسا ہو یا نہ ہو۔ اس قدر ضرور قطعی ہے کہ چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں کو ادائیگی مالیہ کے لئے قرض لینا پڑتا ہے۔ اس کو آمدنی کی قلت۔ فضول خرچی۔ پہلے قرضوں کی گراں قدر شرح سود کی وجہ سے عدم ادائیگی کسی چیز پر محمول کیجئے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ کاشتکار ادائیگی مالیہ کے لئے قرض لیتا ہے۔ اسی سے اندازہ فرمایئے کہ پنجاب کے ان کاشتکاروں نے (جو انجمن ہائے امداد باہمی میں شامل ہیں) گذشتہ پانچ سال میں پندرہ فی صدی سے زاید قرض روپیہ اس غرض سے لیا۔

اس تمام حیثیت سے میری مراد صرف اس قدر ہے کہ حکومت کا نظام محاصل محتاج ترمیم ہے۔ کس قدر تعجب اور تاسف کا مقام ہے کہ دوسرے طریقوں سے روپیہ کمانے والا تو آج سے چند سال پہلے ۱۹۹۹ روپیہ سالانہ کما کر بھی انکم ٹیکس ادا نہ کرے اور کاشتکار نو روپے سال کمائے تو بھی حکومت اس کی مزدوری میں شریک ہو۔ کم آمدنی پر ٹیکس کی معافی اگر ہر پیشہ کے لئے مناسب اور موزوں ہے تو بیچارے کاشتکار نے ہی کیا گناہ کیا ہے کہ کپکپا دینے والی راتوں اور پگھلا دینے والے دنوں کی مسلسل مشقت سے جو چند پیسے اس کو نصیب ہوں اور وہ بھی اس کا پیٹ بھرنے کے لئے ناکافی ہوں تو ان میں بھی حکومت اس سے اپنے حصہ کی طلبگار ہو۔ کاش اس مظلوم کی خاموش صدا سننے کے لئے ہمارے دل کے کان کھل جائیں۔

مقدار قرضہ | کسی ملک و صوبہ کا تو کیا ذکر کسی ضلع اور شہر کا قرضہ دریافت کرنا ہی نہایت مشکل کام ہے

اس کی صرف ایک ہی ترکیب ہے وہ یہ کہ حکومت یا تو یہ اعلان کر دے کہ وہ سب قرضہ خود ادا کر دیگی یا جس کو لینا ہو لے لے یا پھر کم از کم یہ اعلان کرے کہ جو قرضہ جات اس وقت ظاہر نہ کئے جائیں وہ منسوخ سمجھے جائیں گے۔ لیکن ایسے اعلان کے باوجود ساہوکار تیس چالیس فیصدی قرضہ ظاہر نہیں کریں گے۔ کیونکہ ایسا قرضہ جائداد اور زیورات کی کفالت پیدا کیا گیا ہوگا اور وہ بہت زیادہ محفوظ ہے ساہوکار قرضہ ظاہر نہیں کرتا اس لئے کہ وہ اپنی حالت عوام اور حکومت دونوں سے بمصلحت چھپائے رکھنا چاہتا ہے اور کاشتکار کی خودداری اگرچہ وہ بر خود غلط ہی کیوں نہ ہو اسے اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنے دکھ ایسے لوگوں سے بیان کرتا پھرے جو اس کی کوئی معقول امداد کرنے پر تیار نہیں۔ اب بتائیے فریقین کی پر اسرار خاموشی کے باوجود یہ معمہ کھلے تو کیونکر اور کس حد تک۔ میری رائے یہ ہے کہ قرضہ کی مقدار معلوم کرنے کی کبھی کوئی معقول کوشش نہیں کی گئی۔

پنجاب میں جو اندازے کئے گئے ہیں ان میں تازہ ترین اندازہ بنکنگ انکوائری کمیٹی کا ہے جس کے مطابق پنجاب کے کاشتکاروں کے قرضہ کی مالیت ایک ارب پینتیس کروڑ معین کی گئی ہے۔ اس پر آٹھ نو سال گذر چکے ہیں۔ کساد بازاری پورے زور پر رہی ہے زمین اور اس کی پیداوار کی قیمت گر چکی ہے۔ قرضہ کی ادائیگی کا کس میں بل تھا۔ دس فیصدی سالانہ کے حساب سے سادہ سود کے ساتھ اصل زر دس سال میں دگنا ہو جاتا ہے اور اسی حساب سے سود در سود کی حالت میں سات سال سے کچھ زیادہ میں دگنا ہو جاتا ہے لیکن ساہوکار کا سود تو ماہانہ۔ سہ ماہی اور ششماہی ہوتا ہے اور اس صورت میں رقم بہت جلد دگنی ہو جاتی ہے۔ سود در سود بھی ہے صرف سود بھی ہے۔ کچھ روپیہ ادا بھی ضرور ہوا ہے کیونکہ زمینیں فروخت ہوئی ہیں۔ مویشی فروخت ہوتے ہیں اور کاشتکار تو درکنار اوسط درجہ کے زمینداروں کے ہاں سے بھی سونا رخصت ہو چکا ہے۔ اب اندازہ فرمائیے پنجاب کا زراعتی قرضہ ۲ ارب ستر کروڑ ہوگا ستر کروڑ ادائیگی تصور کر لیجئے تو آج سرکاری اندازہ کی بنا پر پنجاب کا زراعتی قرضہ ۲ ارب تو ہو چکا ہے اور کیفیت یہ ہے کہ مارگیج بنکوں سے جو روپیہ معقول زمینداروں نے دس بارہ برس پہلے لیا تھا اس کے متعلق سرکاری خیال یہ ہے کہ موجودہ

قیمتوں کی بنا پر اگر زمیندار کی زمین پر قبضہ کر لیا جائے تو بیس برس میں اس قرضہ کا جمع شدہ سود بھی ادا نہیں ہو سکتا۔ ع

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

ساہوکار | لین دین کے معاملات میں ساہوکار اور کاشتکار دونوں شامل ہیں۔ اگر دونوں فریق معاملے کے کھرے اور برابر کے ہوشیار ہوں تو خطرہ کی بات نہیں۔ لیکن موجودہ حالت میں ان میں وہی نسبت ہے جو ہوائی جہاز اور بیل میں ہے۔ میری رائے میں پنجاب اور ہندوستان کے مسئلۂ مقروضیت میں کاشتکار کی ناعاقبت اندیشی۔ جہالت۔ پیداوار۔ فضول خرچی اور دوسری بری عادتوں کو بہت تھوڑا دخل ہے۔ حقیقت میں اس مسئلہ کی جان جناب ساہوکار صاحب کی ذات والا صفات ہے۔ بقول ایک انگریز مصنف "وہ ایک خندق میں محفوظ ہے اور اس کی سنہری گولیاں کشتوں کے پشتے لگا رہی ہیں۔ اور جو بدنصیب چڑیا ایک مرتبہ اس باز کے پنجہ خونین میں پھنس گئی ایک نہایت ہی دردناک موت اس کے لئے مقدر ہو چکی ہے"۔

ع دل شاہین نہ سوزد بہر آں مرغے کہ در چنگ است

ساہوکاروں کے طور طریقے بیان کرنے سے پہلے ان کی تعداد پر ایک نظر ڈالنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

سنہ ۱۹۲۲ء میں مسٹر کیلورٹ نے پنجاب کے ساہوکاروں کی تعداد کا اندازہ انکم ٹیکس کے شمار و اعداد سے کیا۔ اس وقت پنجاب میں چالیس ہزار ساہوکار تھے۔ عورتیں اور زمیندار ساہوکار اس اندازہ میں شامل نہ تھے۔ سنہ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق پنجاب میں ۳۶۸۷۳ اشخاص ساہوکاری کر رہے تھے جن میں ۱۱۹۱ عورتیں شامل تھیں۔ ۱۲ ۱۱۵ اشخاص ایسے تھے جن کا ضمنی پیشہ ساہوکاری تھا۔ بنکنگ کمیٹی نے زمیندار ساہوکار کی تعداد کا اندازہ کیا۔ کمیٹی کا خیال ہے پنجاب میں کم و بیش ۵۵ ہزار اشخاص ساہوکاری کرتے ہیں۔ اس اندازہ کی صحت استدلال کی ایک مثال عرض کروں گا۔ انجمن ہائے امداد باہمی کی انسپکٹرس صاحبہ نے اپنے بیان میں فرمایا

کہ مستورات کی انجمنوں میں دو ہزار عورتیں شامل ہیں ان میں سے پانچ فی صدی روپیہ کا سودی لین دین کرتی ہیں۔ اسی بنا پر روپیہ کا لین دین کرنے والی عورتوں کا اندازہ کیا گیا ہے حالانکہ اسی اندازہ کو زیادہ احتیاط سے استعمال کیا جانا چاہیئے تھا اس طرح پر جو اندازہ کیا گیا ہے وہ قابل اعتماد نہیں مثلاً سنہ ۱۹۳۰ء میں انجمن ہائے امداد باہمی میں عورتوں کی تعداد ۲۲۸۶ تھی۔ ان میں سے صرف ۵۰۸ عورتیں ہندو اور سکھ تھیں اور باقی مسلمان۔ مسلمان مرد تو اکا دکا سود سے گریز نہیں کرتا لیکن شہر و دیہات کے جن طبقات میں سے ان مسلمان عورتوں کا تعلق ہے ان میں خدا کے فضل سے عورتیں مردوں سے زیادہ راسخ الاعتقاد ہیں اور سود کو حرام سمجھتی ہیں۔ پس انجمن ہائے امداد باہمی میں شامل ہو کر بھی روپیہ کا سودی کاروبار کرنے والی عورتیں لازماً صرف ہندو اور سکھ ہیں۔ دو ہزار میں سے پانچ فی صدی کا اندازہ حقیقت میں ۵۰۸ میں سے بیس فی صدی کا اندازہ ہے۔ اگر انجمن ہائے امداد باہمی میں شامل ہونے کے باوجود ہندو اور سکھ مستورات سودی کاروبار میں مشغول ہیں اور ان میں سے بعض یقیناً اس قدر مالدار نہیں ہوں گی کہ اس کاروبار کو شروع کر سکیں تو آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ عورتوں کی تعداد کے اندازہ میں کمیٹی نے بہت بڑی ٹھوکر کھائی ہے۔

ہندو اور سکھ مستورات بڑی کثرت سے ساہوکاری کرتی ہیں اور زیورات کی کفالت پر تھوڑی مدت اور بھاری شرح سود پر قرض دیتی ہیں۔ ان میں سے تیرہ سو تو ایسی ہیں جن کی ساہوکاری از روئے رپورٹ مردم شماری بھی مسلم ہے۔

سود کو جائز سمجھنے والی جماعتوں کا ہر فارغ البال مرد جو سود خواری کو دولتمند ہونے کا تیز ترین ذریعہ سمجھتا ہے اپنی آمدنی قرض دیکر بڑھاتا ہے۔ کتنے ہی وکیل اور سرکاری ملازم چپکے چپکے اپنی آسامیوں کا خون چوستے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ فصل کے موقع پر رخصت حاصل کر کے رقمیں وصول کرنے پہنچ جاتے ہیں۔ گذشتہ بارہ پندرہ سال سے ساہوکاروں کی طرف جو نمائشی توجہ کی گئی ہے اور انکم ٹیکس والوں نے بھی کچھ پرسش کی تو یار لوگوں نے ساہوکاری کو اپنا پیشہ بتانے سے انکار کر دیا اور جو انکار نہیں کر سکتے تھے اسے ضمنی بتانے لگے۔ اب ساہوکاروں کی تعداد میں

کمی نظر آنے لگی ہے اور ان کے دوست کہتے ہیں کہ یہ پیشہ مفلس ہو رہا ہے۔ لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ ہر ہندو دوکاندار خواہ گاؤں میں بستا ہو یا شہر میں رہتا ہو۔ ساہوکار ہے۔ منڈیوں کے آڑھتی ساہوکار ہیں اور پیشہ وروں سے مال خریدنے اور اجرت پر بنوانے والے ساہوکار ہیں۔ یہ اندازہ کہ ایسے لوگ اپنی دوکانداری سے زیادہ کماتے ہیں یا ساہوکاری سے' ایک امر مشکل ہے لیکن یہ ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے جس سے انکار ایک افسوسناک نادانی یا صدرجہ کی غلط بیانی ہے۔ پنجاب میں پینتیس ہزار گاؤں ہیں۔ ہر گاؤں میں ایک یا دو ہندو دوکاندار موجود ہیں جو لین دین کرتے ہیں۔ ساہوکار علیحدہ موجود ہیں جن کا حقیقی یا ضمنی پیشہ ساہوکاری ہے۔ شہروں کے دوکاندار اور ساہوکار اس کے علاوہ ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق ستر اسی ہزار سے زیادہ ساہوکار تو صرف دیہات ہی میں بستے ہیں۔ ان کی تعداد سے بحث کرنا زیادہ اہم نہیں۔ ضرورت تو ان کے کاروبار کی وسعت کو جاننے کی ہے۔ زراعت کے بعد پنجاب میں سب سے اہم کاروبار ساہوکاری ہے اور آج سے دس برس پہلے ساہوکاروں نے صوبہ کے انکم ٹیکس کا ۷ ۴ فی صدی ادا کیا ہے اگرچہ ہم سب جانتے ہیں کہ ساہوکار مختلف حیلوں سے ٹیکس ادا کرنے سے یا تو صرف بچ جاتے ہیں یا جس قدر ان کو حقیقت میں ٹیکس ادا کرنا چاہئے نہیں کرتے۔

ساہوکار کے طور طریقے

وضعات ابتدائی۔ ملتانہ قرض دیتے وقت عام طور پہ ساہوکار ایک مقرر حساب سے کچھ رقم دینے کے لئے وضع کر لیتا ہے۔ عام طور پہ ایک آنہ فی روپیہ وضع کیا جاتا ہے۔ ایک سب جج صاحب نے بنکنگ کمیٹی کے سامنے کہا کہ ایک آنہ روپیہ تو بڑی رعایت ہے۔ اصل میں دو آنہ روپیہ لیا جاتا ہے اور بعض حالتوں میں تو چار آنہ فی روپیہ لے لیا جاتا ہے۔ مختلف اضلاع میں ساہوکار کے اس نذرانہ کا نام گھر چھوڑا۔ جھلکانہ۔ اور ملتانہ وغیرہ ہیں۔

کم دیکر زیادہ لکھانا قرض لینے والے کی ضرورت اور حیثیت کے مطابق بسا اوقات کم روپیہ دیکر زیادہ تمسک لکھوایا جاتا ہے۔ مثلاً سو روپیہ قرض مانگنے والے کو ستر روپیہ دیکر اس سے ایک سو کے

تمسک پر انگوٹھا لگوایا جاتا ہے۔ یہ طریقہ بھی عام ہے اور قرض لینے والے کی شدت ضرورت اور حیثیت کے مطابق اس میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ ساہوکار بہانے بتاتا ہے، روزگار مندا بتاتا ہے، روپیہ کو کمیاب بتاتا ہے کاشتکار کو مایوس اور پھر اس کی اُمیدوں کو زندہ کر دیتا ہے کاشتکار اپنی ضروریات کو پورا ہوتے دیکھ کر نہال ہو جاتا ہے اور پوری بے جگری سے ایسی مستعدی اور رضامندی کے ساتھ انگوٹھے کا نشان تمسک پر ثبت کر دیتا ہے جیسے کسی دشمن کو یہ رقم ادا کرنا ہوگی۔

سود کی پیشگی وصولی | اچھی خاصی آسامیوں کے ساتھ یہ ترکیب کی جاتی ہے کہ چھ ماہ کا سود اصل زر سے قرض دیتے وقت وضع کر لیا جاتا ہے۔ چھ ماہ کا سود تو پیشگی لے لیا جاتا ہے لیکن ستر روپیہ دیکر تمسک پورے ایکسو کا ہی لکھوایا جاتا ہے اور شرط یہ قرار پاتی ہے کہ اگر اگلی فصل پر چھ ماہ بعد سو روپیہ ادا کر دیا گیا تو کوئی سود نہ لیا جائے گا۔ اور اگر چھ ماہ بعد تمام رقم ادا نہ کی گئی تو کل زر کو اصل زر تصور کر کے سود لیا جائے گا۔

تازہ ترین ایجاد | ساہوکاروں کو ایک وہم پیدا ہو گیا ہے کہ دیوانی عدالتیں بعض قوانین کے ماتحت ان کی مقررہ شرح سود کو زیادہ منصفانہ بنا دینے کا اختیار رکھتی ہیں۔ بنکنگ انکوائری کے سلسلہ میں یہ معلوم ہوا کہ کتنے ہی منصف۔ سب جج اور وکیل ایسے قوانین کی موجودگی سے بے خبر ہیں۔ بہر حال کسی وقت پیش آجانے والی صورت حال کا تدارک پہلے ہی سے سوچ لیا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص ایک سو روپیہ قرض لینا چاہے تو ستر روپیہ دیکر اس سے ۱۸ ۳/۴ فی صدی سالانہ کا تو ایک تمسک لکھوا لیا جاتا ہے اور ایک پرامیسری نوٹ چالیس روپیہ کا اسی قدر شرح سود پر لکھوایا جاتا ہے۔ ستر روپیہ دیکر اس طرح اس کو چالیس کے علیحدہ علیحدہ قبالے لکھوائے جاتے ہیں اور جو سود حقیقت میں ساڑھے سینتیس فی صدی ہے بظاہر ۱۸ ۳/۴ ہی نظر آتا ہے۔ جب پرامیسری نوٹ کی میعاد ختم ہونے کو آتی ہے تو اس کو تمسک میں تبدیل کرا لیا جاتا ہے اور شرح سود کی گرانی چھپانے کے لئے ایک اور پرامیسری نوٹ لکھوا لیا جاتا ہے۔

رسید کا نہ دینا | ساہوکاروں کے خلاف ایک عام شکایت یہ ہے کہ وہ روپیہ وصول کر کے یا

قسطیں وصول کرکے رسید نہیں دیتے اور اسی طرح کئی بار روپیہ وصول کرتے رہتے ہیں اور جب
کسی آسامی کو کسی ضرورت سے نیچا دکھانا بلکہ مٹانا منظور ہوتا ہے تو جوں کا توں صاف حساب
دکھاکر ڈگری کرالی جاتی ہے۔ عدالت ادائیگی کا ثبوت صرف رسید تسلیم کرتی ہے۔ زمیندار
رسید یا تو لیتا ہی نہیں یا لیکر اس کو محفوظ نہیں رکھتا۔ کپتان لال چند نے کیا اچھا کہا ہے کہ
"وہ عدالتیں جو زمینداروں کی زبانی شہادتوں پر ملزموں کو پھانسی تک کی سزا دے دیتی ہیں۔
جب ادائیگی قرض کا مسئلہ پیش ہو تو ان کا دس روپیہ تک کے لئے بھی اعتبار نہیں کرتیں"۔

کئی کئی بہیاں رکھنا اور جھوٹے انگوٹھے لگوانا

کاشتکار اپنا انگوٹھا لگانے میں بڑا دلیر ہے۔ ساہوکار اس کی سادہ لوحی
کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ سادہ ورق پر انگوٹھا لگوا لیتے ہیں۔ حساب
کتاب مکمل کرنے کے بہانے سے عدالت میں دعویٰ دائر کرنے سے پہلے ہی کو حسب ضرورت
مرتب اور نشان انگوٹھا سے مزین کر لیتے ہیں۔ ہر روز ایسے سینکڑوں مقدمات پیش ہو کر
فیصل ہوتے ہیں جن کی بنا ردہوکہ سے لگوایا ہوا انگوٹھا ہوتا ہے۔

کرنال کے ایک زمیندار کے خلاف ضلع رہتک میں ۸۰۰ روپیہ کا دعویٰ دائر کیا گیا۔
زمیندار نے کہا کہ اس نے کبھی اس ساہوکار سے قرض نہیں لیا۔ لیکن انگوٹھے کا نشان نہایت
صاف ناقابل انکار تھا۔ دوران مقدمہ میں ثابت ہوا کہ مدعی ساہوکار کا رشتہ دار ایک بنیا
مدعا علیہ کے گاؤں میں رہتا تھا اور ساہوکار نے اپنی ہی اپنے رشتہ دار کے پاس بھیج کر عرصہ
ہوا کسی بہانے سے اس پر انگوٹھا لیا ہوا تھا۔ زمیندار بار سوخ تھا۔ ساہوکار کی دغابازی بھی ظاہر
ہو چکی تھی۔ انگوٹھے کے صاف نشان کے باوجود مقدمہ خارج ہوگیا۔ لیکن معاملہ آگے نہ بڑھا۔

ساہوکار اپنی بوجھی اور ان بوجھی مصلحتوں کی بنا پر کئی کئی بہیاں رکھتے ہیں۔ ضلع رہتک
میں ایک بنئے نے وصولی قرضہ کا دعویٰ کیا۔ مقروض نے کہا کہ وہ مدت ہوئی وہ اپنا قرضہ
بیباق کر چکا ہے۔ عدالت میں جو بہی پیش ہوئی اس میں حساب بالکل بے خطا نظر آتا تھا۔
مقروض کے شدید انکار پر اس حساب کو مختلف طریقوں سے جانچا گیا تو یہ بات پایہ ثبوت کو

پہنچ گئی کہ بعض قرضہ جات ایسی تاریخوں میں دئے گئے ظاہر کئے گئے ہیں جن تاریخوں میں بنیا اس گاؤں میں موجود ہی نہیں تھا۔ بعض وقت حافظہ نباشد کے مصداق عدالت میں ایسی بہیاں بھی پیش ہو گئی ہیں جن پر سادہ لوح اشخاص کے انگوٹھے سادہ اوراق پر لگے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔ کبھی کبھار کوئی ساہوکار ایسی جعلسازی کی علت میں کسی منصف مزاج کے ہاتھوں پٹ بھی جاتا ہے۔ سنہ ۱۹۳۴ء میں ایک ہندو مجسٹریٹ نے ایک ساہوکار کو سزا دی۔ لیکن عدالت العالیہ سے وہ رہا ہو گیا۔

حساب کی زبان | پنجاب کی عدالتی زبان اردو ہے۔ ہر پڑھا لکھا آدمی اسی زبان سے واقف ہے۔ لیکن ساہوکار اپنی مخصوص مصلحتوں کی بنا پر لنڈے میں حساب کتاب رکھنے پر اصرار کرتا ہے۔ اس زبان کی عمدگی کا یہ حال ہے کہ خود لکھنے والا کچھ دیر بعد اس کو صحیح نہیں پڑھ سکتا۔ لالہ دنی چند صاحب نے خوب نمونہ پیش کیا ہے۔ " لنڈے میں ایک ساہوکار نے لکھا۔ لالہ جی اجمیر گئے بڑی بہی بھیج دو اور دوسرے نے پوری صحت اور درستگی کے ساتھ پڑھا۔ لالہ جی آج مر گئے بڑی بہو بھیج دو۔"

حساب کتاب کی عمدگی اور باقاعدگی کا اسی سے اندازہ کر لیجئے کہ چار ہزار دیہاتی ٹیکس گزار ساہوکاروں میں سے صرف ۸۷ اشخاص کا حساب کتاب ایسا تھا کہ اس پر اعتماد کیا جا سکے۔

شرح سود اور منافع | یہ بڑی پر لطف مگر پر پیچ داستان ہے۔ کوشش یہ کی گئی ہے کہ ثابت کیا جائے کہ ساہوکار کا منافع چھ سات فی صدی سے زیادہ نہیں ہوا کرتا۔ بڑی بڑی سرکاری دستاویزیں اور فیصلہ جات اور دلیلیں پیش کی گئیں لیکن واقعات کی منطق دنداں شکن ہوا کرتی ہے۔ سود بالعموم ساڑھے سینتیس فی صدی سالانہ سے شروع ہو کر ۵، فی صدی تک جاتا ہے اور پھر سود در سود کے چکر اور دوسرے فوائد کو شامل کیا جائے تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ شرح سود اور منافع کہاں پہنچتا ہے۔ اگر واقعات کی طرف سے آنکھ بند کرنا ہی منظور ہو تو ہائی کورٹ

کے ججوں کی شہادت تو ہر طرح قابل اعتماد و لائق احترام ہے۔ ان کا اندازہ ہے کہ شرح سود بالعموم ۲۵ فی صدی ہے۔ اور ان کا ارشاد ہے کہ " ساہوکار کی مشکلات کے پیش نظر یہ شرح کچھ زیادہ نہیں۔

غیر تحریری فوائد اور منافع | ساہوکار اپنی معینہ شرح سود کے علاوہ کئی طرح کے مالی فائدے اٹھاتا ہے۔ کاشتکار کے یہاں سے سبزی۔ گنا۔ گڑ۔ پھل۔ بھوسہ۔ چارہ۔ لکڑی وغیرہ مفت وصول کرتا ہے۔ اس سے اور اس کے مویشیوں سے بیگار لیتا ہے۔ اس کی پیداوار اس سے بازاری نرخ سے بہت کم پر ہتیا لیتا ہے اور شرح سود جوں کی توں۔ میرے شہر میں ایک زمیندار کو چالیس پچاس روپیہ قرضہ کے بدلے اپنا ایک لڑکا ساہوکار کے ہاں کام کرنے کے لئے بھیجنا پڑا۔ لڑکا کام بھی کرتا تھا پھر عمر میں بڑھا تو مزدوری بھی کیا کرتا اور ساہوکار کو ادا کرتا تھا۔ کم از کم پندرہ برس وہ لڑکا ساہوکار کے ہاں رہا اور بڑی مشکلوں سے اس کی خلاصی ہوئی۔

اگر ساہوکاری سے منافع چھ سات فی صدی ہی ہے تو بتایا جائے کہ ساہوکار جیسا معاملہ فہم اور زیرک انسان کیوں اپنا روپیہ کوآپریٹیو بنکوں میں جمع کرا کے اس قدر منافع حاصل نہیں کر لیتا۔ چند سال پہلے یہ شرح سود ان بنکوں میں رائج تھی۔

عدالت میں | جب ساہوکار کو ضرورت محسوس ہوتی ہے (اور یہ ضرورت ہمیشہ روپیہ کی وصولی ہی کی نہیں ہوا کرتی مقروض کو بے آبرو کرنا منظور ہو۔ اس کی پارٹی کو زک دینا مقصود ہو تو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے سے بہت مدت پہلے اپنے حساب کتاب کو عدالت کے اطمینان کے موافق ٹھیک ٹھاک کر لیتا ہے۔ دعویٰ دائر ہو تو روز اول سے ہی ساہوکار مقدمہ کو اپنی مرضی کے مطابق چلاتا یا چلواتا ہے۔ اگر وہ یہ چاہتا ہے کہ مقروض عدالت میں حاضر نہ ہو تو ابتدائے کار سے مقروض کا کام تمام ہو جانے تک اس کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ نوٹس بھیجا جاتا ہے اور اسکو ماسٹر کی معرفت چپکے سے یہ لکھا کر واپس بھجوا دیا جاتا ہے کہ مکتوب الیہ لینے سے انکاری ہے نالش دائر کی۔ سمن جاری ہوئے پیادہ ساہوکار کی مٹھی میں ہے۔ لکھوا دیا جاتا ہے کہ موجود نہیں ہے۔

انکاری ہے۔ یا کسی دوسرے کے نام اطلاع کرادی اور غریب مقروض کو پتہ تک نہ چلا۔ پیادے عام طور پر چار آٹھ آنے کے لالچ میں یہ ظلم اور بے عنوانی کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن بسا اوقات تو ساہوکار پیادہ کو بھی جُل دے جاتا ہے۔ میں نے ایک پیادے سے ساہوکاروں کے ان طریقوں اوران میں پیادوں کی شمولیت کے متعلق دریافت کیا تو اس نے سنایا کہ بعض وقت تو ساہوکار پیادہ کو بھی الو بنا دیتا ہے۔ مثلاً اس نے بتایا کہ وہ ایک مرتبہ ایک ساہوکار کے ساتھ تعمیل سمن کے لئے گیا تو ساہوکار نے گاؤں کے باہر کھیت میں بیٹھے ہوئے ایک آدمی کی طرف اشارہ کیا اور زور سے کہا "وہ رہا" یہ سنتے ہی وہ شخص سر پر پاؤں رکھکر بھاگا اور غائب ہو گیا اس طرح اس کے فرار اور انکار کی رپورٹ سمن سے داموں ہو گئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ساہوکار نے پہلے سے ایک دوسرے شخص کو اس فریب دہی میں کچھ دے دلا کر شامل کر رکھا تھا۔

مدعا علیہ غیر حاضر ہے۔ حتیٰ کہ یکطرفہ ڈگری ہو گئی یا جب جی چاہے اسے عدالت میں بلا یا اور اقراری بیان دلوالیا یا اگر اس کا بیان ناموافق ہوا تو گاؤں میں جا کر اس سے راضی نامہ کی طرح ڈالی اور اسے سمجھا دیا کہ اب عدالت میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ادھر اس کی غیر حاضری میں معاملہ سلجھا لیا اور ڈگری کرالی۔

پنجاب کے سابق چیف جسٹس کا مقولہ لا کالج کے ہر نئے طالب علم کی زبان پر ہوتا ہے۔ "ڈگری دار کی مشکلات کا آغاز ڈگری حاصل کر لینے کے بعد ہوتا ہے" پنجاب کے بعض منصفوں۔ وکیلوں ساہوکاروں۔ ایڈیٹروں اور اس برادری کے دوستوں کا اندازہ ہے کہ ڈگری دار زر ڈگری کا ۲۵ فی صدی بمشکل وصول کر سکتا ہے۔ ان ساہوکار دوست منصفوں کا فیصلہ ایک سب جج کی زبانی حسب ذیل ہے۔ "جہانتک زمینداروں کا تعلق ہے قانون نے ان کی محافظت کا کافی انتظام کر دیا ہے۔ انکی فصلوں اور جنسوں کا ایک حصہ قرق نہیں ہو سکتا۔ انکا مکان آزاد ہے۔ انکی زمین پر کوئی بار نہیں" لیکن حقیقت قانون کی موجودگی میں بھی حقیقت ہی رہتی ہے اور زمیندار کا سب کچھ قرق ہو سکتا ہے مگر سلیقہ سے اور قانون کی سرپرستی میں

ڈگری حاصل کی۔ اگر مقروض کچھ ادا نہیں کرسکتا یا اس سے فوراً ہی کچھ طلب کرنا خلاف مصلحت ہو تو کچھ رقم اپنی طرف سے جمع کرکے عدالت میں وصول ہونے کی اطلاع کرادی جاتی ہے اور مناسب وقت پر اجرائے ڈگری و قرقی کی درخواست دی جاتی ہے۔ بعض اوقات تو اس کمال سے کام لیا جاتا ہے کہ جب تک قرقی کا حکم نہ پہنچ جائے مقروض کو مقدمہ کی خبر تک نہیں ہوتی۔ اس کی مثال ابھی عرض کروں گا۔ مقروض کے پاس مال اسباب نہ ہو تو اس کے دوستوں۔ رشتہ داروں کا مال قرق کرلیا جاتا ہے انکی چیخ پکار کوئی نہیں سنتا۔ مال وصول کرلینے کے بعد زمیندار کے دوست رشتہ دار عذرداریاں کرتے پھرتے ہیں جو بالعموم نامنظور ہوا کرتی ہیں۔ مقروض اور اس کے دوست ذرا غصیلے ہوئے تو انکو طیش دلاکر بیلف کی گردن میں ایک جھٹکا ہی لگوادیا یا اس کے پھٹے ہوئے کرتے کو ذرا اور کھینچ لگوادی تو ۳۵۳ عاید ہوگئی اور قرقی کے مال کو چھین لے جانے اور سرکاری افسر کے کار منصبی میں مداخلت کے جرم میں سیدھے سرکاری مہمان خانے پہنچا دئے گئے۔ اب کون ہے جو ساہوکار کا لوہا نہ مانے اور رام رام نہ کرے۔

ساہوکار زر ڈگری بارہ برس تک وصول کرسکتا ہے۔ پہلے سال تو کچھ وصول کرکے وہ عدالت میں اطلاع کردیتا ہے۔ اسامی کمزور ہو تو اجرائے ڈگری بھی کرالیتا ہے لیکن بالعموم وہ اپنا روپیہ عدالت کے باہر مختلف طریقوں سے وصول کرلیتا ہے۔ منصفوں اور وکیلوں کی طرح موشگافیوں کی کوئی گنجایش میرے دماغ میں نہیں۔ اس لئے میں یہ معمہ نہیں سمجھ سکتا کہ ایک ساہوکار ڈگری حاصل کرلینے کے بعد کس طرح اس مقروض سے روپیہ وصول کرنا چھوڑ دیتا ہے جو قرض ادا کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ جو کچھ مقروض دے سکے وصول کرلیا جاتا ہے۔ اس کی زمین باقی رقم کے لئے مستاجری پر دے دی جاتی ہے۔ اسامی کھری ہو تو بقیہ رقم کا نیا تمسک لکھوالیا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے منصف اور وکیل صاحبان یہی کہتے رہتے ہیں کہ زر ڈگری کا چوتھا حصہ بھی بمشکل وصول ہوتا ہے۔

جب کبھی ساہوکار کو معلوم ہو جائے کہ مقروض یا مدیون نے اپنی زمین اپنی بیوی یا بیٹے

کے نام ہبہ کر دی ہے یا اپنی جائداد کو ادھر ادھر خورد برد کر دیا ہے تو وہ آسان ترکیب نکالتا ہے اور مقروض کو جیل بھجوا دیتا ہے۔ چونکہ ایسی قید دیوالیہ پن کے مرادف ہوتی ہے ڈگریدار عدالت دیوالیہ کے سامنے مقروض کو دیوالیہ قرار دئے جانے کی درخواست دے دیتا ہے تاکہ اس طریقے سے سرکاری ریسیور کے ذریعہ مقروض و مدیون کے فریب کارانہ انتقالات جائداد کو بہ آسانی منسوخ کرا سکے۔ اس طرح ڈگریدار ایکٹ انتقال جائداد کی دفعہ ۵۳ کی سختیوں سے محفوظ ہو جاتا ہے جس کے ماتحت فریب کارانہ انتقال کا بار ثبوت ڈگریدار پر ہوتا ہے۔ لیکن ڈگریدار وہ صورت اختیار کرتا ہے جس میں ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آتے۔ کام آسانی سے ہو اور بار ثبوت مقروض اور دوسرے فریق انتقال کے سر ہو۔ ساہوکاروں کے کارنامے قرضے اور اس کے متعلقات کی یہ ایک سرسری سی کیفیت پیش کرنے کے بعد اجازت چاہتا ہوں کہ ساہوکاروں کے بعض کارناموں کا ذکر کروں۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ جس ملک میں ایسے واقعات روز مرّہ پیش آتے ہوں وہاں غریب کسان کے لئے اطمینان کی صورت پیدا ہو تو کیونکر۔

پنجاب کے ایک مشہور و معروف قصبہ میں ایک پڑھے لکھے میونسپل کمشنر نے اپنی ضمانت پر ایک شخص کو کچھ قرض دلوایا۔ کئی سال بعد ساہوکار نے جو اسی شہر میں رہتا تھا مقروض پر ڈگری کرائی اور جو روپیہ وہ ادا نہ کر سکتا تھا اس کی ادائیگی کے لئے ضامن کی قرقی ایسے طریقے سے لے آیا کہ ضامن کو قرقی کا علم بھی نہ ہوا۔ ضامن کو اس وقت معلوم ہوا ہے جب ساہوکار نے اسکو مکان خالی کرنیکا نوٹس دیا۔ اصل میں ساہوکار عدالت سے خاموشی کے ساتھ قرقی لے آیا۔ بیلف کے ساتھ مل کر اس نے اپنے گھر میں بیٹھ کر ہی پانچ سات دوستوں کی بولی نیلام عام میں لکھادی اور انجام کار پانچ سات ہزار کا مکان اپنے نام پانچ سو پر ختم کرا لیا اور اس وقت تک ایسی رازداری اور خاموشی سے کام لیا جب تک ضامن کے لئے عذر داری کی مدت نہیں گذر گئی۔ جب شہر میں چرچا ہوا اور ساہوکار کو بظاہر اپنی سلامتی کا خدشہ نظر آیا تو اس نے پانچ سو روپیہ وصول کر کے مکان پر سے اپنا قبضہ مخالفانہ اٹھایا۔ ۱۹۳۴ء میں ضلع اٹک میں ایک مشہور مقدمہ ہوا جس کی نظیر آج تک تو غالباً کسی دوسرے

ملک میں ملے گی نہیں۔ ایک مسلمان محمد گل نے ۱۸۸۳ء میں ایک ساہوکار سے پانچ سو روپیہ قرض لیا اور اپنی دو ہزار سات سو اکھتر کنال زمین رہن باقبضہ کردی۔ قرار پایا کہ اس زمین کی آمدنی دو سو روپیہ کا سود شمار ہوگی باقی رقم پر ۲۵ فیصدی کے حساب سے سود لیا جائیگا۔ ۱۹۲۹ء میں وارثان کو ہوش آیا اور انھوں نے زمین فک الرہن کرانے کی درخواست دی۔ قانون کی تیز رفتاری کے صدقے میں ۱۹۳۴ء میں ہائی کورٹ سے آخری فیصلہ نافذ ہوا کہ مقروض کو دو لاکھ دس ہزار روپیہ ساہوکار کو ادا کرنا چاہیئے۔

پہلوان خاں نے جیت سنگھ سے چھ روپیہ کا ایک گدھا قرض میں لیا۔ چھ سو روپیہ ادا کرچکا ہے ابھی دو سو کا مطالبہ باقی ہے۔

فتح خاں نے جیون سنگھ سے ساڑھے چار من گندم ادھار لی۔ چھبیس من دس سیر دے چکا ہے۔ ساہوکار ابھی سترہ ہزار روپیہ کا مطالبہ کر رہا ہے۔

قائم خاں نے ایک شخص سے پندرہ سیر جوار قرض لی۔ بائیس ہزار روپیہ ادا کرچکا ہے ابھی پونے دو سو کا مطالبہ موجود ہے۔

کئی ساہوکاروں کا یہ حال ہے کہ ہزاروں روپیہ کا مطالبہ کرتے ہیں اور جب منصفوں کے سامنے حساب پیش ہو تو پتہ چلتا ہے کہ وہ عرصہ ہوا اپنا قرض وصول کرچکے ہوتے ہیں بلکہ زمیندار کا روپیہ ان کے ذمہ نکلتا ہے۔

پچاس ساٹھ برس پہلے کئی لوگوں نے اپنی کچھ زمینیں رہن رکھیں اور باقی زمینوں کو ساہوکار کو لیکھا لکھی کے طریق پر دے دیا اور قرار یہ پایا کہ تمام زمین بیک وقت فک الرہن ہوگی۔ اصلی ساہوکار اور مقروض کی کئی پشتیں گذر چکی ہیں لیکن چھوٹے چھوٹے قرضوں کا لیکھا لکھی حساب ہے کہ چلا آرہا ہے۔

ایک اسکول ماسٹر نے پچاس روپے کی ایک لنگی خریدی اور اڑھائی سو ادا کئے۔ ایک رئیس نے بیس ہزار قرض لیا اور وہ دس برس میں پچھتر ہزار ہوگیا۔

جدید قوانین قرضہ | ۱۹۳۰ء میں ایکٹ انضباط حسابات نافذ ہوا جس کی رو سے ساہوکار کو اپنے

حسابات ایک خاص طریق پر رکھنے پڑتے ہیں اور مقروض کو ہر چھ ماہ بعد اس کے حساب کی ایک تفصیل اور کیفیت بھیجنی پڑتی ہے۔ اس ایکٹ سے بظاہر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اور جب تک ساہوکاروں اور کاشتکاروں کی دماغی حالتوں اور عادات میں موجودہ تفاوت قائم ہے اس کا تدارک مشکل ہے۔
۱۹۳۴ء میں ایکٹ تخفیف قرضہ پاس ہوا جس کے ماتحت مصالحتی بورڈ ہائے قرضہ قائم ہوئے جو بلاشبہ ساہوکار اور زمیندار کے فائدہ کا بہت سا کام انجام دے رہے ہیں۔ ساہوکاروں پر پابندیاں عاید کرنے اور ان کو وصولی قرضہ میں بعض سہولتیں مہیا کرنے کے مسئلہ پر ملک میں کم و بیش دس سال سے تجویزیں ہو رہی ہیں لیکن تمام کوششیں کوئی معقول صورت حالات پیدا نہیں کر سکیں۔

مزید توجہ کی ضرورت | موجودہ طویل اور شدید کساد بازاری نے کاشتکار کا کام تمام کر دیا ہے۔ وہ اپنے پیشے کو چھوڑ رہا ہے۔ زمین کوڑیوں کے بھاؤ فروخت ہو رہی ہے۔ اس کے مویشی فروخت اور اس کا گھر نیلام ہو رہا ہے۔ اس کا قرضہ باوجود پشتہا پشت کی محنت و مشقت کے ادا نہیں ہو سکتا۔ وہ قرض لئے ہوئے اصل سے کئی گنا زیادہ ادا کر چکا ہے جو کچھ باقی ہے وہ ادا کرنے کے ناقابل ہے جو زمین و آسمان اس کے دشمن ہو چکے ہیں۔ وہ خود اپنی زندگی سے بیزار ہے۔ ساہوکار کی چیرہ دستیاں ناقابل برداشت ہو چکی ہیں۔ سال بھر میں پنجاب میں اکتیس ساہوکار قتل ہو جاتے ہیں اور اس کو بڑے خطرہ کا مقام سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جو شخص پشتہا پشت تک اپنی خاندانی محنت سے ساہوکار کا گھر بھرتے رہنے کے باوجود بھی قرض میں ڈوبا ہوا ہو اور جسے مخلصی کی کوئی صورت نظر نہ آتی ہو اگر وہ اپنی جان دے کر دوسرے کی جان لے لے تو اس ظالم دنیا کو کیوں تعجب ہوتا ہے۔ پنجاب کا کاشتکار ہندوستان کے لئے وجہ افتخار ہے۔ وہ زراعت کی زینت۔ شرافت کا مجسمہ۔ خزانہ کی دولت اور سلطنت کا محافظ ہے۔ اگر اس کی بے بسی اور بیکسی پر توجہ نہ کی گئی تو اس کی کثیر جماعت یا تو بدحال غلام ہو کر رہ جائے گی یا پھر باغیوں اور ڈاکوؤں کا ایسا گروہ ہو جائے گی جو امن کے لئے ایک خطرہ اور ترقی کے لئے ایک روک ہوگی۔ کوئی ہے جو وقت کی اس دردناک صدا کو سنے اور انصاف اور شفقت کا ہاتھ اس کی طرف بڑھائے۔ ان کی بہتری کی تدابیر کا مفصل تذکرہ میں کسی دوسری قسم کی صحبت کیلئے

اظہار کرتا ہوں اس وقت صرف اس قدر کہوں گا کہ ایک دن کی تاخیر کے بغیر ہر ضلع میں مصالحتی بورڈ ہائے قرضہ قائم کر دینے چاہئیں تاکہ معاملہ کو سمجھنے اور سلجھانے کے لئے جن امور کی ضرورت ہے وہ تو فراہم ہوں۔

انجمن ہائے امداد باہمی کی ترقی نہایت کم رفتار ہے۔ ایسا انتظام ہونا چاہیئے کہ پندرہ برس کے اندر اندر ہر گاؤں میں ایک انجمن قرضہ قائم ہو جائے اور حقیقی اور مفید طاقت بن جائے دوسری اقسام امداد باہمی کو بھی ترقی دینا چاہیئے۔ اور جب تک دیہات کے بسنے والے تعلیم کے عام اور عمدہ ہونیکی بدولت اپنے مفادات کو سمجھنے اور انکی حفاظت کرنیکی قابلیت پیدا نہیں کر لیتے حکومت کا فرض ہے کہ انھیں صنعتوں کی ابتدائی حالت کی طرح اپنی پناہ میں رکھے۔
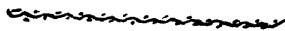
دعوتِ عیدِ الضحیٰ

(جناب مولوی محمد ابوالحسن صاحب صدیقی بصیر ایم، اے نواده بدایوں)

آج لائی ہے صبا پیغام ایام بہار — نغمہ زن ہیں بلبلیں، پھولوں پہ آیا ہے نکھار

گوشہ گوشہ ہے چمن کا گل بداماں آجکل — چپہ چپہ پر زمیں کے آج چھائی ہے بہار

دامن گل پر ہے دھوکا ساغرِ گلرنگ کا — سبزۂ نورستہ پر ہے سبز مخمل کا سنگھار

ہے نمو کا آج وہ عالم کہ جسکے فیض سے — ذرّہ ذرّہ ریگِ صحرا کا بنا ہے مرغزار

ہیں جو گلہائے نگاریں بازوئے طاؤس پر — کیا عجب ہے جو مہک اٹھیں بہ فیضان بہار

کیا عجب ہے قوت نشو و نما کا ہو عمل — اور بنیں گل پنجۂ مرغ چمن پر ہیں جو خار

باغِ عالم، رشکِ صد جنت الفردوس ہے — سبزہ و گل میں چھپے بیٹھے ہیں دشت و کوہسار

عالم ایجاد کی اللہ رے! بزم آرائیاں — قدسیانِ عالمِ بالا ہیں دل میں شرمسار

ہے خوشی میں عید کی ترتیب بزم دوستاں — منعقد ہے دعوتِ عید الضحیٰ کیا شاندار

جشن نوروزی بھی گویا جسکے آگے گرد ہے — زیب و زینت پر ہے جسکی تزہت روئے بہار

ہے دلِ مسلم پہ طاری وجد کی سی کیفیت — ہے فراموش اس گھڑی سب گردشِ لیل و نہار

ہاں! منالے عید لیکن کچھ حقیقت کو بھی دیکھ — کر ذرا دل میں بھی غور اے مسلم آشفتہ کار

عید کیا ہے؟ اک مسرت ہے ادائے فرض کی — ہوگیا یعنی سُبک، تھا قلب مسلم پر جو بار

جب ادائے فرض سے تو اپنے قاصر رہگیا — پھر تجھے ہے کیا مسرت؟ کس لئے یہ افتخار؟

جشن جمشیدی منانے کا تجھے پھر حق ہے کیا؟ — جب سے ہے میدانِ وغا سے دل ترا کوسوں فرار

کس قدر قربانیاں کیں تو نے؟ اُنکو پیش کر! — کیا ہے وہ ایثار تیرا جس پہ ہے یہ افتخار

ہاں! دکھا کچھ تو زمانے کو کہ تو نے کیا کیا؟ — کس طرح پوری ہوئی رسمِ خلیل کردگار؟

بیخبر! اک بے زباں کی جان لینا سہل ہے — لیکن اپنے دل پہ لے کچھ چوٹ گر ہے مرد کار!

ہے ضرورت قوم کو بھی کچھ ترے ایثار کی — ہے تقاضا ملتِ بیضا کا "ہو اب ہوشیار"

اے فدائے ملک و ملت! امتحاں کا وقت ہے — آزمائش ہے کہ دیکھیں! کون ہے بروئے کار؟

کچھ نمونے ہم بھی دیکھیں اس ترے ایثار کے — دیکھیں مسلم کا دل ہے کس طرح دیں پر نثار؟

اپنے فرزندوں کی جانبازی کی حسرت دل میں ہے — مادرِ گیتی ہے کھولے چشمِ یاس و انتظار

اقتضائے وقت ہے ہستی کو اپنی کر فنا — ہے زمانے کو تری قربانیوں کا انتظار!

سینچ اپنے خونِ دل سے کشت زار قوم کو — کچھ نہ ہونا چاہیئے پروائے جاں بھی زینہار!

سرفروشی جو کہ شیوہ تھا ترے اسلاف کا — ہے ضرورت بے پس و پیش اُسکو کر تو اختیار

دوش کے آئینے میں بھی دیکھ لے تصویرِ حال — دیکھ! پہلے تجھ سے کیا کیا کر گئے مردانِ کار

عید آئی ہے ہمیں بیشک رُلانے کے لئے
قصۂ ماضی سے دِل کو گُدگُدانے کے لئے

چین کے جاپان پر احسانات

ٹاؤ ازم کے بانی کی تصنیف کے شرح نویس چوانگ۔تسی نے ایک دلچسپ کہانی لکھی ہے
"جنوبی سمندر کا بادشاہ شو تھا اور شمالی کا ہو تھا۔ وسطی سمندر کے اوس (chaos) کے قبضے میں تھا۔ شو اور ہو اکثر کے اوس کی مملکت میں آیا جایا کرتے تھے اور ان کا میزبان ہمیشہ بڑی خاطر مدارات سے پیش آتا تھا۔ ایک دن دونوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ کسی طریق سے وہ اسکی عنایات کا بدلہ اتارنے کی کوشش کریں۔ بہت سوچ کر انھوں نے ایک تجویز نکالی کہ ہر انسان کے جسم میں کھانے۔ سننے۔ دیکھنے کے لئے سات سوراخ ہوتے ہیں اور اس غریب کے ایک بھی نہیں، ہم کیوں نہ یہ کمی پورا کردیں۔ پس انھوں نے ہر روز ایک سوراخ بنانا شروع کیا اور سات دن کے بعد بے چارہ کے اوس مرگیا۔"

اس کہانی کے چینی مصنف کو یہ پتہ نہ تھا کہ ایک دن اس کا وطن عزیز شاہ کے اوس کی طرح اندرونی اختلافات اور خانہ جنگیوں سے اس قدر کمزور ہو جائے گا کہ دوسرے 'ہمدرد' ہمسایے محبت اور جاں سوزی کے پردے میں اس کو ختم ہی کر دینے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ آج اگر ایک جانب سے مغربی 'شو' ہیں جو ہانگ کانگ۔ شنگھائی۔ کانٹن وغیرہ تجارتی اور سیاسی مرکزوں سے چین کے جسم میں وہ سُرنگیں کھود رہے ہیں جو ایک دن اس کی اقتصادی اور سیاسی جڑوں کو کھوکھلا کردینگی تو دوسری طرف جاپان کا 'ہو' ہے جس کی جوع البقر وہ دوزخ ہے جسے مانچو کو اور اندرونی منگولیا کے ترلقمے بھی ٹھنڈا نہ کرسکے اور وہ شمالی چین میں جاپانی وزارت خارجہ کے زیر اثر ایک نئی حکومت قائم کرنے کے منصوبے سوچ رہا ہے۔ لطف یہ ہے کہ چینی قصے کے شاہ کے اوس کی طرح اہل چین کے یورپ اور جاپان پر جو احسانات ہیں وہ کچھ ایسے نہیں کہ آسانی سے نظر انداز کئے جاسکیں۔ یورپ اور جاپان کا ہی کیا ذکر ساری دنیا کے ادب۔ آرٹ۔ علوم وفنون۔ تمدنی و معاشی ترقی میں اہل چین کا بڑا

حصہ ہے۔ اس کا حلقہ اثر مشرق اور مغرب دونوں پر یکساں طریق سے محیط ہے۔ اور کوئی متمدن قوم آج اس سے انکار نہیں کر سکتی کہ اس کا تمدن کسی نہ کسی پہلو سے چینی تمدن کا خوشہ چیں ہے۔ مسلمانوں کو ہی لیجئے۔ دوسری صدی ہجری کے وسط تک تفسیر۔ حدیث۔ علم الرجال تراجم وغیرہ سب روایتاً محفوظ تھے۔ اگرچہ اہل عرب حیرت انگیز قوت حافظہ رکھتے تھے تاہم یہ ناممکن تھا کہ وہ اسلامی علوم و فنون کے بڑھتے ہوئے سمندر کو آسانی سے دماغی کوزے میں زیادہ مدت تک بند کر سکیں۔ اس ضرورت کے شدید احساس کی وجہ سے بغداد میں کاغذ کے چند کارخانے کھولے گئے اور موجودہ کاغذ دنیا کے لئے چینی تمدن کا ہی عطیہ ہے۔ جنھوں نے ہندوستان کی بھوج پتر یا مصری کے پیپرس (Papyrus) کو دیکھا ہے، وہی اس ایجاد کی اہمیت کا کچھ صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کیا کوئی مغربی عالم وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ یورپ میں وٹن برگ کا سب سے پہلا چھاپہ خانہ چینی اثر کا مرہون منت نہ تھا۔ ابھی حال میں سرائے باغچہ (ترکی) میں منعقدہ علم التاریخ کی کانفرنس میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ ترکوں نے وٹن برگ کے مطبع سے پہلے چھپائی کا کام شروع کر دیا تھا۔ طباعت کا فن یورپ میں چین سے ترکوں یا صلیبی مجاہدوں کے ذریعہ سے پہنچا ہوگا۔ یورپ کا چینی تمدن سے تعلق مارکو پولو مشہور سیاح کے ذریعہ ہوا جس نے پہلے پہل اہل مغرب کو اس عظیم الشان تمدن کے سماجی۔ کلچرل اور فنی سرمایے سے ایک حد تک روشناس کرایا۔

چینی تمدن آسمان سے باتیں کرنے والے اس پیپل کی طرح ہے جس کا بیج دنیا کے بچپن کے زمانے میں قدرت کی گود میں جا گرا۔ چینی دریاؤں نے اس کی آب یاری کی۔ چینی ہواؤں نے جھولے میں جھلایا اور چینی فضا میں زندگی کے بیدار کرنے والے آفتاب نے اس کو چمکایا۔ اگر اس کی جڑیں تمدن انسانی کے آغاز کی خبر دیتی ہیں تو اس کے پھول اور شگوفے انیسویں صدی تک کیا بلکہ آج بھی روح و قلب کے لئے علم اور فن کا روحانی پیغام دے رہے ہیں۔ ایک امریکی نے ایک چینی سے وہاں کی معاشی اور سیاسی کمزوریوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ان تنگ و تاریک گلیوں اور گنجان شہروں کا ذکر کیا جن میں انسانی زندگی کا قیام اور دوام حفظان صحت کے ماہرین کے لئے اک معمّا ہو کے رہ گیا ہے۔ امریکی نے تعجب سے پوچھا " حیرانی ہے کہ

آپ لوگ ایسی فضا میں اب تک زندہ کیسے ہیں؟" چینی ایک پرمعنی انداز میں مسکرایا اور بولا" جب آپ نہیں تھے ہم تھے، اور جب آپ نہ ہوں گے تب بھی ہم ہوں گے" چینی تمدن کا خمیر چین کی مٹی ہے۔ اس میں دوسرے تمدنوں کا اثر ماسوا ہندوستان کے بہت کم ہے۔ دنیا کا کوئی بھی ملک اس وثوق سے اپنے تمدن کو قومی یا ملکی نہیں کہہ سکتا جتنا چین۔ اور چین نے دنیا کو کیا کچھ نہیں دیا۔ چینی کے برتنوں کی صنعت دنیا کے لئے اس کا سب سے لطیف اور رنگین تحفہ ہے۔ اور چینی نقاشی تو ایشیائی ادب میں ضرب المثل ہی ہو گئی ہے۔ بتِ چین، نقشِ چین وغیرہ ترکیبیں اس گہرے اثر کا پتہ بتاتی ہیں جو چینی نقاشی۔ رنگوں کی آمیزش۔ پس منظر کے اصولوں کا ایرانی مصوری پر ہوا۔ قطب نما کی ایجاد سے چین نے دنیا کی منچلی قوموں پر سمندر کی طوفانی زندگی کا ایک نیا باب کھول دیا۔ ریشم کی ایجاد کا سہرا بھی چینیوں کے سر ہے۔ ابن بطوطہ سفر چین کے بیان میں لکھتا ہے کہ" ریشم یہاں اس کثرت سے پایا جاتا ہے کہ غریب سے غریب بھی ریشم ہی پہنتا ہے۔ اور روئی کے کپڑے کے ایک تھان کے عوض کئی ایک ریشم کے تھان مل سکتے ہیں۔" ابن بطوطہ ایک جگہ حیرت سے لکھتا ہے کہ" یہ لوگ سیاہ مٹی کے ڈھیلے جلاتے ہیں جن سے آگ خوب تیزی سے بھڑکتی ہے" سیاح کی مراد پتھر کے کوئلے سے ہے جس کا استعمال چین میں سب سے پہلے شروع ہوا۔

ہمارا مقصد یہاں ان فنی احسانات کا تذکرہ نہیں جن سے عام انسانی تمدن کے لئے سامان رنگ و بو میسر ہوا۔ دیکھنا یہ ہے کہ خاص جاپان پر چین کے کیا احسانات ہیں۔ جاپان نے جب اس نے پرانے قبائلی نظام سے آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو چینی تمدن کی آغوش میں پایا۔ چین نے جاپان کو ادب، آرٹ سماجی نظام۔ نظم و نسق۔ مذہب۔ اخلاق فلسفہ کیا کچھ نہ دیا۔ اس کے فنی تخیل اور اصول پچھلی صدی تک جاپانی مصوری، اور صنعت میں زندگی کی نئی رَو دوڑاتے رہے۔ موجودہ جاپانی تمدن کی وہ تمام چیزیں جو انسانی مسرت، اخلاق، بلند تخیل، تمدنی اور سماجی آسائش کے لئے ضروری ہیں۔ چینی عطیے ہیں اور اس کے برعکس اس کے تمدن کا میکانکی پہلو۔ استبدادیت۔ عسکریت اور استعماریت مغربی تمدن کے نتائج ہیں۔ اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو موجودہ جاپان بھی بنیادی چیزوں میں چینی مدنیت کا ایک جزو ہے بلعینہٖ

جیسے کوئی ہندوستانی لنکا میں جا کے بیگانگی محسوس نہیں کرتا اس طرح جاپان بھی ان جزیروں کی طرح معلوم ہوتا ہے جو کسی بڑے زلزلے کی وجہ سے براعظم سے علیحدہ ہو گئے، لیکن ان میں اصلی تمدن اور سماجی نظام کی سوتیں جاری رہیں۔ آج جاپان کے اونچے خاندانوں کے افراد کی رگوں میں چینی آباؤ اجداد کا خون دوڑ رہا ہے۔ ان کا نظام خانہ داری اور علم اخلاق کنفوشس اور تاؤ و مشہور چینی مفکرین کی تعلیم پر مبنی ہے اور جاپان کی اکثریت کا مذہب شنٹو ازم' ان دونوں مذاہب کے ملنے ہی سے پیدا ہوا ہے جسے جاپانی قومیت کے بے پناہ جذبے نے اور جلا دے دی موجودہ جنگ میں جاپان اپنے تمدنی اور سماجی پیشرو پر ہی تلوار نہیں چلا رہے ہیں بلکہ وہ اس ادبی اور فنی تخیل اور تخلیق حسن کی تخریب کا سامان کر رہے ہیں جس نے دنیا میں بالعموم اور جاپان میں بالخصوص انسانی زندگی کو زیادہ خوشگوار اور دلچسپ بنا دیا۔ چین بڑا سخت جان ہے۔ وہ منگولوں کے حملوں۔ خونخوار تاتاریوں یا مانچوؤں کے باوجود برقرار رہا۔ چالیس صدیوں سے بلکہ اس سے بھی پہلے سے زندگی کے طوفان اس دیودار کی شاخوں اور کونپلوں میں الجھ رہے ہیں۔ جو روایتی ایشیا کی طرح ایک دم کے لئے ان جھکڑوں کے سامنے خم ہوا اور جب طوفان خیز ہوائیں ٹھنڈی پڑ گئیں تو پھر فضائے بسیط کو اپنی خوشبو سے مہکانے لگا، جاپانی حملہ بھی اس بحر ذخار کے لئے اک موج کی مانند ہے جو آخر لب ساحل کو چوم کر اور اس سے کچھ سرگوشیاں کرنے کے بعد خاموش ہو جاتے گی۔

برٹرنڈ رسل دنیائے جدید کے مشہور مفکر نے اپنی دلچسپ کتاب میں جو اس نے چین پر لکھی ہے ان احسانات کو گنایا ہے جو چین نے جاپان پر کئے ہیں۔ اس کے لحاظ سے اس عظمت کا احساس ظاہر ہوتا ہے جو دنیا کے سب سے پرانے زندہ تمدن کو دیکھ کر اک مغربی کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ رسل کی رائے اس لحاظ سے اور بھی وقیع ہو جاتی ہے کہ اس نے چین میں کچھ عرصہ رہ کر ایک مفکر کی نگاہ سے چین کے تعلیمی سیاسی اور سماجی مسائل کا مطالعہ کیا۔ وہ لکھتا ہے "ان سب چیزوں میں جو انسانی مسرت میں اضافہ کرنے والی ہیں چینی تمدن ہمارے تمدن سے بڑھ کر ہے۔ میں چین میں تعلیم دینے کی غرض سے گیا تھا۔ (رسل پیکن یونیورسٹی میں معلم فلسفہ تھا) مگر میرے دوران قیام میں ہر روز مجھے اس امر کا احساس زیادہ شدت سے ہوتا گیا کہ میں یہاں سکھانے کے لئے نہیں بلکہ کچھ سیکھنے کے لئے آیا ہوں" جاپانی تاریخ پہ

تبصرہ کرتا ہوا کہتا ہے " جاپانی قوم کی تاریخ میں ہم دو متضاد قوتوں کو برسرکار دیکھتے ہیں جو عوام کے قلوب پر فتح پانے کی کوشش کرتی رہی ہیں۔ ایک تو منظم حکومت۔ ترقی پذیر تمدن اور آرٹ کا تخیل جو چین سے لیا گیا دوسرے فیوڈل ازم (جاگیرداری) ۔ قبائلی حکومت اور خانہ جنگی کا رجحان جو جاپان کے اصلی تمدن اور قومی خمیر سے پیدا ہوا "۔

چینی زبان اور ادب جاپان میں سب سے پہلے ۲۸۴ء میں لائے گئے اس سال کوریا کے حکمراں نے جو جاپانی بادشاہ کا باج گزار تھا دانی نامی ایک مشہور عالم کو شاہزادے کی تعلیم و تربیت کے لئے بھیجا جس نے اسے چینی زبان اور کنفوشس کا فلسفۂ اخلاق سکھایا۔ اس سے پہلے جاپانی لکھنے کے فن سے محض عاری تھے۔ انکی تاریخ روایتی اور سینہ بہ سینہ چلی آتی تھی جس میں بے سر و پا حکایتیں شامل ہو گئی تھیں۔ لارڈ میکالے کا ہندو تاریخ پر طنز کہ اس میں تیس تیس گز اونچے راجہ ہزاروں سال حکومت کرتے تھے۔ جاپانی تاریخ پر بھی صادق آتی تھی، طرز تحریر میں اہل جاپان نے چینی رسم الخط جوں کا توں لے لیا۔ اس طریق میں ہر حرف کسی خاص آواز کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ اک مرئی تخیل کو ظاہر کرتا ہے۔ طرز تحریر کی ترقی کا یہ ابتدائی درجہ مختلف پرانے تمدنوں میں تھوڑی بہت تبدیلی کیساتھ موجود ہے۔

چھٹی صدی عیسوی میں بدھ مت بھی کوریا سے جاپان میں داخل ہوا۔ پہلے پہل تو اسی تجربتہً لیا گیا مگر جلد ہی اس نے لوگوں کے دلوں میں اپنا گھر کر لیا۔ بدھ مت نے نہ صرف ملک کی روحانی اور اخلاقی زندگی میں ہی اک انقلاب عظیم پیدا کر دیا بلکہ مذہب ان کی تمدنی سماجی زندگی کا جزو لاینفک بن گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ چینی تمدن کا خوشگوار اثر جاپانی زندگی کے ہر پہلو میں سرایت کرنے لگا۔ پرجوش اور مخلص چینی پرچارکوں نے نہ صرف لوگوں کے سامنے اخلاق کا بلند تخیل پیش کیا بلکہ انھوں نے عوام میں حُسن اور توازن کا وہ شدید احساس پیدا کیا جو ہوری یوجی کے مندر کے دیواروں کے نقوش میں بہترین صورت میں جلوہ گر ہوا۔ ان تصویروں میں ہر اک بجائے خود ایک کارنامہ ہے جس کے خطوط۔ امتزاج رنگ اور تخیل میں اُن اثرات کا پتہ چلتا ہے جنھوں نے اک زمانے میں اجنٹا کے تاریک غاروں کی فضا کو رنگین بنا دیا تھا۔ مشہور ماہر نقاشی ڈاکٹر کزن نے اپنی دلچسپ کتاب " جاپان "

میں ہوری یوجی مندر کو جاپان کا ایجنٹا لکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جاپانی قوم کے فنی احساس کو ان کوریا کے مصورین نے بیدار کیا جنھوں نے ایجنٹا کے چٹانی مندروں کے بھکشو نقاشوں سے چونے اور پتھر میں رنگین زندگی کی رو دوڑانے کا فن سیکھا اور جاپانی آرٹ میں حیاتِ ابدی کی روح پھونک گئے جو نسلِ انسانی کے لئے اک مستقل سرمایۂ مسرت اور لطف اندوزی ثابت ہوگا۔

بدھ مت کی آمد سے جاپان میں چینی تمدن کے بے پناہ سیلاب کے بند کھل گئے۔ اور جاپانی سماجی اور سیاسی زندگی جو اپنے آپ میں گھٹ کر اس کھاری جھیل کی مانند رہ گئی تھی جس کی نہ تہ میں شیریں چشمے پھوٹتے ہوں اور نہ ہی کوہسار سے مچلنے والی آبشاریں حیاتِ نو کا پیام لاتی ہوں۔ یہ چینی اثر ہم زندگی کے ہر شعبے میں جاری و ساری پاتے ہیں۔ پروفیسر جان ڈیوی نے ان الفاظ میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے کچھ ایسا مبالغے سے کام نہیں لیا ہے "ایک ہزار سال پہلے چین نے اپنے اس ہمسایہ ملک کو جو آج دنیا کی اول پانچ طاقتوں میں شمار ہوتا ہے۔ اخلاق، ادب، آرٹ اور تمدن کی بنیادی چیزیں عطا کی تھیں"۔

بدھ مت کے ہمہ گیر اثر کی بدولت سماجی طبقوں کے نظام۔ سیاسی اداروں۔ فن سنگتراشی تعمیر۔ نقاشی میں کیا کچھ تبدیلیاں نہ ہوئیں۔ معاشی اور سماجی زندگی میں کھانے پینے پوشاک اور طریق نشست و برخاست سب ہی اک متمدن اور ترقی پذیر بلندی پر اٹھ آئے۔ خاندان اور کنبے کی تشکیل نئے سرے سے کنفوشس کے ان پانچ اصولوں کے ماتحت کی گئی۔ وفاداری۔ اولاد کی اطاعت۔ امور خانگی میں عزتِ نفس۔ برادرانہ محبت اور دوستانہ یکجہتی۔ آج بھی کنفوشس کی تعلیم جاپان میں اس قدر عام ہے اور جاپان کی معاشری زندگی میں ایسا گھر کر گئی ہے کہ وہ ان کے تمدن اور تہذیب کا اک ضروری جزو بن گئی ہے اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو شاید کنفوشس کے اصول اور تعلیم جاپان کی گھریلو زندگی اور آدابِ معاشرت میں چین کی نسبت زیادہ نمایاں اور محفوظ نظر آتے ہیں۔ اگر جاپان صنعتی اور تجارتی حلقۂ عمل میں انتہائی جدت پسند واقع ہوا ہے تو وہ مذہبی اور بہت حد تک سیاسی رنگ میں چین سے زیادہ قدامت پسند ہے اور پرانے فرسودہ طریق حکومت۔ اور عقیدوں میں عجیب غلامانہ ذہنیت رکھنے والا ثابت ہوا ہے۔ جس قسم کی مذہبی شہنشاہیت وہاں برسر کار ہے وہ اس جمہوریت اور اشتراکیت کے

زمانے میں کسی دوسرے ملک میں صرف عجائب خانے کے شیشوں میں ہی محفوظ رکھی جاسکتی ہے۔ اور جب کوئی غیر ملکی بادشاہ کے جلوس کو اوپر کی منزل سے ایک کھڑکی کھول کر دیکھنے کے لئے سر نکالتا ہے اور دفعتاً اک جاپانی کانسٹیبل اپنے سخت ہاتھ سے اس کی گردن ناپتا ہے کہ تم نے بادشاہ کی بے حرمتی کیوں کی تو وہ سوچتا ہے کہ کہیں وہ قبلائی خان یا اس کے خونخوار جانشینوں کے زمانے میں تو موجود نہیں جس آسانی سے اہل چین نے مانچو خاندان کے پچھلے بادشاہ کو تخت سے اتار کر جمہوریۂ چین کی بنیاد رکھدی جاپانی قدامت پسند کے خواب میں بھی نہیں آسکتی۔

بہر حال اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جاپان کے سیاسی یا سماجی نظام میں جب بھی کوئی اہم اور بنیادی تغیرات ہوئے وہ کسی نہ کسی خارجی حکومت یا تمدن کے اثر سے تھے۔ ۱۸۶۷ء میں جب جاپانی شہنشاہ کو شوگن کے پنجۂ استبداد سے نجات ملی تو یہ ان جنگی جہازوں کا اثر تھا جنھوں نے کمانڈر پیری کی سرکردگی میں اہل مغرب کی عسکریت۔ فوجی طاقت اور میکانکی تمدن کا مظاہرہ اہل جاپان کے سامنے کیا تھا۔ اسی طرح چین کے اثرات نے سیاسی لحاظ سے قوت اور حکومت کو جو مختلف قبائل اور سرداروں میں منتشر تھی اک مرکزی نظام میں منسلک کردیا۔ اہل جاپان نے چینیوں سے سماجی طبقوں کی چار حصوں میں تقسیم جوں کی توں لے لی۔ دربار میں مختلف گروہوں کی جگہ کی تخصیص۔ آداب مجلسی۔ کورنش وغیرہ بھی حکمران چین کے دربار سے لئے گئے۔ یہاں تک کہ چھوٹی چھوٹی جزئیات مثلاً دائیں اور بائیں نشستوں کی تقسیم۔ درباری پوشاک راست اور چپ کے درباریوں کی تلواروں کے امتیازی نشانات میں بھی چینیوں کی نقل کی گئی۔ مختلف ملازمتوں اور عہدوں وغیرہ کے نام اور ان کی تنظیم بھی وہی رکھی گئی جو چین میں رائج تھی اور شاہی قربانیاں تو ابتک بھی چینی رسومات کی یاد دلاتی ہیں۔ اس سلسلے میں یہ امر قابل توجہ ہے کہ شہنشاہ اور اس کا دربار جاپان کی سیاسی اور سماجی بلکہ مذہبی زندگی کا سب سے ضروری جزو ہے اور جب یہ چینی "کفر" خود جاپانی کعبہ سے ہی پیدا ہوا تو عوام کی طرز معاشرت۔ اخلاق۔ مذہب پر تو اس نے کیا کچھ اثر نہ ڈالا ہوگا ان احسانات اور زندگی بخش اثرات کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ چین کی جاپان پر وہی مہربانیاں اور احسان ہیں جو یونانی اور رومن تہذیب کے انگلستان پر۔

شعر وادب اور نظام تعلیم میں یہ اثر اور بھی نمایاں ہے۔ جاپان کے قدیم شعرا مورخین اور انشا پردازوں نے اپنے خیالات کو چینی تخیل اور اصولوں کی روشنی میں سلجھایا اور اس آئینہ میں اپنے ذاتی جوہروں کو سب سے پہلے محسوس کیا۔ اور چینی علما کی شاگردی میں اس طرز تحریر کو سیکھا جو آج ان کی ذہنی اور نفسیاتی زندگی کا ذریعۂ اظہار رہے۔

نقاشی میں تو چین کل دنیا کا استاد مانا گیا ہے۔ فارسی۔ ترکی اور اردو ادب میں لعبت چین یا نقش چین ضرب الامثال ہو کے رہ گئے۔ بہترین ایرانی بلکہ کبھی کبھی مغل آرٹ کے نمونوں میں بھی چینی اثر نمایاں ہوتا ہے۔ انتہائے کمال یہ ہے کہ انسان قدرت کی طرح کوڑا کرکٹ سے رنگینئ بہار کا سامان پیدا کردے۔ اور نقاش کریہہ اور گھناؤنی چیز کے نقش میں بھی حسن اور توازن کا احساس پیدا کردے۔ اہل چین نے اژدھے کے تخیلی نقش کو کھینچ کر فن تخلیق کا عجیب شاہکار پیش کردیا۔ یہ شاہکار کہیں کہیں مغل آرٹ کے نقوش میں حاشیہ کی زینت ہوتا ہے۔

اہل چین اس فن میں ہمیشہ سے مشہور و معروف رہے ہیں۔ جس حیرت سے ابن بطوطہ جہاں گرد سیاحوں کے پیر و مرشد نے ان کی صنعت کا تذکرہ کیا ہے دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ جب ابن بطوطہ اور اس کے ہمراہی بادشاہ کے دربار میں حاضری کے بعد رخصت ہوئے تو بازار میں ان کو کچھ تصویریں نظر آئیں جب غور سے دیکھا تو اپنے ہی خد و خال نظر آئے اب ہر ایک دوسرے کے چہرے کی طرف نظر کرتا ہے تو بال برابر بھی فرق نہیں۔ اس صنعت کاری پہ حیران ہو گئے تحقیق کی تو پتہ چلا کہ بادشاہ نے پہلے سے انتظام کیا تھا کہ جب یہ لوگ دربار میں حاضر ہوں تو خفیہ طور پر ان کی تصویریں اس عرصے میں تیار کردی جائیں۔ ابن بطوطہ انکی اس محیر العقول صنعت اور چابک دستی پر لکھتا ہے" اہل چین آرٹ اور صنعت گری میں سب قوموں سے بڑھ گئے ہیں۔ جیسی کاریگری اور صفائی وہ اپنے کام میں دکھاتے ہیں دنیا کی اور کوئی قوم اس کی نظیر پیش نہیں کرسکتی۔ جزئیات کے پورا اتارنے میں تو نہ یونانی ان سے لگا کھا سکتے ہیں اور نہ کوئی اور قوم "

برٹرنڈ رسل کے خیال میں چینی آرٹ کا پایہ یورپ کے احیار علوم کے زمانے کے فن سے کسی

صورت میں کم نہیں۔ آج پیکن کے عجائب خانے میں چینی فن کے نادر نمونوں کے ساتھ ساتھ لوئی چہاردہم شاہ فرانس کے وہ بیش بہا تحفے بھی رکھے ہوئے ہیں جو اس نے اپنا جلال اور شان و شوکت کو دکھانے کے لئے شاہ چین کو بھیجے تھے دونوں کے مقابلہ سے ایک عامی بھی فیصلہ کر سکتا ہے کہ فرانسیسی شاہکار جو ایک بادشاہ کی خدمت میں پیش کئے جانے کے لحاظ سے اور لوئی چہارم کے فرانسیسی تمدن کو پیش نظر رکھتے ہوئے بہترین ہوں گے مگر چینی نمونوں کے سامنے حقیر اور بے مایہ نظر آتے ہیں۔

لیکن ہمارا موضوع بحث یہاں وہ اثر ہے جو چینی فن کا جاپانی مصوری پر ہوا۔ بقول برنکلے "جاپانی مصوری چینی روایات کی روح سے مملو ہے۔ بلکہ یہ کہنا کچھ بے جا نہ ہوگا کہ جاپانی فن مصوری چینی صنعت کا پروردہ ہے۔ اس گہرے تعلق کے اثرات کم و بیش درجے میں جاپانی مصوری کی تاریخ کے ہر دور میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں" اگرچہ جاپانی فن کے نادر نمونے اس امتزاج اور اختلاط کا نتیجہ ہیں جو چینی اصولوں اور جاپانی جدت اور ندرت سے پیدا ہوا۔ تاہم اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جاپان کا پہلا سب سے بڑا نقاش کوسے نوکا نوایکا خالص چینی روایات اور اثر کا حامل تھا۔

فن ظروف سازی پر تو چینی اثر اور بھی نمایاں اور دیرپا معلوم ہوتا ہے۔ آج تو جاپان نے دنیا کی منڈیوں کو سستے چینی ظروف سے بھر دیا۔ اس کے لئے بھی چینی صنعت اس کے اصولوں۔ طریق رنگ سازی اور نمونوں سے پورا پورا استفادہ کیا گیا ہے جاپان میں اس فن کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ چینی اثرات جاپانی تمدن کو پیدا ہی نہیں بلکہ زندہ رکھنے کے لئے بھی کس قدر ضروری ہیں۔ اس فن کو چین سے پہلے پہل شیراز و من لایا جس نے چھ سال چین میں رہ کر وہاں کے صناعین سے اس فن کو سیکھا۔ جاپان میں ظروف سازی کے لئے پہلی بھٹی اسی نے قائم کی اور رنگوں کی آمیزش اور ڈیزائن میں وہ جدت طرازیاں دکھائیں کہ اس کے نفیس رنگین گلدان آج بھی اس فن کے قدردانوں کی نظر میں جاپانی صنعت کے بہترین نمونے شمار کئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد مرور وقت سے اس فن کی چینی روایات بھولتی گئیں اور انیسویں صدی کے آغاز میں تو جاپانی صنعت کی یہ حالت ہو گئی کہ جاپانی تاجر تازہ بنی ہوئی چیزوں پر دھبے وغیرہ ڈال کر کوشش کرتا تھا کہ وہ قدیم زمانے کے فن کے نادر نمونے معلوم ہونے لگیں

اور اس طرح مغربی شوقینوں کی جیب سے ان "چینی شاہکاروں" کی گرانقدر قیمتیں نکلوالیتا۔ انیسویں صدی کے آغاز اور وسط میں تو یہ خاصی تجارت بن چلی تھی۔ پھر بھی تابکے

پھر ایک مرتبہ اہل جاپان نے اسی سرچشمہ حیات کی طرف اُمید افزا نگاہیں دوڑائیں جس سے پہلے بھی زندگی بخش سوتیں بہ کر جاپان کو رنگینئ بہار کا پیام سُنا چکی تھیں۔ اس مرتبہ اپنے مشہور پیشرو کی طرح میاگاوا نے جاپان کی انحطاط پذیر صنعت کے خلاف احتجاج کیا اور دوبارہ چینی روایات۔ چینی رنگ آمیزی اور نمونوں کو زندہ کر دیا۔ اس اقدام سے نہ صرف جاپان نے صنعت ظروف سازی میں چین کی استادی کا دوبارہ اعتراف کیا بلکہ انھوں نے اس جاذبی اور اکتسابی اصول کا مظاہرہ کیا جو جاپانی تمدن کا سب سے درخوش کن پہلو ہے۔

چین نے جاپان کو ادب دیا۔ مذہب سکھایا۔ فلسفہ پڑھایا۔ نئی سماجی تشکیل کی داغ بیل ڈالی اور سیاسی اور فنی زندگی میں نئی رو دوڑادی۔ یہی نہیں چین نے اس سے بھی زیادہ دل آویز۔ اس سے بھی زیادہ خوشگوار تحفے دئے۔ چین سے اد۔ چا (چائے کے لئے جاپانی لفظ) آئی۔ صہبائے ساکی (ایک خاص جاپانی شراب) آئی جس کے بغیر ہر جاپانی مجلس بے رنگ دآب ہو کر رہ جاتی۔

اور اس کے بدلے میں جاپان نے چین کے جرعۂ تلخکام کی تندی کو اور بھی تیز کیا۔ اور اس کے جامِ ناکامی میں جو ایک بوند کی کسر تھی وہ بھی پوری کردی۔ افسوس تو یہ ہے کہ جاپان اس قوم کی مصیبت وآلام میں اضافہ کر رہا ہے جس نے دنیا کے لئے معاشرتی۔ فنی۔ صنعتی مسرتوں کو بڑھانے میں سب سے زیادہ حصہ لیا ہے۔

سردی کی بپتا

سدھو نے بیوی سے کہا: "رما! کسان تو اب کھیت پر مجھے رکھنا نہیں چاہتا۔ اس نے اپنے بھانجے کو گاؤں سے بلا بھیجا ہے۔ میری جگہ وہ کام کرے گا۔ کہیں اور بھی چھوٹا موٹا کام نہیں ملتا۔ سردی بڑھتی جا رہی ہے۔ پیٹ کی فکر کروں یا کپڑے لتے کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" رما نے سن کر کہا: "تھوڑی سی جوار اور رہ گئی ہے۔ دو تین دن تک چل جائے گی۔ پرماتما نے یہ پیٹ ایسی بنا دی کہ اس کو بھرنا ہی پڑتا ہے۔"

سدھو کو رات بھر نیند نہیں آئی وہ اسی ادھیڑ بن میں رہا کہ اب کیا کروں۔ اس نے سب اونچ نیچ سوچ کر صبح کو رما سے کہا: "دلی یہاں سے بیس کوس ہوگی۔ بڑی جگہ ہے۔ وہاں محنت مزدوری مل ہی جائے گی۔ ہم بچوں سمیت وہیں چلیں گے۔"

اگلے دن صبح کو سب تیاری ہو گئی۔ رما نے کھاٹ کھٹولے اور بڑے برتن ایک کوٹھری میں بند کر دیئے۔ گھر کو تالا لگا دیا اور چل پڑے۔ اس دو کڑی کے جھونپڑے کو انہوں نے مڑ کر حسرت سے دیکھا یہ انہیں کتنا پیارا تھا! دکھ سکھ میں بھی ان کا غم خوار تھا۔ بھوک اور فاقے میں یہاں ان کو پناہ ملتی تھی آج یہ رفیق بھی چھوٹ گیا۔ تھوڑی دور چلے تھے کہ پیچھے پیچھے رنگی مل پرچونیا دوڑا ہوا آیا "سدھو! سدھو! پرچون کے پیسے تو چکا دے۔ اب کا گیا جانے کب آئے۔" سدھو کو جیسے لرزہ آگیا ہو وہ وہیں کھڑا ہو گیا، اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا: "لالہ جی! میں تمہارے سب ٹکے چکا دوں گا۔ پر اس وقت تو بہت تنگی ہے۔ پرماتما کو حال معلوم ہے۔ ذرا سہارا رکھو۔ رام تمہارا بھلا کرے گا!" رنگی مل نے کہا "نہ بھئی سدھو۔ اس طرح میں بہت گھاٹا اٹھا چکا ہوں۔ میری ادھار بہت مر گئی۔ مجھے تو وصول ہوتے نظر نہیں آتے۔ تو ایسا کر کہ اپنے برتن بھانڈے میرے پاس چھوڑ دے۔ جب تو آئے گا تو ٹکے چکا کر لے لیجو۔"

سدھو نے دیکھا کہ یہ سخت لوہا تو مڑتا نظر نہیں آتا، وہ اس کے قدموں میں گر گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے تھے۔ اس نے لجاجت سے کہا: "لالہ جی! ذرا بچوں پر دھیان کرو۔ میں لوٹ کر سب

پہلے آپ کا حساب ضرور ادا کر دوں گا"۔ رنگی مل حالت کو دیکھ کر ذرا پسیجا، اور پوچھا "کب تک لوٹے گا"۔ اس نے کہا اگلے مہینے تک"۔

رنگی مل سے پیچھا چھوٹ گیا، ایک بچے کو رما اور دوسرے کو سدھو گود میں اٹھا کے دلی کو چل دیئے۔ کئی کوس یہ لوگ پیدل چلتے رہے۔ مگر رما میں اب سکت نہیں رہی تھی۔ وہ کبھی اتنی دور پیدل نہیں چلی تھی۔ وہ تھک ہار کر سڑک کے کنارے بیٹھ گئی۔ سدھو کو اب اور بھی سوچ ہو گیا پیچھے سے ایک لاری آ رہی تھی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے رکوایا۔ ڈرائیور نے پوچھا "کہاں جائے گا"۔ اس نے کہا دلی جائیں گے پر تھوڑی دیا کرو ہمارے پلے کچھ ہے نہیں۔ ہم دور سے پیدل آ رہے ہیں، عورت نے ہمت ہار دی"۔ ڈرائیور یہ سن کر بپھر گیا، جیسے اس کے دل میں رحم تھا ہی نہیں اور کہا "تیرے باپ کی لاری ہے نا۔ بڑا لاٹھ آیا کہیں کا۔ گاڑی کو رکوا دیا۔ جیسے اس کا تو ہی مالک ہے"۔ مسافروں نے یہ سن کر قہقہہ لگایا۔ ایک خدا ترس نے کہا "بٹھا لیا ہوتا، جانے کون بپتا کا مارا ہوگا"۔ کلینر نے کہا "ایسی دیا آئی ہے تو کرایہ تو دیجو"۔ وہ سن کر چپ ہو رہا۔

یہ غریب مایوس اور بے بس ہو کر بیٹھ گیا۔ جیسے کوئی غیب سے امداد کا منتظر ہو۔ رما رونے لگی تھی، اور بچوں کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کے غم میں شریک تھے، ایک تین سال کا اور دوسرا چار سال کا تھا۔

ایک موٹر آ رہی تھی۔ کوئی دلی کے سیٹھ اس میں سوار تھے، انہوں نے عورت کو روتا دیکھ کر سمجھا یہ کوئی مصیبت کے مارے ہیں۔ انہوں نے موٹر روک لی۔ اور اتر کر ان کا حال پوچھا۔ سدھو نے ان کو اپنی بپتا سنائی۔ سیٹھ جی نے ان چاروں کو موٹر میں بٹھا لیا اور خود ڈرائیور کے پاس بیٹھ گئے۔ سدھو نے دعا دی۔ "دھن! ایشور تمہارا بھلا کرے۔ تم بڑے دھرماتما ہو۔ ہم جیسے ابھاگوں کو تم نے سہارا دیا۔ پرماتما تمہیں راضی رکھے"۔

شہر میں آ کر سیٹھ جی نے ان لوگوں کو اتار دیا، اور ایک روپیہ خرچ کے لئے دیا۔ سدھو کو روپیہ ایسا ملا جیسے ڈوبتے کو تنکا مل جائے۔ اب بجھے ہوئے دلوں میں کچھ گرمی پیدا ہوئی۔ امید نے آ کر ان کو سہارا دیا۔ اب ان کے پاؤں میں سکت آ گئی تھی۔ اور چہروں پر پہلی سی اداسی نہیں تھی۔ سیٹھ جی نے جس دھرم سالہ

کا پتہ بتایا تھا۔ وہ وہاں چلے گئے۔ یہاں دن کو تین دن تک بھوجن ملتا رہا۔ آخر ان کو اپنا انتظام کرنا ہی پڑا۔

سدھو نے ایک جھلّی مول لے لی تھی، وہ بازاروں میں گھومتا اور دو ڈھائی آنے روز کما لاتا۔ کبھی کچھ بھی نہ ملتا تھا۔ رات کو ایک دوکان کے سائبان کے نیچے یہ لوگ لیٹ جاتے تھے۔ اب سردی بہت بڑھ گئی تھی۔ ان کے پاس دو چادرے اور ایک توشک تھی۔ بدن پر ایک ایک کرتا تھا اور ٹانگوں میں دھوتی۔ رما کے پاس لہنگا تھا۔ رات بھر ان کو نیند نہ آتی تھی۔ پر دن کو کمپنی باغ میں رما اور بچے دھوپ کی آنچ میں سو لیتے تھے۔ مگر سدھو کو کمانے کے لئے جانا پڑتا تھا۔ وہ کبھی تھک تھکا کر کہیں اونگھ ہی لیتا تھا۔ اس بے سر و سامانی میں انہیں اپنا دو کڑی کا جھونپڑا بہت یاد آتا تھا۔

جھلی والوں کی شہر میں بہت کثرت تھی۔ خوشامد سے اور کم سے کم مزدوری پر بھی بوجھ ہاتھ نہ لگتا تھا۔ دن بھر گھوم کر سدھو چھ پیسے لایا۔ سردی کی رات اور چھ پیسے۔ اسی میں پیٹ بھر لو۔ اور رات گذارنے کے لئے اُپلے خرید لو۔ اور ایک پیسے روز کا گڑ بھی آجاتا تھا۔ اس کو کھا کر ذرا سردی سے بچاؤ رہتا تھا۔ یہ لوگ روکھی سوکھی کھا کر، چادروں میں سکڑ کر ٹانگیں پیٹ میں کئے ہوئے الاؤ کے گرد پڑ جاتے ایک بچے کو رما چھاتی سے لگا لیتی اور دوسرے کو سدھو۔ الاؤ کے سامنے تو سردی نہ لگتی تھی۔ پر پیٹھ پر جیسے کوئی ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیتا ہو۔ ایک پہلو سے سکڑے ہوئے پڑے رہنے سے ہڈیاں اور کمر دکھ جاتی تھیں۔ ہاتھ گرم رہتے تو پاؤں برف ہو جاتے۔ ان جیسے خدا کے بندے اور بھی تھے۔ جو دوکانیں بند ہوتے ہی سائے کی جگہ میں آجاتے۔ رات بھر تاپتے گذرتی۔ فقیر اور مفلس اِدھر اُدھر سے تنکے کڑیاں، چھپٹیاں۔ بائیسکل کے ردی ٹائر، اور کپڑوں کی دھجیاں جمع کر کے لاتے تھے۔ ساری رات ان کو جلا کر سینکتے تھے۔ نیند کسی کو بھی نہ آتی تھی۔ سنتری بھی گرم کپڑے پہنے ان مفلسوں کے پہرے پر تعینات تھا۔ وہ کہیں آرام سے بیٹھا اونگھ رہا ہوگا۔ ایک بجے لوگ بائیسکوپ سے آتے تھے۔ گرم کپڑے پہنے اور رضائیاں اوڑھے ہوئے ٹھنڈی اور تیز ہوا سے ان کا بھی دانت سے دانت بجتا تھا۔ وہ بھی غور کرتے کہ ایک یہ لوگ ہیں کہ چادروں میں زمین کے بستر پر گٹھری بنے پڑے ہوئے ہیں۔ ان کو کیا نیند آتی ہوگی۔ ان کے لئے تو ہوا سے کوئی بچاؤ ہی نہیں۔ اللہ اللہ! مفلسی بُری بلا ہے۔ اس کا منہ کالا۔ خدا اس سے دشمن

کو بھی بچائے۔

صبح ہوئی۔ سورج نکلا۔ اور ان لوگوں کے دم میں دم آیا۔ مردہ جسموں میں کچھ جان سی آنے لگی۔ سوداگروں نے اپنی اپنی دوکانیں کھولیں۔ بازار چلنے لگا۔ ہر ایک دوکان پر بہت بھیڑ ہوگئی۔ اور لوگ کچھ چرچا کر رہے تھے۔ آن کی آن میں پولیس بھی آگئی۔ سدھو اس وقت دھوپ کے مزے لے رہا تھا وہ اتنی بھیڑ دیکھ کر اور چرچے کا غل سُن کر دیکھنے گیا۔ اس نے دیکھا کہ رات کے پالے سے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی چادر میں لپٹا ہوا ٹھنڈا ہو گیا۔ دلی جیسے شہر میں ایسے مفلسوں اور لاوارثوں کی موت پر لوگوں کو کچھ افسوس نہیں ہوتا۔ جیسے کوئی بلی یا کتا مر گیا ہو۔ بس تعجب یہ ہے کہ وہ بھی ایک آدمی تھا۔ جسے لوگ اعجوبہ سمجھ کر دیکھتے ہوئے اپنے اپنے کام پر چلے جا رہے تھے۔ جیسے اس موت سے کسی کی ذمہ داری وابستہ نہیں ہے۔ سدھو بہت افسوس کرتا ہوا لوٹ آیا۔

سردی کوئی حد نہ تھی۔ بڑھتی ہی جاتی تھی۔ سدھو کے چھوٹے بیٹے پربھو کو کھانسی اور بخار ہو گیا آج اس نے ایک پیسے کا سارا گڑ پربھو ہی کو کھلا دیا۔ اس کے خیال میں یہی کھانسی کی مجرب دوا تھی۔ وہ کئی دن تک یہی کرتا رہا۔ پر کھانسی نہ گئی۔ وہ کسی دواخانے میں گیا۔ اس نے حکیم جی سے ہاتھ جوڑ کر کہا میرے بچے کو کھانسی اور تاپ ہے۔ کوئی دوا دیدو۔ پر میں بہت غریب ہوں۔ دیا کرو۔ حکیم جی صرف کھانسی کی گولیاں اسکو دیدیں۔ اور وہ دعائیں دیتا ہوا چلا آیا۔ اس نے پربھو کو یہ گولیاں کھلائیں، مگر کچھ نہ ہوا۔ اب وہ آہستہ آہستہ کھانستا تھا۔ جب اس میں طاقت ہی نہ رہی۔ کچھ کھاتا بھی نہ تھا۔ رما اس کی یہ حالت دیکھ کر رو دینے لگی۔ راہ گیر جمع ہو گئے۔ کسی نے کہا ہسپتال جاؤ۔ وہاں سے دوا مفت مل جائے گی۔ یہ لوگ کپڑے لتے سمیٹ کر ہسپتال گئے۔ ڈاکٹر صاحب کرسی پر بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ دو چار مریض ان کے گرد تھے۔ دو ایک امیر کرسیوں پر ان کے برابر ڈٹے ہوئے تھے۔ سدھو نے ہاتھ جوڑ کر بندگی کی۔ اور ڈاکٹر سے پربھو کا حال کہا۔ اس نے کچھ توجہ نہیں کی وہ تو ایسے مریضوں کو دیکھ رہے تھے۔ جن کے علاج سے انھیں کچھ ہاتھ آئے گا۔ وہ ان لوگوں سے بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ آخر سدھو کی التجا کا اثر بھی ہو ہی گیا۔ ڈاکٹر نے دو ایک باتیں پوچھیں اور نسخہ لکھ کر دیدیا۔

اگلے دن سدھو کی مزدوری اچھی لگ گئی تھی۔ وہ مٹھی دبائے ہوئے خوشی خوشی اپنے بیوی بچوں کے ٹھکانے پر چلا جا رہا تھا۔ اور خیال کرتا جاتا تھا۔ کہ پربھو کو ایک ٹوپا اور بنیان لے کر پہنا دوں گا کھانسی اور بخار اس کا جاتا ہی رہے گا۔ کسی اور دن محنت اچھی لگ گئی تو ہر نام کے کپڑے بنوا دوں گا۔ آج اس نے گڑ بھی بہت سا خرید لیا۔ اور ایک پیسے کی چائے لے لی۔ ٹھکانے پر جو آیا تو رما رو رہی تھی وہ گھبرا گیا۔ اس کی طاقت سلب ہو گئی۔ جیسے بجلی گر گئی ہو۔ دل دھڑکنے لگا۔ اور رگ رگ سے جان سی نکلنے لگی۔ سدھو کا ایک چراغ گُل ہو چکا تھا۔

رزم بزم

جناب مولوی محمود علی خاں صاحب بی اے بھوپال

عیش و طرب کی بزم میں عباسی عظیم — بیٹھا تھا اور جمع تھے درباری و ندیم

تھا معتصم وہ شاہِ عرب صدر انجمن — عباسیوں کا حلقۂ اسود تھا زیب تن

وہ دلبرانِ شوخ کے ملبوس شوخ رنگ — وہ منظر عجیب کہ رہ جائے عقل دنگ

سرخ اور زرد و سبز و طلائی وہ خلعتیں — دنیائے روشنی میں وہ تابندہ طلعتیں

مشرق کی شان و عظمت و تہذیب کا سماں — اک خیرہ کن نظارۂ رنگیں وہ بیگیاں

شعریت و لطافتِ نغمات و رنگ و بو — اور حسن مضطرب کا وہ ہنگامہ سو بسو

موسیقیٔ عرب سے وہ مجلس کا اہتزاز — وہ نغمہ ہائے دلکش و شیریں کا سوز و ساز

وہ زرق برق حسن مجسم کی گردشیں — اور شاہد حسیں کی وہ مستانہ لغزشیں

ساقی کا ناز عشوہ خرد سوز و دلربا — تصویر نغمہ دلبر رقاص کی ادا

وہ ساغر شراب کی گردش ادھر ادھر — مخمور انکھڑیوں کی وہ جنبش ادھر ادھر

تھی بزم محو لطف و طرب معتصم بھی مست — آزاد نظم سلطنت و فکر بند و بست

ناگاہ ایک پیک سبک سیر آگیا — محفل پہ جس سے دوسرا اک رنگ چھا گیا

بولا وہ بارگاہ میں اے شاہ ذی وقار — اے زینتِ خلافت و فرخندہ تاجدار

نصرانیوں نے روم کے حملہ کیا ہے سخت — ڈرتے نہیں حضور سے کیا اب وہ تیرہ بخت

قتل اور لوٹ مار کا اک حشر ہے بپا — پہنچا زمیں سے تا بفلک نالہ و بکا

تثلیث حملہ آور توحید ہو گئی — تقدیر کیا غریب مسلماں کی سو گئی

قصہ نہیں ہے ختم ابھی ظل کبریا — اک دردناک سانحہ سن لیجئے ذرا

نصرانیوں کی قید میں اک ہاشمی نژاد
خاتون شوربخت وستم دیدہ نامراد

کہتی تھی بار بار کہ اے معتصم مدد!
کیجے مدد خدا کے لئے معتصم مدد!

سنتا رہا سکوت سے وہ اس کی داستاں
چہرے پہ اُس کے غیظ وغضب پھر ہوا عیاں

لبیک کہہ کے مرد مجاھد رواں ہوا
ہمّت سے اُس کی پیرِ کہن بھی جواں ہوا

اُٹھا مثالِ شیر وہ جنگ آزمودہ مرد
لاکھوں سپاہ لے کے وہ پہنچا پئے نبرد

وہ جوشِ انتقام وحمیت کہ الاماں
وہ زورِ غیظ وغصہ کہ تھرائے آسماں

لہو ولعب نہ مانع جوشِ عمل ہوا
اعلائے دینِ حق میں ہر اک بے بدل ہوا

گونجی فضا میں نعرۂ تکبیر کی صدا
تلوار نے، تبر نے، کیا خوب حق ادا

ظلم وستم سے ملک کو آزاد کر دیا
اُجڑے ہوئے دیار کو آباد کر دیا

تثلیث سرنگوں ہوئی توحید سربلند
کفّار کو نصیب ہوا قتل وقید وبند

واپس ہوا مظفر ومنصور وہ جواں
عزّت سے یاد کرتے ہیں ہم اس کی داستاں

تنقید و تبصرہ

برہانِ ماثر | یہ کتاب شاہان دکن کی تاریخ میں سید علی طباطبائی نے جو عراق سے دکن میں وارد ہوئے تھے برہان نظام شاہ کی فرمائش سے ۱۰۰۰ھ میں لکھی اور اس کا تاریخی نام برہانِ ماثر رکھا۔ عبارت شروع سے آخر تک ادیبانہ ہے جس کی وجہ سے اس کا مطالعہ نہایت دلچسپ ہے۔

ہندوستان میں یہ کتاب نادرالوجود تھی۔ مجلس مخطوطات فارسیہ حیدرآباد دکن نے کوشش کرکے اسکے چند نسخے فراہم کئے اور مقابلہ اور تصحیح کے بعد جدید اصول کے مطابق معہ فہرست عنوانات و اعلام کے شائع کیا۔ کاغذ اعلیٰ بڑی تقطیع اور ضخامت ۶۴۲ صفحات ہے۔ مطبع جامعہ ملیہ دہلی نے بکمال نفاست ٹائپ میں اس کو چھاپا ہے جس سے اس کی رونق اور شان دوبالا ہوگئی ہے۔ (م - ا)

پریم سوگ | مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ، حیدرآباد دکن۔ کاغذ عمدہ، سائز ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۸۶ صفحے، قیمت ۸/

اُردو افسانہ نگاری میں جان ڈالنے والے منشی پریم چند، جن کی زندگی اب دنیا کے لئے افسانہ بن چکی ہے۔ اپنی غیرفانی خدمات کے لئے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ اور اُن کی عام محبت اور ہر دلعزیزی، مبسوط اور ضخیم سوانحعمری بھی مرتب کرالے گی۔ لیکن اس وقت محمد حسام الدین خانصاحب غوری، کا یہ چھوٹا رسالہ جو بقول "سید محی الدین صاحب قادری زورؔ منشی پریم چند کی مکمل سوانح حیات کا پیش خیمہ ہے۔ بہت غنیمت ہے" حسام الدین صاحب نے اس رسالہ میں وہ خطوط بھی درج کئے ہیں منشی جی نے موجودہ سینما کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور ان کے ایک ایک لفظ میں اصلاح کی تڑپ بتائی جاتی ہے۔

کتاب مفید اور دلچسپ ہے، لکھائی چھپائی اگر اور بہتر ہوتی تو کتاب کی ظاہری قدر میں بھی اضافہ ہو جاتا۔

رفتار زمانہ ؎ ۔ حجم ۲ ۵ صفحے، قیمت ۸ر۔ ملنے کا پتہ درج نہیں شاید صاحب تصنیف سے مل سکتی ہو۔

یہ کتاب اصل میں خواجہ عبدالمجید صاحب دہلوی کی اُن تقریروں کا (ایک اضافہ کے ساتھ) مجموعہ ہے جو آپ نے دہلی کے ریڈیو اسٹیشن سے نشر کی تھیں۔ کُل تقریریں چھ ہیں جن میں ایک غیر مسموعہ ہے یعنی ریڈیو پر نہیں پڑھی گئی ہے۔ خواجہ صاحب نے ان تقریروں میں ایک مقصد پیش نظر رکھا ہے اور وہ خود موصوف کے الفاظ میں "یہ کوشش ہے کہ تہذیب جدید کا خاکہ کھینچ دوں اور اس کی بُرائیاں اور بھلائیاں نمایاں کر کے دکھا دوں۔" خواجہ صاحب نے یہ مقصد خاندانی نوک جھونک، کے تحت میں حاصل کیا ہے۔ یہ تمام تقریریں اگرچہ الگ الگ ہیں لیکن دراصل ایک ہی کتاب کی مختلف فصلیں اور ایک ہی افسانہ کے مختلف مناظر ہیں۔ کتاب کی زبان، اس کی جان ہے، عنوانات ساس بہو، سالا بہنوئی، ہم زلف، گھر داماد، بی ہمسائی اور گھریلو نوک جھونک کا آخری منظر ہیں۔

انتظام کتب خانہ حجم ۲۲ صفحے، قیمت ۴ر (محبوبیہ کارخانہ جلد سازی، حیدرآباد دکن)

یہ مختصر رسالہ شیخ محبوب قریشی صاحب بانی محبوبیہ کارخانہ جلد سازی حیدرآباد نے کتب خانوں کے انتظام اور عام کتابوں کی ترتیب و حفاظت کے متعلق لکھا ہے۔ جس میں کتب خانہ کی عمارت، کتب خانہ کی آرائش اور کتابوں کی حفاظت و ترتیب کے متعلق بہت سے مفید مشورے دئے ہیں، اپنے فن کا شاید یہ پہلا رسالہ ہے اور کتب خانوں کے لئے مفید ہے۔

جنت کی کنجی (مینجر دینی بک ڈپو۔ کوچہ ناہر خاں، دہلی) تقطیع ۱۸×۲۲، کاغذ سفید چکنا۔ لکھائی چھپائی عمدہ، قیمت عہر۔

مولانا احمد سعید صاحب ناظم جمعیتہ علما ہند بہت مصروف آدمی ہیں لیکن عام مسلمانوں کی اصلاح و ہدایت کے لئے کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہتے ہیں۔ زیر نظر کتاب، ایک ہزار سے زاید ایسی حدیثوں کا مجموعہ ہے

جس سے اعمال صالحہ کی ترغیب ہوتی ہے۔ کتاب میں احادیث کا متن نہیں دیا گیا ہے۔ صرف ترجمہ ہے متن کی کچھ ایسی ضرورت بھی نہ تھی، زبان کی سلاست اور ترجمہ کی شگفتگی، جو دِلّی میں بھی ان ہی کا حصہ ہے کتاب کی جان ہے۔ کتاب متعدد عنوانات کے ماتحت منقسم ہے، اور نماز، حج وزکوٰۃ کے متعلق تفصیلی احادیث کے ساتھ ساتھ شہادت، جہاد، کسب حلال، لین دین، شادی بیاہ، صلہ رحمی، لباس، طعام، اور بیماری، سفر، وغیرہ تمام ضروریات زندگی کے متعلق، ایسی حدیثیں جمع کردی گئی ہیں جو عام طور پر اور بالخصوص بچوں اور عورتوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوں گی۔

سالنامے

سالنامے عموماً دسمبر اور جنوری میں شائع ہو جاتے ہیں، اب کئی مہینے بعد ان پر تبصرہ شائع کرنا بظاہر بعد از وقت معلوم ہوتا ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ سالنامے کی حیثیت رسالہ کی نہیں رہتی جو ایک مہینے کے بعد باسی ہو جاتا ہے بلکہ وہ کتابوں کی صف میں آجاتا ہے، یہی وجہ ہے ہم ان سالناموں میں آج بھی وہی تازگی پا رہے ہیں جو آج سے دو مہینے پیشتر تھی۔

علی گڈھ میگزین (تعطیلات نمبر) (مسلم یونیورسٹی علی گڈھ) صفحات ۲۴۹ - قیمت درج نہیں۔

معین الدین صاحب دردائی کے عہد ادارت کا آخری کارنامہ پیش نظر ہے، رسالہ اپنی ضخامت اور مضامین کی بوقلمونی کے لحاظ سے ایک خاص شان کا مالک ہے۔ اس نمبر کی ممتاز کامیابی، جیسا کہ خود جناب مدیر نے اشارہ فرمایا ہے، اس دور اندیشی کی رہین منت ہے جو زمام ادارت ہاتھ میں لیتے ہی شروع کردی گئی تھی، یہ نمبر اپنے مضمون نگاروں کے اعتبار سے اڈیٹر نمبر بھی ہے یعنی جناب مدیر رسالہ کے سابق اڈیٹروں سے مضامین حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ جو رہ گئے ہیں ان میں ایک مدیر اولین مولانا شبلی مرحوم ہیں۔ "بغاوت یونان اور سیاست یورپ" اور "انقلابات اسپین" لکھنے والوں کے وسیع سیاسی اور تاریخی مطالعے کا پتہ دیتے ہیں شاد کا رنگ تغزل، رجب علی سرور اور رتن ناتھ سرشار کی تحقیق اور ادبی چاشنی کے لئے۔ شاہ منظور الدین صاحب اختر، زکریا ہاشمی صاحب اور آل احمد صاحب سرور کا نام کافی ضمانت ہے۔ اسی طرح ظفر اللہ صاحب صدیقی

لکچرار فلسفہ کا مضمون 'ہیوم اور فلسفہ جبر و اختیار' اور پروفیسر رشید احمد صاحب کا 'سفر کا ماحی جالی' اور جلیل قدوائی صاحب کا 'مرثیہ مسعود' محتاج تعریف نہیں۔ پروفیسر عبدالباسط صاحب نے ہندوستانی زبان اور معاشرت پر انگریزی اثرات کے عنوان سے اُردو ہندی کے مسئلہ پر بڑی دلچسپی سے بحث کی ہے۔ محمود الحسن صاحب صدیقی کے ترجمے اور پروفیسر عبدالواحد صاحب کے افسانوں نے رسالے کے بڑی کمی کو پورا کر دیا ہے۔ رسالہ میں مدیران رفتہ کی متعدد تصویروں کے ساتھ مرحوم سر راس مسعود کی بھی تصویر دی گئی ہے۔

زمانہ | (پریم چند نمبر) صفحات ۲۵۲۔ قیمت عہ (دفتر زمانہ کانپور)

منشی دیا نرائن نگم مدیر زمانہ کا اُردو دنیا کو ممنون ہونا چاہیئے کہ موصوف نے اُردو کے سب سے بڑے افسانہ نگار منشی پریم چند کی یاد میں اپنے رسالہ زمانہ کا ایک خاص نمبر نکال کر اُردو صحافت کے فرض کفایہ کو ادا کیا ہے اور بہت خوبی سے ادا کیا ہے۔ مضامین تین حصوں میں منقسم ہیں۔ سوانحی حالات، افسانہ نگاری اُردو شاعروں کا خراج تحسین۔ ہر حصہ میں ملک کے مشہور لکھنے والوں نے منشی جی کے مختلف پہلوؤں کا اجاگر کیا ہے۔ اور سیرت نگار کے لئے نہایت قیمتی سرمایہ مہیا کر دیا ہے۔
مضامین اپنے علمی اور ادبی اور تحقیقی اعتبار سے تو بلند ہیں ہی لیکن منشی جی کے عقیدت اور محبت نے اہل قلم کی ان کاوشوں میں سونے پر سہاگا کا کام دیا ہے۔
نگم صاحب نے محبت کا حق خوبی سے ادا کر دیا ہے اُمید ہے کہ عام 'پریمی' اپنے فرض کو پورا کریں گے۔

سالنامہ ساقی | (جنوری ۱۹۳۷ء) قیمت عہ (ساقی۔ دہلی)

شاہد صاحب کے مے خانہ ادب کے لئے کس کے دل سے دعائیں نہ نکلتی ہونگی، اپنے رسالہ کے ہر ماہنامہ کو وہ جب یہ سعی خاص مرتب کرتے ہیں تو ظاہر ہے سالنامہ کے لئے کیا کچھ نہ

کریں گے۔ ۲۰۸ صفحے کا مصور ساقی اس وقت پیش نظر ہے۔ سنجیدگی کے ساتھ لطافت اور لطافت کے ساتھ سنجیدگی، ساقی کا خاص رنگ ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، آغا شاعر، حجاب امتیاز، اختر رائے پوری، ایم اسلم، صادق الخیری، مرزا عظیم بیگ، جناب بے خود، پروفیسر برلاس، بادشاہ حسین، اشرف صبوحی، ماہر القادری، خواجہ حسن عباس، سب اپنا اپنا ساغر لے ہوئے موجود ہیں، لیکن رسالہ کی نمایاں ترین چیز صہبائے فرنگ "میکبتھ" ہے جو اردو کے مشہور مترجم مولانا عنایت اللہ صاحب نے نئے شیشوں میں میگساران ادب کو عنایت فرمائی ہے۔

ہمایوں (سالگرہ نمبر) صفحات ۱۲۲ قیمت ۱۲ر (رام نگر لاہور)

شگفتگی و سنجیدگی سادگی و پُرکاری ہمایوں کا خاص رنگ ہے جسے بشیر احمد صاحب کے مذاق نفاست نے نازک مرحلوں میں بھی قائم رکھا ہے۔ پیش نظر سالنامہ بھی اپنی انہی خوبیوں کا مرقع ہے جناب مدیر نے اشتراکیت پر خوبی کے ساتھ سیر حاصل تبصرہ کیا ہے جو ایسا ہے کہ اس مذہب کے مومن و کافر دونوں کے لئے قابل دید ہے۔ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری جامعہ عثمانیہ کا 'پردہ کے پس و پیش' ایک فکاہیہ مضمون حضرت فلک پیما کا " نیمو " (ڈراما) پروفیسر فیاض کا 'عہد' (افسانہ) میاں عطاء الرحمٰن صاحب کا "مصیبت کے ساتھی" (افسانہ) سب ایسے مضمون ہیں جنھیں ضرور پڑھنا چاہئے پروفیسر حمید احمد خانصاحب نے " غالب اور بیدل" میں غالب کی شاعری کے ایک خاص پہلو پر تحقیقی نظر ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ " غالب نے دس سال کی عمر میں میر کی بجائے بیدل کو اپنا روحانی استاد کیوں اور کس طرح بنایا ہے" لیکن اس مضمون کا بلکہ کہنا چاہئے اس سالنامہ کا قابل اعتراض پہلو یہ ہے کہ اس مضمون کی ایک قسط درج کرکے دوسری کے لئے فروری کا منتظر بنا دیا ہے۔ شروع میں بزم ہمایوں اور جہاں نما کے ذیل میں اردو دنیا کی اہم واقعات کی ڈائری اور عام دنیا کے واقعات کا روزنامچہ مرتب کرکے بشیر صاحب نے تبصرہ کے ساتھ درج کیا ہے۔ جس سے پرچے کی معنوی حسن میں اضافہ ہوگیا ہے۔ ماہر القادری، وقار انبالوی، تاجور سامری، الطاف مشہدی اور حضرت ذوقی کی

نظموں اور غزلوں کے علاوہ ' ہمایوں گولڈ میڈل شاعرہ ' کے چیدہ نظمیں بھی دی گئی ہیں - چھ مختلف تصویریں بھی ہیں -

---

عالمگیر | (خاص نمبر) صفحات ۲۳۶ قیمت ایک روپیہ ' (بازار سید مٹھا لاہور)

بہت سے عمدہ مضامین کا مجموعہ ہے ' حکیم برہم کا ایک غیر مطبوعہ مضمون " اُردو زبان کی تاریخ - انسانی پرواز کی تاریخ (مولٰنا اسمٰعیل ناصح) جوزیفائن کی طلاق (عشرت رحمانی) " سنسکرت شاعری " (فرزند حضرت جلیل) تیمور کا عشق (شاہزادہ ایاز) کچھ اقبال نامہ جہانگیری سے (محمد عبداللہ صاحب قریشی) ادب اور ہئیت اجتماعی (جناب مجنوں گورکھپوری) ہندوستان کا لرزہ خیز افلاس (جناب شبلی) دوشیزاؤں کا خواب (ماہر القادری) مانی اور اسکی تعلیم (نصیر الحسن صاحب رضوی) اور زمانہ سے لیا ہوا کرکٹ میچ (منشی پریم چند) پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں - عالمگیر کا ستھرا مذاق اور شاعریت اسکی ان تصویروں میں بھی موجود ہے جو سالنامہ کے صفحات کو زینت دے رہی ہے -

حضرت ناصح ' جناب مجنوں ' شاہزادہ ایاز اور قریشی صاحب کی تحقیق و تفتیش قابل داد ہے -

---

ادب لطیف | صفحات ۲۲۸ - قیمت ایک روپیہ (لوئر مال ۹ لاہور)

دلچسپ افسانوں ' تنقیدی مضامین اور ادب رنگیں کا ایک دلآویز مجموعہ ہے ' پریم کا جادو (مصنفہ ایف ' ڈبلیو ' بین اور ترجمہ سراج الدین احمد صاحب نظامی) قسمت (ایم اسلم) اندر سبھا (امتیاز علی تاج) صحرا نورد کا پانچواں خط (مرزا ادیب) نغمۂ تحقیق (پروفیسر بیخود موہانی) اور دنیا کی اہم سیاسی تحریکات (شبلی بی کام) رسالہ کے خاص مضامین ہیں - ' پریم کے جادو ' میں خود ایک جادو ہے - اسلم اور تاج کے رشحات قلم ' محتاج تعریف نہیں - نغمۂ تحقیق ہیں نواب اثر لکھنوی کے اس تبصرہ پر تبصرہ ہے جو موصوف نے بیخود موہانی صاحب کے رسالہ جوہر آئینہ پر ادب لطیف ہی کی گذشتہ پرچے میں لکھا تھا - جوہر آئینہ سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب کی مشہور تصنیف ' ہماری شاعری ' پر تنقیدی سلسلے کا پہلا رسالہ ہے - شبلی صاحب

نے مشہور معاشی اور سیاسی نظریوں کو آسان پیرائے میں پیش کیا ہے طارق صاحب ایم اے نے 'فلسفۂ خنداں سے بالتفصیل بحث کی ہے'، آخر مضمون میں برگساں کی کتاب خندہ کا ایک اقتباس نقل کرتے ہوئے ڈاکٹر بجنوری مرحوم کے ایک مغالطہ کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔

رسالہ کا منظوم حصہ بھی خاصا دلچسپ ہے۔ اور اس میں ماہر، راز، تپش، احسان دانش، محترمہ حیا، اختر شیرانی، وغیرہ موجود ہیں۔ ایک خاوند کی ضرورت، میں غالباً مغربی تہذیب کے بڑا پہلو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن قالب مشرقی رکھا گیا ہے، اس لئے اثر اُلٹا مرتب ہوتا ہے اور لطافت تو اس میں بہر حال کوئی نہیں ہے۔ تنقید ادب پر عبدالرشید صاحب بی اے کا اچھا مضمون ہے۔

ادبی دنیا | صفحات دو سو سے زاید۔ قیمت عہ (مال روڈ لاہور)

ادبی دنیا کا سالنامہ بھی بہت سی ادبی خوبیوں سے مالا مال ہے۔ افسانوں اور ڈراموں میں عاشق بٹالوی طاہر قریشی، فضل حق قریشی، صاحبزادہ محمد عمر، پروفیسر فیاض اور جناب کرشن چندر ایم اے کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، لطیف الدین احمد صاحب نے ایک افسانہ 'حقیقت افسانہ' صرف ایک صفحہ میں لکھا ہے۔ اور خوب لکھا ہے۔ ایک صفحہ کا افسانہ اور اس میں فسانہ کے کم و بیش سارے عناصر موجود۔ علمی اور ادبی مضامین میں گاروتر خاندان کے اُردو شعرا، (منشی پیارے لال شاکر) داغ (بشیر ہاشمی) ہندو مسلمانوں کے کلچرل تعلقات (پنڈت برجموہن دتاریہ کیفی) چین کا ملک الشعرا۔ لی۔ پو (میراجی) لندن میں اُردو پروفیسر براؤن کے کتب خانہ میں، چنڈی داس، بیگمات اودھ کے خطوط۔ میں ہر ایک ایسا ہے جس کو پڑھے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ حصہ نظم میں آسمانِ شاعری کے سارے روشن سیارے ادبی دنیا میں ضوفشانی کر رہے ہیں۔ جلیل قدوائی، فراق گورکھپوری، بہزاد لکھنوی، نصراللہ خاں عزیز، اسد ملتانی، بیخود دہلوی، سیماب اکبرآبادی، جوش ملیح آبادی، ماہر القادری، غرضکہ کون ہے جو یہاں نہیں ہے۔ تصویریں تو سالنامہ کی شرط لازم ہیں۔ کیسے ممکن تھا کہ ادبی دنیا کا سالنامہ اس آرٹ سے خالی ہو۔

شاہکار | صفحات ۱۶۰ - قیمت ۱۲ار (دفتر شاہکار گورکھپور)

یہ سالنامہ بھی مصور ہے، کئی تصویریں خاص اہتمام کے ساتھ دی گئی ہیں، لیکن وہ سب مقامی حضرات کی ہیں اور اس حیثیت سے رسالہ پر 'مقامیات' غالب ہے۔ لیکن سرورق سے اس کمی کی تلافی ضرور ہو جاتی ہے جس پر ایک دو نہیں پورے چالیس مشہور ادیب اور شعراء کی چہرہ نما تصویریں ہیں، اس طرح سرورق ادبائے اردو کا ایک مرقع بھی بن گیا ہے۔ اپنے ٹائیٹل کے لحاظ سے شاہکار تمام سالناموں میں نمایاں نظر آتا ہے لکھائی چھپائی میں بھی وہ بس ہماریوں سے پیچھے ہے، البتہ کہیں کہیں نقش و نگار کی جرأت بے جا نے اس کو کم رو بنا دیا ہے۔ مضامین میں "جدید اردو نثر کے رجحانات" (سید اعجاز حسین ایم اے) صنمیات ہند (نیاز فتحپوری) بغداد خاتون (قاضی تلمذ حسین) مہدی افادی الاقتصادی (مجنوں گورکھپوری) فلسفہ سیاسیات کا ایک رخ (سید رضوان اللہ ایم ایل اے) اور برامکہ کا عروج زوال (ماہر القادری) نا قدان ادب (عطاء اللہ پالوی) قابل دید ہیں۔ شوق مرحوم، ریاض خیرآبادی، کے عکس تحریر اور شاد مرحوم کے تبرکات بھی زینت دہ رسالہ ہوئے ہیں۔

دلگداز | صفحات دوسو - قیمت درج نہیں (کشمیری بازار لاہور)

دلگداز نے اپنی زندگی کے دوسرے ہی سال میں قدم رکھا ہے، اور اب تک تو عمری کے تقریباً سارے لوازم اس میں موجود رہے ہیں، طباعت، کتابت، کاغذ اور ترتیب سب میں بچپن کی سادگی ہے۔ لیکن سالنامہ کو دیکھکر اس کی 'ہونہاری' سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس کی نشو ونما میں توجہ سے کام لیا گیا تو وہ بہت جلد لاہور کے معیاری پرچوں کی صف میں آجائیگا۔ اور شاید کچھ خاص خوبیاں لیکر آئے۔ فہرست مضامین میں ادبیات اور اقتصادیات کے علاوہ اسلامیات اور نسائیات کے بھی دو عنوان ہیں۔ بعض مضامین خاصے دلچسپ اور پر از معلومات ہیں۔ تصویروں میں مرتب نے کوشش کی ہے کہ لاہور کے ادبی رسالوں اور اخبارات کے زیادہ سے زیادہ ارکان ادارہ سے قارئین روشناس ہو جائیں۔

رفتار عالم

ممالک غیر

آسٹریا کا انقلاب وسط فروری میں آسٹریا کے سابق چانسلر ڈاکٹر شُشنگ اور ہٹلر سے جو ملاقات ہوئی تھی اس کے بعد یقین کے ساتھ کہا جا سکتا تھا کہ جرمنی اور آسٹریا کا سیاسی اور قومی اتحاد ہو کر رہے گا، لیکن یہ خیال نہ تھا کہ یہ کارروائی اس قدر جلد تکمیل کو پہنچے گی جیسا کہ حقیقت میں ہوا۔ ہٹلر سے گفتگو کے بعد ڈاکٹر شُشنگ نے جو تقریریں کیں ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بغیر دو چار وار کئے ہتھیار نہ ڈالیں گے، اور اسی دوران میں نازیوں کو قابو میں رکھنے کی وہ ایک دفعہ کوشش بھی کی گئی۔ مگر ڈاکٹر شُشنگ محسوس کرتے ہوں گے کہ ان کے پیروں تلے سے زمین نکلتی چلی جا رہی ہے، اور ان کی آخری تدبیر یہ تھی کہ ساری قوم سے ایک وقت میں ووٹ لیکر اپنے اور نازیوں کے درمیان فیصلہ کرائیں۔ اس کے لئے انھوں نے ۱۳ مارچ کی تاریخ مقرر کی تھی، اور بہت ممکن ہے کہ قوم انھیں کا ساتھ دیتی۔ مگر ووٹ لینے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ نازیوں نے یہ کہہ کر کہ انھیں تیاری کے لئے کافی مہلت نہیں ملی ہے پہلے اپنی پارٹی کو ووٹ دینے کی ممانعت کر دی، پھر ہٹلر نے ڈاکٹر شُشنگ کو الٹیمیٹم دیا کہ استصواب کی تاریخ بڑھاؤ۔ جب یہ ہو گیا تو دوسرے الٹیمیٹم کے ذریعے ڈاکٹر شُشنگ اور آسٹریا کے صدر مکلاس سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کیا گیا اور فیصلے کرنے کو صرف ڈیڑھ گھنٹے کی مہلت دی گئی۔ ڈاکٹر شُشنگ نے یہ اعلان کر کے کہ وہ جبراً علیحدہ کئے جا رہے ہیں استعفیٰ دیدیا۔

۱۲ مارچ ہی کو نئی وزارت اور نئے چانسلر کا انتخاب ہو گیا۔ یہ سب نازی ہیں، اور انھیں یہ صاف صاف کہہ دینے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ انھیں حکومت ان فوجی دستوں کی بدولت حاصل ہوئی ہے جو ڈاکٹر شُشنگ کی آخری چال کی خبر پاتے ہی جنوبی جرمنی میں آسٹریا کی سرحد پر پہنچا دئے گئے تھے، اور جواب "امن قائم رکھنے کے لئے" ویئنا پر مسلط ہیں۔

ادھر ویٔنا میں نازیوں کے برسرِ اقتدار ہونے کا اعلان کیا گیا اور ادھر ہٹلر کی ایک تقریر ڈاکٹر گوبلز نے پڑھ کر سنائی جس میں ان کارروائیوں کی تشریح کی گئی جو جرمنی کے نازیوں نے کی تھیں۔ آسٹریا اور جرمنی کے نسلی اور تہذیبی تعلق کو جتا کر ہٹلر نے کہا کہ جنگ عظیم کے بعد سے آسٹریا میں جتنی حکومتیں قائم ہوئیں انھوں نے ان دونوں قوموں کو زبردستی الگ رکھنا چاہا، ہزاروں جو اتحاد کی کوشش کر رہے تھے جیلخانوں میں بند کر دئے گئے اور ہزاروں کو وطن چھوڑ کر بھاگنے کے سوا چارہ نہ رہا۔ پھر ہٹلر نے کہا کہ ۱۹۳۶ء میں جب میری ڈاکٹر شُشنگ سے ملاقات ہوئی تو میں نے اسے بہت سمجھایا کہ اس طرح قوم کے حوصلوں کو مارنا اور اس کے اُمنڈتے جوش کو دبانا مناسب نہیں، مگر شُشنگ نے میری بات نہ مانی، اور مکاری اور عیاری سے باز نہ آیا۔ اب وہ چاہتا تھا کہ اچانک استصواب کر کے قوم کو اپنے موافق رائے دینے پر مجبور کرے اور دنیا پر یہ ظاہر کرے کہ قوم میرے ساتھ ہے۔ لیکن قوم کو اس زیادتی سے بچانے کے لئے جرمن فوجیں آسٹریا کی سرحد پر بھیج دی گئیں، اور اب وہ آگے بڑھ کر ویٔنا تک پہنچ گئی ہیں تاکہ قوم خوف زدہ ہو کر اپنے اصل ارادے کے خلاف رائے نہ دے! اب اگر آسٹریا والے چاہیں تو اس معاملے پر عام رائے لی جا سکتی ہے کہ آسٹریا کی حکومت نازی ہونا چاہیئے یا کچھ اور، اور جرمنی اور آسٹریا

کی سیاست کو ہم دل اور ہم زبان ہونا چاہیئے یا نہیں !

عام آبادی کے مقابلے میں نازی پارٹی کے اراکین یوں بھی مسلح فوج کی حیثیت رکھتے ہیں، جو کسر تھی وہ جرمن فوج نے آکر پوری کردی ۔ اب بے شک لوگ چاہیں گے تو آزادی سے ووٹ دیکر نازی حکومت کو معزول کردیں گے ! استصواب کی کوئی تاریخ ضرور مقرر کی جائے گی، مگر آسٹریا کی فوج جرمن فوج میں، اس کی خارجی پالیسی جرمنی کی سیاست میں ضم ہوگئی ہے ۔ یعنی آسٹریا الگ ملک نہیں رہا ہے، اور خودمختاری کی تمام علامتیں غائب ہوگئی ہیں ۔

انگلستان، فرانس اور وسطی یورپ

آسٹریا کے انقلاب کا یورپ کی سیاست پر کیا اثر ہوگا ؟ موسولینی نے صاف صاف کہدیا ہے کہ وہ جرمنی اور آسٹریا کے اتحاد میں حائل نہ ہوگا، ہٹلر نے اس کی اس خیر خواہی کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا ہے، اور انگلستان اور اٹلی کے نمایندوں میں اب جو گفت وشنید ہورہی ہے اس میں اٹلی کو جرمنی کی دوستی سے بڑا سہارا ملے گا ۔ انگلستان اور فرانس نے اپنی آبرو بچانے کے لئے سفیروں کے ذریعے جرمنی کے طرز عمل پر سخت اعتراض کیا ہے، لیکن جرمنی کے ارادے کی انھیں خبر تھی، اور اگر وہ واقعی آسٹریا کی خودمختاری کو عزیز رکھتے تھے تو انھیں اسی وقت دخل دینا چاہیئے تھا جب ہٹلر نے ڈاکٹر شُشنگ کو اپنے پاس پکڑ بلایا تھا ۔ قوموں کی نبض پر جن لوگوں کا ہاتھ رہتا ہے ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ جرمنی کے تیور دیکھ کر انگریزوں پر خوف کی ایک عجیب کیفیت طاری ہے، اور جو اسے مبالغہ سمجھتے ہیں وہ بھی اس سے انکار نہیں کرتے کہ انگلستان جنگ سے بچنے کی اتنی کوشش کرے گا کہ اسے کوئی بڑا نقصان ہو جائے تو تعجب نہیں ۔

فرانس کی حالت اس سے بھی نازک ہے ۔ جرمنی اور اٹلی کی عداوت سے تو خطرہ تھا ہی، اب ہسپانیہ میں "حکومت" کا چراغ ٹمٹما رہا ہے، اس نے صلح کی درخواست کی ہے اور اس میں فرانس سے مدد مانگی ہے ۔ فرانسیسیوں اور انگریزوں نے وہاں کی 'حکومت' سے جو بے رخی برتی ہے اس کا یہ نتیجہ ہوگا کہ جب صلح کی گفتگو ہوگی تو ہسپانی فاشسٹ ان دونوں کو الگ نہ رکھ سکیں گے، لیکن فاشسٹوں پر اٹلی اور جرمنی کا اتنا اثر ہے کہ فرانسیسی شاید ہی اپنے فائدے یا اطمینان کی کوئی صورت نکال سکیں ۔ یہ

سننے میں آیا ہے کہ باسک علاقہ جو فرانس کی جنوب مغربی سرحد سے ملا ہوا ہے، ایک بڑا فوجی اور ہوائی مرکز بن گیا ہے، اور اگر کہیں ہسپانی حکومت یعنی آئندہ حکومت، کی خارجی پالیسی نے جرمنی اور اٹلی کی سیاست کا رنگ پکڑا تو فرانس کی جان پر بن آئے گی۔

غالباً فی الحال انگلستان اٹلی سے سمجھوتا کر کے اٹلی اور جرمنی کی دوستی میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کرے گا، اور فرانسیسی مجبوراً ان وعدوں پر اعتبار کریں گے جو ہٹلر نے کئے ہیں کہ وہ مغرب کی طرف قدم نہ بڑھائے گا، اس کے معنی یہ ہیں کہ وسط اور مشرقی یورپ میں اسے اختیار دیدیا جائے گا کہ جو چاہے کرے، اور فرانسیسی سیاست نے تعلقات کا جو جال پھیلایا تھا وہ تار تار ہو جائے گا۔ لیکن ایسی کوئی کارروائی شاید ہی ہو جس پر جرمنی کی قانونی گرفت کی جا سکے۔ آسٹریا کے نازی اپنا کرتب دکھا چکے ہیں، اب چکوسلوواکیا کے نازیوں کی باری ہے۔ ان کے سردار اس کا مطالبہ کر چکے ہیں کہ چکوسلوواکیا کو سوئٹزرلینڈ کی طرح قوموں کی قوم سمجھا جائے، اور اس کے چک، جرمن اور سلوواک حصوں کو خودمختار ریاستوں کی حیثیت دی جائے۔ یہ مطالبہ مان لیا گیا تو مشکل ہے، کیونکہ پھر چکوسلوواکیا کا صنعتی علاقہ، جہاں کی آبادی کا بہت بڑا حصہ جرمن ہے الگ ہو جائے گا، اور آسٹریا کی طرح وہ جرمنی میں شامل ہو گیا تو اسے کوئی منع نہ کر سکے گا۔ اور اگر یہ مطالبہ منظور نہ کیا گیا تو پھر خانہ جنگی کا بڑا خطرہ ہے، اور اس خانہ جنگی میں جرمنی کے لئے اپنی ہم قوموں کو خفیہ مدد پہنچانے میں ہر طرح کی آسانی رہے گی۔ لیکن چکوسلوواکیا کی حکومت کو بہت جلد فیصلہ کرنا پڑے گا، اور اسی کا انگریز، فرانسیسی، روسی اور جرمن دم برانتظار کر رہے ہیں۔

انگریز، فرانسیسی اور روسی اس وقت متحد ہو کر مشترک طرز عمل اختیار کریں تو جرمنی یقیناً دب جائے گا اور شاید چکوسلوواکیا کی جان بچ جائے۔ مگر روس سے سرمایہ دار اس قدر خائف اور خفا ہیں کہ وہ اس اتحاد سے بچنے کے لئے بہت کچھ نقصان اٹھانے پر تیار ہیں۔ ہٹلر کو انگریزی اور فرانسیسی ذہنیت کی اس گتھی کا راز معلوم ہے، اور اسی کے زور پر وہ اپنے مہروں کو برابر آگے بڑھاتا چلا جاتا ہے۔

مشرق بعید۔

یورپی ریاستیں اپنے معاملات میں الجھ گئی ہیں، روس میں "غداری" کا قصہ ختم ہی نہیں ہوتا، اور

خدا جانے بخارن، یا گودا، راکوفسکی اور ان کی ٹولی کے بعد کس کی باری آئے گی۔ جاپان کا اس سے بہرحال کام بنتا نظر آتا ہے۔ اب اس کے لئے بس ایک مہم، لنگہائی ریلوے جنکشن کی فتح باقی ہے۔ اس کے بعد چینیوں میں دم رہا تو وہ قزاقانہ جنگ کے ذریعے جاپانیوں کو ستائیں گے، لیکن جم کر مقابلہ کرنا درکنار، کسی بڑی فوج کو مقابلے کے لئے بھیج بھی نہ سکیں گے، اس لئے کہ ملک کی تمام ریلیں دشمن کے قبضے میں ہیں۔

یہ ریلیں یورپ اور امریکہ سے قرض لے کر بنائی گئی تھیں، اور ان کی آمدنی اور درآمد کے محصولوں پر بھروسا کرکے غیر قوموں نے چین کو قرضہ دیا تھا۔ ریلیں تو اس طرح ہاتھ سے گئیں، محصول کا حال یہ ہے کہ جاپانی خفیہ طور پر اپنا مال اس کثرت سے ملک کے اندر پہنچا رہے ہیں کہ محصول کا محکمہ معطل سا ہو گیا ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ جاپان کے سیاسی اور تجارتی حریف اگر چین کو چھوڑ کر اپنے اپنے گھر چلے نہ گئے تو بس بیٹھے جھک مارتے رہیں گے۔ (م۔ م)

اسلامی دنیا

مصر:-

انتخابات وفد اور بادشاہ کی ٹکر آخر ہو کر رہی، اور بیچ بچاؤ کرانے کے جتنے جتن ہوئے سب بیکار گئے، ۲۲ دسمبر کو بادشاہ نے اپنے اختیارات خصوصی سے کام لیتے ہوئے نحاس پاشا کی وزارت کو برخاست کر دیا، اور فرد جرم یہ لگائی کہ وفدی وزارت وطنی مفاد کو پس پشت ڈال رہی ہے، نئے وزیر اعظم محمد محمود پاشا مقرر ہوئے، موصوف نے دستور پر چلنے کا عہد کیا، اور وعدہ کیا کہ ان کا کابینہ ۲ فروری کو پارلیمنٹ سے پروانہ خوشنودی حاصل کرکے حکومت کرے گا:

اس سے پہلے جب کبھی وفدی وزارت ٹوٹتی مصری فوج اور پولیس کو امن قائم رکھنے کے لئے اچھی خاصی دوڑ دھوپ کرنی پڑتی، خونریزی ہوئی ہوتی، بہتوں کے سر ٹوٹتے، درجنوں زخمی ہوتے، اور "کمسن وفدی سورماؤں" کو اور نہیں تو کم سے کم سڑکوں کے لیمپوں پر اپنا غصہ نکالنے کا موقع مل جاتا، پر اب کی بار نہ کوئی مظاہرہ ہوا اور نہ اور کوئی ہنگامہ۔

۲ فروری کو پارلیمنٹ کا اجلاس بُلایا گیا، محمود پاشا کا خیال تھا کہ وہ وفد کی صفوں سے اتنے آدمی ضرور توڑلیں گے کہ اُن کی اقلیت اکثریت سے بدل جائے۔ اور نئی وزارت وفدی یلغار سے بچ نکلے لیکن آخیر وقت میں اُن کی ہمت نے جواب دے دیا۔ چنانچہ پارلیمنٹ کا اجلاس بادشاہ کے اس اعلان سے شروع ہوا کہ پارلیمنٹ معطل کی جاتی ہے، نئے انتخابات ۲ اپریل کو ہوں گے اور ۱۲ اپریل کو نئی پارلیمنٹ کا اجلاس ہوگا۔

اب ہر طرف انتخابات کی چہل پہل ہے، گو نحاس پاشا اور اُن کے دست راست مکرم پاشا کی روش نے بہت سے وفدی لیڈروں کو وفدی قیادت سے بدظن کر دیا ہے۔ لیکن جماعت کے رعب و وقار کا یہ حال ہے کہ چند ایک ممتاز افراد کے سوا کسی کو نحاس پاشا کے مقابل آنے کی جرأت نہیں ہوتی، نقراشی پاشا سابق وفدی وزیر اور احمد ماہر پاشا صدر پارلیمنٹ کو تو مجبوراً نحاس پاشا سے بھڑنا ہی پڑا۔ لیکن وفد کی بہت بڑی اکثریت نحاس کی قیادت پر راضی ہے، اب تک تو جب کبھی عام انتخابات کی نوبت آئی ملک نے ہمیشہ وفد کے حق میں رائے دی لیکن اس دفعہ معاملہ کچھ جدا ہے۔ خود وفد میں اختلاف ہے اور نحاس پاشا کی ہر دلعزیزی پہلی سی نہیں رہی، پہلے بادشاہ سے لوگ بیزار ہوتے، اور اُسے اور اس کے ساتھیوں کو انگریزوں کا پٹھو سمجھتے لیکن اب نہ وفد کی انگریز دشمنی باقی رہی اور نہ بادشاہ اتنا انگریز دوست ہے، برطانی مصری معاہدے میں وفدی اتنے جھک گئے تھے کہ اب انھیں غیر وفدی لیڈروں کو برطانیہ پرست کہنے کا حوصلہ نہ ہوگا،

وفد کی خواہش تھی کہ انتخابات کے زمانہ میں محمد محمود پاشا کی وزارت کی جگہ کوئی غیر جانب دار وزارت ہوتی۔ اور انھوں نے اپنے اس مطالبہ کو بادشاہ کے کانوں تک پہنچایا بھی، لیکن وہاں شنوائی نہیں ہوئی۔ موجودہ وزارت جمہور کو خوش کرنے کے لئے بڑی کوشش کر رہی ہے فلاح کی دست گیری کی اسکیمیں زیر غور ہیں۔ حکومت کے مصارف گھٹانے کے اعلانات کئے جا رہے ہیں، برطانی مصری معاہدہ میں کتر بیونت کی تجویزیں ہیں، اور تو اور بادشاہ کو ملک کے بعض حصوں میں پھرائے جانے کی تدبیریں کی جا رہی ہیں، الغرض وفد کو زک دینے کے لئے جو کچھ ممکن ہے موجودہ وزارت

کرنے پر تُلی ہوئی ہے۔

۲ر اپریل کو یہ معرکہ کارزار گرم ہوگا، ایسے موقعوں پر خون خرابہ تو ہوہی جاتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر وفد کا پلہ بھاری رہا تو بادشاہ اپنی ہار مان لے گا اور حکومت وفد کے سپرد کرکے راضی بتقدیر ہوجائے گا یا اپنی بات پر اڑا رہے گا، دوسری طرف وفدی کامیاب ہوکر اپنے مخالفوں کے ساتھ کیا سلوک کریں گے، ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے کہ نحاس پاشا پر ایک سرپھرے نوجوان نے حملہ کیا تھا اور موصوف نے اس کا الزام اپنے سیاسی حریفوں کے سر دھرا تھا شاید کامیابی کی صورت میں اپنے حریفوں سے انتقام لینے کا موقعہ بھی مل جائے اب دیکھنا یہ ہے کہ وفد کی کامیابی یا ناکامی مصری سیاست کو کس ڈگر پر ڈالے گی، ۲ر اپریل کا دن مصری سیاست کے لئے تاریخی دن ہے۔ اُمید ہے آیندہ پرچہ میں ہم تفصیل سے اس موضوع پر لکھ سکیں گے۔

خلافت | بعض ہندوستانی اخبارات میں اس خبر کو بڑی اہمیت دی جارہی ہے کہ جامعہ ازہر کے شیخ اعلیٰ مراغیؒ شاہ فاروق کو خلیفۃ المسلمین بنانے کی کوشش میں ہیں، سنتے ہیں ایک جمعہ کو شاہ فاروق ازہر کی جامع مسجد میں تھے، شیخ مراغی نے اپنے خطبہ میں امیر المومنین کے نام سے یاد کیا اور طلبہ نے "زندہ باد امیر المومنین" کے نعرے لگائے۔ بس پھر کیا تھا، ہندوستان کے بعض اہل قلم کو "ایک نئے فتنہ" کے ظہور کا وسوسہ پیدا ہوگیا۔ اور انہیں اس میں انگریزوں کی کارستانی کا ایک اور شعبدہ نظر آنے لگا؛

مصر میں احیائے خلافت کی تحریک ایک بار اور بھی ہوچکی ہے۔ مئی ۲۶ء کا ذکر ہے کہ علماء ازہر نے خلافت کے مسئلہ پر غور وخوض کرنے کے لئے ایک کانفرنس بلائی، دعوت تو دنیا جہان کے مسلمانوں کو دی گئی لیکن اس میں مصر کے علاوہ صرف ہندوستان سے ایک صاحب شریک ہوئے، مصری رائے عامہ اس کانفرنس کے خلاف تھی، علماء ازہر اپنی قدامت پرستی کی وجہ سے ملک میں کافی بدنام تھے، اور اس وقت کے شیخ ازہر سے تو لوگ اتنے بیزار تھے کہ اگر اُن کا منصب انتخاب سے ملتا ہوتا تو اُن کو کوئی مسلمان رائے نہ دیتا۔ ظاہر ہے ان حالات میں احیائے خلافت کا حشر ناکامی کے

سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔

بارہ برس بعد اب پھر ازہر کے ایوان سے خلافت کی آواز اٹھی ہے، اس عرصہ میں مصر کی سیاست کئی رنگ بدل چکی ہے، وطنیت کا وہ جنون جس نے مصریوں کو سرشار کر رکھا تھا اب کچھ ٹھنڈا پڑ رہا ہے، نہ بادشاہ وہ ہے اور نہ شیخ ازہر قدامت پرست اور عضو معطل، ممکن ہے احیائے خلافت کی نئی تحریک اپنے اندر کچھ اور معنی لے کر نکلی ہو، یہ بات تو کسی عامی کے دماغ میں بھی نہیں آسکتی کہ شاہ فاروق کو مصطفےٰ کمال، رضا شاہ، غازی شاہ عراق اور دوسری اسلامی حکومتیں اپنا خلیفہ مان لیں گی، ظاہر ہے شاہ فاروق کو امیر المومنین کے نام نامی سے ملقب کرنے کا مطلب کچھ اور ہے، مراغی اتنا بیوقوف نہیں کہ وہ ایسی موٹی سی بات کو بھی نہ سمجھے اور بے سروسامانی اور بے بضاعتی کے باوجود "نقلی خلافت" کا خواب دیکھے۔

بات اصل میں یہ ہے کہ سعد پاشا مرحوم کی قومی تحریک نے مصر کو بری طرح سے فراعنہ پرستی کی راہ پر ڈال دیا تھا، انگریزوں کے خلاف مصریوں کو نفرت تو تھی ہی، اور یہی نفرت کا جذبہ ان کی زندگی کے تمام معیاروں پر چھا گیا، اور وہ ہر چیز کو اسی نقطہ نظر سے دیکھنے لگے، وفدی انگریزوں کے دشمن ہیں اس لئے ان کی ہر برائی اچھائی ہے، بادشاہ کی انگریزوں سے کتنی دبتی ہے، اس لئے وہ مصر کا دشمن اور ملک کا غدار ہے، بدقسمتی سے وفد میں قبطی لیڈروں کا بڑا رسوخ تھا، سیاسی ضرورت اتحاد کی مقتضی تھی، اس اتحاد کے استحکام کے لئے قدیم مصر کی پرستش ضروری سمجھی گئی، خیالات اور افکار کو تو چھوڑئیے اس فراعنہ پرستی کی زندہ اور ناقابل انکار مثالیں دیکھئے۔

"بیداری مصر" کا مجسمہ بنتا ہے تو اس کے لئے "ابوالھول" قدیم مصری دیوتا کی شبیہ مستعار لی جاتی ہے، سعد زغلول مرحوم کا مزار فرعونی طرز تعمیر پر تیار ہوتا ہے، اور لاکھوں پونڈ ایک بدوضع عمارت پر خرچ کر دئیے جاتے ہیں پارلیمنٹ کے ایک ہال کو 'ایوان فرعون' سے موسوم کیا جاتا ہے، عمارتوں سے آپ خیالات کا اندازہ لگا سکتے ہیں، تعجب یہ ہے کہ مصر عہد اسلامی کی خوشنما عمارتوں سے پٹا پڑا ہے، لیکن مصر کے زعمار کو اس عہد کی یاد کھلتی تھی۔ جمہور سیاسی ہیجان میں تھے وہ ان باتوں کو

اول تو سمجھتے ہی نہ تھے، اور اگر بعض سمجھتے بھی تھے تو "زندہ باد مصر" اور "زندہ باد سعد" کے نعرے اُنہیں پھر بے حس کر دیتے۔

بھلا یہ ممکن ہے کہ ۹۰ فیصدی مصری مسلمان جو اپنے آپ کو اولادِ عرب کہتے ہیں، اور اُن کے دل اور دماغ اسلامی روایات کی تخلیق ہیں ان باتوں کو دیکھ کر صبر کرتے، کچھ عرصہ سے لوگوں میں غیر شعوری طور پر اسلامی جذبات کا اُٹھان شروع ہوا ہے اور اب یہ غیر شعوری جذبات واضح اور ٹھوس شکل اختیار کر رہے ہیں، درحقیقت یہ ردّ عمل ہے اُس وطنیت کے جوش کا جس نے مصریوں کو بیس برس تک مدہوش رکھا، اب سیاست کی ہنگامہ خیزی کا اُتار اُنھیں زندگی کے دوسرے شعبوں کی اہمیت جتلائے گا، اور ظاہر ہے ان شعبوں میں اسلام کا نمبر سب سے اول ہے،

فراعنہ پرستی کی تحریک کو پُرانے آثار کے اکتشافات سے زندگی ملی، سچ پوچھیے تو مصر قدیم کی زریں تاریخ اور اس کے زندہ جاوید کارناموں پر جو اب بھی دنیا کو حیرت میں ڈال رہے ہیں اہل مصر جتنا فخر کریں کم ہے، اس عرصہ میں اکثر یہ دیکھا گیا کہ جب کبھی کوئی نئے آثار ملتے تو مصری اہل قلم اور مصری اخبارات مہینوں تک اُن کی حمد و ثنا میں مصروف رہتے، ان باتوں سے بھلا فراعنہ پرستی کی تحریک کو کیوں نہ تقویت پہنچتی، اب اگر مصر کو اسلامی بنانا ہے، اور رمسیس اور توت عنخ آمون کی جگہ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عمرو بن عاص کے نام اُجاگر کرنے ہیں تو اہل ملک کے سامنے ایک نیا اور زوردار تخیل پیش کرنے کی ضرورت ہے، میرے خیال میں المراغی کی یہ کوششیں اسی تخیل کی تشکیل کے لئے ہیں۔

مصر نیم آزاد سہی، مصریوں کے اخلاق بھی زیادہ اچھے نہ سہی، ان میں ایک چھوڑ ہزارہا غلطیاں سہی لیکن کیا یہ واقعہ نہیں کہ مصر کے اخبارات، رسالے، اور کتابیں تمام اسلامی دنیا میں پڑھی جاتی ہیں، مصر کی اپنی تحریک نے تمام دنیا کے مسلمانوں کو متاثر کیا۔ شیخ محمد عبدہٗ کی تفسیر، شیخ رشید رضا کے اظہار اور مصری ترجموں نے کتنی علمی مجلسیں آباد کیں۔ کیا یہ سچ نہیں کہ مصر کے خزانہ سے ہزارہا پونڈ ارض مقدس کی آبادی پہ صرف ہوتے ہیں، مصر کی ایک درسگاہ ہندوستان، ترکی، جاوہ، مراکش، سوڈان، شام، عراق، حجاز اور یمن کے ہزارہا طلبہ کو مفت تعلیم دیتی ہے اور بہت حد تک اُن کے مصارف کی کفیل ہوتی ہے، دنیائے اسلام

پر نہ صرف آج سے بلکہ جب سے مصر اسلامی بنا ہے، نیل کی اس وادی سے خیر و برکت کی نہریں جاری ہیں، تاتاریوں کے سیلاب میں مصر نے ہی اسلامی شمع کو بجھنے سے بچایا، کے حملوں کو مصر نے روکا، اور پچھلی صدی میں اسلامی علم و تہذیب کی شمع سب سے پہلی بار نیل ہی کے کنارے پر روشن ہوئی؛

اگر شیخ مراغی مسلمانانِ مصر کو اس شاندار ماضی کی یاد دلائیں اور مستقبل کے لئے انھیں اسلامی دنیا میں اس سے زیادہ شاندار حیثیت پیدا کرنے کی راہ بتائیں تو اس میں اسلام یا مسلمانوں کا کیا نقصان ہے، شاہ فاروق حضرت عمر فاروق رضؓ تو ہونے سے رہا لیکن اگر اس کے سامنے رمسیس کی جگہ حضرت عمر فاروق کا اسوہ رکھا جائے اور اُسے اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی تلقین کی جائے تو اس میں کیا حرج ہے۔

مرکزی خلافت کا خواب اب شرمندہ تعبیر ہونے سے رہا، ضرورت اس کی ہے کہ اسلامی حکمران ہلاکو، کیخسرو اور رمسیس کا جانشین بننے کی بجائے امیر المومنین بنیں، اور پھر اسلامی دنیا کی مرکزیت کی کوئی دوسری صورت پیدا ہو۔

ایران:-

طہران کی ایک تازہ اطلاع سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت نے ایک فرمان جاری کیا ہے کہ یکم اپریل سے تمام تجارتی فرموں اور کمپنیوں کا حساب کتاب فارسی زبان میں رکھا جائے، کسی بدیشی کمپنی کو اپنی زبان میں حساب رکھنے کی اجازت نہ ہوگی، نیز دکانوں کے بورڈ اور اشتہارات فارسی زبان میں لکھے جائیں، اس سے پہلے ترکی حکومت بھی اس قسم کا قانون نافذ کر چکی ہے، اور وہاں یہ تجربہ کامیاب بھی ہوا۔

ممکن ہے بعض حضرات اس قسم کی پابندیوں کو تنگدلی اور تنگ خیالی گنیں اور اسے وطنی تعصبات کا ایک گھناؤنا منظر قرار دیں لیکن یاد رہے کہ ترکی اور ایران کا اس قبیل کے قوانین نافذ کرنا محض خیالی وطن پرستی کے جذبہ کی تسکین نہیں ہے بلکہ اس کی تہ میں ایک بہت بڑا معاشی اور تمدنی عنصر کار فرما ہے، جنگ عظیم کے بعد سے گو مشرق قریب کے یہ ممالک سیاسی لحاظ سے تو آزاد ہو گئے لیکن ان کی معیشت اور تمدن پر بدستور یورپ کا اقتدار ہے، تمدنی اقتدار کی داغ بیل ڈالنے والے یورپی مدارس ہیں جنھوں نے گذشتہ

پچاس سال میں ملک کے اعلیٰ طبقوں کو ایسے رنگ میں رنگ دیا ہے کہ وہ وطن کی ہر چیز کو بنظرِ حقارت اور یورپ کی ہر ادا کو معیاری سمجھنے لگ گئے ہیں، انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ چھوٹے بڑوں کی راہ پر چلتے ہیں، اعلیٰ طبقوں کی یورپ زدگی کا نتیجہ یہ نکلا کہ جمہور کے نزدیک بھی اپنی زبان کے سوا یورپ کی کسی دوسری زبان میں بات کرنا شرافت سمجھا گیا۔ اور یورپی معیاروں پر پورا اُترنا بلند پائگی کا لازمہ قرار پایا، اس رجحان کو ختم کرنے کے لئے ترکی حکومت نے کبھی تو یہ پابندی لگائی کہ تجارتی فرموں اور کارخانوں کے حساب ترکی زبان میں ہوں، کبھی بر سرِ عام اور ٹریم وے وغیرہ میں غیر ترکی میں بات کرنا جرم قرار دیا مقصد یہ کہ ملکی زبان کو حقیر سمجھنے کی ذہنیت بدل جائے اور لوگ یورپی زبانوں میں گفتگو کرنا اپنے لئے باعثِ عزت و شرافت سمجھیں۔

یہ تو ہوئے تمدنی اسباب، معاشی وجوہ یہ ہیں کہ جب تک تجارتی فرموں اور صنعتی کارخانوں کا حساب کتاب غیر ملکی زبانوں میں رہے گا ملک کے نوجوانوں پر اُن کے دروازے بند رہیں گے، وہ سرکاری مدارس میں ترکی اور فارسی پڑھیں گے لیکن کاروبار میں کھپنے کے لئے انگریزی اور فرانسیسی کی ضرورت ہوگی، مصر میں تعلیم یافتہ طبقے کی بے کاری کا بہت بڑا سبب یہی ہے۔ کاروبار کی زبان فرانسیسی ہے، مصری اس زبان کو سیکھنے کی لاکھ کوشش کرے؛ وہ فرانسیسی کا مقابلہ نہیں کرسکتا، نتیجہ یہ ہے کہ مصری بیچارہ یا تو ہل جوتتا ہے، یا سرکاری نوکری سے پیٹ پالتا ہے، ورنہ بھاؤڑہ چلاتا ہے، کاروبار کے دروازے اُس پر بند ہیں؛

اب اگر ایران میں تجارتی فرموں کے حساب فارسی میں ہو گئے تو ایران کے تعلیم یافتہ نوجوان ہزارہا کی تعداد میں ان کاموں میں لگ سکیں گے اور یورپی افراد کے لئے ملکی نوجوانوں کا مقابلہ کرنا مشکل ہو جائے گا؛

ہمیں ہمیشہ اس حقیقت کو مدنظر رکھنا چاہئے کہ اب تک ایران، ترکی اور عربی حکومتوں کی وطنیت کی شدت یورپی اقتدار کے خلاف گام فرسا ہے، اب تک ان ممالک میں اسلامیت اور وطنیت میں تصادم نہیں ہوا، ابھی تو ان کو یورپ سے اپنا حصہ بخرہ بٹورنا ہے، وہ ٹکر جس کا رونا ہمارے اہل وطن ابھی سے رو رہے ہیں بہت دور ہے۔ •

وطن پرست ایرانیوں، ترکوں اور عربوں کی ہر زد یورپی سامراج پر پڑ رہی ہے، قیاس غالب تو یہ ہے کہ یورپ سے نمٹتے نمٹتے یہ ممالک وطنیت کے غیر معتدل جنون سے نکل جائیں گے، اور اسلامیت اور وطنیت میں تصادم کا موقعہ ہی نہ آئے گا؛

حجاز :-

فلسطین کے خوں ریز واقعات اور اس پر اٹلی کی طرف سے ریڈیو پر جو زبردست پروپگنڈا ہو رہا ہے اُس نے عربی دنیا میں برطانیہ کے خلاف ہیجان پیدا کر دیا ہے، پچھلے دنوں سننے میں آتا تھا کہ ابن سعود برطانیہ کی عرب دشمن روش سے اپنی بے زاری کا اظہار کر رہا ہے اور اس کی سلطنت کے عرب باشندے اپنے فلسطین بھائیوں کی مصیبتوں پر پیچ و تاب کھا رہے ہیں، اس کے ساتھ انہی دنوں میں جزیرہ عرب کے اس بیدار مغز تاجدار کی طرف سے عقبہ و معان کی واپسی کا مطالبہ بھی شد و مد سے ہونے لگا، ظاہر ہے اگر بین الاقوامی پیچیدگیاں مصریوں کو شیر برطانیہ کے مقابل آنے کا حوصلہ دلا سکتی ہیں تو ابن سعود اس نازک صورت حال سے کیوں فائدہ نہ اٹھائے، ازبسکہ بحیرہ قلزم برطانی سلطنت کے لئے شاہ رگ کا حکم رکھتا ہے۔ اس لئے ابن سعود سے میل ملاپ رکھنا برطانی مفاد کے لئے بے حد ضروری ہے، اس سلسلہ میں ہندوستانی سول سروس کا پرانا گھاگ اور جہاں دیدہ مدبر الحاج شیخ فلبی جو چشم بد دور اب نہایت پکا مسلمان ہے بنفس نفیس جدہ میں یہ خدمت بہت خوش اسلوبی سے انجام دیتا ہی رہتا ہے لیکن ابن سعود کی موجودہ برہمی کو دور کرنے کے لئے اور تعلقات بڑھانے کی ضرورت تھی، بس پھر کیا تھا برطانی شاہی خاندان کے ایک فرد ارل آف اتھلون اور اُن کی بیوی کو سرزمین عرب کی سیاحت کی سوجھی، جدہ میں نہایت کر و فر سے اُن کا استقبال ہوا۔ عرب مہمان نوازی کے تو برطانی مدبر پہلے ہی سے قائل ہیں، اور ظاہر ہے کہ سیر و سیاحت کے لئے عرب کے لق و دق صحرا اور بے آب و گیاہ جنگلوں سے بڑھ کر اور کون سی پر فضا جگہ ہو سکتی ہے، ارل صاحب آئے بھی اور سیر تماشا کے بعد واپس تشریف بھی لے گئے، دیکھیں اس سیر تماشے کا حاصل کیا ہوتا ہے، معزز مہمانوں کی مہر و محبت ابن سعود کو عقبہ و معان کے تلخ مباحث کو نہ چھیڑنے پر مجبور کر دیتی ہے یا یہ "اکھڑ" مدبر برطانیہ کی

سیاسی چالوں کے دام سے بچ کر اپنے مطالبات پر مُصر رہتا ہے۔

انہی دنوں امام یمن کے ایک صاحبزادے بھی کافی عرصہ تک لندن میں رونق افروز رہے، برطانی ملقوں میں اُن کی بڑی آؤ بھگت ہوئی، برطانیہ یمن میں اٹلی کے بڑھتے ہوئے اثر سے خائف ہے، اس کی کاٹ کے لئے ایک تو اُس نے عدن کے آس پاس کی عرب نیم آزاد ریاستوں پر اپنی گرفت مضبوط کرلی ہے، اور دوسرے امام یمن سے دوستی کی پینگیں بڑھانی شروع کردی ہیں، برطانیہ کی ابن سعود سے تو دوستی ہے ہی، لیکن وہ امام یمن سے بھی بگاڑ پیدا کرنا نہیں چاہتا، عدن کے بالمقابل افریقی ساحل پر اٹلی کی مقبوضات ہیں، اور اگر خدانخواستہ عربی ساحل پر اٹلی کے قدم جم گئے تو برطانیہ کے لئے بحیرہ قلزم کا راستہ بند ہو جائے گا، اور اس طرح نہ نہر سویز کی کچھ اہمیت رہیگی، اور نہ عدن سے کچھ مطلب نکل سکے گا۔ (م۔س)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

زیرادارت :- ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے، پی ایچ ڈی

جلد ۲۹ مئی سنہ ۱۹۳۸ء نمبر ۵

فہرست مضامین

پرنٹر وپبلشر: پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن)
مطبوعہ محبوب المطابع برقی پریس دہلی

سالانہ پانچ روپیے

فی پرچہ آٹھ آنے

اسبابِ زوالِ امت

اس زمین کے اوپر اور اس آسمان کے نیچے سب سے زیادہ حیرت انگیز امر مسلمانوں کا زوال ہے۔

کیونکہ وہ ایسی سچی اور روشن کتاب کے حامل ہیں جو ان کو نہ صرف آخرت بلکہ دنیا میں بھی ہر قسم کی عزت اور بلندی بخشنے کا اعلان کرتی ہے۔

قرآن کا وعدۂ حق ہے کہ مومنوں کیلئے امن ہے۔

اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ اُولٰئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ وَھُمْ مُّھْتَدُوْنَ ۸۲/۶ — جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو انھوں نے ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا ان کے لئے امن ہے اور وہ ہدایت پر ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ عزت مومنوں کے لئے ہے۔

اِنَّ الْعِزَّۃَ لِلّٰہِ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ ۸/۶۳ — حقیقت یہ ہے کہ عزت اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کے لئے ہے۔

قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ مومنوں کی مدد اللہ کے ذمہ ہے اور وہی سربلند رہیں گے۔

وَکَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ ۴۷/۳۰ — اور ہمارے اوپر ہے حق مومنوں کی مدد کا۔

وَلَا تَھِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۱۳۹/۳ — اور نہ سست ہو اور نہ غم کرو حال یہ ہے کہ تمھیں سربلند ہو گے اگر تم مومن ہو۔

قرآن یہ بھی اطمینان دلاتا ہے کہ کفار کو مومنوں پر کبھی غلبہ نہ ہوگا۔

وَلَنْ یَّجْعَلَ اللّٰہُ لِلْکٰفِرِیْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًا ۱۴۱/۴ — اور اللہ کافروں کو کبھی مسلمانوں کے اوپر راستہ نہ دیگا۔

قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ مومن کفار پر ہمیشہ غالب رہیں گے۔

وَلَوْ قَاتَلَکُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا یَجِدُوْنَ — اور جو کفار تم سے لڑیں گے تو وہ نہ کوئی پشت پناہ

وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا ۲۲ؕ۔ پائیں گے نہ کوئی مددگار۔

اور قرآن مومنوں کے لئے روئے زمین کی بادشاہت کا بھی وعدہ کرتا ہے۔

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ ۵۵؍۲۴۔ اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور انھوں نے عمل صالح کئے کہ ان کو ضرور روئے زمین کا بادشاہ بنائیگا۔

لیکن ان کے برخلاف صدیوں سے مسلمان ایک مسلسل زوال اور انحطاط کے گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں جو سرعت کے ساتھ ان کو ہلاکت اور تباہی کی طرف لئے جا رہا ہے۔ اور نہ صرف یہ کہ وہ زندگی کی دوڑ میں اقوام عالم سے پیچھے رہ گئے ہیں بلکہ ان کا بڑا حصہ کفر و شرک سے مغلوب ہو کر محکومیت کے دردناک عذاب میں گرفتار ہے۔

ہمارا ایمان ہے کہ قرآن کریم کے وعدے غلط نہیں ہو سکتے۔ اور ممکن نہیں ہے کہ مومن ہوتے ہوئے ہمارے ساتھ اللہ اپنے وعدے پورے نہ کرتا۔ اس لئے کچھ خرابیاں ہمارے ہی ایمان و عمل میں ہیں جن کی وجہ سے ہم ان کے مستحق نہ رہ سکے۔

ہمارے اسباب زوال دو قسم کے ہیں ایک خارجی جو غیر مسلم اقوام کے حرب و ضرب و تغلب و تسلط سے پیدا ہوئے۔ دوسرے داخلی جو خود ہماری بے راہ روی اور سیاسی غلطیوں کی وجہ سے پیش آئے۔ میں انھیں داخلی اسباب سے بحث کروں گا۔ کیونکہ ملت کے امراض کے اصلی باعث یہی ہیں۔ انھیں کی بدولت ہم کمزور ہو گئے جس کی وجہ سے دوسروں نے جو توانا اور قوی تر تھے ہمارے اوپر اپنا تسلط جما لیا اگر ان اسباب کے دفعیہ کا سامان ہو جائے تو کمزوری خود بخود جاتی رہیگی۔

لہٰذا اصل نقطۂ بحث وہی امور ہیں جن کے باعث ہم انعامات الٰہی کے مستحق نہ رہے اور کرم کی جو بارشیں ہمارے اسلاف پر ہوئی تھیں ان سے محروم کر دئے گئے۔

اس لئے لازم ہے کہ آغاز عہد سے ان کے اوپر ایک سرسری نگاہ ڈالی جائے تاکہ مسئلہ کی حقیقت واضح ہو سکے۔

اسلامی تعلیم کی اصلی روح یہ ہے کہ انسانوں کا حاکم اکیلا اللہ ہے اور سب صرف اسی کے بندے ہیں۔ یہ وہ عظیم الشان منتہائے نظر ہے جو قرآنی آیات میں جا بجا واضح کیا گیا ہے۔

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاہُ ۔ کسی کی حکومت نہیں سوائے اللہ کے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ تم بجز اس کے کسی کے بندے نہ ہو۔

اسلام کی رو سے ایک انسان دوسرے انسان پہ یعنی ایک بھائی دوسرے بھائی پہ حکمراں نہیں ہو سکتا ان معنوں میں کہ اپنی منفعت کے لئے اپنی منشا کے مطابق اس پہ حکومت کرے۔ بلکہ اسلامی امارت کا مفہوم صرف یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے احکام الٰہی کی تنفیذ کی جائے اور بس۔ اللہ کے سوا اسلام کسی کو حاکم نہیں تسلیم کرتا۔

خلافت راشدہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ میں جس طریق پہ امت کو چلایا اس کے متعلق کچھ لکھنا ہی غیر ضروری ہے۔ وہ تو خالص پیغمبرانہ تعلیم اور مربیانہ تربیت تھی جو عالم کی تاریخ میں بے نظیر ہے۔ آپکا ۲۳ سالہ عہد نبوت گویا ۲۳ موتیوں کی مالا ہے جو زمانہ کی گردن میں پڑی ہوئی ہے۔ آپکی صحبت کے فیض سے صحابہ کرام نے خلافت کو انہی اصول پہ قائم کیا۔ خلیفہ میں شاہانہ تمکنت اور جاہ و جلال حکومت کی کوئی شان نہ تھی۔ عام لوگوں کی طرح وہ بھی سڑکوں پہ پیدل پھرتا تھا۔ نہ اس کے ساتھ محافظ ہوتے تھے نہ نقیب۔ سب لوگ اس سے ملتے تھے اور سب سے وہ ملتا تھا۔ اس میں اور دوسرے مسلمانوں میں بجز عہدۂ خلافت کے اور کوئی امتیاز نہ تھا۔ نہ اس کو اس قسم کی دینی ریاست حاصل تھی کہ جو چاہے حکم دیدے وہی مذہبی مسئلہ ہو جائے۔ بلکہ وہ صرف احکام دینی کو نافذ کرنے کا مجاز تھا۔

اس خلافت کا کل زمانہ تیس سال رہا۔ اس تیس سال کے عرصہ میں مسلمانوں کو وہ سربلندی نصیب ہوئی کہ ترکستان سے بحر خزر تک اور افریقہ میں تونس تک اسلام پھیل گیا اور قوت اس قدر زبردست ہو گئی کہ روئے زمین پر کسی کو ان سے ٹکرانے کا یارا نہ رہا۔ یہ تمام آسمانی برکتیں اور فتوحات اور امت اسلامیہ کی یہ عظمت و شان اس وجہ سے تھی کہ سب اسلامی نظام میں منسلک اور اکیلے اللہ

کے فرمانبردار تھے۔ خلیفہ کی ذات میں انکی مرکزیت تھی جس کی وجہ سے ان کے ملی مقاصد متعین تھے اور ساری اُمت ایک محور پر گھومتی تھی۔

عہد نبی امیہ | خلافت راشدہ کے بعد نبی امیہ کا دور آیا جو اس دن سے شروع ہوا جس دن امیر معاویہ کی خلافت پر عام بیعت ہوئی یعنی ۴۱ھ۔ اس دور میں بھی جو ۹۲ سال رہا اُمت ایک ہی جھنڈے کے نیچے رہی۔ خلفاء راشدین کی طرح ان خلفاء کی ذات میں بھی امت کی مرکزیت قائم تھی۔ اور خواہ وہ کیسے ہی رہے ہوں اسلامی قوت اور شوکت کو انھوں نے سنبھالے رکھا۔ بلکہ ولید بن عبدالملک کے عہد میں تو فتوحات کے حدود مشرق میں سندھ اور چینی ترکستان تک۔ اور مغرب میں اندلس تک پہنچ گئے تھے۔ اور بری فوجوں کے علاوہ ایک طاقت ور بحری بیڑہ بھی تھا جس نے سطح آب پر کئی بار رومیوں کو شکستیں دی تھیں۔ دولت کی فراوانی کا یہ حال تھا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عہد میں اہل نصاب راتوں کو اشرفیوں کی تھیلیاں لے کر گھومتے تھے مگر کوئی لینے والا نہیں ملتا تھا۔

استبداد | مگر باوجود ان خوبیوں کے مرض پیدا ہو چکا تھا یعنی استبداد۔ وہ استبداد جو اقوام دائم کے لئے ہمیشہ مہلک ثابت ہوا ہے۔ اس کا پہلا مظہر خود انکی خلافت تھی۔ خلفاء راشدین میں سے اگرچہ ہر ایک کی نوعیت انتخاب جداگانہ تھی مگر مشورہ اور بیعت عامہ یعنی جمہوریت کی روح ہر ایک میں موجود تھی۔ لیکن امیر معاویہ جو خلافت نبی امیہ کے بانی ہیں انکا انتخاب عام نہیں ہوا تھا۔ صرف اہل شام نے ان کو خلیفہ بنایا تھا اور اہل عراق نے امام حسن کو منتخب کیا تھا۔ مگر جب امیر معاویہ نے ان پر لشکر کشی کی تو انھوں نے امت میں خونریزی کو ناپسند کر کے مصالحت کر لی۔ لہٰذا اہل عراق نے بھی امیر معاویہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی مگر مغلوب ہو کر۔ اس وجہ سے ان کی خلافت میں تغلب شامل تھا۔ چنانچہ جب حضرت سعد بن وقاص فاتح قادسیہ جو عشرۂ بشرہ میں سے ہیں امیر معاویہ کے پاس آئے تو ان کو اس طرح سلام کیا جس طرح بادشاہوں کو کیا جاتا ہے۔ امیر معاویہ ہنسے اور کہا کہ اگر تم مجھے امیرالمومنین کہتے تو کیا بگڑ جاتا۔ انھوں نے جواب دیا کہ جس طریق سے تم نے خلافت حاصل کی ہے اگر مجھے ملتی تو میں کبھی اس کو قبول نہ کرتا۔

غرض اہل نظر اور ارباب صلاح خلافت کو اسی رنگ میں دیکھنا چاہتے تھے جو خلفاء راشدین کے عہد میں تھا۔ امیر معاویہ کا غلبہ اور تسلط سے اس کو حاصل کرنا ان کو پسند نہ تھا۔ اگرچہ بعد میں یہ تغلب رضامندی سے بدل گیا۔ کیونکہ امیر معاویہ کی خلافت کی قابلیت میں کسی شخص کو بھی اختلاف نہ تھا۔ لیکن انھوں نے خلیفہ کے انتخاب عام کے دستور ہی کو توڑ ڈالا اور اپنے بعد اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد مقرر کیا جس کے بعد سے خلفاء بنی امیہ سلسلہ وار اپنے ہی خاندان کے افراد میں سے جس کو چاہتے تھے ولی عہد بناتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انکی خلافت پر استبداد کا رنگ غالب رہا اور انکی حکومت خاندانی سلطنت ہو گئی۔ مگر چونکہ خلیفہ کا لفظ دینی اقتدار اپنے ساتھ لئے ہوئے تھا اس لئے انھوں نے اس لقب کو ترک نہیں کیا۔ کیونکہ اس کے ذریعہ سے وہ لوگوں پر اپنا مذہبی اثر قائم رکھتے تھے۔ بے شک بنی امیہ کی حکومت میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کا عہد مستثنیٰ ہے جنھوں نے انکے مظالم کو مٹا کر خلافت راشدہ کی شان قائم کر دی تھی مگر ان کا کل زمانہ صرف ۲ سال پانچ ماہ تھا۔

قہر و غلبہ | بنی امیہ کے عہد میں قہر و غلبہ کی حکمرانی تھی۔ یہاں تک کہ عبدالملک نے جو انکا چوتھا اور سب سے مدبر خلیفہ تھا صاف صاف کہدیا کہ "تم لوگ کیونکر یہ خواہش رکھتے ہو کہ ہم شیخین کے طریقہ سے تمھارے اوپر حکومت کریں پہلے خود تو ویسے بنو جیسے ان کے زمانہ کے لوگ تھے" اس وجہ سے انکی حکومت میں وہ مظالم ہونے لگے جو استبداد میں لازمی ہیں۔ لوگ سختی کے ساتھ دبائے جانے لگے۔ جس کی طرف سے مخالفت ہوتی اس کا سر کٹوا کر مشتہر کیا جاتا تاکہ دوسرے لوگ ڈر جائیں اور مخالفت کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔

خلفاء کے علاوہ ان کے بعض بعض عمال نے بھی آزاد طبع اور حریت پسند مسلمانوں کو جنھوں نے خلافت راشدہ کا عہد دیکھا تھا نہایت سختی کے ساتھ محکوم اور رعایا بنانا شروع کیا۔ زیاد اور اس کے بیٹے ابن زیاد کے مظالم مشہور ہیں۔ یہ صرف شبہہ پر لوگوں کو گرفتار کر کے سخت سے سخت سزائیں دیتے تھے۔ حجاج بن یوسف کوفہ کے عامل نے جس قدر آدمیوں کو قتل کیا مسعودی کے بیان کے مطابق انکی تعداد سوا لاکھ سے کم نہ تھی۔

تفریق اُمت استبداد کی خصوصیات میں سے یہ بھی ہے کہ اس کی حکومت رعایا کے فائدہ کے لئے نہیں ہوتی بلکہ حکمراں جماعت کے مقاصد کے لئے ہوتی ہے ۔ یہ خلفاء اپنے مخصوص اغراض کے لئے ملت میں وحدت قائم رکھنا نہیں چاہتے تھے ۔ بلکہ جاہلانہ عصبیتوں کو ابھار کر انکو ایک دوسرے کا دشمن رکھتے تھے تاکہ ضرورت پر ایک فریق سے دوسرے فریق کے مقابلہ میں کام لے سکیں ۔ ان باہمی عداوتوں کی وجہ سے خود خلفاء کو بھی خطرہ رہتا تھا اس لئے وہ اپنے ساتھ محافظ دستے رکھتے تھے یہاں تک کہ مسجدوں میں بھی ان کے لئے مقصورے بنائے جاتے تھے اور جب وہ نماز پڑھتے تھے تو دائیں بائیں دونوں طرف مسلح سپاہی حفاظت کے لئے کھڑے رہتے تھے ۔ حالانکہ خلفاء راشدین عام لوگوں کی طرح بازاروں میں پھرتے تھے ۔ اور سب کے ساتھ مسجدوں میں جاتے تھے اور خود نماز پڑھاتے تھے ۔

بیت المال سب سے بڑی بات یہ تھی کہ خلفاء راشدین عام افراد ملت کی طرح بسر کرتے تھے۔ بیت المال کو مسلمانوں کی ملکیت سمجھتے تھے اور خود اپنے مال سے زیادہ اس کی حفاظت کرتے تھے ۔ اس میں سے سوائے اس کے جو ان کے گزارہ کے لئے مقرر کر دیا جائے اپنی ذات کیواسطے ایک حبہ بھی نہیں لیتے تھے ۔ اس پر بھی کہا کرتے تھے کہ خلافت کی ذمہ داریوں سے قیامت کے دن اگر ہم بلا عذاب اور ثواب کے نکل گئے تو بہت بڑی کامیابی ہے ۔ لیکن خلفاء بنی امیہ شاہانہ شان و شوکت سے رہتے تھے بیت المال کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھتے تھے ۔ اور جس طرح چاہتے تھے اپنی منشا کے مطابق اس کو صرف کرتے تھے ۔

ظاہر ہے کہ جس کا اقتدار خزانہ پر ہوگا وہی ملک کے لوگوں پر اپنا اثر قائم کر سکتا ہے ۔ یہ خلفاء مسلمانوں کے بیت المال کو اپنے استبدادی اغراض پر صرف کر کے لوگوں میں مقبولیت حاصل کرتے تھے ۔ کیونکہ جو لوگ ان کے یہاں سے تنخواہیں پاتے تھے ان میں یہ جرأت باقی نہیں رہتی تھی کہ مخالفت کر سکیں ۔ جو نافرمانی پر آمادہ ہوتا اس کی تنخواہ بند کر دی جاتی ۔ چنانچہ یزید کے عہد میں اہل حرمین کی اور ولید کے زمانہ میں آل حزم کی تنخواہیں بند کی گئیں ۔ انصار کے وظائف بارہا اس بنا پر روک دئے گئے کہ اہل بیت کی طرفداری کرتے ہیں ۔

مدینہ کا عامل زکوٰۃ کی رقم قریش کے اعیان کو قرض پر دیتا تھا جس کی وجہ سے ان پر اپنا قابو رکھتا تھا۔ جہاں کوئی مخالفانہ حرکت ان سے نمایاں ہوئی فوراً قرض کا مطالبہ شروع ہو جاتا۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ بنی امیہ کی اطاعت پر مجبور ہو گئے۔

ہوس زر | خلافت راشدہ میں ممالک مفتوحہ سے محاصل اس لئے وصول کئے جاتے تھے کہ مجاہدین کی ضروریات رفع کی جائیں لیکن بنی امیہ کا نصب العین چونکہ اپنے گھرانے میں ایک مستقل سلطنت قائم کرنا تھا اس لئے ان کو ضرورت ہوئی کہ طاقتور قبائل و اشخاص پر اپنا اثر رکھیں۔ اس کی صورت سوائے اس کے اور کیا تھی کہ انکے سامنے دولت پیش کریں۔ چنانچہ انھوں نے بیت المال کو اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا اور جا و بیجا بے دریغ اس کی رقمیں صرف کرنے لگے۔ امراء و روساء قبائل کے علاوہ خطباء و شعراء کو بھی بڑی بڑی رقمیں زبان بندی کے لئے دی جاتی تھیں۔ یہی وجہ ہوئی کہ محاصل کی وصولی میں ناجائز سختیاں بھی عمل میں آنے لگیں۔ یہاں تک کہ بعض صوبوں میں ذمیوں کے مسلمان ہو جانے کے بعد بھی ان سے جزیہ وصول کیا جانے لگا۔ افریقہ اور خاصکر خراسان میں اس جھگڑے نے بہت طول کھینچا۔ جب حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو انھوں نے یہ کہکر کہ ہم مبلغ ہیں محصل نہیں ہیں اس خلاف اسلام طریقہ کو بند کیا جس کے بعد لاکھوں ترک حدود سمرقند میں جو اسلام سے برگشتہ ہو گئے تھے پھر مسلمان ہو گئے۔

مال زکوٰۃ کو بھی جس کے مصارف خود قرآن کریم نے متعین کر دیے ہیں یہ خلفاء اپنے ذاتی مصارف میں خرچ کرتے تھے۔ یہ دیکھکر عمال حکومت میں بھی دست درازی کی عادت ہو گئی۔ خلفاء بنی امیہ نے ایک مد تحصیل زر کی یہ بھی نکالی کہ عہدوں کو فروخت کرنے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عمال ان کو اپنی زرخرید جائداد سمجھ کر رشوت۔ غبن اور جبر ہر طریق سے دولت پیدا کرنے لگے۔ خلفاء جب ان سے خفا ہوتے تو ان کو برطرف کر کے ان کی جائدادیں ضبط کر لیتے۔

الغرض شخصی اور استبدادی حکومت کی جو لازمی خرابیاں ہیں وہ خلافت بنی امیہ میں پیدا ہو چکی تھیں۔ خلفاء بنی امیہ اگرچہ مسلمانوں کا مرکز تھے لیکن انکی مرکزیت خلفاء راشدین کی طرح اخوت۔ مساوات

اور جمہوریت کی مرکزیت نہ تھی۔ بلکہ انھوں نے ملت اسلام کو جو خلافت راشدہ کے زمانہ میں صرف اللہ کی غلام تھی اپنا غلام بنا لیا تھا۔

بنی عباس بنی عباس جنھوں نے مخفی تبلیغوں سے بنی امیہ کی بغاوت کا بیج بویا اور پھر ان کے مقابلہ کے لئے لوگوں کو کھڑا کیا جب کامیاب ہو کر ۱۳۲ھ میں تخت خلافت پر آ گئے تو انھوں نے بھی وہی استبداد قائم رکھا جو بنی امیہ کے عہد میں تھا۔ ان میں سے ابتدائی آٹھ خلفار کا زمانہ جو تقریباً سو برس رہا قوت اور شوکت کا زمانہ تھا۔ انھوں نے شعائر اسلامی کا احترام رکھا۔ نمازیں بھی پڑھتے تھے۔ حج بھی کرتے تھے اور جہاد میں بھی حصہ لیتے تھے مگر باوجود اس کے ملک و ملت کو ہمیشہ کے لئے اپنا اور اپنی اولاد کا غلام رکھنا چاہتے تھے۔ ایک کے بجائے دو دو بلکہ تین تین ولی عہد مقرر کرتے تھے اور ان عہدناموں پر اللہ، رسولؐ اور ملائکہ سب کو گواہ بناتے تھے تاکہ یہ "جائداد" کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہ جا سکے اور ابد تک ساری ملت اسلامیہ انھیں کے استبداد کے شکنجوں میں رہے۔

خلفار بنی امیہ کو تو جملہ امت کی مرکزیت بھی حاصل تھی مگر بنی عباس کے قبضہ سے اندلس روز اول سے خارج رہا جہاں بنی امیہ کے بقایا میں سے ایک شخص عبدالرحمٰن بن معاویہ نے پہنچکر اپنی سلطنت قائم کر لی جو تھوڑے ہی دنوں کے بعد عظمت و شان کے لحاظ سے خلافت عباسیہ کی حریف ہو گئی۔ علاوہ بریں عہد بنی امیہ میں قوت کی حکمرانی تھی کیونکہ انکی سلطنت اپنی قوم عربوں کی عصبیت اور طاقت پر قائم تھی مگر بنی عباس نے عجمیوں خاصکر خراسانیوں کی مدد سے سلطنت حاصل کی تھی اس وجہ سے کوئی قومی طاقت ان کے پاس نہ تھی۔ انکی خلافت بجز اس کے کہ خلیفہ عرب تھا اور زبان عربی تھی سر تا سر عجمی تھی۔ اور ساری وزارتیں اور امارتیں عجمی موالیوں کے ہاتھوں میں تھیں۔ یہی وجہ ہوئی کہ بنی عباس کو یہ خطرہ ہوا کہ کہیں یہ خلافت کو ہمارے ہاتھوں سے نکالکر دوسرے کو نہ دیدیں۔ چنانچہ انھوں نے ایرانیوں کی طاقت کے بالمقابل ترکوں کی بھی ایک فوج مرتب کی تاکہ توازن قائم رکھیں۔ مگر اس ترکی فوج نے خود خلفار پر تغلب حاصل کر لیا۔ جس کو چاہتے تھے خلیفہ بناتے تھے اور جس کو چاہتے تھے معزول بلکہ قتل کر دیتے تھے۔ خلفار کی اس بے بسی کے زمانہ میں نئی نئی اسلامی سلطنتیں ظہور پذیر

ہونے لگیں جن کے غلبہ سے وہ بالکل بدست و پا ہوگئے دیالمہ اور سلاجقہ کے تسلط کے عہد میں جو صدیوں رہا ان خلفاء کا صرف مذہبی اثر رہ گیا تھا اور حکومت سلاطین کے ہاتھوں میں تھی یہاں تک کہ ۲۹۵ء میں افریقہ میں فاطمیہ نے اور اس کے بعد اندلس میں عبدالرحمٰن ناصر نے اپنی اپنی خلافتوں کا اعلان کر دیا جس سے دنیائے اسلام میں بیک وقت تین خلافتیں قائم ہوگئیں جو ایک دوسری کی حریف تھیں۔ اور وہ مرکزیت جسکو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوع انسانی کی صلاح و فلاح کے لئے نصب فرمایا تھا ان قریشی خانوادوں کی باہمی رقابت اور دنیاوی منافست سے بازیچۂ طفلاں بنگئی۔

خلافت کا مقصد یہ تھا کہ جملہ بنی نوع انسان صرف حکومت الٰہی کے فرماں بردار ہوں نہ کہ انسانوں کے۔ لیکن خلفاء بنی امیہ و بنی عباس نے اس کو محض خاندانی سلطنت بنانے کی کوشش کی جس کا انجام وہی ہوا جو ہر ایسے دنیاوی کارگاہ عمل کا ہوا کرتا ہے امراء و لایات نے جب خلفاء کی یہ خودغرضی دیکھی تو ان میں بھی اسی قسم کی خواہش پیدا ہوئی اور وہ یکے بعد دیگرے خود مختار ہوتے گئے۔ خلفاء کا رسماً صرف اس قدر اثر رہ گیا تھا کہ یہ متغلبین تحفے اور ہدئے بھیجکر ان سے اپنی اپنی حکومتوں کے فرمان لکھوا لیتے تھے۔ آخر ۶۵۶ھ میں یہ بے جان خلافت ہلاکو کے ہاتھوں غارت ہوگئی۔

خلفاء عثمانیہ | بغداد کی عباسی خلافت کی تباہی کے بعد سلاطین مصر نے انھیں بقایائے بنی عباس میں سے ایک شخص کو مصر میں خلیفہ بنالیا تاکہ اس کے ذریعہ سے اپنی حکومت کو مستحکم رکھیں۔ ان خلفاء کا عزل ونصب خود سلاطین مصر کے ہاتھوں میں تھا جن کے وظیفہ پر یہ گزر کرتے تھے۔ ۹۲۳ھ میں سلیم عثمانی نے مصر کو فتح کر کے خلافت بھی حاصل کرلی اور اس طرح اپنے دنیاوی وقار کے دستار میں دینی عزت کا بھی طرہ لگایا۔ لیکن خلفاء عثمانیہ بالطبع اپنے رتبۂ سلطنت ہی کو جس کے ذریعہ سے انھوں نے خلافت حاصل کی تھی بالاتر سمجھتے رہے۔ اور سوائے سلطان کے کبھی اپنے آپ کو خلیفہ کہلانا پسند نہ کیا۔ علاوہ بریں انکی خلافت بھی خلافت عامہ نہ تھی بلکہ ان کے رقبۂ مقبوضہ تک محدود تھی۔ اور انھوں نے شروع سے آخر تک بجز حرمین شریفین کے خادم اور جزیرۃ العرب کے محافظ ہونے کے جو فتح مصر کے بعد انکی سلطنت کا جزو ہوگیا تھا فرائض خلافت کا خیال نہ رکھا۔ یہاں تک کہ حج جس میں اقصائے عالم کے

مسلمان آکر شریک ہوتے ہیں اور جو اجتماع ملت کا دینی مرکز ہے اس میں بھی وہ کبھی نہیں آئے۔ بالآخر ۱۳۴۲ھ میں جمہوریہ ترکیہ نے اس خلافت کا بھی جو اتحاد ملت کا ایک بوسیدہ رشتہ اور بے معنے ادارہ رہگیا تھا الغا کر دیا۔ جس کے بعد سے مسلمانوں کی مرکزی زندگی کا نام بھی جاتا رہا۔

آج امت اسلامیہ کی تعداد تمام عالم میں تخمیناً ساٹھ کروڑ بتائی جاتی ہے جو دنیا کی بڑی سے بڑی قوموں کی تعداد سے اگر زیادہ نہیں ہے تو کم بھی نہیں ہے۔ مگر ان میں سے سوائے ترک، ایرانی۔ افغانی اور عرب کے جن کی مجموعی تعداد چھ کرور سے زیادہ نہیں ہے بقیہ ساری امت غیر مسلم حکومتوں کے قبضہ میں ہے۔ یعنی مسلمانوں کی مجموعی تعداد کا زیادہ سے زیادہ صرف دسواں حصہ ہے جو آزاد کہا جا سکتا ہے ان آزاد اقوام مسلمہ کا بھی کوئی ایک مرکز نہیں ہے بلکہ متعدد خود مختار سلطنتوں میں یہ بٹی ہوئی ہیں۔ عرب جس سے اسلام کا چشمہ ابلا تھا آج اس میں چھوٹی بڑی ۹ سلطنتیں ہیں جن میں سے کوئی کسی کے اثر میں ہے اور کوئی کسی کے۔ یہ سارا نتیجہ ہے امرار و سلاطین امت کی ان مطلق العنانیوں کا جن کی وجہ سے انھوں نے مرکزیت کا لحاظ نہیں رکھا اور اپنے ذاتی اغراض کے پیچھے ملت کے انجام پر نظر نہیں ڈالی۔

جو مسلم قومیں دوسروں کی محکوم ہیں انکا انتشار تو اس درجہ پر پہنچ گیا ہے کہ ان کے اعمال سے صلاحیت مفقود ہوگئی ہے۔ ادہر کم سے کم دو سو سال کے کارناموں پر اگر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ باوجود کوششوں اور قربانیوں کے بھی کامیابیوں کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہو سکا۔ مراکش سے لیکر دیوار چین تک کتنے ہنگامے اٹھے۔ اور کتنے مجاہدانہ معرکے ہوئے مگر ہر ایک میں نقصان ہی اٹھانا پڑا۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ امت کا شیرازہ بکھرا ہوا ہے اور کوئی مرکز نہیں ہے جو اس کی قیادت کرے تاکہ اس میں عمل صالح کی حرکت پیدا ہو۔

ہندوستان کے متعلق میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ اس کی حالت خود آپ کے سامنے ہے۔ یہاں نو کرور کے قریب مسلمان آباد ہیں مگر اجتماعی زندگی کا نام تک نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم دن بدن ہر لحاظ سے گرتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ کوئی راہ نہیں جس پر سب متفق ہو کر چلیں۔ کوئی کام نہیں جس کو سب ملکر کریں۔ جمود اور تعطل کی زندگی ہے اور ہاتھ پر ہاتھ دہرے بیٹھے ہیں۔

ذہنی تشتت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے صرف ایک کتاب لے کر آئے تھے یعنی قرآن کریم جس پر عمل کر کے صحابہ کرام نے دینی اور دنیاوی سربلندی حاصل کی۔ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم نے اپنا عمل اسی کتاب پر رکھا اور امت کو اس سے ہٹنے نہ دیا جس کی وجہ سے ان کے زمانوں میں کوئی مذہبی فرقہ پیدا نہ ہوسکا اور ساری ملت متحد رہی۔

عہد بنی امیہ میں جب استبداد کا تسلط ہوا تو خلفاء نے دنیا کو لیکر دینی قیادت چھوڑ دی جو علماء کے حصہ میں آگئی۔ اسی وقت سے اختلافات پڑنے لگے، اور شخصیت پرستی کی وجہ سے نت نئے فرقے بنے شروع ہو گئے۔ عباسی عہد میں فقہا میں اختلافات واقع ہوئے جن کی وجہ سے رفتہ رفتہ ان کے پیروؤں کی ٹولیاں الگ الگ ہونے لگیں۔ اسی زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال وغیرہ روایات کے ذریعہ کتابوں میں مدوّن کئے گئے۔ نیز علوم عقلیہ کے تراجم ہوئے۔ اس وقت سے اختلاف روایات وتاویلات کے باعث یہ ذہنی تشتت اور بھی بڑھ گیا۔ چنانچہ ایک ہی ملت میں ۷۲ فرقے بنگئے جن میں سے ہر ایک اپنے ہی کو ناجی سمجھنے لگا اور دوسروں کو ناری۔ اس طرح پر ملت کی وحدت پارہ پارہ ہوگئی۔

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے امت اسلامیہ کو دو عظیم الشان نعمتیں ملی تھیں۔ ایک قرآن کریم، دوسری امامت کبریٰ یعنی مرکزیت امت جس کو آپ نے نصب فرمایا تھا۔ ملوک اور سلاطین نے مرکزیت کو فنا کر دیا اور علماء وفقہا نے قرآن کی جگہ حدیث وفقہ کی کتابوں پر عملدرآمد شروع کیا جس سے دنیاوی اور دینی دونوں لحاظ سے امت میں لامرکزیت پیدا ہوگئی۔ اور یہی زوال کا باعث ہوئی۔

مستقبل امت کی آئندہ صلاح وفلاح کی صورت صرف یہی ہے کہ لامرکزیت چھوڑ کر وحدت کی طرف آئے۔ یعنی رفتہ رفتہ مسلمانوں کا مرکز ایک ہو جائے جہاں سے ملت کے اجتماعی مقاصد کی تعیین اور ان کو عمل میں لانے کی تشکیل ہو اور دینی مرکز صرف قرآن کریم ہو تاکہ ہر قسم کی فرقہ بندی مٹ جائے، اور سب کے سب متحد ہو کر ایک راستہ پر گامزن ہوں۔

حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد مسلم اقوام نے اس حقیقت کو سمجھ لیا ہے اور اُن کے پیش نظر
نہ صرف ملت کا اتحاد عمل ہے بلکہ مرکزیت کا نصب کرنا بھی مقصود ہے۔ اس لیے اُمید ہوتی ہے کہ شاید
ان عروق مردہ میں پھر زندگی کا خون دوڑنے لگے۔ اور ساری اُمیدیں تو اللہ کے کرم اور رحم سے ہیں
جو افراد کی طرح ملت کے گناہوں کو بھی معاف کر دیتا ہے۔

جارج برنارڈ شا

مسٹر چرچل اپنی تازہ تصنیف "دورِ حاضر کی نہ بھولنے والی شخصیتیں" کے ایک باب کا آغاز کرتے ہوئے لکھتے ہیں "مجھے اوائل عمر میں جن لوگوں سے نفرت تھی، اُن میں سے ایک جارج برنارڈ شا بھی تھا" میں نے اپنا سب سے پہلا ادبی مقالہ بھی اُسی کے خلاف لکھا۔ یہ ۱۸۹۷ء کا ذکر ہے۔ جب وہ ہندوستانی فوج میں لفٹیننٹ کی حیثیت سے ملازم تھا۔ مگر افسوس میرا وہ مضمون کبھی نہ چھپ سکا۔ میرا مقالہ اُس کے ایک طنزیہ مضمون کے جواب میں تھا جو اُس نے ایک چھوٹی سی جنگ کے سلسلہ میں فوج کے خلاف احتجاجاً لکھا تھا۔ میں نے اپنے مقالہ میں دل کھول کر اس کی خبر لی"

"اس واقعہ کے چار پانچ سال بعد میری اُس سے ملاقات ہوئی۔ میری ماں کا حلقۂ احباب زیادہ تر ادبی اور ڈرامے سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں پر مشتمل تھا۔ اور اسی سلسلہ میں وہ مجھے ایک دن برنارڈ شا کے ہاں لے گئی جہاں وہ لنچ پر مدعو تھی۔ اس کی پُر لطف اور برجستہ گفتگو نے پہلی ہی ملاقات میں مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اس کا سادہ کھانا۔ پھل، سبزی اور پانی — دیکھ کر میں اور بھی متاثر ہوا۔

میں نے اُس سے پوچھا: "کیا آپ واقعی شراب نہیں پیتے؟"

اُس نے مسکرا کر جواب دیا: "میں اُسے پی کر اپنے آپ کو قابو میں نہیں رکھ سکتا"

شاید اُسے علم ہو گیا تھا کہ میرے خیالات اُس کے خلاف ہیں۔

جنگِ عظیم سے پہلے اور اس کے بعد بھی میری اس سے پُر لطف ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ جن میں سے بعض کی یاد تو مجھے زندگی بھر نہیں بھولیگی۔ ہمارا موضوعِ گفتگو اکثر سیاسیات ہوا کرتا تھا۔ مگر آئرلینڈ اور سوشلزم پر خصوصیت سے ہم مذاکرہ کیا کرتے۔ اور اکثر باتوں میں مجھے اُس سے اختلاف تھا۔ لیکن اس اختلاف رائے کو اُس نے کبھی بُرا نہیں مانا۔ کیونکہ جب اس کا شاہکار "رہنمائے اشتراکیت سمجھدار عورتوں کے لیے" چھپا تو اُس نے مجھے بھی ایک کتاب بطور ہدیہ دیتے ہوئے کہا:

"تمہیں اس کتاب کو پڑھنے سے روکنے کے لیے یہ طریقہ سب سے موثر ہے"
بہرحال میری آنکھوں کے سامنے اس کا نام سن کر ایک روشن دماغ، کمزور جسم، تند خو اور معاملہ فہم انسان کا تصور آجاتا ہے جو آزاد پرندے کی طرح کھلی دھوپ کو پسند کرتا ہے۔ اور جس کی موت میرے لیے ایک جانکاہ صدمہ ہوگا"

ایڈورڈ شینکر جنہوں نے برنارڈ شا کی سوانح حیات لکھی ہے۔ ایک جگہ اس کی شخصیت کے متعلق لکھتے ہیں کہ "اس بات سے کہ وہ آئرلینڈ میں پیدا ہوا یہ یاد رکھنا زیادہ ضروری ہے کہ وہ انیسویں صدی عیسوی میں منصۂ شہود پر آیا" یہ بات ہی بھی سچ۔ آپ اس کا سارا لٹریچر چھان جائیے۔ آپ کو آئرلینڈ کا اثر شاذ ہی نظر آئیگا۔ اس کے برخلاف انیسویں صدی کا اثر اس پر بہت گہرا اور نمایاں ہے۔ دور حاضر کے انحطاط کی طرف جانے کی بجائے وہ صحافت کے جدید نظریات، جدید سیاسی تحریکات اور انقلابی مذہبی خیالات سے زیادہ متاثر نظر آتا ہے اور انہی جدید تحریکات کے سراب میں وہ کھو گیا۔

نو برس تک وہ لندن میں فاقہ کشی کی زندگی بسر کرتا رہا اور کامیابی اس سے کوسوں دور تھی۔ اس کا سوٹ جس پر نسوار کے کئی دھبے ہوتے۔ اس کی بوسیدہ ٹوپی، سیاہ رنگ کا کوٹ جس کا رنگ زیادہ استعمال سے سبزی مائل ہو رہا تھا اس کے حلقہ اثر میں اب تک مشہور ہیں۔ ان تمام سالوں میں اس نے چھ پونڈ کمائے جن میں سے پانچ پونڈ ایک ہی اشتہار لکھنے کی اجرت تھی۔ اس زمانے میں اس کی ماں اس کے اخراجات کی کفیل رہی۔ اس نے چند معمولی ناول لکھے جنہیں کسی ناشر نے طبع کرانے کی ہامی نہ بھری۔ اسے اپنے آپ پر اعتماد نہ تھا۔ مضمون کے پہلے فقرہ کو وہ بار بار کاٹتا اور لکھتا۔

پھر اسے کام ملنے لگا۔ اور وہ موسیقی اور ڈرامے پر تنقید، سیاسی فکاہیے اور چھوٹے چھوٹے مضمون لکھنے لگا۔ آخر ۱۸۹۲ء میں اس کا سب سے پہلا ڈرامہ "رنڈوؤں کے مکانات" نکلا۔

اس کا بچپن آئرلینڈ میں گذرا، ماحول کے اثر سے اسے رسمی اخلاق اور مذہب سے نفرت ہوگئی وہ ایک ادنیٰ درجے کے گرجے سے متعلق کر دیا گیا۔ اور اسے تاجروں کے بچوں سے کھیلنے کی اجازت بھی

نہ تھی۔ اس کا اثر اس پر اتنا گہرا ہوا کہ وہ ابھی تک انہی خیالات سے متاثر ہے۔ اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ اُس نے علانیہ طور پر "رواجی اخلاقیات" اور تہذیب پرستی کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔

جب وہ میدان میں نکلا۔ تو ایک انقلابی تھا، روائتی معروضات کا مخالف، زندہ دل شورش انگیز اور انقلاب پسند تھا۔ اس نے عجیب و غریب معتے پیش کیے۔

تیس سال کا ایک غریب، باہمت اور تند خو نوجوان۔ چند ناکام ناولوں اور تنقیدوں کا مصنف جسے موسیقی اور مصوری میں کافی دسترس تھی اور جس کو اظہار نفرت کرنے کے لیے الفاظ پر پورا قابو تھا۔ ہنری جارج سے ملاقات کرتا ہے اور فوراً فیبین سوسائٹی میں شامل ہو جاتا ہے۔

وہ ہوٹلوں کی مجلسوں میں اور گلی کوچوں کے نکڑ پر تقریریں کرتا ہے۔ اب اس کی طبیعت میں ہچکچاہٹ نام کو باقی نہیں رہی۔ اس کا طرزِ تحریر نہایت شستہ ہوتا جاتا ہے۔ اس کے ڈراموں کے دیباچوں میں مناظرہ کا رنگ نمایاں ہونے لگا ہے۔

سنہ ۱۸۸۹ء میں پہلی بار وہ کارل مارکس کے خیالات سے متاثر نظر آتا ہے مگر تھوڑے عرصہ بعد اس کے خیالات پر سڈنی وب کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ اسے خود بھی اس کا اعتراف ہے کہ سب سے زیادہ وہ اسی شخص کے نظریوں سے متاثر ہوا ہے۔

مذہب سے بیزاری کے متعلق شینکر اس کی سوانح حیات میں لکھتا ہے۔ "وہ تمام عمر ایک مصیبت میں مبتلا رہا ہے — خدا کا نام لیتے وہ شرم محسوس کرتا ہے مگر اس لفظ کا قائم مقام اُسے کوئی دوسرا نام بھی نہیں ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خدا کو "زندگی کی طاقت" میں تبدیل کرتا ہے۔ مسیح کو وہ "نیم سوشلسٹ" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اور "جنت" اپنے سیاسی تصورات میں بناتا ہے۔

وہ کسی ایسے کام میں ہاتھ نہیں ڈالتا جس میں نفع کی اُمید نہ ہو۔ ایک جگہ وہ لکھتا ہے "آرٹ صرف آرٹ کی خاطر۔ میرا یہ نظریہ اب تبدیل ہو چکا ہے۔ یہ تو ایک ایسا خیال ہے جیسے کوئی بڑی میخ لے کر چند کاغذ کے اوراق میں گاڑے"۔

اس کی متلون طبیعت نے اسے کسی ایک مفکر کا پیرو نہ بننے دیا۔ بلکہ وہ متضاد الطبع مفکرین کے

خیالات کی طرف رجوع کرتا ہے۔ جن میں شوپن ہار۔ شیلے، گوئٹے، ہورس جیسے لوگ قابلِ ذکر ہیں۔
ایک جگہ تو وہ کمال ہی کرتا ہے کہ ولیم مورس کو گوئٹے کا ہم پلہ لکھ دیتا ہے۔ شاید یہ وہ زمانہ ہے جب اس کی تنقیدی قوت بیدار نہیں ہوئی تھی۔

غرض یہی تضاد اس کی شہرت کا باعث ہوا اور لوگوں کی توجہ اس کی طرف ہونے لگی۔ اس کے عجیب نظریے ہی اس کی شہرت و ترقی کا زینہ بنے۔

اُنیسویں صدی میں شہرت کی دیوی نے اس کے قدم لیے اور جارج برنارڈ شا کی دنیا میں دھوم مچ گئی۔ یکے بعد دیگرے اس کے ڈرامے قبولیت حاصل کرتے گئے اور "Candida" "میجر باربرا" اور "بشر و مافوق البشر" [1] ان ڈراموں نے ادبی اور علمی دنیا کی توجہ کو اس کی طرف مبذول کرا دیا۔

آسکر وائلڈ کی موت سے جو خلا ادبی دنیا محسوس کر رہی تھی اُس کو پُر کرنے کے لیے برنارڈ شا برسرِ کار آیا۔ سُلجھا ہوا مذاق، دلوں کو موہ لینے والی ظرافت، نہایت برجستہ مکالمہ، پُر مغز نفسِ مضمون، پُر زور عبارت آرائی اور قادر الکلامی۔ یہ وہ ہتھیار تھے جن سے وہ مسلح تھا۔ اسی کا اثر ہے کہ آج برنارڈ شا کے ڈرامے اپنی نظیر آپ ہی ہیں۔ اس کا اسلوب اپنے اندر ایک نئی شان لیے ہوئے ہے۔ آج اس کے ڈرامے سب سے زیادہ مقبول ہیں۔ اور اُن کی قبولیت کا حلقہ صرف انگریزی خواں دنیا تک محدود نہیں بلکہ تمام اطراف میں وہ شکسپیر سے دوسرے درجہ پر ہے۔ اس کے ڈرامے ہر طبقے اور ہر خیال کے لوگوں میں خراجِ تحسین حاصل کرتے ہیں۔

ڈرامہ میں اُس نے ایک جدت یہ پیدا کی ہے کہ وہ کرداروں پر یا کردار اور ماحول پر اپنے ڈرامہ کا انحصار نہیں رہنے دیتا۔ بلکہ اس کے ڈرامے میں "استدلال" پر سارا زور ہوتا ہے۔ اس کے خیالات شخصیتیں بن کر آپس میں برسرِ پیکار ہو جاتے ہیں۔ بعض دفعہ تو ان میں ڈرامائی اثر ہوتا ہے۔ مگر بعض دفعہ یہ بھی مفقود نظر آتا ہے۔ اس کے ذی رُوح کردار (بعض مستثنیات کے علاوہ) صرف کلام کے لیے ڈرامہ میں موجود ہوتے ہیں۔ نہ کہ اس لیے کہ وہ کون ہیں اور انہیں کیا اداکاری کرنا ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ ڈرامہ کی جان ہیں دنیا میں چند ہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ، کرتے بھی ہیں۔ مگر برنارڈ شا اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے۔ اس

[1] "Man & Superman."

کا روحانی وطن روس میں ہے گو اس کا اصلی وطن آئرلینڈ کی آزاد ریاست ہے۔ مگر اس کی بود و باش برطانیہ کی پُرامن فضا میں ہے۔ زندگی اور سماج کے متعلق اس کے عجیب و غریب نظریے ہیں مگر اس کے ذاتی رویے اور خانگی زندگی پر ان کا سایہ تک بھی نہیں پڑتا۔ شاید ہی دنیا میں کوئی ایسا انسان ہو جو اس سے زیادہ باعزت زندگی بسر کر رہا ہو۔ اور اس کے اپنے نظریوں اور اس کی زندگی میں اس قدر بعد ہو۔ وہ شادی کے ایجاب وقبول کی ہنسی اُڑاتا ہے۔ محبت کے جذبات اُس کے نزدیک دماغی خلل کا نتیجہ ہیں۔ مگر اس کے باوجود دنیا میں شاید ہی اس سے بڑھ کر کوئی شادی کے معاملہ میں خوش قسمت ہو۔ اُس کی متاہل زندگی نہایت خوشی سے گذر رہی ہے

صبح سے لے کر شام تک وہ نہایت غیر ذمہ دارانہ طریق سے آزادی تقریر کی حمایت میں سرگرم نظر آتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ پارلیمنٹری اداروں کو توڑ کر اس کی بجائے "آہنی آمریت" قائم کرنے کا بھی زبردست حامی ہے۔ شاید اپنی اس مجوزہ آمریت کا وہ پہلا ڈکٹیٹر ہوگا۔

وہ انگریز سوشلسٹوں کے ساتھ اتفاق رائے کا اظہار کرتے ہوئے اُن کی "یاوہ گوئی" کی ہاں میں ہاں ملاتا ہوا اور مسیولینی اور اسٹالین کی طرح مُسکراتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ ببانگ دہل اعلان کرتا ہے کہ دولت کی برابر تقسیم کی جائے۔ جس کے پاس زیادہ دولت ہے۔ وہ اس کے نزدیک غیر ارادی طور پر بھی مجرم ہے۔ یہ دولت اگر فریب نہیں تو ذاتی کمینہ پن کا ثبوت ضرور ہے۔ وہ ہمیشہ سے اسی عقیدہ کی اشاعت کر رہا ہے کہ ہر قسم کی دولت ریاست کی ملکیت ہونی چاہیے لیکن جب لائڈ جارج کے مسودہ بجٹ میں ایسے لوگوں پر جن کے پاس زیادہ دولت تھی ایک غیر معمولی ٹیکس لگانے کی تجویز پیش کی گئی تو سب سے زیادہ اس ٹیکس کے خلاف واویلا اور شور کرنے والا بھی "فیبین سوسائٹی کا معزز رکن" اور دولتمند تھا۔

وہ ایک طرف تو دولت جمع کرنے کے لیے رات دن کوشاں ہے مگر دوسری طرف وہ ایک پکا اشتراکی ہے۔ وہ اپنے ڈرامائی کرداروں کی زبان سے نہایت بے تکلفی سے اختلافِ رائے پر قتل کی تلقین کراتا ہے مگر خود وہ ایک مکھی مارنا بھی پسند نہیں کرتا۔

اُس کی زندگی کا اگر قریب سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انہی متضاد عادتوں اور نظریوں

ہیں اُسے خوشی اور راحت محسوس ہے۔ وہ زندگی کی کشاکش میں ہنستا کھیلتا چلا جاتا ہے۔ وہ تمسخر اور استہزاء سے دنیا کے بڑے بڑے مسلّمات کو ٹھکرا دیتا ہے۔ جب کبھی اُسے تقریر کا موقع ملتا ہے تو وہ اپنے ہی سامعین کا مذاق اُڑاتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور بعض اوقات خود اپنے مقررہ اصولوں کی دھجیاں بکھیرنی شروع کر دیتا ہے۔

دنیا ایک زمانے سے نہایت صبر اور دلچسپی کے ساتھ اس کمزور جسم انسان کی ان مجیر العقول باتوں کو سُن رہی ہے۔ جو خود ہی ایک اصول بناتا ہے اور پھر اُس کا ہی تمسخر اُڑاتا ہے۔ اس پر طرّہ یہ ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ اُس کی ہر بات کو نہایت سنجیدگی سے سُنا جائے۔

اس کی کامیابی کا راز ہر ایک کی تردید میں ہے۔ "آئرلینڈ کا آزاد کنندہ" قدرتی طور پر برنارڈ شا سے متمنی تھا کہ وہ اُس کی قربانی اور ایثار کی داد دیگا۔ مگر بیچارے کو اُس نے ہجو اور تمسخر میں اُڑا دیا۔ "سُرخ جھنڈا" لیبر پارٹی کا بین الاقوامی ترانہ سُن کر یہ سوشلسٹ زیرک اُسے "بندر کے جنازے" سے تعبیر کرتا ہے"

تین سال کے عرصہ میں وہ سوشلزم پر ایک مبسوط کتاب لکھتا ہے جس میں دلیل، اصول اور تجربہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ وہ چاہتا تو اس عرصہ میں نصف درجن کے قریب ڈرامے لکھ سکتا تھا۔ اس کی یہ کتاب سرمایہ دار طبقہ میں نہایت دلچسپی سے پڑھی گئی۔ مگر لیبر پارٹی کے سیاستدانوں نے اس کتاب کا مقاطعہ کر دیا۔

وہ ایک مفکر ہے۔ اس کا دماغ ہمیشہ نئی بات سوچتا ہے۔ اس کی رائے نہایت ٹھوس ہوتی ہے وہ زندگی کے متعلق لائحہ عمل پیش کرتا ہے۔ مگر بات اتنی ہے کہ اس کے افکار متضاد نظریوں پر مبنی ہوتے ہیں اور جو کچھ اس کے دماغ میں آتا ہے وہ اُن خیالات کو من وعن پیش کر دیتا ہے۔ اس بات کی وہ کبھی تکلیف گوارا نہیں کرتا کہ اِن خیالات کو وہ اپنے مسلّمات پر جانچ لے۔ یا یہ دیکھے کہ خیالات کا اثر دوسرے مفکرین کے مسلّمات پر کیا ہو گا لیکن پھر بھی ہم اس کے اخلاص پر کوئی حرف نہیں رکھ سکتے۔ وہ جو کچھ کہتا ہے دل سے کہتا ہے اور اس کا پیغام کچھ معنی رکھتا ہے۔ "قدرت نے ہمارے زمانے میں ایک مسخرہ بھیج دیا ہے جو قرون وسطی کے درباری مسخروں کی یاد کو تازہ کر رہا ہے۔"

برنارڈ شا روس کی سیر کے لیے جاتا ہے۔ اس سفر میں لیڈی اسٹر اس کے ساتھ تھی۔ اس کا انتخاب

نہایت موزوں اور اس کے لیے پُر لطف ثابت ہوا۔ کیونکہ اس کی رفیق سفر بھی عالمگیر شہرت کی مالکہ ہے۔ بحر اوقیانوس کے دونوں طرف۔ نئی اور پُرانی دنیا ہیں۔ اس کا اثر ہے۔ اگر وہ کبھی فیشن پرست طبقہ میں سب سے بالانشین تھی۔ تو وہ اب "نسوانی جمہوریت" کی تحریک میں سب سے بلند نظر آ رہی ہے۔ وہ دل کی گو نرم ہے مگر زبان کی طرار اور تیز۔ وہ دارالعوام کی پہلی رکن ہے اور اس لحاظ سے وہ تاریخی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ جوے کی مذمت نہایت کھلے الفاظ میں کرنے کے باوجود اس کا گھوڑ دوڑ کا اصطبل یورپ میں مشہور ہے۔ گو پارلیمنٹ کی اشتراکیت پسند جماعت اس پر بہت مہربان ہے اور اس کی تعریف میں رطب اللسان ہے مگر وہ "قدامت پسند" حلقہ کی طرف سے دارالعوام کی رکن ہے۔

لیڈی اسٹر کی زندگی بھی متضاد افعال سے پُر ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ اس قدر کامیاب ہے کہ اب وہ تنقید سے بھی بالاتر ہو چکی ہے۔ اور ہمیشہ رائے عامہ اس کے حق میں ہوتی ہے۔ اس کی آمد پر ہر ایک کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ دارالعوام میں اس کا داخل ہونا تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ پارلیمنٹ کی روایات کے خلاف ایک عورت کو رکنیت سے نوازا گیا۔ اس کے سامنے سب جھکتے ہیں۔ مردانہ اور زنانہ مجلسوں کا تعصب اس کے آنے سے اس طرح دور ہو جاتا ہے۔ جیسے سورج کی روشنی کے سامنے دھندلی فضا غائب ہو جاتی ہے۔

سوویٹ روس کی آمریت نے ان کا خوب شان و شوکت سے استقبال کیا۔ روسی لوگ چونکہ ہمیشہ سرکش اور سفری تماشوں کے شائق رہے ہیں مگر انقلاب کی وجہ سے بہت سے مسخرے اور مزاحیہ اداکار یا تو موت کی بھینٹ چڑھ گئے یا جیل میں شاہی مہمان بنے بیٹھے تھے۔ اس لیے ان دونوں کی آمد روس کی خشک زندگی میں ایک نعمت کی طرح محسوس کی گئی اور لوگ جوق در جوق اس بین الاقوامی شہرت کے "مسخرے" کو دیکھنے آئے۔ ہزارہا منظم روسیوں نے سُرخ جھنڈوں سے اُن کا استقبال کیا۔ سوویٹ کابینہ کے ممبر لٹوینوف نے یہ جانتے ہوئے کہ روس کے شہروں کی گلیوں میں کتنے لوگ خوراک کی قلت سے مضطرب ہیں۔ ایک نہایت شاندار اور پُر تکلف دعوت کا انتظام کیا۔

اِن کا یہ سفر تحقیقاتی تھا اور وہ روس کے پنجسالہ پروگرام کے متعلق صحیح معلومات حاصل کرنے کے لیے

گئے تھے کہ دیکھیں کیا واقعی اشتراکیت سرمایہ داری سے بہتر ہے؟ اور سوویٹ روس کے باشندے اس نئے دور میں زندگی، آزادی اور خوشی کے حاصل کرنے کی تگ و دو میں کس طرح مصروفِ عمل ہیں۔

جارج برنارڈ شا کے لیے اس سے بڑھ کر اور کونسا موقع ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے میزبانوں کے شیشے کے قلعے میں محفوظ بیٹھ کر اُن پر سنگباری کرے۔

جارج برنارڈ شا ایک رشی، برگزیدہ مگر مسخرہ، صائب الرائے، قابلِ تعظیم لیکن نہایت غیر ذمہ دار انسان ہے۔ گو آج تمام دنیا اُس کے سامنے جُھک نہیں جاتی۔ مگر یہ مسلمہ امر ہے کہ وہ انگریزی بولنے اور سمجھنے والی دنیا میں سب سے بڑا مفکر ہے

ہندوستانی کاشتکاروں کا افلاس

(تلخیص)

ہندوستان کے متعلق سرکاری یا نیم سرکاری تحقیقات کی بنا پر جو ان گنت رپورٹیں شائع ہوتی رہتی ہیں اگر اُن کا سرسری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی مفلسی کا علاج در اصل بہت ہی دشوار کا تھا مگر چند باہمت انگریزوں نے جن کا اپنا کوئی فائدہ اس مسئلہ سے نہ تھا بڑی تندہی اور محنت سے اس لا علاج مرض کا ازالہ کرنے کی کوشش کی۔ اس جد وجہد میں انہیں ہندوستانی کسانوں کی فطری ضد، ناشائستگی اور جہالت پر بھی قابو پانے کی کوشش کرنی پڑی مگر آخر کار انہوں نے مقصد کی تکمیل کر ہی لی۔ اور اس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

لیکن جب سرکاری اعداد وشمار سامنے آتے ہیں تو حقیقت بے نقاب ہو کر رہ جاتی ہے غضب تو یہ ہے کہ سرکاری رپورٹوں کے مصنف مفلسی کے "اصل اسباب" اور اُن کے خطرناک نتائج کو پس پشت ڈال کر نہایت خندہ پیشانی سے ایسی ترقیوں اور اصلاحوں کا ذکر کرتے ہیں جو غالباً اُن کے ذہن مقدس کے علاوہ اس آب وگل کی دنیا میں کہیں دیکھنے میں بھی نہیں آتیں۔

سرکاری رپورٹیں زرعی زمین کی ٹکڑے ٹکڑے وار تقسیم، مویشیوں کی کمزوری، ذرائع آبپاشی کی کمی، علم کے فقدان اور کسان کی غفلت کو بڑی دیدہ دلیری سے ہندوستانی کسان کی مفلسی کا سبب ٹھہراتی ہیں لیکن سرکاری اجارہ داری اور پچیس لاکھ پونڈ کی اس آمدنی کے متعلق جو غریب کسانوں سے وصول کر کے سرکار اپنے خزانوں میں بھر لیتی ہے ایک لفظ نہیں کہتیں۔ اس کے علاوہ زمیندار بھاری رقمیں کسانوں سے لیتے ہیں، مہاجن اپنے قرضوں پر خون آشام شرح سود وصول کرتے ہیں۔ برتنے کی چیزوں پر بھاری بھاری ٹیکس حکومت کی طرف سے عائد کیے جاتے ہیں۔ پانی کا محصول اور دوسرے مقامی مطالبے جو براہ راست گاؤں کی معاشی زندگی پر اثر ڈالتے ہیں اس پر مضاعف ہیں اور سرکاری رپورٹیں ان کا ذکر کرنا بھی گناہ

سمجھتی ہیں۔

ہندوستان کی بڑھتی ہوئی مفلسی کا اصلی سبب اس کی محکومی ہے۔ برطانوی راج نے ہندوستان کو ایک زرعی ملک قرار دے کر اپنے لیے خام پیداوار مہیا کرنے کا سستا ذریعہ بنا لیا ہے۔ اسی اصول کے ماتحت یہاں کی صنعتی ترقی کو جس طرح روکا گیا ہے اُس کا اندازہ سنہ ۱۸۹۱ء سے سنہ ۱۹۲۱ء تک کی مردم شماری کے اعداد سے ہو سکتا ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ زراعت پر بسر کرنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ آخری مردم شماری سنہ ۱۹۳۱ء میں ہوئی تھی سنہ ۱۸۹۱ء کے مقابلہ میں اس حرفہ کسانوں کی تعداد میں ۵ فیصدی کا اضافہ نظر آتا ہے۔ جنگ عظیم کے زمانے میں باوجود اس کے کہ ہندوستان میں صنعتی کارخانے جا بجا قائم ہو رہے تھے مگر گھریلو صنعتوں میں برابر کمی ہوتی چلی جا رہی تھی۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ بھی اس انحطاط پر پردہ نہ ڈال سکی۔ دس سال پہلے گھریلو صنعتوں پر بسر کرنے والوں کی تعداد ۷ء۱۱ تھی سنہ ۱۹۲۱ء میں گھٹ کر یہ تعداد ۷ء۱۵ رہ گئی اور سنہ ۱۹۳۱ء میں ۴ء۱۵ نظر آتی ہے۔ جب زراعت پر بسر کرنے والوں کی تعداد میں اس طرح اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے تو کسانوں میں افلاس خود بخود بڑھ جانا چاہیے تھا۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں زمینداروں کی تعداد ۸ء۲ ملین تھی سنہ ۱۹۳۱ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۳ء۳ ملین ہو گئی۔ سرکاری مردم شماری کے مطابق کاشتکاروں، اجارہ داروں، اور زمین کے مالکوں کی تعداد سنہ ۱۹۱۱ء میں ۱ء۷ ملین تھی لیکن سنہ ۱۹۳۱ء میں گھٹ کر ۲ء۶۱ ملین رہ گئی جبکہ دوسری طرف ایسے کسانوں کی تعداد میں جن کے پاس کوئی زمین نہ تھی تقریباً ۱۰ ملین کا اضافہ ہوا۔

ان حقائق کے بعد بھی انگریز ہندوستانیوں کا دعویٰ یہ ہے کہ ہندوستان کی آبادی اس قدر زیادہ بڑھی ہے کہ معاشی ذرائع اس کی کفالت کرنے سے مجبور ہیں۔ ظاہر ہے اس بیان میں حقیقت کا شائبہ تک نہیں۔ سفید جھوٹ بول کر اس کو نبھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ورنہ صرف سرکاری مردم شماری یہ بتلا رہی ہے کہ پچھلے پچاس برسوں میں ہندوستان کی آبادی کے بڑھنے کا تناسب ۱۰ فیصدی سے زائد رہا ہے جو انگلستان اور ویلس کے اضافہ آبادی کی نسبت سے کم ہے۔ سنہ ۱۹۰۱ء اور سنہ ۱۹۲۱ء میں علی الترتیب اضافہ کا تناسب نصف اور چوتھائی کے اعتبار سے گھٹا ہے۔ اس قسم کی تخفیف کی مثال ہندوستان

کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔

واقعہ یہ ہے کہ لوبھی زمینداروں کی لوٹ مار کے بعد جو کچھ زمین کاشتکاروں کو ملتی ہے اُس سے وہ اپنی روزی نہیں حاصل کرسکتے۔ ہندوستان میں زرعی زمینوں کا اندازہ کل رقبہ کے تیسرے حصہ سے کچھ زائد ہے جو ہندوستان کے وسیع رقبہ کے اعتبار سے کم ہے۔ لیکن اس میں سے ⅓ سماجیوں کے قبضہ میں ہے اور باقی تیسرے حصہ پر ۱۰ کروڑ کسانوں کی زندگی بسر ہوتی ہے۔ زرعی رپورٹ کا اعتراض یہ ہے کہ کل رقبہ کا مزید چوتھائی حصہ "قابل کاشت ہے، مگر اس پر کاشت نہیں کی جاتی" لیکن زرعی زمین میں جتنے رقبہ کا اضافہ ہوا ہے اس سے کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ اور مندرجہ ذیل اعداد و شمار تبلاتے ہیں کہ پچھلے دس برسوں میں حالات میں کوئی تبدیلی بھی نہیں ہوئی:۔

زرعی پیمائش

(ایکڑ ملین میں)

	سنہ ۱۹۲۲-۱۹۲۳ء	سنہ ۱۹۳۲-۱۹۳۳ء
کل رقبہ	۶۶۷	۶۶۷
ناقابل کاشت زمین	۱۵۲	۱۴۵
جنگلات	۸۵،۵	۸۸،۴
بنجر زمین	۱۵۴	۱۵۴
قابل زراعت زمین جس پر کاشت نہیں ہوتی	۲۲۴،۹	۲۲۸
بارانی رقبہ	۴۷،۸	۴۹،۶

مندرجہ بالا اعداد زراعت میں جمود دکھلا رہے ہیں۔ سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء کے اعداد و شمار سے حالت بالکل تنزل پذیر نظر آتی ہے۔ اگر سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء کا اگلے برس سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کل رقبہ کا ۴۴ فیصدی حصہ جوتا بویا گیا۔ مگر دوسرے سال اس زمین کے رقبہ میں جس پر غلوں کی فصل بوئی گئی تھی تین لاکھ ایکڑ زمین کی کمی نظر آتی ہے۔ یہی حال چاول کی پیداوار کے اعداد و شمار کا بھی ہے۔ پچھلے سال نہ صرف رقبہ میں کمی ہوئی

بلکہ سنہ ۲۳-۱۹۲۲ء کے مقابلہ میں فی ایکڑ پیداوار بھی گھٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ اسی طرح گیہوں کی پیداوار میں بھی فی ایکڑ کمی ہوئی ہے۔ دوسری طرف جنگلات کا حال یہ ہے کہ ۸۸ ملین ایکڑ میں سے نصف تو حکومت کے قبضہ میں ہیں اور باقی نصف زمینداروں اور مالدار کسانوں کے۔ معمولی کسانوں کو نہ صرف لکڑی کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے بلکہ اُس گھاس پر مویشی چرانے کے پیسے بھی دینے پڑتے ہیں جو جنگلات میں اِدھر اُدھر اُگ آتی ہے۔

مزروعہ اور بنجر زمینوں کا کل رقبہ ۶۷۸ ملین ایکڑ ہے۔ اگر اس زمین کو کسانوں اور زمینداروں کے درمیان مساوی طور پر بانٹا جائے تو ہر ایک کے حصہ میں ۲½ ایکڑ سے کچھ زائد زمین آتی ہے لیکن اس وقت زمیندار پچاس ایکڑ تک زمین پر قابض ہیں۔ سنہ ۱۹۲۸ء کی شاہی زرعی کمیشن کا بیان ہے:-

پنجاب کے اعداد و شمار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۲٫۵ فیصدی کسان ایسے ہیں جو ایک ایکڑ یا اس سے کم زمین کے مالک ہیں۔ ۱۵٫۴ فیصدی ایک اور ۲½ ایکڑ کے درمیان، ۱۷٫۹ فیصدی ۲½ اور ۵ ایکڑ۔ ۲۰٫۵ فیصدی ۵ اور ۱۰ ایکڑ کے درمیان زمین پر کاشت کرتے ہیں۔ بمبئی کو جہاں کی حالت پنجاب سے کچھ ملتی جلتی ہے اور برما کو جہاں تناسب زیادہ بلند ہے چھوڑ کر باقی تمام صوبوں میں بہت چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاشت کے لیے ہیں"

زرعی پیداوار کی قیمتوں کی کمی اور ضروریات کی دوسری اشیاء کی قیمتوں کا جمود کسان کی حالت کو بد سے بدتر کرتا چلا جا رہا ہے۔ اور حکومت کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ البتہ جب کبھی کسانوں کو پنپتا دیکھتی ہے تو فوراً لگان کی مقدار میں اضافہ کر کے غریب کسانوں کو ان خونخوار مہاجنوں کے رحم پر زندگی بسر کرنے کے لیے مجبور کر دیتی ہے جن کی اس شائستہ مردم خوری میں وہ بھی برابر کی حصہ دار ہوتی ہے۔ سنہ ۱۹۲۸ء کی زرعی کمیشن کا بیان ہے۔

"واقعہ یہ ہے کہ کوئی کسان کسی نفع یا بدلے کی خاطر زمین نہیں جوتتا۔ بلکہ جو کچھ کرتا ہے اپنا پیٹ پالنے کے لیے کرتا ہے۔ زراعت پر بسر کرنے والوں کی بڑھتی ہوئی تعداد، روزی حاصل کرنے کے مختلف النوع وسائل کی کمی مصیبت کی زندگی سے چھٹکارا نہ پاسکنا اور کم عمری میں ایک آدمی پر پورے خاندان کی پرورش

کا بوجھ پڑ جانا۔ غریب کسانوں کو مجبور کرتا ہے کہ جہاں اور جن داموں پر بھی ملے وہ اپنی روزی کا سہارا ڈھونڈھے جب اس کی زمین قرضے کے بدلے ظالم مہاجن کے قبضے میں چلی جاتی ہے تو کوئی آئین اُس کے درد کا مداوا نہیں کر سکتا۔ ملکیت کا کوئی قانون اُس کی حفاظت کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ بہر صورت پیٹ پالنے کے لیے اُسے زمین کی ضرورت پڑتی ہے اور یہ ضرورت اُسے اُس حریص مہاجن کا دروازہ جھنکاتی ہے جس کو وقت پڑنے پر پہلے ہی وہ اپنی کل ملکیت کی مجموعی قیمت سے بھی زیادہ رقم قرض لے چکا تھا۔ یہ مہاجن دوسری جاتی کا آدمی ہوتا ہے۔ کرایہ خوری اس کا پیشہ ہے۔ زمینداری سے اس کا کوئی تاریخی تعلق نہیں ملتا۔ وہ زمین پر قبضہ پاتے ہی اُسے تباہ کر دیتا ہے"۔

۱۹۳۵ء میں ایک طرف زرعی پیداوار کی قیمتوں کی کمی اور دوسری طرف لگان کی شرح میں تین پونڈ فی لاکھ کی زیادتی نے حالات اور بھی قابو سے باہر کر دیے ہیں۔ خوش حال کسانوں نے اپنے سونے چاندی کے زیورات فروخت کرکے اپنا بھرم نبھانے کی خاطر تقریباً بیس کروڑ روپیہ حاصل کر لیا مگر معمولی کسان ان حالات کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اُس میں سود کی موٹی موٹی رقمیں ادا کرنے کی طاقت نہیں۔ رہی زمینیں تو اُن پر سونے بنیوں اور سود خوار مہاجنوں کا قبضہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔

مہاجنی لین دین کو سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل بیان سے بہت مدد ملتی ہے:۔

"سود پر روپیہ چلانے والوں کا سب سے اہم طبقہ گاؤں کے دوکاندار ہیں۔ یہ لوگ عام طور سے بنیے، بزاز، دلال اور غلہ فروش ہوتے ہیں۔ اپنے گاؤں کے کسانوں کو ضروریات کی چیزیں اور نقد روپیہ اُدھار دیتے ہیں۔ سود اور اصل زر کے بدلے غلہ وغیرہ قبول کر لیتے ہیں، جو کچھ کسان کو دیتے ہیں چالاکی سے اُس کی قیمت بہت زیادہ لگاتے ہیں اور بدلے میں جو کچھ اُن سے لیتے ہیں اُس کو بہت ہی گرے ہوئے داموں سے آنکتے ہیں۔ سورت کے ایک تعلقہ دار کا بیان ہے "اگر ایک من غلہ اُدھار لیا جاتا ہے تو ۱½ من واپس کرنا پڑتا ہے۔ مع ایک من کے بدلے دو من وصول کیے جاتے ہیں۔ تمباکو اور دوسری چیزوں کی قیمت بازار کے بھاؤ سے ۱۲ فیصدی زائد لگائی جاتی ہے۔ مثلاً جو تمباکو عہ کا ہے بہی میں اُس کے دام عہ لکھے جاتے ہیں"۔

غرض کسانوں کی بیشتر تعداد زندگی بھر مہاجنوں اور بنیوں کی غلام بنی رہتی ہے۔ حکومت ان موٹی آسامیوں کو دل کھول کر داد سخن دیتی ہے۔ جو چند ایک قانون کسانوں کی حفاظت کے لیے بن گئے ہیں سرکاری اشاعتوں میں انہیں غیر مفید اور غیر موثر ثابت کر کے خوب قہقہے لگائے جاتے ہیں۔

ہندوستانی اور برطانوی سرمایہ داروں کی نظروں میں بھی کسانوں کی یہ بدحالی کچھ اچھی بات نہیں ہے۔ ننگا بھوکا آدمی معقول خریدار نہیں ہو سکتا۔ اسی حقیقت نے ہندوستانی سرمایہ داروں کو اپنے بازار کی حالت پر توجہ کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ۳۴-۱۹۳۳ء کی سالانہ رپورٹ میں جو متحدہ برطانیہ کی طرف سے شائع ہوئی ہے ہندوستان کی درآمد کی کمی کے اسباب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:-

"ہندوستانیوں کی قوت خرید خواہ وہ شہری ہوں یا دیہاتی دن بدن گھٹتی چلی جا رہی ہے۔ یہ لوگ صرف بہت ہی موٹی ضروریات کی چیزیں خریدتے ہیں۔"

بمبئی کی انجمن مالکان مل کی ۱۹۳۳ء کی رپورٹ کا بیان ہے۔ "کپڑے اور سوت کی تجارت پر جس چیز نے اثر ڈالا ہے وہ لوگوں کی قوت خرید کی کمی ہے۔ فصلوں کی تباہی اور اس پر اجناس کی قیمت گر جانے سے لوگ سخت مصیبت میں مبتلا ہیں۔"

۲۸۔ اگست ۱۹۳۳ء کے اخبار لبرٹی نے لکھا تھا کہ "وقت آنے والا ہے جب زمیندار کسانوں سے ان کی ساری پیداوار لے لیا کریں گے اور مفلس کسانوں کے پاس محاصل ادا کرنے اور فیکٹریوں کا سامان خریدنے کے لیے دمڑی تک نہ رہے گی۔ آگے چل کر کہتا ہے "بنگال میں یہ صورت حال دیکھنے میں آرہی ہے۔ اگر ایک بنگالی کسان کچھ خریدنا چاہتا ہے تو وہ زمیندار سے روپیہ مانگ کر خریدتا ہے۔ خود اس کے پاس دھیلا نہیں ہوتا۔ صاف ظاہر ہے کہ بنگال معاشی پستی کے کنارے کھڑا ہوا ہے۔"

ستمبر ۱۹۳۳ء میں پنڈت جواہر لال نہرو نے یونائیٹڈ پریس کے ایک نمائندے سے گفتگو کے دوران میں کہا تھا۔ "زمینداری نظام بہت پست ہو چکا ہے اور سماج کی تنظیم کا احساس پیدا ہو چلا ہے" لیکن دیکھنا یہ ہے کہ پنڈت جی اور کانگریس کے دوسرے لوگ نیا سماجی نظام مرتب کرنے

کے لیے کیا کر رہے ہیں؟ کیا کانگریس کی دیہی صنعتوں کو ترقی دینے کی تدبیر سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ یہ نیا سماجی نظام قائم ہو جائیگا اور وہ لوگ بغیر کسی کو نقصان پہنچائے اپنی تحریک کو اُبھرنے میں مدد دے سکینگے؟

سنہ ۱۹۳۰-۳۳ء کی ٹیکس نہ ادا کرنے کی تحریکیں بتاتی ہیں کہ ہندوستانیوں میں انقلابی خیالات نہایت سرعت کے ساتھ پھیل رہے ہیں۔ اور لوگ سرمایہ داروں اور سامراجیوں سے بدظن ہوتے چلے جارہے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ برطانیہ بہت ہشیار ہے وہ جانتی ہے کہ کہاں سختی کرنی چاہیے اور کہاں نرمی، لیکن کیا انگریز ہندوستانی بہادر بھی ایسے ہی چالاک ہو سکتے ہیں؟ خیر وہ چالاک ہوں یا نہ ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ ۶۰ ملین کسانوں کو ان کے حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ جو لوگ سرکاری رپورٹوں کے دل خوش کرنے والے بیانات پڑھنے کے بعد ہندوستان کی اصلی حالت کا مطالعہ کرتے ہیں وہ حکومت ہند کو کبھی بنظر استحسان نہیں دیکھ سکتے۔ یہ لوگ شہر کے غریب کاریگروں اور دیہات کے مفلس کسانوں کو ایک دوسرے کی حالت سے بیخبر رکھنا چاہتے ہیں۔ مگر اس کے لیے وقت درکار ہے۔ زمینداری نظام کی سخت گیری اور کسانوں کی مسلسل غلامی اس ڈھونگ کا بھانڈا بہت جلد پھوڑ دیگی۔ اور جب شہری کاریگروں اور دیہاتی کسانوں کو یہ یقین ہو جائیگا کہ اب ان غلامی کی بیڑیوں کو اُتار پھینکنے کا وقت آگیا ہے تو وہ اُٹھینگے اور اپنے جیون کا سُواگت کرینگے۔

(جان بیچسم

غزل

جناب جلیل قدوائی

اداشناسِ محبت گِلا نہیں کرتے
ہزار دل میں ہوں شکوے، کہا نہیں کرتے

طبیبِ عشق نے حالت مری سُنی تو کہا
یہ وہ مرض ہے کہ جس کی دوا نہیں کرتے

یقیں ہے دل کو اثر کا یہی سبب ہے کہ ہم
حصولِ مطلبِ دل کی دعا نہیں کرتے

دلِ عزیز کی خودداریاں، جزاک اللہ
وگرنہ لوگ محبت میں کیا نہیں کرتے

رہے تو دل میں تمنائے وصلِ یار رہے
یہ بات وہ ہے جو مُنہ سے کہا نہیں کرتے

زباں پہ لفظِ وفا جن کے ہو مدام وہ لوگ
وفا کا وقت جب آئے وفا نہیں کرتے

ملی ہے چشمِ حقیقت نگر جنہیں وہ جلیل
تمیزِ رتبۂ شاہ و گدا نہیں کرتے

رفتارِ عالم

ممالکِ غیر

دنیا کا عام قاعدہ ہے کہ جب کسی کا پیٹ بھر جاتا ہے تو اُسے تھوڑی دیر کے لیے آرام سے بیٹھ کر یا لیٹ کر کھانا ہضم کرنے کی خواہش ہوتی ہے، اور سیاست میں ایسے ہی موقعوں کو امن کا زمانہ کہتے ہیں لیکن بھوک ایسی بلا ہے کہ مرتے دم تک پیچھا نہیں چھوڑتی، اور قومیں مطمئن بس اتنی دیر کے لیے ہوتی ہیں جب تک کہ انہیں دوبارہ بھوک نہیں لگتی۔ پیٹ بھر کھانے اور اپنی فطرت کے مطابق پھلنے پھولنے کا حق قدرت نے ہر جاندار کو دیا ہے، قوموں کا یہ حق ان کی طاقت کے برابر ہوتا ہے، اور اسے منوانے کے لیے وہ اس کو طرح طرح کے سیاسی عقیدوں میں حوصلوں میں، اور اگر ان کا بڑے یا برابر والوں سے مقابلہ ہوا تو مطالبوں میں ظاہر کرتی ہیں۔ اس وقت آپ جانتے ہیں کہ اٹلی، جرمنی اور جاپان بھوکی قومیں ہیں اور ان کے مطالبے ایسے مرکز ہیں جن کے گرد سیاست چکر لگا رہی ہے۔ سوال اب یہ ہے کہ یہ قومیں جتنا مانگتی ہیں اتنا حاصل کرنے کی اُن میں طاقت اور استعداد ہے یا نہیں، اور دنیا کے امن کی جو قیمت انہوں نے لگائی ہے وہ اتنی تو نہیں ہے کہ اُسے ادا کرنے پر کوئی راضی نہ ہو۔ دنیا کی تاریخ میں آج کل کی یہ کیفیت نئی یا نرالی نہیں ہے۔ یہ بھی کوئی نئی بات نہیں کہ سب سے زیادہ الزام اُسی پر لگائے جاتے ہیں جو کمزور ہوتا ہے لیکن قوم اور قومی روح کا موجودہ فلسفہ بے شک انوکھا ہے، اور جرمنی نے یہودیوں پر، جاپانیوں نے چینیوں پر، اور اٹلی، جرمنی، جاپان تینوں نے جمہوریت اور کومیونزم کی تعلیم پر روح کی چوری کا جس انداز سے الزام لگایا ہے وہ سیاست کی بالکل ہی نئی چال ہے۔ اس فلسفہ پر ہم یہاں بحث نہیں کر سکتے، اس کی آڑ لے کر جو سیاسی مطالبے پیش کیے جاتے ہیں اُنہیں البتہ ہمیں ہر وقت نظر کے سامنے رکھنا چاہیے۔ اور اگرچہ ان میں اس وقت کوئی اضافہ یا کمی نہیں کی گئی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس موقع پر جب جرمنی اور اٹلی انگلستان سے سمجھوتہ کرنے کی کوشش میں لگے ہیں، ہم ان پر نئے سرے سے غور کر لیں تو بہت مفید ہوگا۔

پہلے اٹلی کے مطالبوں کو لیجیے۔ اٹلی کے قوم پرست رہنما صدیوں سے اس آرزو میں تڑپ

رہے ہیں کہ اٹلی پھر دنیا کی قوموں کا اسی طرح سردار بنے جیسے کہ رومی سلطنت کے زمانے میں تھا، اور ۱۸۷۰ء سے اٹلی کے مدبر ہاتھ پیر پھیلانے کے لیے موقع کے منتظر رہے ہیں۔ اپنی قوم کے دل میں یہ خیال سب سے پہلے مسولینی نے ہرگز نہیں ڈالا کہ بحر روم اس کی موروثی جائداد میں شامل ہے، اور بحر روم کے ساحلوں پر قبضہ کرنے کا سلسلہ بھی مسولینی کے ڈکٹیٹر بننے سے پہلے شروع ہو گیا تھا۔ مسولینی نے بس دل کو ذرا گرما دیا ہے اور دوسروں کی چالوں کو دیکھنے اور ان کی ضرورت یا غلطی سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اٹلی کی سیاست کو جرأت سے پیش قدمی کرنا سکھایا ہے۔ جرأت اور حوصلے کا اسے پھل بھی ملا ہے۔ اور اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ بحر روم کی سیاست میں جغرافیہ نے تاریخ پر فتح پائی ہے، یعنی بحر روم میں اٹلی کی جو حیثیت مقام کے لحاظ سے ہونا چاہیے تسلیم کی جا رہی ہے اور اس کے مقابلہ میں وہ قومیں جنہوں نے اٹلی سے پہلے ترقی کی معاہد اور قبضے کے تاریخی اور قانونی حق کو جتا کر قصہ ختم نہیں کر سکتیں۔ مسولینی نے اپنی فوجی، بحری اور ہوائی طاقت بہت بڑھائی ہے، لیکن اس سے زیادہ موثر وہ تدبیریں تھیں جو اس نے رقیبوں کو حیران کرنے کے لیے اختیار کیں، یعنی باری کا ریڈیو اسٹیشن، برطانیہ اور فرانس کے مخالفوں کی امداد اور ان کی تجارت کو نقصان پہنچانا اور ہسپانیہ کی خانہ جنگی میں دخل دے کر مغربی بحر روم میں مورچے بنانا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی لازمی تھا کہ مسولینی یورپی سیاست میں اپنا الگ رستہ اختیار کرے، اور اس میں بھی یوگوسلاویہ اور جرمنی سے اس کی گاڑھی دوستی اور روم برلن کا محور اس کی نمایاں کامیابی ظاہر کرتا ہے۔

برطانوی مدبروں کو اس حالت میں جبکہ اٹلی کی درپردہ دشمنی بہت خطرناک تھی اور گفتگو کے ذریعے سے اس کو دور یا بے ضرر کر دینا ممکن نظر آ رہا تھا خالی رعب یا قانونی دھمکیوں پر بھروسہ کرنا غلط معلوم ہوا۔ اس قدر غلط کہ سابق وزیر خارجہ مسٹر ایڈن کا استعفیٰ بھی گفتگو کے حامیوں کو اپنے خیال پر عمل کرنے سے نہ روک سکا۔ اب وہ معاہدہ جو اٹلی اور انگلستان کے درمیان ہوا شائع بھی ہو گیا ہے۔

اس معاہدے سے ہم آپ بس یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ دونوں فریقوں نے کچھ لیا اور کچھ دیا ہے لیکن جس کے پاس مال ہو اُسے زیادہ ہی دینا پڑتا ہے، یا آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جس کے پاس ستانے کی طاقت ہو وہ کچھ نہ کچھ مار ہی لیجاتا ہے، چاہے لین دین میں شریک ہونے کا حقدار بننے کے لیے اس کی

اپنی گرہ میں کچھ بھی نہ ہو۔ اب تک بحرِ روم پر انگلستان اور فرانس کی حکومت تھی، اب اٹلی اس حکومت میں برابر کا شریک ہے۔ اور حکومت کے ساتھ اسے بحرِ روم میں پہرہ دینے اور اس کی حفاظت، یعنی اُس کی سیاست اور تجارت میں اپنی اغراض کی نگرانی اور اپنے فائدے کی تدبیریں کرنے کا قانونی حق مل گیا ہے۔ اس کے بدلے میں اس نے دیا کیا ہے؛ باری کا ریڈیو اسٹیشن اور ہسپانیہ کی خانہ جنگی میں حصہ لینے کا حق۔ باری کے ریڈیو اسٹیشن کا سامان کہیں اور استعمال ہو سکتا ہے، اگر جھوٹا پروپیگنڈا کرنے سے اس کے آلات خراب نہ ہو گئے ہوں، اور ہسپانیہ میں سپاہی اور سامانِ جنگ سے اٹلی کا خزانہ خالی ہو رہا تھا۔ اس طرح اٹلی نے جو کچھ دیا ہے اُس میں بھی اسی کا فائدہ ہے، اور برطانیہ کے خیر خواہ ہرگز اس سودے کو برطانیہ کے حق میں مفید نہیں مان سکتے۔ اٹلی کو کئی برس تک غاصب اور ظالم گردانے کے بعد حبش پر اُس کا قبضہ تسلیم کرنا بے شک دل کی بڑائی اور قصور معاف کرنے کی ایک قیمتی اخلاقی صفت ظاہر کرنا ہے، مگر مشکل یہ ہے کہ حبش کے سابق شہنشاہ ہیلے سلاسی بھی اگرچہ رہتے جنیوا میں ہیں لیکن پیرس اور لندن میں بھی اکثر نظر آتے ہیں اور تقدیر کی ستم ظریفی سے کچھ بعید نہیں کہ ان کی صورت اسی وقت دکھائی دے جب برطانوی مدبر اٹلی سے اپنی دوستی ظاہر کرنے کا اہتمام کر رہے ہوں۔ اس خطرے سے بھی زیادہ اندیشے کی بات یہ ہے کہ معاہدے میں برطانیہ کی آمدنی کا خانہ خالی رہ گیا ہے۔ نہر سویز پر برطانیہ کو کوئی خاص اختیار نہیں رہا، مورچے بنانے کا حق برطانیہ کی طرح اٹلی کو بھی ہے، اب تک اُس نے برطانوی مورچوں کے مقابلے سے جو فوجی مرکز قائم کیے ہیں وہ بدستور رہیں گے۔ اور اگر یہ سب ہے تو اٹلی کو مغربی ایشیا اور افریقہ میں اپنا اثر بڑھانے سے کون روک سکتا ہے۔ مسٹر چیمبرلین کی موقع شناسی ثابت کرنے کے لیے دے کر بس یہ دلیل رہ گئی ہے کہ ہسپانیہ کی خانہ جنگی ختم ہونے والی ہے، اور لڑائی میں چاہے عدم مداخلت کے گُن گائے جاتے، اس کے ختم ہونے پر عدم مداخلت کا نام لینا اپنی تجارت اور سیاست کی لُٹیا ڈبونا ہے۔

یہ ہے برطانیہ اور برطانیہ کے ساتھ فرانس کی طرف سے اٹلی کے مطالبوں کا جواب۔ اب آئیے ذرا جرمنی کے مطالبوں اور اُن کے جواب پر ذرا غور کر لیں۔ جرمنی ایسی حیثیت کا دعویدار ہے کہ دنیا

کی تہذیبی رہبری کا ازل سے مقرر کیا ہوا فرض انجام دے سکے اور اس کے لیے لازمی ہے کہ وہ اپنی طاقت کو بڑھائے، یہاں تک کہ تمام جرمن زبان بولنے والے آزاد یعنی ایک رہنما اور ایک سیاسی نظام کے ماتحت ہو جائیں، جرمنی کی صنعت کے لیے ہر طرح کا خام مال مہیا ہو سکے، جنگ کے زمانے میں بھی جرمنی آپ اپنی تمام ضروریات پوری کر سکے، اور اس کا رعب ایسا ہو کہ وہ دنیا کے امن کا سہارا بن سکے۔ جرمنی نے مغلوب ہونے کا داغ بالکل مٹا دیا ہے، اور آسٹریا کو اپنے اندر شامل کر لینا آزاد سیاست کے میدان میں اس کا پہلا قدم ہے لیکن اس کا پیٹ ایسا نہیں ہے کہ آسٹریا کو نگل جانے سے بھر جائے اور اس کارروائی سے اس کے مطالبوں میں سے ایک مطالبے کا آدھے سے بھی کم حصہ پورا ہوا ہے۔ ابھی پولینڈ، لتھوئینیا، چکوسلواکیا، ہنگری، رومانیا کی جرمن آبادی کی آرزو کہ ایک سیاسی نظام کے ماتحت ہو جائیں پوری نہیں کی جا سکی ہے اور صنعتی مطالبوں کے تو سارے عنوانات بھی بیان نہیں کیے گئے، صرف نوآبادیوں کا قدرتی حق جتایا گیا ہے۔ جرمنی نے بھی اٹلی کی طرح مطمئن قوموں کو ڈرانے اور ستانے کی جو تدبیریں بن پڑیں اختیار کی ہیں، اور اس سے بھی گفت و شنید کا سلسلہ جاری ہے لیکن ہنگری، چکوسلوواکیا، میمل (Memel) اور جنوبی ڈنمارک میں ایسی بے چینی ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جرمن سیاست یورپ کی تمام جرمن آبادی کو آزاد کرنے کے فرض سے دم بھر بھی غافل نہیں رہتی ہے، اور یہ سیاست ہر وقت جنگ کی اس حالت کو بھی سامنے رکھتی ہے جب ملک کو آپ اپنی تمام ضروریات پوری کرنا ہونگی۔ یہاں بھی مانگنے والے کا پلہ ہر طرح سے بھاری ہے مگر اس کا اندازہ معاہدہ ہو جانے پر ہی کیا جا سکتا ہے کہ امن کی کیا قیمت طے پائی۔

اٹلی اور جرمنی مطمئن قوموں کے پڑوسی ہیں اور کان کے پاس چلاتے ہیں۔ جاپان کی آواز دور سے آتی ہے، مگر اطمینان چاہنے والوں کی طبیعت اس سے بھی خاصی بے کیف ہوتی ہے امریکی سیاست نے تو حساب لگا کر معلوم کر لیا ہے کہ چین فتح ہو جانے اور وہاں جو کچھ سرمایہ لگا ہے اُس کے ڈوب جانے میں اس کا اتنا نقصان نہیں جتنا کہ جاپان کے دیوالیہ ہو جانے میں، انگریزی سیاست اب تک کشمکش و پیچ میں پڑی ہے، اور غالباً ایک عرصے تک پڑی رہیگی، کیونکہ پہلے اگر یہ اندیشہ

تھا کہ جاپان اس قدر جلد اور نمایاں طور پر کامیاب ہوگا کہ چین میں کسی حریف یا رقیب کی موجودگی اور مداخلت گوارا نہ کریگا۔ تو اب یہ پریشانی ہے کہ کہیں چین روس کی مدد سے کامیاب نہ ہو اور چین اور مشرقی ایشیا میں کومیونزم کا زہر نہ پھیل جائے۔ جاپانی قوم کا جو مطالبہ اب سے تیرہ چودہ برس پہلے سٹرتاناکا نے پیش کیا تھا وہ پورا ہو تو مشرقی دنیا ساری جاپانیوں کے قبضے میں آجائیگی لیکن دوسری صورت کہ روسی سیاست مشرقی دنیا پر چھا جائے کچھ زیادہ خوشگوار نہیں۔ روس کو پہلے چیانگ کائی شک کی حکومت سے یہ شکایت تھی کہ اُس نے چینی کومیونسٹوں کے مقابلے میں اپنے قومی دشمن جاپان کی مدد کی، اور اگر جاپان نے لڑائی نہ چھیڑی ہوتی تو روس اور چین کی عداوت بدستور قائم رہتی۔ جاپان کی سیاست ایک طرف چین کی ساری آبادی کو متحد کرکے اور دوسری طرف چینی حکومت کے روس سے تعلقات بڑھا کر اپنے بچھائے ہوئے جال میں خود ہی اُلجھ گئی ہے۔

جنگ کے حالات روز اخباروں میں بیان ہوتے ہیں۔ میری طرح آپ نے بھی یقیناً یہ دیکھا ہوگا کہ ہر جگہ چینیوں اور جاپانیوں دونوں کو فتح ہوتی ہے، کبھی کسی کو ایک دن پہلے فتح کی خبر پہنچا دینے کا موقع ملتا ہے اور کبھی یہ خبر تردید کی صورت میں آتی ہے۔ خبر کو خبر اور تردید کو تردید سے گھٹانے کا جو نتیجہ نکلتا ہے وہ بس ایک طرح کی الجھن ہے اور بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ کسی تیسرے فریق کا بیان لیا جائے اور اس سے راوی کی اپنی ہمدردی، تعصب اور خیال آرائی کو گھٹا کر اور اس کا کسی چوتھے پانچویں بیان سے مقابلہ کرکے اُس پر اعتبار کیا جائے۔ جب تک کہ کوئی تردید یا نیا بیان شائع نہ ہو۔ لیکن نچوڑنے اور چھاننے کے بعد جو کچھ بچتا ہے اس میں کمی بیشی، جھوٹ اور مبالغے کے لیے گنجائش رکھتے ہوئے یہ تو ہم قریب قریب یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ جاپان کی گاڑی چین کے میدانوں کی لسلسی مٹی میں پھنس گئی ہے اور اب وہ نہ آگے بڑھتی ہے نہ پیچھے گھسیٹی جا سکتی ہے۔ جنگ میں چینیوں کو کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی ہے نہ ہو سکتی ہے، لیکن فاصلہ اور وقت اور ان کا اپنا بڑھتا ہوا اتحاد انہیں سہارا دے رہا ہے، اور کوئی تعجب نہیں کہ جاپان کے ہتھیار اور اس کی فوجی تنظیم چین کی اس

قدرتی طاقت کی ٹکر نہ لے سکے

دو سال ہوئے جاپان نے اندرونی منگولیا میں فوج کے بل پر ایسی مقامی حکومتیں قائم کی تھیں جو اس کے اثر میں تھیں لیکن منگول اس تقسیم کو پسند نہیں کرتے ہیں، اور اب جو وہاں سے جاپانی فوجیں ہٹا کر چین بھیج دی گئی ہیں تو اندرونی منگولیا والوں نے بیرونی یعنی شمالی منگولیا سے جس کی سرپرستی روس کو حاصل ہے مشورے کرنا شروع کر دیا ہے اور کوئی تعجب نہیں اگر دونوں مل کر شمال کی طرف سے جاپانی فوجوں پر ٹوٹ پڑیں۔ اگر ایسا نہ ہوا تب بھی جاپان کا یہ بازو کھلا رہیگا۔ اور اُسے بچانے کے لیے اُسے چین سے اس طرف چند فوجی دستے منتقل کرنا پڑینگے۔

۱۹۳۶ء میں جاپان نے اس رستے کو جو شمال مغربی چین سے روس کو جاتا ہے روکنے کے لیے مغربی چین کے مسلمانوں سے ساز باز شروع کی تھی لیکن یہ اور اس کے بعد ۱۹۳۷ء کی ایک اور کوشش بالکل ناکامیاب رہی اور وہ جاپانی جو تحفے اور بندوقیں لے کر اس طرف گئے تھے اب تک لاپتہ ہیں، اگرچہ بندوقوں کی رسید پہنچ گئی ہے۔ اب چین کے لیے سامان جنگ حاصل کرنے کا کانٹون اور ہونگ کونگ کے علاوہ یہ بھی ایک رستہ ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سے بہت فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ ڈاکٹر سُن فو جو چینی قوم کے سفیر بن کر روس گئے تھے، اپنے مقصد میں غالباً کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کا حال ہی میں ایک بیان شائع ہوا ہے جس میں اُنھوں نے اپنی قوم کو اور دنیا کو یقین دلایا ہے کہ روس چین کی مدد کرنے کو تیار ہے۔ لیکن چینیوں کو اُمید ہے کہ روس کی مدد کے بغیر بھی دشمن کو ملک سے نکال باہر کرینگے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ روس عدم مداخلت کا وہی طریقہ اختیار کریگا جو اٹلی اور جرمنی نے ہسپانیہ میں کیا تھا، اور دوسری قومیں چاہیں بھی تو اُسے روک نہیں سکتی ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جاپان نے شروع میں چین کے خلاف جنگ کا اعلان نہیں کیا تھا اور جاپان کے خیال میں اب بھی قانوناً جنگ ہو ہی نہیں رہی ہے۔ اس لطیفے کا جواب ابھی حال میں روس نے خوب دیا جب اس کا ایک ہوائی جہاز پکڑا گیا کہ ہمارے اوپر مداخلت کا الزام کس منہ سے لگایا جاتا ہے جب آپ خود ہی اصرار سے کہتے ہیں کہ آپ کے اور چین کے درمیان جنگ نہیں

ہو رہی ہے۔

اسی طرح کا ایک اور لطیفہ جو نامکمل رہ گیا یہ ہے کہ جاپان نے برطانیہ سے بیچ میں پڑکر صلح کرانے کی درخواست کی تھی۔ مگر یہ لطیفہ چینی تھا اور اس پر ہنسنے کی نوبت نہیں آئی۔ (م۔م)

(باجازت آل انڈیا ریڈیو دہلی)

اسلامی دنیا

مصر :-

۳۱۔ مارچ اور ۲۔ اپریل کے انتخابات نے مصر کی سیاست کا رنگ بالکل ہی بدل دیا۔ کہاں تو یہ حال تھا کہ ۱۹۲۳ء سے لے کر اب تک جب کبھی عام انتخابات ہوتے وفدی ہزار مشکلات کے باوجود سو فیصدی نہیں تو نوّے فیصدی ضرور کامیابی حاصل کرتے اور کہاں اب یہ ہے کہ وفد کے صرف بارہ ۱۲ ارکان کامیاب ہوئے، اور خود مصطفیٰ نحاس اور مکرم عبید جو وفد کے لیڈر اور سیکرٹری ہیں اپنے آپ کو شکست سے نہیں بچا سکے۔

اس انقلاب کے اسباب کچھ بھی ہوں، پر اتنی بات یقینی ہے کہ وفد کی آپس کی سرپھٹول سے اُن کی ہوا اُکھڑ گئی تھی۔ مانا کہ حکومت نے انتخابات کی آزادی میں دخل اندازیاں کیں اور ووٹ دینے والوں اور لینے والوں کو غیر قانونی طور پر ڈرایا دھمکایا لیکن اتنا اندھیر تو نہیں ہو سکتا کہ وفد کی سی منظم اور زبردست پارٹی محض ان دقتوں کی وجہ سے اپنے سینکڑوں اُمیدواروں میں سے صرف بارہ کو کامیاب کرا سکے۔ آخر ہندوستان میں پچھلے انتخابات میں کانگریس کو زک دینے کے لیے کونسی تدابیر تھیں جو نہ کی گئی ہوں لیکن جمہور کا سیلاب تھا کہ سب مخالفتوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گیا۔

۱۲۔ اپریل کو نئی پارلیمنٹ کا افتتاح ہوا اور بادشاہ کی زبان سے وزارت نے اپنے پروگرام کا اعلان کیا۔ مصر کے داخلی اور خارجی جھگڑوں کا نبٹانا کچھ اتنا آسان کام نہیں اور نہ نعرہ بازیوں اور ہنگامہ خیزیوں سے اب کام چل سکتا ہے۔ انگریز کے بیچ میں سے ہٹ جانے سے مصر کی بھیانک تصویر

اب ہر شخص کے سامنے ہے، تباہ حال فلاح روٹی چاہتا ہے، پڑھے لکھے طبقے بیکاری کے ہاتھوں پریشان ہیں، عام آبادی قرضوں کے بار کے تلے دبی ہوئی ہے، امرا تو مال مست ہیں ہی لیکن فقیر اب حال مست نہیں رہے۔ اب تک "انگریز کو نکالو" کے نعرے سے ان کو بازی گر سیاست داں تسکین دے دیا کرتے تھے لیکن اب تو سیاسی رہنماؤں کے خود اپنے قول کے مطابق انگریز نکل گیا، سوال یہ ہے کہ اب فقیروں کی بے اطمینانی بلکہ خواہش جنگ آزمائی کو کس طرح پورا کیا جائے۔ الغرض نئی وزارت کو بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا، اور اگر اُس نے حالات کو بدلنے میں انقلابی تدابیر اختیار نہ کیں تو مصر میں انتہا پسند تحریکوں کو سر نکالنے کا خوب موقع ملیگا۔

انتخابات کے سلسلہ میں جامع ازہر کے رئیس اعلیٰ شیخ مراغی کے ایک اعلان نے ملک میں ہلچل سی ڈال دی تھی۔ رائٹر کی خبر رساں ایجنسی نے اس اعلان کو اتنی اہمیت دی کہ اُسے دنیا جہان میں مشتہر کیا، شیخ مراغی نے انتخابات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کو سن لینا چاہیے کہ اب مصر میں مذہب کی اہمیت سے کوئی پارٹی انکار نہیں کرسکتی" ۱۹۲۰ء کی قومی تحریک نے مذہبی عناصر کو بالکل پس پردہ پھینک دیا تھا، سیاست کی گرم بازاری تھی، اور مذہبی اور اخلاقی قدریں ملک و ملت کی راہ میں رکاوٹیں سمجھ کر چھوڑی جا رہی تھیں، آخر اٹھارہ برس کے بعد مذہب نے سنبھالا لیا ہے، خدا کرے کہ وہ اس سنبھالے سے سنبھل جائے۔ ورنہ خدانخواستہ اگر مذہب نے اب بھی فقہی موشگافیوں اور بیکار بحثوں سے قدم باہر نہ نکالا، اور اہل ملک کی روحانی تسکین اور اجتماعی مرفہ الحالی کا سامان بہم نہ کیا تو یہ پکار مذہب کی آخری پکار ہوگی، اور مذہب کی زمام قیادت علماء کے ہاتھوں سے نکل کر ترکی کی طرح انقلابی نوجوانوں کے ہاتھ میں چلی جائیگی۔

روشن خیال حضرات کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ "مذہب خطرہ میں ہے" کی یہ صدا رجعت پسندی اور ثروت پرستی کے حلقوں سے نکلی ہے۔ شیخ مراغی جس مذہب کی اہمیت اپنے سیاسی کارفرماؤں سے منوانا چاہتے ہیں۔ وہ وہ مذہب نہیں جس کو مصطفے کمال نے بیخ و بن سے اکھیڑ پھینکا ہے اور اب رضا شاہ اُسے ملک بدر کرنے کی فکر میں ہیں۔ وہ رجعت پسندی، جاہ پرستی، اور جہالت و توہمات کا مذہب

نہیں بلکہ مصری مصلحین کے سامنے مذہب کی وہ حیثیت ہے جو ایک قوم کی روحانی اور اجتماعی زندگی کا اساس ہوتا ہے اور اس کو ٹھکرا کر قوم کھوکھلی سی ہو کر رہ جاتی ہے۔ مصر نے گزشتہ ہنگامہ خیز زمانہ میں مذہب کی اس حیثیت کو بھلا دیا تھا نتیجہ یہ نکلا کہ قوم کا دماغی توازن بگڑ گیا، نہ وہ مغربی معیاروں تک پہنچ سکی، اور نہ اپنا مشرقی اساس حیات باقی رکھ سکی، مذہبی جمود کی شکل عیش کوشی نے لے لی، اور زندگی سراپا طاؤس و رباب بن کر رہ گئی۔

روس:۔

چند دن ہوئے اخبارات میں یہ خبر آئی تھی کہ روس کی اشتراکی حکومت نے ایک بہت بڑے مسلمان رہنما کو پھانسی کی سزا دے دی، اس قبیل کی آئے دن اور بھی اطلاعات آتی رہتی ہیں۔ اشتراکیت اور روسی ترکوں کی چپقلش کو سمجھنے کے لیے اس تصویر کا پس منظر سامنے رکھنا ضروری ہے

اشتراکی انقلاب سے پہلے روس کے زاروں نے اپنی ترکی رعایا کو حلقہ بگوش رکھنے کے لیے بہت سی راہیں اختیار کی تھیں، اول تو ترکوں کو زبردستی عیسائی بنا کر روسی قومیت میں مدغم کرنے کی کوشش کی، ہوا یہ کہ جو قبائل اسلامی اثرات سے خالی تھے اور اسلامی تمدن نے اُن کی قومی تشکیل میں کوئی رنگِ امتیازی پیدا نہ کیا تھا وہ آسانی سے نئے مذہب کو قبول کرنے لگے لیکن جن کے ہاں چند پشتوں سے اسلامی روایات جڑ پکڑ چکی تھیں وہ زاروں کے خلاف ڈٹ گئے، بغاوتیں ہوئیں بے طرح خون بہایا گیا اور قتل و غارت میں حکومت نے کوئی کسر نہ چھوڑی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں اسلامی بیداری کی بنیاد پڑ گئی۔ روسی ترکوں نے اپنے اخبارات نکالے، مدارس کھولے، نئے علوم و فنون کی تحصیل کی اور ملک میں قومی شعور پیدا ہو گیا۔ روسی ترکوں کی بیداری کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ جنگ عظیم سے پہلے یہاں کے کئی نوجوان عثمانی ترکوں کے ہاں جا کر اُن کی ملی تحریکات کے رہنما بنے، اور اپنے علم و ادب اور شعر و سخن سے عثمانیوں میں نئے انقلاب کا بیج بویا۔

سنہ ۱۹۱۷ء اور سنہ ۱۹۱۸ء میں اشتراکی سیلاب کا دھارا یورپی روس سے ترکی روس کی طرف بہا، مسلمان زار کی حکومت سے خوش نہ تھے، اس لیے اُنہوں نے نئے انقلاب کا خیر مقدم کیا۔ دوسرے

اُس زمانے میں لینن کی حکمت عملی بظاہر اسلام دوست تھی اور انور طلعت، جمال اور شکیب ارسلان ماسکو میں پناہ گزین تھے، نیز اشتراکی پارٹی یورپی حکومت کے نرغے میں بُری طرح پھنسی ہوئی تھی، اس آڑے وقت میں مسلمانوں سے دوستی پیدا کرنا اُن کے لیے ناگزیر تھا۔ لینن نے اشتراکی روس کو سرمایہ دار یورپ سے بچانے کے لیے مسلمان رہنماؤں سے کہا تھا کہ اسلامی ممالک میں پھیل جاؤ اور ہر مسجد کو سامراج کے خلاف پروپیگنڈے کا مرکز بناؤ۔

روس کا اشتراکی انقلاب کامیاب ہوا۔ جہاں کشائی کے بعد اب جو جہانبانی کی نوبت آئی تو روسی ترکوں سے اشتراکی روسیوں کی ٹکر ہوئی۔ اشتراکیت ایک نئے اساس پر روسی قومیت کی بنیاد رکھ رہی تھی، لیکن ترک جو کئی صدیوں سے اپنے ملی وجود کو ایک خاص رنگ دے چکے تھے اس نئے اساس کو کیسے قبول کرتے۔ سوال نمازوں، اذانوں اور مسجدوں کا نہ تھا بلکہ روسی ترکوں سے مطالبہ یہ کیا جا رہا تھا کہ تم اپنے آپ کو بھول جاؤ۔ جس تمدنی ورثہ کو تم اب تک اپنا سمجھ رہے ہو اُس کو خیرباد کہہ دو، نئے حالات میں پنپنے کے لیے تھوڑی سی بھول چوک تو ہر قوم کو کرنا ہی پڑتی ہے لیکن اپنے ملی وجود سے سراسر انکار کسی قوم کے بس کی بات نہیں، الغرض تصادم ضروری ہو گیا، روسی اشتراکیت نے اسلام کو مسیحی کلیسا سمجھا، اور اس کے اثر کا باقی رہنا اپنی ریاست کے لیے نقصان دہ قرار پایا۔

بے شک اشتراکیت کا ریلا روسی ترکوں کو اپنے اندر بہائے جا رہا ہے، نوجوانوں نے جس ماحول میں آنکھیں کھولی ہیں وہ سرتاپا اشتراکی ماحول ہے۔ بوڑھے کبھی کے رخصت ہو گئے، اور جو ہیں وہ یا تو ڈر کے مارے سہم گئے ہیں یا اپنی جان بچا کر ملک سے نکل گئے ہیں۔ اب اشتراکی معماروں کے ہاتھ میں قوم کی نئی پود ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ اسلامی اثرات روسی ترکوں کی زندگی میں اشتراکیت کے مقابلہ میں جم سکینگے یا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائینگے

اشتراکی روس کے ماتحت تقریباً تین کروڑ مسلمان بستے ہیں۔ کیا اشتراکی عمل کیمیاوی ان کو قومیت کے ایک ایسے مرکب میں ڈھالنے میں کامیاب ہو جائیگا جس کے اجزا پھر کبھی جُدا جُدا نہ ہو سکیں یا اس دوران میں کوئی اور انقلاب رونما ہو جائے جو اس عمل کیمیاوی کو پایۂ تکمیل تک پہنچنے

سے پہلے ہی ختم کردے، تیسری صورت یعنی اشتراکی علم کے نیچے روسی ترک اپنا ملی وجود برقرار رکھ سکیں بہت مشکل نظر آتا ہے۔

فلسطین:-

ارض مقدس کے شہروں، دیہات، پہاڑوں اور صحراؤں میں برطانی فوجیں اب تک پڑاؤ ڈالے پڑی ہیں، اور کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ قتل وغارت اور مار دھاڑ کی خبریں برطانی طیاروں اور توپوں کو "بزن" کا حکم دینے پر مجبور نہ کرتی ہوں، اس آٹھ لاکھ کی آبادی نے جس میں بچے، بوڑھے عورتیں، اور بے دست و پا ہزارہا افراد بھی شامل ہیں پورے ایک برس سے دنیا کی سب سے زبردست سامراجی سلطنت کو پریشان کردیا ہے۔ اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ جب کبھی "عرب لٹیروں" اور برطانی سپاہیوں میں ٹکر ہوئی، ہوائی جہازوں اور مشین گنوں کے مقابلہ میں عربوں کی بندوقیں زیادہ کام نہ دے سکیں لیکن وَنِّیْ عرب بندوقچیوں کو پسپا کرنے میں برطانی کمک میں وہ افراتفری مچتی ہے کہ حکومت کا دم صحیح معنوں میں گھٹنے لگتا ہے، کہتے ہیں عربوں کو اس قسم کی جنگ میں خداداد ملکہ حاصل ہے "کرّوفر" یعنی چھاپہ مارنا اور خطرہ دیکھ کر بھاگ جانا تو جنگ میں عربوں کا قومی امتیاز ہے۔ اس پر فلسطین کی پہاڑیوں اور دشوار گذار راستوں نے "کرّوفر" کے بہترین مواقع فراہم کردیے ہیں۔

فلسطین کی خبریں پڑھیے تو قتل وغارت، پھانسی، جرمانہ، قید و بند، اور مار کٹائی اور ضبطیوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا کسی جگہ گولی چل جائے تو کہیں آس پاس گاؤں ہو تو برطانی فوج اُس پر چھاپہ مارتی ہے، فاقہ مست عربوں کے پاس بھیڑ بکریوں کے سوا اور ہوتا ہی کیا ہے۔ وہ تاوان کی نذر ہوتی ہیں، جوانوں کو بندوقوں کے کندوں سے پیٹا جاتا ہے، عورتوں کی بے حرمتی ہوتی ہے، اور گاؤں میں پولس یا فوج کا دستہ متعین کردیا جاتا ہے، تعجب تو یہ ہے کہ اس سخت گیری کے باوجود فلسطینی اب تک مقابلہ کیے جا رہے ہیں، نہ اُنھیں موت ڈرا سکی ہے، اور نہ قید و بند اور جرمانے و ضبطیاں ہراساں کرسکی ہیں۔

خون خرابہ تو ایک طرف رہا نظر بندوں کے کیمپ الگ قائم کیے جا رہے ہیں، برطانی پارلیمنٹ

میں ایک سوال کے جواب میں یہ بتایا گیا کہ ۲۸ فروری تک ۶۵۸ عرب نظر بند کیے جا چکے ہیں "فلسطین" اخبار لکھتا ہے کہ "یہ تعداد اصل تعداد سے بہت کم ہے، نیز ان نظر بندوں کے علاوہ سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں عرب فوجی پکڑ دھکڑ اور اندھیر گردی کی وجہ سے گھر سے بے گھر ہو گئے ہیں اور آس پاس کے علاقوں میں مارے مارے پھر رہے ہیں"۔

جب ملک کی یہ حالت ہو تو کسی نئے برطانی کمیشن کی آمد سے فلسطین کی صورت حال میں کیا تبدیلی پیدا ہو سکتی ہے، نیا کمیشن مجوزہ تقسیم کی حدیں مقرر کرنے آیا ہے، اور کچھ حد تک اسے ترمیم و تنسیخ کا بھی حق دیا گیا ہے لیکن فلسطین کی تمام سیاسی جماعتوں نے متفقہ طور پر یہ کہہ دیا ہے کہ جب تک تقسیم کا فیصلہ اپنی جگہ پر قائم ہے، فلسطین میں امن قائم نہیں ہو سکتا، اگر رعب و جبروت سے عربوں کو خاموش بھی کر دیا گیا تو یہ ناسور ایک نہ ایک دن پھوٹ کر رہیگا، مصیبتوں سے گھبرا کر عرب اپنے عقیدے سے پھرا نہیں کرتا بلکہ برخلاف اس کے مصیبتیں اُس کے عقیدہ کو اور مستحکم کر دیتی ہیں۔

"الاہرام" قاہرہ میں یہ خبر چھپی ہے کہ امام یمن نے برطانی وزیر اعظم کو تار دیا ہے کہ فلسطین کے قضیہ کو ختم کرنے کی ضرور سعی کرنا چاہیے، اُن کے خیال میں بحیرۂ روم کے کنارے پر یہودی سلطنت کا قیام نہ مشرق قریب کی عربی سلطنتوں کو آرام سے بیٹھنے دیگا اور نہ دوسری سلطنتیں چین سے رہ سکینگی، ڈر یہ ہے کہ پھر اس سرزمین میں وہ محاذ نہ قائم ہو جائے جو صلیبی جنگوں کے زمانہ میں مشرق اور مغرب یا اسلام اور عیسائیت کے درمیان قائم ہو چکا ہے۔ اہل عراق کا تو یہ حال ہے کہ وہ اپنے فلسطینی بھائیوں کے مظالم سُن سُن کر غم و غصہ میں تلملا رہے ہیں، اُن کے اخبارات کی شعلہ نوائی معلوم نہیں خود عراق کا خرمن امن کب پھونک ڈالے، عراق میں یہودیوں کی بہت کافی تعداد ہے، کاروبار سب ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے، ڈر یہ ہے کہ اگر فلسطین میں یہودیت اور برطانی سامراج کا ساتھ رہا تو عراق کے یہودیوں کو اپنی جان کے لالے پڑ جائینگے، اور فلسطین کی آگ کے شرارے دور دور پہنچ کر رہینگے۔

عراق کا اخبار "الکفاح" لکھتا ہے کہ صہیونیت اور برطانیت کے مقابلہ کے لیے ہمیں اتحاد اسلامی

اور اتحادِ عربی قائم کرنا چاہیے، ارض مقدس کو مسیحی اور یہودی ہاتھوں میں جانے سے بچانے کے لیے روئے زمین کی تمام اسلامی قوموں کو بڑی آسانی سے برطانیہ کے خلاف کیا جا سکتا ہے، اور عربی اتحاد اس مخالفت کو عملی شکل دینے میں ممد و معاون ہوگا، وہ برملا فلسطینی مجاہدوں کی تائید کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ برطانیہ کو تنگ کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ اکّے دُکّے عرب بندوقیں سنبھال کر برطانی سپاہیوں کی تاک میں رہیں اور جہاں موقع ملے اُن پر ہاتھ صاف کرنے سے نہ چوکیں دوسری طرف برطانی مال کا مقاطعہ کیا جائے اور برطانیہ کے خلاف ایسا سخت پروپگنڈا ہو کہ اُسے عربوں سے صلح کیے بغیر چارہ نہ رہے۔

عربوں کے اس جنگجویانہ ذہنیت کا اندازہ اس مراسلہ سے ہوگا جو عراق کے اخبار "الکفاح" میں چھپا ہے، مراسلہ نگار کسی فلسطینی دستہ کا لیڈر رہے، وہ لکھتا ہے :-

" مجاہدین کی جماعت عاملہ نے طے کیا کہ بیسان کی پولس چوکی پر حملہ کیا جائے، اور پھر جنین کے قصبہ پر قبضہ کرنے کی کوشش ہو، ایک دستہ تو نابلس کے فوجی مرکز پر چھاپہ مارے اور دوسرا نابلس اور جنین کے درمیان پہرہ دینے والوں سے چھیڑ چھاڑ کرے "

اس فیصلہ کے مطابق دستہ عمر بن خطاب نے تو بیسان چوکی کی راہ لی اور چھاپہ مار کر چوکی کے تمام اسلحہ اور ساز و سامان کو قبضہ میں کر لیا، پھر یہ چار دستے، دستہ قسام، دستہ حمزہ، دستہ عمرو بن عاص اور دستہ ابوبکر، جنین کی طرف بڑھا اور چاروں طرف سے اسے گھیر لیا، نعرۂ اللہ اکبر کی گونج میں مشین گنیں فوج اور پولیس کے سپاہیوں پر آگ برسا رہی تھیں، وہ مقابلہ کی تاب نہ لا کر بھاگ نکلے اور مجاہدین نے قصبہ پر قبضہ کر لیا، اور اُنھیں بہت سی بندوقیں اور ساز و سامان ملا۔

دستہ علی بن ابی طالب نے نابلس کا رُخ کیا اور مشرق اور مغرب دونوں طرف سے نابلس کے فوجی مرکز پر فائر کرنے شروع کیے، نابلس کا فوجی مرکز تو اس دستہ کو پسپا کرنے میں مصروف تھا کہ دستہ خالد بن ابی ولید اور دستہ ابوعبیدہ نے نابلس اور جنین کے درمیان پہرہ دینے والوں کو روکا ایک برطانی دستہ سے مقابلہ ہوا "ٹنک" کا ڈرائیور ایک مجاہد کی گولی کا نشانہ بنا، دوسری موٹر کا ڈرائیور

جو یہودی تھا، مجاہدوں کے نرغہ میں آگیا۔ پہلے تو اُس نے روپیے پیسے دے کر بچنا چاہا، اور جب مقابلہ کے لیے پستول نکالا تو ایک مجاہد نے اُس کو ٹھکانہ لگا دیا۔

نابلس اور جنین کے حلقہ کا افسر اعلیٰ، شیخ عطیہ

زمانہ کی ستم ظریفی دیکھیے کہ جنگ عظیم کے دوران میں کرنل لارنس نے عربوں کے اس قسم کے دستوں کو منظم کر کے ترکوں کو زک پر زک دی تھی۔ اور آج یہی دستے لارنس کے جانشینوں کو تنگ کر رہے ہیں۔

ٹیونس:۔

عربی کی ایک ضرب المثل میں ٹیونس کو نازنین، الجزائری کو مرد اور مراکشی کو شیر ببر سے تشبیہ دی گئی ہے، اہل ٹیونس صرف قلم کے دھنی اور اپنے جوہر بزم سخن میں دکھانے کے قائل ہیں۔ اسی لیے ٹیونس کو وکیلوں کی سرزمین کا لقب دیا جاتا ہے لیکن اب ٹیونسی نازنین کے بھی مردانہ جوہر کھلنے لگے ہیں۔ فرانس کے خلاف قانونی جنگ تو ایک عرصہ سے جاری ہے ہی لیکن اب اس جنگ نے غیر قانونی شکل اختیار کر لی ہے، اور زبان اور قلم کی جگہ تلوار اور بندوق نے لینی شروع کر دی ہے، دو تین دن ہوئے فرانسیسی حکومت کے سپاہیوں اور وطن پرستوں کے درمیان ایک ٹکر کی خبر آئی تھی جس میں دو تین جانیں گئیں اور اچھا خاصہ بلوہ ہو گیا،

ٹیونس میں تیس لاکھ کے قریب تو مسلمان ہیں اور دو دو لاکھ کی تعداد میں فرانسیسی اور اطالوی آبادکار ہیں، آخر الذکر نے ملک کے معاشی وسائل پر بہت حد تک اجارہ داری قائم کر رکھی ہے اقتصادی بدحالی کی وجہ سے اہل ملک حکومت کی سرمایہ دارانہ حکمت عملی سے سخت نالاں ہیں دوسرے مصر سے نسبتاً قریب ہونے کی وجہ سے عربی ادب کا یہاں الجزائر اور مراکش سے زیادہ چرچا ہے اور چونکہ آبادی کا بیشتر حصہ خالص عربوں کا ہے اس لیے شام فلسطین اور مصر کی عربی تحریک نے ان میں سے بہت زیادہ اپنے ہم نوا پیدا کر لیے ہیں۔

۱۹۱۹ء میں عبد العزیز ثعلبی نے دستور پارٹی کے نام سے اپنی سیاسی جماعت بنائی، اُن کے مطالبات خود اختیاری حکومت کے تھے۔ فرانسیسی سامراج کو موصوف کی یہ جرأت پسند نہ آئی اور بیچارے

کو برسوں دشتِ غربت کی خاک چھاننی پڑی، اس جلا وطنی کے دوران میں وہ دو بار ہندوستان بھی آچکے ہیں۔ اب اُنہیں واپس وطن جانے کی اجازت ملی ہے لیکن زمانہ کی تیز رفتاری ملاحظہ ہو کہ وہ اب ٹیونس میں معتدلین میں سے شمار ہوتے ہیں، اور دستور پارٹی کے نوجوان لیڈر اُن کی اعتدال پسندی سے اتنے ہی شاکی ہیں جتنے ۱۹۱۹ء میں اُن کے بہت سے ہم وطن اُن کی انتہا پسندی سے شاکی تھے۔

اہل ٹیونس حکومت سے خفا ہیں، اور اُن کی خفگی اس وجہ سے اور بڑھ رہی ہے کہ اُن کے دوسرے عرب بھائی یعنی مصری، عراقی اور شامی تو آزاد ہو کر جمعیۃ الاقوام میں داخل ہو رہے ہیں، اور ٹیونسی اب تک غلام ہیں اور سامراجی سخت گیریوں کے نشانہ ۱۹۳۴ء میں دستور پارٹی کی سرگرمیوں نے حکومت کی نظر میں خطرناک صورت اختیار کر لی تھی چنانچہ فرانسیسی ہائی کمشنر نے تقریباً ایک سو کے قریب دستوری لیڈروں کو صحرا میں جلا وطن کر دیا لیکن اس سخت گیری سے تحریک نرم نہیں پڑ گئی اور وطن پرستوں کا مطالبہ بدستور قائم ہے۔

فرانس کو اٹلی کی ہمسائگی سے ڈر لگ رہا ہے۔ ٹیونس کے مشرق میں طرابلس ہے جہاں مسولینی کی اسی ہزار فوج ڈیرہ ڈالے پڑی ہے۔ ظاہر ہے اہل ٹیونس کے لیے فرانسیسیوں کو ستانے کا اس سے بہتر موقع کیا ملیگا۔ ٹیونس والے شام اور مصر و عراق کا سا معاہدہ فرانس سے کرنا چاہتے ہیں، اور جب تک اس میں وہ کامیاب نہ ہونگے یہ شورش برابر بڑھتی جائیگی۔ م۔س

ہندوستان:۔

مسلم لیگ کا اجلاس مسلم لیگ کا خاص اجلاس کلکتہ میں ۱۷ اور ۱۸ اپریل کو منعقد ہوا۔ جلسہ کے صدر مسٹر جناح کا نہایت شاندار جلوس سولہ گھوڑوں کی گاڑی میں نکالا گیا۔ شرکاء جلوس کی تعداد اور جوش سے اگر اندازہ کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ مسلم لیگ کو عوام سے رابطہ پیدا کرنے میں خاصی کامیابی ہو رہی ہے۔ لیگ کا یہ اجلاس مسجد شہید گنج کے بارے میں لیگ کی پالیسی متعین کرنے کے لیے منعقد کیا گیا تھا اور کلکتہ میں یہ اجلاس اس لیے رکھا گیا تھا تاکہ پنجاب کی ہنگامہ پرور فضا سے دور رہ کر ٹھنڈے دل کے ساتھ اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کیا جا سکے۔ ملک برکت علی نے پنجاب کی مجلس قانون ساز کے سامنے مسلمانوں کے مقدس مقامات کے تحفظ کے لیے ایک مسودۂ قانون پیش کرنا چاہا تھا، لیکن سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم نے اس بل کو پیش نہیں ہونے دیا تھا اور اس سلسلہ میں ایک طویل بیان اپنی پالیسی کی وضاحت میں پیش کیا تھا۔ مسلم لیگ نے

پنجاب کے وزیر اعظم کے اس بیان کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ ان پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا اور ان کے ذمہ یہ خدمت تفویض کی کہ وہ اپنے ذاتی اثر اور رسوخ سے مصالحت کی کوئی صورت نکالیں۔

اس فیصلہ کی دانشمندی کا ملک کے طول و عرض میں عام طور پر اعتراف کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سکھ بھائیوں نے اپنے اس قانونی حق سے فائدہ اٹھا کر جس کو ہائی کورٹ کی اکثریت نے تسلیم کیا ہے ایک بہت ناخوشگوار صورت پیدا کر دی ہے۔ مذہب کے نام پر اس قسم کی دل آزاریاں چاہے وہ مسلمانوں کی طرف سے ہوں چاہے سکھوں کی طرف سے کچھ اچھی نہیں معلوم ہوتیں مذہب کا کام امن اور محبت کی نشر و اشاعت ہے اس کا کام شر انگیزی اور فتنہ خیزی نہیں ہے۔ جب مذہب کے پیرو اس کی روح کو چھوڑ دیتے ہیں اور محض اس کے مردہ جسم کی حفاظت کرنا اپنی زندگی کا مقصد قرار دے لیتے ہیں تو چاہے وہ اس کے لیے کتنی ہی جانی اور مالی قربانیاں کیوں نہ کریں وہ اپنے مذہب کی واقعی خدمت نہیں کر سکتے۔ جس طرح سکھوں نے مسجد کو گرا کر سکھ مذہب کی کوئی خدمت نہیں کی اسی طرح مسلمان بھی شہید گنج کے قطعۂ زمین کو واپس لے کر یا اس پر از سر نو ایک عالیشان مسجد تعمیر کر کے اسلام کی کوئی خدمت نہ کر سکیں گے۔ ہمارا یہ یقین ہے کہ شہید گنج کی واگذاری کے لیے جو لوگ اس وقت شورش کر رہے ہیں وہ بھی اس بنیادی حقیقت سے ناواقف نہیں ہیں۔ ان کا اضطراب اور بے قراری محض ایک زمین کے ٹکڑے کے واپس لینے کے لیے یا اس پر اینٹوں کا ایک ڈھیر کھڑا کرنے کے لیے نہیں ہے نہ ان کا مقصد سکھ بھائیوں کو پریشان کرنا یا انہیں سزا دینا ہے بلکہ ان کی تمنا اور کوشش یہ ہے کہ وہ مسلمانوں میں مذہبی بیداری پیدا کر سکیں ان کے دلوں میں خدا کا گھر دوبارہ بنا سکیں۔ کیونکہ جیسا کہ علامہ اقبال مرحوم نے فرمایا تھا:۔

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
دل اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا!

مسجدیں تو گرتی رہتی ہیں اور وقتی جوش کے ماتحت آناً فاناً دوبارہ بنا کر کھڑی کر دی جاتی ہیں لیکن جب تک اپنا یہ دل جو "پرانا پاپی" ہے راہِ راست پر نہیں آتا اس وقت تک مسلمانوں کا اصل مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ ہمیں درحقیقت شکایت خود مسلمانوں سے ہے سکھوں یا حکومت برطانیہ سے نہیں ہے۔ اگر ہم اچھے رہتے تو ہندوستان میں اسلامی سلطنت کو کیوں زوال ہوتا۔ سکھ ایک فوجی فرقہ کیوں بنتے۔ پنجاب پر ان کی حکومت کیوں قائم ہوتی۔ مسجد شہید گنج کے پاس گردوارہ کیسے بنتا۔ نہ سکھوں کا پنجاب میں عروج ہوتا نہ حکومت برطانیہ کا پنجاب پر قبضہ ہوتا نہ مسلمان مفلس، مقروض اور جاہل ہوتے۔ نہ ان کے عوام میں یہ ہنگامہ پسندیاں ہوتیں نہ ان کے رہنماؤں میں یہ گمراہیاں ہوتیں۔ نہ وہ سیاسی بازیگروں کے ہاتھ کا کھلونا بنتے اور نہ یہ دنیا کے لیے مسخروں اور بہروپیوں کی طرح سامان تفریح فراہم کرتے۔ رونا دراصل اسی "پرانے پاپی" کا ہے۔

میں نے جیسا ابھی کہا ہماری قوم کے سچے ہمدرد اور غمخوار قوم کی اصلی بیماری سے ناواقف نہیں ہیں لیکن وہ مسجد شہید گنج کے انہدام کو قوم کے لیے ایک عبرت آموز اور بصیرت افروز درس بنا کر پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا مقصد قوم کو بیدار اور منظم کرنا ہے تاکہ اس میں وہ اخلاقی صفات پیدا ہو سکیں جو قوموں اور اُن کے افراد کو بلند اور سرفراز کر کے دنیا کی عزت و توقیر کا مستحق بناتی ہیں۔

یہ سب جانتے ہیں کہ اپنی عبادت گاہوں کی عزت و حرمت دوسروں سے زبردستی نہیں کرائی جا سکتی۔ مذہب قوت اور تلوار کے زور سے نہیں پھیلتا۔ قانون کے ذریعہ لوگوں کو اپنے مذہب کی فضیلت کا معترف نہیں بنایا جا سکتا۔ اس کے لیے دلوں کو تسخیر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ عبادت گاہوں کے ساتھ رفاہ عام کے ادارے کھولنے ہوتے ہیں۔ شفاخانے، یتیم خانے، خیرات خانے، دارالمطالعے، کتب خانے، بے کسوں، لاچاروں، مصیبت زدوں کی امداد کے وسائل کو وابستہ کرنا ہوتا ہے۔ پریشان خاطروں کی دلجمعی کا سامان مہیا کرنا ہوتا ہے اور مذہب کا دروازہ بلا قید رنگ، نسل، عقیدہ، ذات مذہب سب کے لیے عام طور پر کھلا ہوا رکھنا ہوتا ہے۔ اپنی عبادت گاہوں کو جماعت انسانی کی خیر و برکت، رحمت و رافت، سکون قلب اور انشراح خاطر کا مرکز بنائیے۔ پھر آپ کی عبادت گاہوں کا تحفظ آپ ہی کے ذمے نہیں بلکہ ساری دنیا کے ذمے ہوگا اور غیر مذاہب والے ان کے قائم اور محفوظ رکھنے کے لیے آپ سے زیادہ مستعد نظر آئینگے۔

مسجدوں کے تحفظ کے لیے ننگی تلواروں اور خون آشام مجاہدوں کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ ایسے مسکین خاکساروں کی ضرورت ہے جو مسکراتے ہوئے پُرسکون چہروں کے ساتھ نہ صرف اپنے ہم مذہبوں بلکہ سب انسانوں کے دُکھ، درد، افلاس اور مصیبت کو دور کرنے کے لیے ہمیشہ مستعد رہتے ہیں۔ جو دوسروں کے غم اور تکلیف میں شریک رہتے ہیں اور دوسروں کے بھاری بوجھوں کو خود اُٹھاتے ہیں اور یوں آہستہ آہستہ اپنی زندگی کو دوسروں کی خدمت اور محبت میں قربان کر دیتے ہیں سچے مذہبی لوگ کوڑھیوں، تپ دق کے مریضوں، جرائم پیشہ قبیلوں، غریبوں کی تیرہ و تار جھونپڑیوں، شہروں کے گندے اور تباہ حال محلوں اور نامرادوں اور بے کسوں کے ویران دامنوں میں ملتے ہیں۔ وہ اپنی عبادت گاہوں کی حفاظت ننگی تلواروں سے نہیں کرتے نہ ننگی تلواریں لے کر دوسروں کی عبادت گاہوں پر حملہ کرتے ہیں۔ اگر پنجاب کے وزیر اعظم اپنے صوبہ کے سکھوں اور مسلمانوں کے سامنے مذہبی زندگی کا یہ نصب العین رکھ کر انہیں ایک دوسرے کی خدمت اور محبت پر آمادہ کر سکیں تو مسلم لیگ نے ان پر جو اعتماد کیا ہے وہ یقیناً صحیح ثابت ہوگا۔

شذرات

گذشتہ مہینہ کا سب سے پُر ملال سانحہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی وفات کا حادثہ ہے جو ۲۱۔اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح کو پیش آیا۔ ڈاکٹر صاحب کی ذات خوبیوں کا مجموعہ تھی جن کی محبت اور عظمت سے قلوب لبریز ہیں اور ان کی شخصیت نہ صرف اپنے علمی اور دماغی کمالات بلکہ انسانیت اور اسلامی صفات کی وجہ سے ایسی تھی جو کبھی کبھی فطرت کی طرف سے کسی خوش قسمت قوم کو بطور عطیہ کے ملا کرتی ہے۔ انہوں نے اپنی اسلامی حکیمانہ اور فلسفیانہ شاعری سے ملت جدیدہ کی دماغی تعمیر میں بہت بڑا حصہ لیا، اور اس قدر دلکش اور بلیغ مجموعہ اپنے اشعار کا چھوڑ گئے ہیں جو ملت کا ایک قابل فخر سرمایہ ہے۔ ان کے کلام کا یوں تو ہر پڑھے لکھے اور واقف کار کے دل پر اثر ہے، لیکن اہل جامعہ کو اُن کے ساتھ کچھ خصوصیتیں بھی حاصل تھیں کیونکہ وہ جامعہ کے خاص مربیوں اور ہمدردوں میں تھے۔ اس وجہ سے اُن کی وفات کے سانحہ کو جامعہ نے شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ بالخصوص اس بنا پر بھی کہ وہ ایک منفرد قابلیت کے مالک تھے۔ جن کی جگہ لینے والا دور حاضر میں کوئی نظر نہیں آتا۔ اور ان کے انتقال سے جو نقصان ملت کو پہنچا ہے اُس کی تلافی ناممکن معلوم ہوتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا سلسلۂ نسب کشمیری پنڈتوں کے ایک خاندان سے ملتا ہے جس کا کچھ حصہ اب تک کشمیر میں موجود ہے اور جس کی گوت "سپرو" ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے جد اعلیٰ آج سے تقریباً دوسو سال پہلے مسلمان ہوئے تھے اور اُنھوں نے سیالکوٹ میں آکر سکونت اختیار کر لی تھی۔ ڈاکٹر اقبال کی پیدائش ۱۸۷۶ء میں ہوئی۔ ابتدا میں اس زمانہ کے دستور کے مطابق مکتبوں میں پڑھتے رہے پھر اسکول میں داخل ہوئے۔ پانچویں جماعت سے ان کے جوہر نمایاں ہونے لگے۔ ہر درجہ میں وظائف یا انعامات حاصل کرتے رہے۔ انٹرنس میں بھی کامیاب ہو کر سرکاری وظیفہ پایا اور سیالکوٹ کالج میں

داخل ہو کر ایف اے پاس کیا۔ اس کے بعد لاہور میں فلسفہ لے کر بی اے میں کامیابی حاصل کی جس میں عربی اور انگریزی میں دو طلائی تمغے پائے اور وظیفہ بھی حاصل کیا۔

اس زمانہ میں پروفیسر آرنلڈ جو پہلے علی گڑھ کالج میں تھے گورنمنٹ کالج لاہور میں آ گئے تھے وہ ان کے فلسفیانہ دماغ کے معترف ہو گئے۔ چنانچہ انہی کی شاگردی میں ڈاکٹر صاحب نے ایم اے کا امتحان فلسفہ میں پاس کیا اور طلائی تمغہ بھی پایا۔

تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اورنٹیل کالج لاہور میں تاریخ فلسفہ اور سیاستِ مدن کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ پھر گورنمنٹ کالج میں فلسفہ اور انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے اس زمانہ میں وہ نہ صرف اپنے شاگردوں کی جماعت میں ہر دلعزیز اور مقبول ترین پروفیسر تھے بلکہ کالج کے افسروں اور محکمہ تعلیم کے عہدہ داروں کے اوپر بھی اُن کی قابلیت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس زمانہ میں سیاست مدن پر ایک کتاب اُردو میں "علم الاقتصاد" لکھی۔ پھر علمی ترقی کے لیے ولایت کا سفر اختیار کیا۔ اور کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفہ اخلاق کی ڈگری لی۔ اس کے بعد جرمنی کی میونک یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی (پی۔ ایچ۔ ڈی) کی فرسٹ کلاس ڈگری حاصل کی۔ ان کا مضمون "فلسفۂ ایران" تھا جو شائع کیا گیا اور عام طور پر علمی حلقوں نے اس کی داد دی۔

جرمنی سے واپس آ کر انگلینڈ میں بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا۔ پھر لندن یونیورسٹی میں چھ مہینے اپنے اُستاد پروفیسر آرنلڈ کی قائم مقامی کی۔ اسی زمانہ میں وہاں ایک انجمن میں اسلام پر چھ لکچر دیے جو بہت مقبول ہوئے۔ ۱۹۰۸ء میں ہندوستان واپس تشریف لائے۔

لیکن ڈاکٹر صاحب کو جس چیز نے خصوصیت کے ساتھ مقبول بنایا وہ اُن کی شاعری ہے۔ وہ جس وقت کالج میں پڑھتے تھے اُسی وقت سے شعر کہتے تھے۔ حسب دستور ابتدا غزلوں سے کی تھی۔ سب سے پہلے مشاعرہ میں جو غزل اُنہوں نے پڑھی تھی اُس کا مقطع یہ ہے۔

اقبالؔ لکھنؤ سے نہ دلّی سے ہے غرض ہم تو اسیر ہیں خم زلف کمال کے

اس غزل کا یہ شعر مشاعرہ میں بہت مقبول ہوا۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے　　　قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

پھر جب ملک پر نظر ڈالی اور ہندوستان اور اُس کے باشندوں کی زبوں حالی دیکھی تو وطن پرور شاعری کی طرف قدم بڑھایا۔ اسی زمانہ میں "ہمالہ" "نیا شوالہ" اور "ہندوستاں ہمارا" وغیرہ متعدد نظمیں لکھیں جو ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک پھیل گئیں۔ بلکہ "ہندوستاں ہمارا" تو بچوں کا قومی ترانہ بن گیا اور آج بھی اسکولوں اور جلسوں میں گایا جاتا ہے۔

سنہ ۱۹۱۱ء میں جنگ بلقان سے جب مسلمانوں پر مصیبت کا آغاز ہوا۔ پھر اس کے بعد طرابلس غرب پر اٹلی کے اچانک حملہ سے کوہِ غم ٹوٹ پڑا تو ڈاکٹر صاحب کا جذبۂ ملی جس کی ابتدا سفر یورپ سے واپسی پر شروع ہو گئی تھی پیدا ہو گیا۔ اب وہ وطنیت کی تنگنائے سے نکل گئے اور اُس کو ایک بت سمجھنے لگے۔ چنانچہ فرمایا :۔

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور　　　ساقی نے بنا کی روشِ لطف و کرم اور

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور　　　تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے　　　جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اور ترانہ ہندی کے بعد ترانۂ ملی لکھا :۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا　　　مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

چونکہ اُن کا پیغام ساری ملتِ اسلامیہ کے لیے تھا اس لیے انہوں نے اُردو زبان چھوڑ کر فارسی زبان اپنی شاعری کے لیے مناسب سمجھی۔ کیونکہ اقوام مسلمہ کا بڑا حصہ چینی ترکستان سے لے کر قسطنطنیہ تک اس کو سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہوئی کہ انہوں نے اپنی مثنویاں اسرار خودی، رموز بیخودی۔ پھر پیام مشرق زبور عجم، اور جاوید نامہ وغیرہ فارسی میں لکھیں۔ آخر میں اہل ہند کی اس شکایت کو سن کر کہ اُردو زبان بالکل چھوڑ دی ہے، دو مجموعے بال جبریل اور ضرب کلیم اُردو کلام کے بھی شائع کئے۔ ابتدائی کلام کا اُردو مجموعہ بانگ درا کے نام سے پہلے شائع ہو چکا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کی شاعری کی مقبولیت نہ صرف ہندوستان ہی میں ہوئی بلکہ اسلامی ممالک افغانستان۔ ایران، ترکی اور مصر سے گزر کر یورپ و امریکہ تک پہنچی۔ انگلش، فرنچ، جرمن، اٹالین اور روسی زبانوں میں اُن کی مثنویوں اور نظموں کے ترجمے کیے گئے۔ اور دنیا کے بڑے بڑے مفکرین نے مختلف ممالک میں ان کے کلام پر تبصرے لکھے اور ان کی مدح سرائی کی۔ جرمنی اور اٹلی میں تو ان کے نام سے انجمنیں قائم ہیں جن میں لوگ اُن کے کلام پر غور کرتے اور مقالے لکھتے ہیں۔

۱۹۲۲ء میں ہندوستان کی برطانوی حکومت کو بھی اُن کی عظمت اور شہرت کا احساس ہوا اور اُس نے بلا کسی قسم کی درخواست یا کوشش کے سر کا خطاب دیا۔

ڈاکٹر صاحب کے لیے ہندوستانی سیاست کوئی دلچسپ چیز نہ تھی۔ چنانچہ اُنہوں نے کہا۔

یہ عقدہ ہائے سیاست تجھے مبارک ہوں   کہ فیضِ عشق سے ناخن مرا ہے سینہ خراش

مگر ۱۹۲۶ء میں احباب کے اصرار سے پنجاب کونسل کی ممبری کے لیے کھڑے ہوئے اور بہت بڑی کثرت رائے سے منتخب ہوئے۔ وہاں غریبوں اور کسانوں کی حمایت کرنی چاہتے تھے مگر سُننے والا کون تھا۔ ایک بار مسودہ قانونِ لگان پیش تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے لگان کم کرانے کے لیے بہت زوردار تقریر کی۔ میاں سر فضل حسین مرحوم ممبر مال تھے اور اُنہیں سے خطاب تھا۔ اُنہوں نے کہا کہ صوبہ کی ترقی کے لیے روپیہ کی سخت ضرورت ہے اور حکومت کیمیا گری نہیں جانتی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ جب تک حکومت کے قبضہ میں کسان ہیں جو مٹی سے سونا بناتے ہیں اس وقت تک اس کو کیمیا سیکھنے کی ضرورت کیا ہے۔ وزیر مال نے کہا کہ یا تو مالگزاری کا یہی قانون رہیگا یا بالکل چھوڑ دیا جائیگا۔ کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ کم سے کم اتنا تو ہو سکتا ہے کہ جس کے پاس صرف پانچ بیگہ زمین ہو اور ایسے رقبہ میں واقع ہو جہاں آب پاشی نہیں ہو سکتی اُس کا لگان معاف کیا جائے۔ وزیر مال نے کہا کہ یہ قرارداد تو اس مسودہ کے لیے جو شیر خوار بچہ ہے موت کا باعث ہوگی اور ارکان کونسل قتل اولاد کے مرتکب ہونگے۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا کہ آج کل جبکہ منع حمل کی تدابیر پر دنیا میں عمل ہونے لگا ہے اگر ایسے بچہ کو مار دیا جائے جس کی نسبت یقین ہو

کہ وہ بڑا ہو کر شریر ہو گا تو کیا مضائقہ ہے لیکن باوجود ان بحثوں کے کچھ نہ ہوا۔

غرض پیہم ناکامیوں کے بعد ان کو معلوم ہو گیا کہ ان کونسلوں میں میں کچھ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اس کے بعد سے پھر سیاست کی طرف رُخ نہیں کیا۔ آخر میں بعض وجوہ سے گول میز کانفرنس میں جانا ضروری معلوم ہوا اس وجہ سے اس میں شرکت کی۔

۱۹۲۸ء میں ڈاکٹر صاحب کو مدراس میں مدعو کیا گیا۔ جہاں اُنہوں نے چھ لکچر دیے۔ پھر بعد میں دو لکچروں کا اور اضافہ کیا۔ ان کا مجموعہ انگریزی میں شائع ہو چکا ہے۔ مگر اردو ترجمہ ابھی تک نہیں چھپا ہے۔ یہ اسلام کا جدید علم کلام ہے جس کو دنیا کے بڑے بڑے فلسفیوں نے غور سے پڑھا اور بہت پسند کیا۔

مدراس سے ریاست میسور نے بلایا۔ اس کے بعد حیدر آباد دکن نے دعوت دی۔ ان تمام مقامات پر ان کا شاہانہ استقبال ہوا اور جا بجا ایڈریس پیش کیے گئے۔ میسور یونیورسٹی میں ڈاکٹر صاحب کی تقریر اس قدر مقبول ہوئی کہ وہاں کے فلسفہ کے پروفیسر نے کہا کہ مسلمان ڈاکٹر اقبال کو لاکھ اپنا کہیں مگر وہ ہم سب کے ہیں۔ اگر مسلمانوں کو یہ ناز ہے کہ اقبال ان کا ہم مذہب ہے تو ہم کو یہ فخر ہے کہ اقبال ہندوستانی ہے۔

ڈاکٹر صاحب قوی ہیکل تھے اور اُن کے قویٰ مضبوط تھے۔ مگر ادھر ایک عرصہ دراز سے ان کی صحت خراب رہنے لگی تھی۔ دمہ کے دورے سخت پڑتے تھے تا آنکہ اس نے خاتمہ ہی کر کے چھوڑا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

محمل میں چھپا ہی قیس حزیں دیوانہ کوئی صحرا میں نہیں
پیغام جنوں جو لایا تھا اقبالؔ وہ اب دنیا میں نہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

زیرِ ادارت :- ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

جلد ۲۹	جون سنہ ۱۹۳۸ء	نمبر ۶

فہرست مضامین

ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم

دن ڈوبے اور اندھیرا چھا جائے تو سب اپنے گھروں میں روشنی کرتے ہیں اور اپنے آپ کو تاریکی کی زحمتوں سے بچاتے ہیں۔ جب کسی کی زندگی کا دن ڈوبتا ہے تو رسم ہے کہ جس کسی کا مرنے والے سے تعلق ہو وہ محبت اور ذکر خیر کا دِیا جلا کر غم کا اندھیرا دور کرے اور زندگی کا اعتبار قائم کرے لیکن بعض برگزیدہ مرنے والے ایسے ہوتے ہیں جو کسی کے غم اور کسی کے یاد کرنے کا سہارا نہیں چاہتے، جنہیں یقین ہوتا ہے کہ دنیا میں ایک طرف شام ہو تو دوسری طرف دن کی رونق پھیلی ہوتی ہے اور زندگی کا کاروبار جاری ہوتا ہے، اور وہ ایک میدانِ عمل سے دوسرے کو اس اطمینان سے جاتے ہیں جیسے کوئی ایک کام ختم کر کے دوسری جگہ جاتا ہے۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اپنی آخری سانس میں فرمایا تھا کہ مسلمان کی نشانی یہ ہے کہ موت آئے تو اُسے مُسکراتا دیکھے، اور موت نے ان کے ایمان کو اتنا ہی پختہ پایا جتنا کہ زندگی نے۔ ہم موت سے ڈرنے اور بھاگنے والے بھلا ماتم کا اتنا سلیقہ کہاں سے لائیں گے کہ ایسے مرنے والے کا حق ادا کر سکیں۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے عمر بھر ہمیں جینے کے گُر سکھائے اور اُن کے دن پورے ہو گئے تو مرنے کا ایک طریقہ بھی بتا گئے کہ ہزار زندگی سے بہتر ہے۔ خدا کرے جینے کی یہ مثال زندہ رہے اور مرنے کی یہ مثال!

ڈاکٹر اقبال کے رخصت ہو جانے سے شعر و شاعری اور فلسفے، بلکہ ملّی زندگی کی محفل ایسی اُجڑ گئی ہے کہ ہم اپنی قسمت کو جتنا بھی روتے اور مرحوم کا جتنا بھی ماتم کرتے کم ہوتا، اگر آنسو بہانے میں یہ خطرہ نہ ہوتا کہ اپنی شخصیت اور کلام کی یادگار وہ شمع ہدایت جو مرحوم چھوڑ گئے ہیں بجھ جائے گی۔ ہمارا غم چاہے جتنا شدید ہو، یہ شمع ہمارے سامنے جل رہی ہے، اور ہمیں یقین ہونا چاہیے کہ اس کی بصیرت افروز روشنی آہستہ آہستہ پروانوں اور آدمیوں کو اپنے گرد جمع کرے گی، محفل میں رونق، آب و تاب اور ہنگامہ پیدا کر دے گی، اور کیا تعجب ہے کہ مرحوم کی آواز ہمارے کانوں میں گونجنے لگے، ہم ایک دوسرے کے دلوں میں اور آنکھوں میں ان کی شخصیت کے نقش دیکھیں اور اُن سے ایک تعلق پیدا کر لیں جو جسمانی رشتوں

سے زیادہ نازک مگر کہیں زیادہ لطیف اور پائدار ہو، جو ہمیں اُمید اور مرحوم کی رُوح کو کامیابی کا مژدہ سنا رہی ہو۔

دراصل اس وقت جب محبت اور عقیدت جوش پر ہیں اور مرحوم کی صورت بار بار آنکھوں کے سامنے آ رہی ہے ہمیں چاہیے کہ ان کی صورت اور شخصیت کا ایک ایسا خاکہ بنا کر محفوظ کر لیں جسے برسوں بعد دیکھنے پر بھی ہم پہچان سکیں اور دنیا بھی مان لے کہ اس کا ہر نقش اصل سے ملتا ہے۔ یہ کام محبت اور عقیدت کے بغیر انجام نہیں پا سکتا۔ لیکن اس کے لیے محبت اور عقیدت ہی کافی نہیں ہیں۔ محبت اپنی ہی آنکھ سے دیکھتی ہے، دوسرے کے نقطۂ نظر کی پروا نہیں کرتی اور عقیدت کو سہرے پہنانے کا اتنا شوق ہوتا ہے کہ وہ اکثر آدمی کی صورت ہی چھپا دیتی ہے۔ اسی طرح تعریف اگر دو چار خصوصیتوں کو اُبھارتی ہے تو بہتیری مٹا بھی دیتی ہے۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم کی شخصیت کا صحیح خاکہ بنانے کے لیے تنقید کا ضبط بھی درکار ہے، کیونکہ اس وقت اگر عقیدت اور تعریف صورت گری کی ہر مشکل آسان کر سکتی ہیں تو آگے چل کر یہی آسانی ہزار مشکلیں بھی پیدا کر دیگی۔

میں نے تنقید اور اُس کے ضبط کا ذکر اس وجہ سے کیا ہے کہ ڈاکٹر اقبال مرحوم کی شخصیت عام معیار پر جانچی نہیں جا سکتی، اور اپنے کلام میں اُنہوں نے پُرانی ادبی رسموں کو اس طرح توڑا ہے کہ ادیب کبھی نہ کبھی اس کا بدلہ ضرور لینگے۔ یورپ میں اٹھارویں صدی اور ہندوستان میں انگریزی تعلیم پھیلنے کے بعد سے یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ ناک اور کان کی طرح مذہب بھی ہر شخص کی اپنی چیز ہے، اس کو نہ دوسروں سے مطلب ہونا چاہیے نہ دوسروں کو اس سے۔ یوں اگر ایک طرف رواداری کچھ بڑھ گئی ہے تو دوسری طرف مذہب زندگی اور ادب سے بے دخل کر دیا گیا ہے۔ جذبۂ دینی کی قدر کرنے والے اب بھی ملتے ہیں لیکن کسی ایک مذہب کی پابندی کو وہ بھی کچھ بہت اچھا نہیں سمجھتے۔ اب اگر ادیب عقیدے رکھتے ہیں تو اُنہیں بیان کرتے شرماتے ہیں، علم کے دعوے سے یا آزاد خیالی کے بہانے سے جو جی چاہے کہیے، لیکن دنیا کو دین کے پیمانے سے ناپیے، اپنے دین اور دینی آئین سے محبت اور عقیدت ظاہر کیجیے تو مہذب لوگوں میں آبرو جاتی رہتی ہے اور تعصب و تنگ نظری کا داغ پیشانی پر لگ جاتا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں میں بھی انگریزی تعلیم کے ساتھ یہ ذہنیت پھیلی اور شاید بہت زیادہ پھیلتی اگر مولوی نذیر احمد،

حالی اور اکبر جیسے ادیب اس کا توڑ نہ کرتے۔ اقبال مرحوم ان بزرگوں سے بھی آگے بڑھ گئے، اُنہوں نے ادب کو دین کی پرچھائیں بنا دیا، جذبے کی رنگین پوشاک اُٹھا کر عقیدے کو پہنا دی اور اُسے ایسا حسین بنا دیا کہ جذبے کو بھی رشک آجائے۔

پھر کیا تعجب ہے اگر آگے چل کر ادیب اور شاعر چاہیں کہ اقبال مرحوم کی یادگاروں کو چُپ چُپاتے ادب سے نکال کر دینیات میں شامل کر دیں، ان کی بزرگی تسلیم کریں لیکن اپنی محفل اپنے ہی لیے رکھیں، دینداری کے تقدس کو اقبال کی نذر کریں، جذبات کی دنیا اور اس کی ہنگامہ آرائیوں کو اپنی جائداد سمجھ کر اس پر قبضہ کر لیں۔ اقبال کو اس انجام سے محبت اور تعریف نہیں بچا سکتی بلکہ وہ سچی تنقید جو دین سے قوت اور خود اعتمادی حاصل کرے، ادب سے طاقت بیان لے اور حق پرستی کی مضراب سے دل کے تار چھیڑتی رہے۔

غور کیجیے تو واعظ اور شاعر دونوں اسی ایک انسانیت کے خادم اور بہی خواہ ہیں لیکن ان کے راستے الگ ہیں اور ان کے درمیان غلط فہمی اور جھگڑے کی گنجائش بہت ہے۔ واعظ انسان کو تسلی اور بقا کا وعدہ کر کے اپنی طرف کھینچتا ہے۔ شاعر اسے آزادی اور شگفتگی کا لالچ دلاتا ہے، واعظ شاعر پر بے اصول اور ناعاقبت اندیش ہونے کا الزام لگاتا ہے، شاعر واعظ پر خدا کے نام سے منطق کو پوچ اور عاقبت اندیشی کے بہانے سے تنگ دلی اور کٹر پن پھیلانے کا۔ تنقید کو چاہیے تھا کہ ان کی عداوتوں اور شکایتوں کو دور کرتی اور ان میں میل کراتی رہے، اور یہ ثابت کرے کہ وہ انسانیت کے ایک دل کے دو قدرتی پہلو ہیں اور ایک کا مقصد دوسرے کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا ایک کو دوسرے کے اوصاف کی قدر کرنا سکھاتی۔ لیکن ایسا ہوا نہیں ہے اور اس لیے تنقید کی جو کسوٹی عام طور سے استعمال ہوتی ہے اس پر ڈاکٹر اقبال کے سے مکمل ذہن اور ہمہ گیر دل کے اوصاف پرکھے نہیں جا سکتے۔ ڈاکٹر اقبال کا کلام ایمان کی لازوال قوتوں کا ایک مظہر ہے، اُنہوں نے تخیل کو عقیدے کا، آرزو کو دین کا پابند کیا، انسانی شخصیت کے ہزاروں جُدا جُدا رنگ نہیں دکھائے بلکہ اُسے مذہب، ملت، آدمیت کے ایک خاص رنگ میں ڈبو دیا، اور ان کا کمال یہ ہے کہ اس ایک رنگ میں ڈوبے ہوئے ہونے پر بھی ان کے کلام میں وہ سارا

جادو ہے جو کسی سرمست عاشق کی غزلوں میں ہو سکتا ہے۔ ان کے تخیل نے جذبۂ دینی کی روشنی میں بلند پروازی کی مشق کی تھی۔ مذہب، تہذیب، تاریخ، سیاست کی حقیقتیں ان کے دل سے لطیف اور موثر شخصی کیفیتیں بن کر نکلتی تھیں۔ ان کے لیے حسن وہی تھا جس میں کامل شخصیت کا جلوہ نظر آئے، عشق وہی جو اس کامل شخصیت کا تصور دل میں بٹھا دے، نغمہ وہی جو شعلے کی طرح لگن کی آگ دلوں میں لگاتا پھرے۔ ان کی مستی میں مصلح کی ہشیاری تھی، ان کی نصیحت میں جذبات کی گرہ کھلنے کا مزہ۔ ان کا کلام عشق اور علم کی دو آنکھوں کا ایک نور تھا، ادیب اور آرٹسٹ کی حیثیت سے ان کی شخصیت مکمل تھی، وہ مختلف صلاحیتیں جن کو ہم ایک دوسرے کی ضد سمجھتے ہیں ان کی طبیعت میں اس طرح آکر مل گئی تھیں جیسے چشمے کی روانی اور چٹان کا سکوت، یا رات کا اندھیرا اور تاروں کی جگمگاہٹ۔ یعنی تنقید اگر ان کا حق ادا کرنا چاہتی ہے تو اسے ان کا کلام کو جانچنا ہی نہ چاہیے بلکہ یہ بھی دکھانا چاہیے کہ وہ مکمل ہے اور اس لیے آئندہ کے واسطے ایک معیار ہے۔

ڈاکٹر اقبال کا کلام تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، جن میں سے پہلا وہ ہے جس میں اُنھوں نے پُرانے مذاق کی تقلید کے ساتھ ایک نئی وضع کی بنیاد بھی رکھی، دوسرے حصے میں ان کی اصل طبیعت اور مذاق کی کرنیں پھوٹتی نظر آتی ہیں، اور تیسرے میں ان کی پوری شخصیت سامنے آجاتی ہے۔ ان تینوں حصوں کی حد بندی نہیں کی جا سکتی، شروع کے کلام میں ہم کو بعض رجحانات ملتے ہیں جو آخر تک رہے، اور بعد کو خصوصیات ملتی ہیں جن کا قیاس شروع کا کلام پڑھ کر نہیں کیا جا سکتا لیکن ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پہلا دور مشق کا تھا جب ان کا تخیل پر تول رہا تھا، زبان صاف ہو رہی تھی اور وہ مختلف میدانوں میں طبع آزمائی کر رہے تھے۔ یہی زمانہ ہے جب ہندوستان کی حالت دیکھ کر شاعر کے دل میں درد اُٹھا، جب "ترانۂ ہندی" لکھا گیا اور برہمن کو دیس کے دوسرے بسنے والوں کے ساتھ مل کر ایک نیا شوالہ بنانے کی دعوت دی گئی۔ "تصویر درد" اس دور کی سب سے موثر نظم ہے، اور اس میں پہلی بار وہ تڑپ نظر آتی ہے جو بعد کو "شکوہ" میں شباب پر آئی اور جس نے ہندوستان کے سارے مسلمانوں کو تڑپا دیا لیکن ادبی نقطۂ نظر سے شاید اس دور

کی بہترین نظمیں "حقیقت حسن" اور "اختر صبح" ہیں۔ نظم کا یہ طرز، تخیل کی یہ نازک گلکاریاں اقبال کا خاص حصہ تھیں، اور اس وقت بھی جب ان کا دل و دماغ مذہب اور فلسفہ میں ڈوبا ہوا تھا، ان کا تخیل اکثر اس طرز کے کرشمے دکھاتا رہا۔

اقبال کے کلام کا دوسرا دور ان کے جذبہ دینی کی بیداری سے شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ تعلیم کے سلسلہ میں یورپ گئے اور تاریخ اور فلسفے کے مطالعے اور دنیا کے مشاہدے نے ان کو شخصی اور اجتماعی زندگی کی تعمیر کے وہ طریقے بتائے جنھیں معلوم کرنے کی انہیں پہلے آرزو تو تھی مگر شاید اتنی شدید نہ تھی کہ اپنا مطلب حاصل کرلے۔ اسی زمانہ میں ان کے سیاسی خیالات بھی بدلے، قومیت کی چارہ سازی کے ساتھ انہوں نے اس کی ستم شعاری بھی دیکھی، اور اس کا ان پر اتنا اثر ہوا کہ اُنھوں نے اس سے بالکل مُنہ پھیر لیا۔ تاریخ کے مطالعہ نے ملت اسلامی کی عظمت کا جو نقشہ ان کے سامنے پیش کیا اُس نے اس محبت کو دوبالا کردیا جو انہیں قدرتی طور پر اسلام اور مسلمانوں سے تھی، اور اسلامی دنیا کی پستی اور بیچارگی دیکھ کر ان کے دل پر ایسی چوٹ لگی کہ وہ اپنے درد کی شکایت بارگاہِ الٰہی تک پہنچائے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔ "شکوہ" اور اس کا جواب "شمع اور شاعر"، "خضر راہ" اور "طلوع اسلام" ان کی اُس وقت کی بے چینی کا عکس ہیں، مگر اپنے دین کو اُنھوں نے ایسا مضبوط پکڑ لیا تھا کہ ان کا درد اپنی دوا بھی کرتا رہا، اندھیرے میں انہیں نور کی دو چار کرنیں منزل مقصود کا رستہ دکھاتی رہیں۔ شخصیت کی تعمیر کا وہ فلسفہ جو "مثنوی اسرار و رموز" میں پیش کیا گیا اس وقت تک ان کے ذہن اور تخیل کو گرویدہ نہ کرسکا تھا، مگر اس کے لیے زمین تیار ہورہی تھی یعنی اس دور میں اقبال کا جذبۂ دینی چڑھاؤ پر تھا، موجیں مار رہا تھا، لیکن ابھی اُس نے وہ شکل نہیں پائی تھی جس کے بغیر وہ ہدایت کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس دوسرے دور میں بھی اگرچہ ایک نظم "وطنیت" میں اقبال نے قومیت سے قطع تعلق کا اعلان کردیا تھا اور اپنے کلام کو اسلام کے رنگ میں رنگ رہے تھے، ان کی خصوصیت ان کا یہ رجحان نہیں تھا بلکہ وہ خوبیاں جو "ستارہ" اور "شاعر" جیسی نظموں میں نظر آتی ہیں۔

جیسے جیسے اقبال کا ذہن خودی اور بیخودی کے فلسفے میں ڈوبتا گیا اقبال کو ایک نئی زبان کی ضرورت محسوس ہوتی گئی اور آخر کار اُنھوں نے فارسی میں لکھنا شروع کردیا۔ اردو کا ان پر بے شک اور تمام زبانوں سے زیادہ

حق تھا لیکن فارسی میں ایک تو یہ آسانی تھی کہ وہ اسلامی تصوف کی زبان ہے اور اس لیے ان خیالات کو بیان کرنے کے لیے خاص طور پر موزوں تھی جنہیں ڈاکٹر اقبال پیش کرنا چاہتے تھے۔ دوسرا ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ اس کے ذریعے سے ہندستانی مسلمانوں کے ساتھ افغانستان، ترکستان، ایران اور ترکی کے مسلمان بھی مخاطب کیے جاسکتے تھے اور یہ واقعہ ہے کہ فارسی میں لکھنے کی بدولت ڈاکٹر اقبال اور اُن کے فلسفے کا اسلامی دنیا میں بڑا چرچا ہو گیا اور ہندستان میں ان کی قدر کرنے والے کم نہیں ہوئے۔ ہندستانی مسلمان ان سے فارسی زبان اختیار کرنے کی شکایت نہیں کر سکتے، اس لیے کہ فارسی جاننا ان کا ایک تہذیبی فرض ہے، باقی ہندوستانی جو اُردو کو چھوڑ چکے ہیں یا چھوڑنا چاہتے ہیں اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔

فارسی میں ڈاکٹر اقبال نے "مثنوی اسرار و رموز"، "پیام مشرق"، "زبور عجم"، "جاوید نامہ" اور بالکل آخر میں نظموں کا چھوٹا سا مجموعہ "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" لکھا۔ بیچ میں اُردو نظموں کے دو اور مجموعے "بال جبریل" اور "ضرب کلیم" شائع ہوئے۔

"مثنوی اسرار و رموز" میں ڈاکٹر اقبال نے شخصیت کی تعمیر کے تمام گُر بتائے ہیں اور حکایتوں اور مکالموں اور مثالوں سے ثابت کیا ہے کہ انسان کا دل جس فلاح اور نجات کا آرزو مند ہے وہ صرف جسمانی اور روحانی قوت سے حاصل ہو سکتی ہے، اور اپنے اندر یہ قوت پیدا کرنا خودی ہے لیکن انسان کامل اُسی وقت ہو سکتا ہے جب وہ خودی سے بھی گزر کر انسانیت کے اعلیٰ اخلاقی مقاصد میں اپنی ذات اور اپنے ارادے کو کھپا دے، اپنی خودی کو بیخودی میں ڈبو دے اور اسی کو اپنا کمال، اپنی نجات اور اپنے وجود کا اصل مقصد جانے۔ خودی کے لیے شخصی ارادے کی ضرورت ہے۔ بیخودی کے لیے ایسی ملت، ایسے اخلاقی مقاصد اور ایسا دین چاہیے جو افراد میں خودی کا حوصلہ پیدا کرے اور ایک بڑا میدان فراہم کرے کہ اس میں وہ اپنی صلاحیتیں استعمال کرکے بیخودی کا جام پئیں۔ اقبال کے نزدیک اسلام خودی اور بیخودی کی اس تعلیم کا دوسرا نام ہے، اور ملتِ اسلامی کی بڑی شخصیتوں نے جو مرتبہ حاصل کیا اور انسانیت کی جو خدمت کی اس کا راز بھی یہی ہے۔ اس تعلیم میں اقبال کا حصہ یہ ہے کہ انھوں نے اسے مذہب، تصوف اور تاریخ سے رس کی طرح نکال کر ایک رنگین اور مدھری شراب بنا دیا کہ اسے دیکھتے ہی چکھنے کو بے اختیار جی چاہتا ہے اور جس نے ایک بار بھی پیالہ منہ

سے لگالیا وہ پھر اُسے مست ہو کر ہی چھوڑتا ہے۔

"مثنوی اسرار و رموز" میں علم، اخلاق اور دین کے مسئلے بیان کیے گئے ہیں، لیکن ایسے شاعرانہ انداز، ایسی محبت اور ایسے درد کے ساتھ کہ پڑھنے والا خیالات کی گہرائی دیکھ کر جھجکتا نہیں بلکہ اس میں شوق سے غوطے لگاتا ہے۔ "پیام مشرق" سراسر شاعری ہے، اور اس میں اقبال نے خودی کی تعلیم کو پس منظر بنا کر نظمیں لکھی ہیں، مختلف مسئلوں پر بحث کی ہے اور مستانہ غزلیں گائی ہیں۔ یہ کتاب جرمن حکیم گوئٹے کے ایک دیوان کے جواب میں لکھی گئی، اور انسانی فطرت اور تقدیر کے ایک بڑے رازداں کے سامنے مشرق کے علم اور عشق کا خزانہ کھول کر رکھ دیا گیا ہے۔ تمہید میں اقبال نے قسمت کی شکایت کرتے ہوئے کہا ہے کہ گوئٹے چمن میں پیدا ہوا اور چمن میں اُس نے پرورش پائی، اور میں ایک مردہ زمین کا پودا ہوں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایشیا کی شاعری کا بہترین نمونہ ہے، اور اس کی دو چار نظمیں ایسی ہیں کہ جن کا دنیا کے کسی ادب میں جواب نہ ملیگا۔

"زبور عجم" میں ڈاکٹر اقبال نے غزل سرائی کا سلسلہ جاری رکھا، مگر اس کے آخر میں تصوف کے چند مسائل بیان کیے ہیں اور ایک "بندگی نامہ" میں غلاموں کے فنون لطیفہ اور مذہب کی خصوصیات دکھائی ہیں۔ اس مجموعے کی زبان پختہ اور منجھی ہوئی ہے، بعض نظمیں بے مثل ہیں، لیکن مضامین کی وہ رنگا رنگی نہیں جو "پیام مشرق" میں پائی جاتی ہے۔ اس کے بعد اقبال نے اپنی نظر دوسری طرف ڈالی، ابن عربی کی طرح آسمان کی سیر کر آئے، جس کا سارا حال "جاوید نامہ" میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ مثنوی موضوع اور تعلیم کے لحاظ سے بہت ہی بصیرت افروز ہے اور اقبال کے سیاسی خیالات پر نئی روشنی ڈالتی ہے۔

"بال جبریل" اور "ضرب کلیم" کی "بانگ درا" کے مقابلے میں قریب قریب وہی حیثیت ہے جو پیام مشرق کے مقابلہ میں "زبور عجم" کی، فرق یہ ہے کہ "بال جبریل" اور "ضرب کلیم" میں سیاسی اور معاشرتی مسئلوں پر زیادہ بحث کی گئی ہے، اور کئی نظموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرمایہ داری اور ملوکیت کو مٹانے کی خواہش اور کسان اور مزدور کو ظلم سے بچانے کی تمنا میں اقبال اپنے زمانے کے جوشیلے نوجوانوں سے بھی دس قدم آگے تھے، لیکن ان کی انقلاب پسندی اپنے دین کی تعلیم اور ہم وطنوں والوں کی محبت کا نتیجہ تھی،

کتاب کی پیدا کی ہوئی یا غیروں کی سکھائی ہوئی نہ تھی۔

ڈاکٹر اقبال کے مطالعے اور علمی ذوق کی یادگار ان کی انگریزی کی ایک تصنیف

"The Reconstruction of Religious Thought in Islam."

ہے۔ اس میں اقبال نے تمہید کے طور پر ثابت کیا ہے کہ عقیدہ جسے موجودہ زمانے کے فلسفے نے اپنی بحث سے خارج کر دیا ہے، علم کا نتیجہ ہے، مگر یہ علم اس طرح سے حاصل نہیں ہوتا جیسے کہ تاریخ یا کیمیا، بلکہ دل پر ایک خاص کیفیت طاری ہو تو خود بخود پیدا ہوتا ہے۔ ہم اس طرح سے حاصل کیے ہوئے علم کو فلسفیانہ معیار پر جانچ سکتے ہیں، اور اگر علم کو اس وقت مذہب سے تعصب نہ ہوتا تو وہ عقیدوں کی بیخ کنی کے بجائے ان کو ثابت اور مضبوط کرنا اپنا فرض سمجھتا۔ پھر ڈاکٹر اقبال نے خدا کے تصور کی تشریح کی ہے، عبادت کا مقصد واضح کیا ہے اور انسان، اس کی بقا اور اخلاقی آزادی کے معنی بتائے ہیں۔ آخری دو بابوں میں اسلامی تہذیب کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں اور اس کے اندر ارتقا کا جو مادّہ اور ترقی کے جو میلانات تھے وہ ظاہر کیے گئے ہیں۔ اگر اس کتاب کا اُردو میں ترجمہ ہو جائے اور مسلمان اس کا عام طور پر مطالعہ کرنے لگیں تو ناواقفیت اور جہالت نے ایک طرف اور اوچھے علم کے گھمنڈ نے دوسری طرف جو غبار اُڑایا ہے وہ چھنٹ جائیگا، اور مسلمان جو اب یا تو مغربی علم سے مرعوب ہیں یا اپنی قدیم تہذیب کی بے جانے بوجھے تعریف کرتے ہیں اپنی تاریخ کو سمجھینگے، اس کی سچّی قدر کر سکینگے اور اپنی صلاحیتوں کے مطابق آئندہ اسلام اور انسانیت کی بہت بہتر خدمت کر سکینگے۔

ڈاکٹر اقبال کا اپنی شاعری کو غزلوں، ترجموں اور قومی نظموں سے شروع کرنا اور آخر میں اسلام کا دل و دماغ بن جانا قدرتی نشو و نما کا ایک سلسلہ تھا۔ ان کی طبیعت یا خیالات نے کسی اتفاقی واقعہ سے اثر لے کر کوئی پلٹا نہیں کھایا، ان کے جذبات اتنے گہرے اور سچّے تھے کہ زندگی کا کوئی طوفان ان میں تلاطم پیدا نہ کر سکا۔ نئی معاشرت اور نئی سیاست کے وہ شیدائی جو اس پر افسوس کرتے ہیں کہ اقبال مرحوم نے قوم کو چھوڑ کر ملت کو مخاطب کیا، شاعری بے قید انسانیت سے مُنہ موڑ کر مومن اور مسلم کے گُن گانے

لگے شاید اتنا اعتراض نہ کرتے اگر اقبال نے نظم کی جگہ نثر میں اپنے خیالات پیش کیے ہوتے۔ ان لوگوں کا اور ان کے ساتھ شعر و شاعری سے اکثر ذوق رکھنے والوں کا عام طور پر یہ کہنا ہے کہ نثر کا میدان اپنا اپنا ہو سکتا ہے، اس میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی جن خیالات کا چاہیں پرچار کریں، نظم میں سب کو بھائی بھائی بن کر ان تمام خصوصیات کو بھلا دینا چاہیے جو ان کا اختلاف ظاہر کرتی ہیں اور انسان کی ان کیفیتوں کو موضوع بنانا چاہیے جو مزاج اور حس، آنکھ اور دل، دکھ اور سکھ کی طرح انسانیت کی عام صفت ہوں۔

نظم کی اس حیثیت پر زور وہ لوگ بھی دیتے ہیں جنھیں قوم کا درد ہے اور جو دینی اختلافات اور آئے دن کے جھگڑوں سے بیزار ہیں، اور اُردو شاعری کے عام رجحان کو دیکھیے تو وہ کوئی نیا یا انوکھا مطالبہ نہیں کرتے۔ ان کے ساتھ آج کل بہت سے ایسے نوجوان شاعری اور مذہب کو الگ رکھنے پر اصرار کر رہے ہیں جو مذہب کے مخالف ہیں اور لوگوں کی توجہ ادھر سے ہٹا کر انھیں معاشرتی اصلاح کی کوششوں اور منصوبوں میں لگا دینا چاہتے ہیں۔ ان سب کو اس کا دکھ ہے کہ اقبال نے اپنی نایاب صلاحیتیں اپنے دین کے نکتے سمجھانے اور خاص مسلمانوں کے حوصلے بڑھانے میں صرف کیں، اور قومیت کا خیال مسلمانوں کے دل سے نکال کر انھیں ملی زندگی کی تعمیر کا سبق پڑھاتے رہے، حالانکہ آزادی اور ملی اور قومی زندگی دونوں کی تعمیر کے لیے اس وقت اتحاد کی ضرورت ہے۔

یہ اعتراض صحیح ہوتے اگر اقبال نے اپنی نظموں میں کبھی بھولے سے کوئی بات ایسی کہی ہوتی جس سے مسلمانوں میں ضد یا ہندوستان کے دوسرے رہنے والوں سے عداوت پیدا ہوتی۔ اقبال کو ہندوستان کی آزادی اور آبرو کا اتنا ہی خیال تھا جتنا کہ اتحاد کے بڑے سے بڑے علم برداروں کو۔ مسلمانوں کو بیدار کرنے، انھیں غیرت دلانے اور خودی کا جام پلانے میں اقبال کا اصل مقصد یہ تھا کہ وہ اپنی اور اپنے دیس والوں کی فکر میں، ہندستان کو آزاد کریں اور اُسے افلاس اور اپنوں کے ظلم سے نجات دلائیں۔ اقبال نے مخالفت کی تو قومیت کے فلسفے کی، اور یہ فلسفہ ہے بھی ایسا تنگ اور اوچھا کہ اُس سے اقبال کیا دنیا کے سب سچے شاعر پناہ مانگتے ہیں۔ قومیت کے گن گانے والوں کے دل ٹٹولیے تو آپ ہمیشہ دیکھیں گے کہ وہ اس رنگارنگی سے ڈرتے ہیں جس کے بغیر آدمی انسان نہیں ہو سکتے، وہ قومی کامیابی کے لیے لازمی سمجھتے ہیں کہ سب کے بدن پر

ایک وردی، سب کی زبان پر ایک سکھایا ہوا نعرہ، سب کے ذہن میں لیڈروں کے پھیلائے ہوئے خیالات ہوں، وہ اُس شخص کو اپنا ہمدرد اور دیس کا سچا خادم سمجھتے ہیں جو اُن کی وردی اس لیے پہنتا ہے کہ اُسے لباس کی کوئی تمیز نہیں، ان کے نعروں کو دہراتا اور اُن کے خیالات سے عقیدت ظاہر کرتا ہے اس لیے کہ اس کی زبان میں بولنے اور دماغ میں سوچنے کی طاقت نہیں، اور اس شخص کو اپنی راہ میں روڑا سمجھتے ہیں جو لباس میں اپنا الگ مذاق رکھتا ہے، ہر بات کو اپنی بات بنا کر کہتا ہے اور ایک زندہ دل اور چارہ ساز صلاحیتوں سے قوم کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔

جو یہ دیکھنا چاہتا ہو کہ قومیت کے فلسفے سے شاعر کی طبیعت کس طرح الجھتی ہے وہ ڈاکٹر ٹیگور کی کتاب "Nationalism" (قومیت) پڑھ لے۔ پھر اسے کم از کم یہ شبہ تو نہ رہے گا کہ اقبال نے اپنے مذہب یا اپنی ملت کی خاطر ہی قومیت کی مخالفت کی۔ اور ہم اپنی چھوٹی سی دنیا اور اُس کے مسائل سے آگے نظر دوڑائیں تو ہم دیکھینگے کہ قومیت کا فلسفہ ایسی فضا پیدا کر دیتا ہے کہ جس میں شاعری کیا انسانیت بھی پنپ نہیں سکتی تاریخ اور واقعات پر ذرا غور کیا جائے تو ہمیں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ قومیت کے موجودہ فلسفے اور قومی زندگی کی تعمیر کے درمیان کوئی لازمی تعلق نہیں۔ قومیں بنتی ہیں ایک طرف خدمت کے شوق اور دوسری طرف رہبری کی صلاحیت سے، ڈسپلن اور ایثار کے مادے سے، عاقبت اندیشی اور انسانیت کی قدر پہچاننے سے۔ اس کے لیے نہ وردی کی ضرورت ہے نہ خیالات کو سرکاری سانچے میں ڈھالنے کی۔ اسے خود رنگی چاہیے نہ کہ یک رنگی، صلاحیتوں کی افراط چاہیے نہ کہ ایک ہی چال چلنے اور ایک ہی بات کہنے کا قانون۔ اقبال نے قومیت کے فلسفے اور قواعد کو تسلیم نہیں کیا لیکن جو مسلمان ان کے معیار پر پورے اترنے کا حوصلہ کریں انہیں قوم کی خدمت کے لیے تن من دھن اس طرح وقف کرنا اور تمام دیس والوں کے ساتھ ایسے اخلاق برتنا ہونگے جن کا کہ قومیت اب تک کوئی دھندلا سا خاکہ بھی نہیں بنا سکی ہے۔

دنیا میں اقبال نے اپنے کلام کی بدولت شہرت پائی لیکن ان کی شخصیت کا بھروسا ایک شعر کہنے کی صلاحیت پر نہ تھا۔ وہ بڑے عالم تھے، اور مشرق و مغرب میں چند ہی لوگ ایسے ہونگے جن کا مطالعہ اتنا وسیع اور گہرا ہے جتنا کہ مرحوم کا تھا۔ مگر شاعری اور علم دونوں مل کر بھی ان کا حوصلہ پورا نہ کر سکے، ان کی نظر آفتاب کی طرح

دنیا کے ہر ذرے پر تھی، اور ان کی نظر ہر ذرے کو چمکا دیتی تھی۔ اپنے کلام میں اُنھوں نے خاص طور پر مسلمانوں کو مخاطب کیا تو کیا اُنہیں دنیا کی ہر قوم، سیاست اور تہذیب کے ہر پہلو، زندگی کے ہر مسئلے سے دلچسپی تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی لاہور کے ایک مکان کے ایک کونے میں گذاری، اور یہ کونا اور اس کا سکون انہیں اتنا عزیز تھا کہ وہ اسے کبھی خوشی سے نہ چھوڑتے تھے لیکن ان کا تخیل ساری دنیا پر چھایا رہتا تھا۔ علم کا ذوق دور دور سے ہر طرح کا مال ان کے پاس پہنچایا کرتا تھا، وہ معلوم ہوتے تھے غافل اور بے پروا مگر انہیں ساری دنیا کے چھوٹے بڑے واقعات کی خبر رہتی تھی۔ قدرت نے اُنہیں دل و دماغ کی جو دولت دی تھی اُسے اُنہوں نے جی بھر کر لٹایا، لیکن اُن کا خزانہ اتنا بڑا تھا کہ وہ برسوں اور لٹاتے رہتے تب بھی دنیا تک اس کا دسواں بیسواں حصّہ بھی نہ پہنچ پاتا۔ اب دنیا کے مالک نے اس خزانے کا دروازہ ہی بند کر دیا ہے۔ مگر ہمیں جو کچھ مل چکا ہے اس کو ہم محفوظ رکھیں اور سلیقے سے صرف کریں تو دنیا میں مالدار کہلائینگے اور ہماری سیکڑوں پشتیں اس پونجی پر فراغت سے بسر کرینگی۔

---

*

اقبال کی لوحِ تربت

جناب کریم الرضا خاں صاحب ایم ایل سی (شاہجہانپور)

بلبلِ گلزارِ مشرق افتخارِ ایشیا
تھا حیات افروزِ ملّت نغمۂ دلکش ترا

اس جہانِ رنگ و بو میں کیا ہے تکمیلِ حیات
یہ حدودِ زندگی اور وسعتِ صد ممکنات

فطرتِ عالم کی فیاضی کا ہر ذرّہ ثبوت
بخل کی یہ حد کہ ہر اک لب پہ اک مہرِ سکوت

عقلِ انساں کا تحیّر پردہ دارِ کائنات
فلسفی کی انتہائے فکر اسرارِ حیات

اس قیودِ حکمتِ مغرب سے تو آزاد تھا
اپنی فطرت کی تجلی زار میں آباد تھا

مغربی تہذیب کی یہ منزلِ وحشت اثر
نوعِ انساں کی تباہی رات دن پیشِ نظر

جبر و استبداد کی دنیا میں طوفاں خیزیاں
اور کمزوروں پہ مغرب کی یہ آتش ریزیاں

دعوئ حق پروری حق کی پامالی کا دور
رحم اور انصاف کے پردہ میں کمزوروں پہ جور

بیکسوں کے نالۂ و شیون سے اک شورِ نشور
"مجلس اقوام میں باہم وہ تقسیمِ قبور" (ماخوذ از اقبالؒ)

اس فریبِ عصرِ نو کو آشکارا کر دیا
پردۂ تزویر تو نے پارا پارا کر دیا

مستِ صہبائے حجازی واہ رے مستی تری
اک عطائے ایزدی دنیا کو تھی ہستی تری

تھا حیاتِ تازہ اک عالم کو پیغامِ کہن
اک نئے انداز سے گردش میں تھا جامِ کہن

وہ تری تعلیم خودداری ترا درسِ فنا
ملّتِ بیضا کو پھر دنیا میں زندہ کر دیا

مسلمِ جانباز کو تلوار کے سایہ میں عید — غازۂ رخسارِ ملت قطرۂ خونِ شہید
مشرقِ خوابیدہ کو پیغامِ بیداری تھا تو — مسلمِ ناکام کو اک رحمتِ باری تھا تو

ملتِ بیضا کا غم کھانا تری قسمت میں تھا
یہ تڑپنا اور تڑپانا تری قسمت میں تھا

حامیِ تہذیبِ یثرب شاعرِ فطرت پرست — بادۂ حبِّ وطن سے ساقیِ ساغر بدست
آہ! اے اقبال اے ملت پرستوں کے امام — اے فدائے حریت ای عاشقِ خیر الانام
تیری خاموشی بیانِ آرزو کی موت ہے — موت تیری اک جہانِ آرزو کی موت ہے
رولے اب دل کھول کر اے مسلمِ حرماں نصیب — چل دیا رہبر ترا پہنچا کے منزل کے قریب

ترجمانِ مشرقِ مظلوم رخصت ہو گیا
نوحہ خوانِ ملتِ مرحوم رخصت ہو گیا

حکیم ٹالسٹائی کے اعترافات"

پانچ سال کا عرصہ گذرا مجھ میں ایک حیرت انگیز تغیر رونما ہو چلا تھا پہلے پہل تو مجھ کو اُلجھن سی محسوس ہوتی تھی اور دل پکڑا پکڑا سا معلوم ہوتا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مجھ کو کیا کرنا ہے اور زندگی کس طرح بسر کرنا ہے مجھے ہر سمت ناچاری و مجبوری ہی نظر آتی تھی۔ اس لیے میں افسردہ اور غمگین رہتا تھا لیکن یہ دور جلد ہی ختم ہو گیا اور میں پھر حسب معمول زندگی کے دن پورے کرنے لگا۔ مگر یہ "لمحات اضطراب" آئے دن اسی شکل میں رونما ہونے لگے کہ زندگی کا مصرف کیا ہے؟ اور اس کا مقصد کیا ہے؟

اول تو مجھ کو یہ سوالات مہمل اور لایعنی معلوم ہوئے۔ میں نے خیال کیا کہ یہ چیزیں سب پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں اور جب کبھی مجھے ان کے حل کرنے کی حاجت محسوس ہوگی تو مجھ کو زیادہ دماغ سوزی سے کام نہ لینا پڑیگا۔ اس وقت تو میرے پاس ان کے لیے فالتو وقت نہیں ہے۔ لیکن جب میں چاہونگا ان کے جوابات معلوم کرلونگا۔ سوالات اکثر و بیشتر نہایت تیزی سے دل و دماغ کو کریدتے رہتے تھے تاکہ میں فوراً ان کے جوابات معلوم کرلوں لیکن وہ مثل سیاہی کے قطروں کے ایک ہی جگہ پر گر گر کر ایک بڑا سا بدنما سیاہ دھبّہ بن کر رہ گئے۔

مجھ پر وہی گذری جو ہر اس شخص پر گذرتی ہے جو باطنی مرض الموت میں گرفتار ہو۔ اول بیماری کے معمولی علامات ظاہر ہوتے ہیں جن کی طرف مریض زیادہ توجہ نہیں کرتا۔ پھر یہی علامات برابر ظاہر ہوتے رہتے ہیں اور ایک مسلسل بیماری کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ بیماری بڑھتی جاتی ہے اور قبل اس کے کہ مریض اس کو اچھی طرح معلوم کر سکے کہ جن باتوں کو اس نے محض وقتی سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا وہی اب اس کے لیے دنیا کی دوسری چیزوں سے زیادہ اہم ہیں۔ موت اُسے آلیتی ہے۔

یہی مجھ پر گذری۔ میں نے پہلے ہی سمجھ لیا کہ یہ کوئی وقتی شے نہیں ہے بلکہ یہ ایک نہایت ہی اہم مسئلہ ہے اور اگر یہ سوالات برابر پیدا ہوتے رہے تو انہیں حل کرنے کی سخت ضرورت ہوگی۔ چنانچہ میں نے

اس کی کوشش شروع کردی۔ سوالات معمولی، اور طفلانہ معلوم ہوتے تھے لیکن جیسے ہی میں نے ان کو ہاتھ لگایا اور حل کرنے کی کوشش کی مجھے فوراً یقین ہوگیا کہ (۱) یہ سوالات معمولی اور طفلانہ نہیں بلکہ یہ نہایت اہم ہیں اور زندگی سے ان کا گہرا تعلق ہے (۲) لیکن باوجود کوشش کرنے کے میں ان کو حل نہ کرسکونگا۔ قبل اس کے کہ میں اپنی ریاست سمارا کا انتظام اپنے ہاتھ میں لوں، یا اپنے بچے کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کروں یا پھر کوئی کتاب تصنیف کروں، مجھ کو یہ معلوم ہوجانا چاہیے۔ کہ آخر یہ سب میں کس لیے کرونگا۔ جب تک میں اس کا سبب نہ سمجھ سکا میں نہ تو کچھ کرسکا اور نہ اچھی طرح زندگی ہی بسر کرسکا۔ جس زمانہ میں ریاست کے انتظام کے سوالات ذہن میں چکر لگا رہے تھے یکایک یہ سوال پیدا ہوا کہ "اچھا مانا کہ مجھ کو ۱۶۰۰۰ ایکڑ زمین سمارا میں مل گئی اور تین سو گھوڑے مل گئے۔ پھر کیا ہوگا؟" میں بالکل بے بس تھا میں قطعی نہیں جانتا تھا کہ کیا سمجھنا چاہیے۔ یا پھر جب میں اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے منصوبے باندھا کرتا تھا تو میں سوچتا تھا کہ آخر یہ کس لیے؟ یا پھر جب میں اپنی شہرت کا خیال کرتا جو کہ مجھ کو میری تصانیف سے حاصل ہوتی۔ میں دل میں سوچتا کہ "اچھا میں گوگول، پشکن، شیکسپیر اور مولیر سے زیادہ بلکہ دنیا کے سارے مصنفوں سے زیادہ مشہور ہو جاؤنگا لیکن اس سے حاصل کیا ہوگا؟" لیکن مجھے ان سب باتوں کا کوئی جواب نہ ملتا تھا۔ سوالات زیادہ مہلت نہیں دیتے تھے۔ ان کے جواب فوراً دینے تھے۔ یہ میرے لیے وبال جان ہو جاتے تھے لیکن ان کا کوئی جواب میرے پاس نہ تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ جس چیز پر میں کھڑا تھا وہ ٹوٹ کر نیچے گر گئی ہے اور اب میرے پیروں کے ٹکنے کی کوئی جگہ نہیں۔ جس چیز پر مجھے بھروسا تھا۔ اس نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ میری زندگی کے لیے کوئی سہارا باقی نہیں رہا۔

میری حیات جامد ہوکر رہ گئی۔ میں صرف سانس لے سکتا تھا، کھا سکتا تھا، پی سکتا تھا اور سو سکتا تھا اور میں اپنے کو ان کاموں سے باز بھی نہ رکھ سکتا تھا لیکن اب زندگی کے کوئی معنی نہ تھے کیونکہ یہ کچھ ایسی خواہشیں نہ تھیں جن کی تکمیل کو میں کوئی معقول کام تصور کرتا۔ اگر کوئی فرشتہ آکر میری

خواہشات پوری کرنے کے لیے تیار ہو جانا تو میری سمجھ میں نہ آتا کہ آخر اس سے کس بات کی تمنا کروں۔ اگر میں کبھی بے خودی کی حالت میں کوئی بات محسوس کرتا جس کو خواہش تو نہیں البتہ خواہشات کی عادت کہا جا سکتا ہے تو ہوش و حواس اور سنجیدگی کے عالم میں اس کو محض "خیال خام" تصور کرتا تھا۔ اور سمجھتا تھا حقیقۃً یہ کوئی ایسی شے نہیں ہے جس کی تمنا یا جستجو کی جائے۔ میں نے کبھی حقیقت کے معلوم کرنے کی تمنا نہیں کی کیونکہ میں اس کی اصلیت سے واقف تھا۔ میرے نزدیک حقیقت یہ تھی کہ زندگی ایک مہمل شے ہے۔

زندگی گذرتی رہی اور میں اسی ڈھرے پر چلتا رہا یہاں تک کہ ایک خندق کے پاس پہنچ گیا اور مجھے اس بات کا کامل یقین ہو گیا کہ اب میرے سامنے سوائے تباہی و بربادی کے کوئی دوسری شے نہیں ہے۔ رکنا ناممکن اور واپس ہونا بھی ناممکن تھا۔ آنکھیں بند کرنا بھی امکان سے باہر تھا۔ میں یہ دیکھنے پر مجبور تھا کہ آگے مصیبت اور حقیقی موت ہے ــ مکمل فنا۔ نیستی ــ

نوبت یہاں تک پہنچی کہ میں ایک تندرست و دولتمند شخص ہونے کے باوجود یہ محسوس کرنے لگا کہ اب میں زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکتا۔ ایک زبردست قوت مجھے اس بات پر مجبور کرتی تھی کہ میں زندگی کے دو پہلوؤں میں سے کسی ایک کو چھوڑ دوں۔ یہ نہیں کہ میں واقعی اپنے کو ہلاک کرنا چاہتا تھا کیونکہ جو قوت مجھ کو زندگی سے بھاگنے پر مجبور کر رہی تھی وہ خواہش سے کہیں زیادہ زبردست مکمل اور وسیع تھی۔

اپنی ہلاکت کا خیال دل میں بالکل اسی طرح از خود پیدا ہوا جس طرح پہلے زندگی کو بہتر بنانے کا خیال پیدا ہوا تھا۔ یہ خیال کچھ اتنا دلفریب تھا کہ اس خوف سے کہ مبادا میں اس کام کو عجلت میں کر ڈالوں مجھے طرح طرح کی تدبیریں کرنی پڑتی تھیں۔ میں نے رسی کو محض اس لیے چھپا کر رکھ دیا تھا کہ کہیں میں اپنے آپ کو پھانسی لگا کر ہلاک نہ کر ڈالوں۔ میں نے بندوق لے کر شکار کو جانا ترک کر دیا تھا کہ کہیں میں جان دینے پر تیار نہ ہو جاؤں۔ یہ میں خود نہیں جانتا تھا کہ آخر میں چاہتا کیا ہوں۔ میں زندگی سے خائف تھا۔ میں اُس سے دور بھاگنا چاہتا تھا لیکن پھر بھی اس کی تمنا تھی۔

یہ مصیبت مجھ پر اُس وقت پڑی جبکہ مجھ کو مکمل خوشحالی نصیب تھی۔ میں ابھی پچاس برس کا بھی نہ ہوا تھا۔ میری بیوی نہایت اچھی تھی جو مجھ کو پیار کرتی تھی اور جس سے مجھ کو محبت تھی بچے بھی

کئی تھے اور ایک بڑی سی ریاست تھی جو کہ بلا میری کوشش و توجہ کے ترقی کرتی جاتی تھی بہ نسبت پہلے کے اب میرے احباب و رشتہ دار میری عزت و وقعت زیادہ کرتے تھے۔ دوسرے لوگ میری تعریف کیا کرتے تھے اور میں بلا خود فریبی کے یہ کہہ سکتا ہوں کہ میرا نام مشہور ہو گیا تھا۔ بیمار اور دیوانہ ہونے کے بجائے میں جسمانی اور دماغی حیثیت سے تندرست و توانا تھا اور یہ بات اپنی قسم کے لوگوں میں بہت کم پاتا ہوں۔ جسمانی طاقت کے لحاظ سے میں کاشتکاروں کے ساتھ کھیت نرا سکتا تھا۔ اور دماغی قوت کے اعتبار سے آٹھ سے دس گھنٹے تک مسلسل آسانی سے اتنا کام کر سکتا تھا جس سے عام لوگ تھکن اور گرانی محسوس کرنے لگتے ہیں۔

میرا دماغی ہیجان اس شکل میں رونما ہوا کہ میری زندگی سراسر مہمل اور ایک ستم ظریفی ہے جو کسی نے میرے ساتھ کی ہے۔ حالانکہ مجھے "کسی ہستی" پر اعتقاد نہ تھا جس نے مجھے پیدا کیا ہو۔ پھر بھی یہ احساس کہ "کسی ہستی" نے میرے ساتھ یہ ظلم اور مذاق کیا ہے کہ مجھ کو اس دنیا میں پیدا کر دیا خود اس فطری شکل میں ظاہر ہو رہا تھا۔

از خود میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ کسی جگہ کوئی ایسی ہستی ضرور ہے جو میری تیس چالیس سال کی گذشتہ سوانح حیات کو معلوم کر کے خوش ہوتی ہے۔ یعنی میری تعلیم و تربیت، نشو و نما، دماغی و جسمانی بلوغ۔ میں نے کس طرح دماغی قوتوں کی تکمیل کر کے زندگی کا بلند و اعلیٰ مقام حاصل کر لیا۔ یہاں اب ساری چیزیں میری نظروں کے سامنے ہیں۔ میں اس بلندی پر کھڑا ہوتا ہوں۔ مثل ایک کامل احمق کے۔ اس بات کو اچھی طرح سے دیکھتا ہوں کہ زندگی میں کچھ بھی نہیں ہے اور نہ اس سے قبل تھا اور نہ آئندہ ہوگا۔ اس سے "وہ ہستی" لطف اندوز ہوتی ہے۔

لیکن آیا وہ ہستی جو مجھ پر ہنس رہی ہے وہ کبھی تھی بھی یا نہیں، میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نہ تو اپنے کسی فعل کا سبب بیان کر سکتا تھا اور نہ اپنی پوری زندگی کا۔ میں صرف اس لیے پریشان تھا کہ آخر میں نے پہلے ہی اس مصیبت کو کیوں نہ ٹال دیا۔ اب اس کو سب پر ظاہر ہوئے عرصہ ہو گیا ہے آج کل میں اُن لوگوں کو موت آنے والی ہے جن سے میں محبت کرتا ہوں، ان کا یہی حشر ہوگا۔ سوائے

ہڈی اور کپڑوں کے کچھ نہ ہوگا۔ دیر سویر میرے کارہائے نمایاں خواہ وہ کچھ بھی ہوں لوگوں کے ذہن سے اُتر جائینگے اور میرا کہیں وجود نہ ہوگا۔ تب پھر کس لیے جدوجہد کی جائے؟ انسان یہ انجام دیکھے بغیر کیسے رہ سکتا ہے؟ یہی چیزیں باعث حیرت ہیں۔ جو شخص شرابِ حیات میں مخمور ہو وہی اس دنیا میں رہ سکتا ہے لیکن جیسے ہی خمار اُتریگا اور آدمی ہوش میں آئیگا اُس وقت وہ ضرور دیکھیگا کہ یہ ساری کائنات محض "فریب خیال" اور "بے معنی" ہے۔ دنیا میں کوئی چیز دلچسپ اور اچھی نہیں ہے سب کچھ سراسر "ظلم" و "حماقت" ہے

ایک مشرقی کہانی میں ایک مسافر کا ذکر ہے جس کو راہ میں ایک خوفناک درندہ ملتا ہے اس سے جان بچانے کے لیے وہ ایک اندھے کنویں میں کود پڑنا چاہتا ہے لیکن کنویں کے اندر اس کو ایک دیو نظر آتا ہے جو مُنہ پھاڑے ہوئے اس کو نگل جانے کے لیے تیار ہے۔ اس بیچارے کو کنویں کے اوپر رہنے کی ہمت اس وجہ سے نہیں ہے کہ کہیں وہ خوفناک درندہ اس کو چیر پھاڑ نہ ڈالے اور کنویں کے اندر اس لیے نہیں کود سکتا کہ کہیں وہ دیو اس کو ہضم نہ کر جائے اسی کشمکش میں وہ ایک شاخ کو پکڑ کر لٹک جاتا ہے جو کہ کنویں کی دراز میں اندر کی جانب نکلی ہوئی تھی۔ وہ نہایت کمزور ہے۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہوتی جاتی ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ بہت جلد اُس کو اپنے آپ کو ان تباہی و بربادی کے حوالے کر دینا پڑیگا جو اوپر اور نیچے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ لٹکا ہی رہتا ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ دو چوہیاں ایک کالی اور دوسری سفید رنگ کی اُسی شاخ کو جسے وہ پکڑے ہوئے ہے برابر کُتر رہی ہیں۔ شاخ خود تھوڑی دیر میں ٹوٹ جائیگی اور یہ اس دیو کا لقمہ بن جائیگا۔ مسافر یہ سب دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ انجام کار فنا ہے لیکن ابھی وہ لٹکا ہی ہوا تھا کہ اُس کو پتیوں پر شہد کے دو قطرے نظر آئے اور اُس نے کوشش کر کے اپنی زبان سے ان کو چاٹ ہی لیا۔ بالکل اسی طرح میں بھی اپنی شاخ زندگی سے لٹکا ہوا تھا یہ میں جانتا تھا کہ موت کا دیو میری بوٹی بوٹی کر ڈالنے کے لیے تیار ہے لیکن میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر میں نے اپنے کو اس مصیبت میں کیوں پھنسا یا تھا۔ میں نے کوشش کر کے شہد کو چاٹا جس سے اوّل تو مجھ کو کچھ تسکین ہوئی

لیکن پھر کچھ فائدہ نہ ہوا اور روز و شب کی کالی اور سفید چوہیاں میری شاخ حیات کو برابر کترتی رہیں میں دیو کو صاف دیکھ رہا تھا اور شہد میں بھی وہ لطف و ذائقہ محسوس نہ ہوتا تھا۔ یہ محض ایک کہانی نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے جس کا کوئی جواب نہیں اور جو ہر شخص کی سمجھ میں آتی ہے۔

زندگی کی خوشیوں کا فریب جو پہلے میرے خوف کو کم کر دیا کرتا تھا اب مجھ کو دھوکا نہیں دیتا کہ "تم میں زندگی کے معنی سمجھنے کی اہلیت نہیں ہے اس لیے اس بات کا خیال ہی نہ کرو اور زندگی پوری کرتے رہو" یہ بات چاہے کتنی ہی بار مجھ سے کہی جائے لیکن نہ تو اس کا مجھ پر کوئی اثر ہوتا ہے اور نہ میں اس پر عمل کر سکتا ہوں کیونکہ بہت عرصہ تک میں یہی کر چکا ہوں۔ اب میں یہ بغیر محسوس کیے نہیں رہ سکتا کہ دن اور رات گزرتے جاتے ہیں اور مجھ کو موت سے نزدیک کرتے جاتے ہیں۔ بس یہی میں دیکھتا ہوں اور یہی حقیقت بھی ہے باقی سب فریب و باطل ہے۔

شہد کے دو قطرے جنھوں نے میری نظر کو تلخ حقیقت سے ہٹا کر اپنی طرف کچھ عرصہ کے لیے متوجہ کر لیا تھا۔ میرے اہل و عیال کی محبت تھی اور تصنیف کی دلچسپی۔ تصنیف کو میں ایک آرٹ کہا کرتا تھا۔ لیکن اب ان میں بھی کوئی کشش باقی نہ تھی۔

خاندان — میں اپنے دل میں کہتا لیکن میرا خاندان یعنی بیوی اور بچے بھی تو آخر انسان ہیں ان کی بھی یہی حالت ہے جو میری ہے۔ ان کو زندہ رہنے کا کیا حق ہے؟ میں کیوں ان سے محبت کرتا ہوں؟ میں کیوں ان کی حفاظت، نگرانی اور پرورش کروں؟ کہیں ان کو بھی میری جیسی مایوسی نہ ہو یا پھر وہ احمق نہ بن جائیں۔ محبت کر کے میں اس حقیقت کو پوشیدہ نہیں رکھ سکتا علم کا ہر قدم اس حقیقت سے قریب کر دیتا ہے۔ اور حقیقت — موت ہے۔

"آرٹ، شاعری" کامیابی اور لوگوں کی تعریف سے مجھے کامل یقین ہو گیا تھا کہ باوجود موت کے نزدیک ہونے کے یہ چیزیں ایسی ہیں جن کو انسان کر سکتا ہے۔ موت جو کہ ہر شے کو فنا کر دیتی ہے میرے کارناموں اور ان کی یاد کو بھی لوگوں کے دلوں سے فراموش کر دیگی۔ لیکن میں نے بہت ہی جلد معلوم کر لیا کہ یہ بھی ایک "فریب" ہے۔ یہ میں اچھی طرح سمجھتا تھا کہ ہنر زندگی کی زیب و زینت ہے،

اور اُسے دلچسپ بناتا ہے۔ لیکن خود میرے لیے زندگی میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ پھر میں کس طرح دوسروں کے لیے دلچسپی پیدا کر سکتا تھا جب تک کہ میں نے اپنی زندگی کی حقیقت کو نہیں پہچانا تھا اور دوسروں کی زندگی نقل کیا کرتا تھا۔ اس وقت تک مجھ کو یقین تھا کہ زندگی کے کچھ معنی ہیں حالانکہ میں ان کو بیان نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت تک ہر قسم کی شاعری اور آرٹ سے مجھ کو دلچسپی تھی اور ان سے حظ حاصل ہوتا تھا۔ زندگی کا عکس آرٹ کے آئینے میں نہایت ہی دلکش معلوم ہوتا تھا لیکن جب میں نے زندگی کے معنی معلوم کرنے کی فکر کی اور خود اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہا تو وہ آئینہ مجھے غیر ضروری، بیکار، مضحکہ خیز اور تکلیف دہ معلوم ہونے لگا۔ جو کچھ میں آئینہ میں دیکھتا تھا اس سے اب میں اپنے دل کو تسکین نہیں دے سکتا تھا۔ کیونکہ جو مجھ کو نظر آتا تھا وہ خود میری حماقت و مایوسی تھی۔ یہ نظارہ اس وقت بھلا معلوم ہوتا تھا جب کہ میں اپنے دل کی گہرائیوں میں یہ محسوس کرتا کہ واقعی زندگی کے کچھ معنی ضرور ہیں۔ تب زندگی کے تفریحی مزاحیہ، سنجیدہ، دلسوز، خوبصورت اور بھیانک کھیل مجھ کو محظوظ کرتے تھے۔ لیکن جب میں زندگی کو ایک بے معنی، ایک خطرناک شئے تصور کرنے لگا تو آئینہ کے عکس مجھ کو خوش نہ کر سکتے تھے جب میں نے دیو پر نظر ڈالی اور چوہیوں کو اپنی زندگی کے سہارے کو کترتے دیکھا تو شہد کی شیرینی و حلاوت بھی میری زبان کو میٹھا نہ کر سکی۔

اسی پر خاتمہ نہ تھا۔ اگر میں صرف یہی سمجھتا کہ زندگی کے کچھ معنی نہیں ہیں تو میں اس کو متانت سے برداشت کر لیتا یہ جان کر کہ میری قسمت ہی میں یہ تھا لیکن اس سے مجھ کو اطمینان نہ ہو سکتا تھا۔ اگر میری حالت اس شخص کی طرح ہوتی جو کسی جنگل میں رہتا ہو اور اس کو نکلنے کا راستہ نہ ملتا ہو تو میں وہیں زندگی بسر کر لیتا۔ لیکن میری حالت تو اُس شخص کی مانند ہے جو جنگل میں بھٹک گیا ہے، راستہ بھول جانے کی وجہ سے ہراساں اور خوفزدہ ہے اور راستہ معلوم کرنے کے لیے ادھر اُدھر بھاگتا پھرتا ہے لیکن یہ محسوس کرتا ہے کہ ہر قدم اس کے لیے اور مصیبت کا سامان مہیا کرتا ہے۔ پھر بھی وہ چاروں طرف بھٹکنے اور بھاگنے سے باز نہیں آتا۔

حقیقتہً یہ ایک خوفناک واقعہ تھا اور میں اپنے کو خوف سے بچانے کے لیے خودکشی کرنا چاہتا تھا میں نے اس خوف کا بھی اندازہ کر لیا تھا جو آنے والا تھا اور میں یہ جان گیا کہ وہ خوف موجودہ حالت سے

کہیں زیادہ ہیبتناک ہے۔ پھر بھی میں خاموشی سے اپنے انجام کا انتظار نہ کر سکتا تھا۔ تاریکی اور بھی زیادہ وحشتناک تھی جس سے میں جتنی جلد ممکن ہو خلاصی پانا چاہتا تھا۔ ایک رسّی کے پھندے یا پھر بندوق کی گولی سے۔ یہی خیالات مجھ کو نہایت ہی استقلال کے ساتھ خودکشی کی جانب لیے جا رہے تھے۔

لیکن شاید میں نے کسی چیز کو نظر انداز کر دیا یا پھر کسی بات کو اُلٹا سمجھا لیکن یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مایوسی انسانی فطرت کا تقاضا ہے سچ پوچھیے تو میں اب بھی موت سے بچ کر نکل جانے کا ذریعہ تلاش کرتا تھا۔

وہ سوال جو کہ مجھ کو پچاس برس کی عمر میں خودکشی پر مجبور کر رہا تھا، وہ ایک ایسا معمولی و آسان سوال تھا جو چھوٹے سے بچے سے لے کر بڑے سے بڑے فلسفی کے دل میں بھی پیدا ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب دیے بغیر کوئی زندہ نہیں رہ سکتا جیسا کہ مجھ کو تجربے سے معلوم ہوا۔ وہ سوال یہ تھا کہ جو کچھ کہ میں آج یا کل کرونگا اس سے کیا حاصل ہوگا؟ میری تمام زندگی سے کیا حاصل ہوگا؟ بالفاظ دیگر میں کیوں زندہ رہوں؟ میں کسی چیز کی تمنا کس لیے کروں؟ اور کسی کام کے کرنے کی کوشش کیوں کروں؟ دوسری طرح اس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کیا زندگی میں کوئی ایسی چیز بھی ہے جس کو موت برباد نہ کر سکے؟ کل انسانی معلومات دو قسم کی ہیں اوّل قسم میں تو علم کیمیا، حساب اور سائنس ہیں جن کو میرے سوال سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ وہ دلچسپ و دلکش اور حیرت انگیز تو ضرور ہیں لیکن اُنھوں نے میرے سوال کو حل کرنے کی کوشش نہ کی۔ دوسری طرف تخئیلی علم ہیں جن میں مابعد الطبعیات بھی شامل ہے اور جس نے میرے سوال کو حل کرنے میں کچھ مدد بھی دی لیکن اس سے بھی خاطر خواہ جواب نہ ملا۔

جہاں فلسفہ کسی خاص سوال کو نظر انداز نہیں کرتا وہاں وہ ہر سوال کا ایک ہی جواب دیتا ہے۔ سقراط، شوپنہار، سلیمان اور گوتم بدھ سب کا ایک ہی جواب ہے۔

"جس قدر ہم زندگی سے دور ہوتے جاتے ہیں اسی قدر ہم حقیقت سے نزدیک تر ہوتے جاتے ہیں"۔ یہ سقراط نے اُس وقت کہا تھا جب کہ وہ مرنے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ "وہ لوگ زندگی کے لیے کیوں بیتاب ہیں۔ جن کو حقیقت سے ذرا بھی لگاؤ ہے؟ ہم کو چاہیے کہ اپنے آپ کو جسمانیت سے

آزاد کرلیں تاکہ اُن تمام بُرائیوں سے بچ جائیں جو کہ جسم سے تعلق رکھتی ہیں۔ اگر یہ حقیقت ہے تو پھر ہمیں موت سے خوشی حاصل نہ ہونے کی کیا وجہ ہے؟

"عقلمند انسان تمام عمر موت کی تمنا کرتا ہے اور موت سے ہرگز نہیں ڈرتا" شوپنہار بھی کہتا ہے کہ زندگی ایک عذاب ہے اور سلیمان نے یا پھر جس کسی نے بھی ان کے نام سے کتابیں لکھی ہیں کہا ہے:۔

"یہ سب دھوکا ہی دھوکا ہے۔ انسان کو اپنی محنت و جانفشانی کا کیا ثمر ملتا ہے۔ نہ تو گذشتہ واقعات کی یاد باقی رہتی ہے اور نہ آئندہ واقعات کے ساتھ موجودہ واقعات کی یاد تازہ رہ سکتی ہے"۔

"اس لیے مجھے زندگی سے نفرت ہے یہ محنت و جانفشانی میرے لیے باعث تکلیف ہے کیونکہ یہ سب روح کا دھوکا اور انتشار ہے"۔

جب سکیا منی کو عمر، مرض اور موت کی اصلیت معلوم ہوئی تو اُس کو زندگی میں کچھ لطف حاصل نہ ہو سکا اور اُس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ زندگی بدترین عذاب ہے اور اس سے خود خلاصی پانے کے لیے اور دوسروں کو آزاد کرنے کے لیے اس نے اپنی ساری روحانی قوت صرف کی اُس نے اس بات کی بھی کوشش کی کہ زندگی کا جڑ سے خاتمہ کر دے تاکہ ہم موت کے بعد کہیں پھر نہ زندہ کر دیے جائیں یہی اعتقاد اور ہندوستانی عارفوں کا بھی ہے۔

زندگی کے مسئلہ کے متعلق انسانی عقل براہ راست یہی جواب دیتی ہے۔ سقراط کا قول ہے کہ "حیات جسمانی سراسر عذاب اور فریب ہے۔ اس لیے جسمانی زندگی کا خاتمہ کر دینا عین ثواب ہے اور ہم کو ایسا ہی کرنا چاہیے"

"حیات ایک ایسی شے ہے جس کو کبھی عذاب نہ ہونا چاہیے۔ عدم کا راستہ زندگی کی بہترین چیز ہے" یہ فلسفہ شوپنہار کا ہے۔

سلیمان کا قول ہے کہ "دنیا کی ہر شے، عقل و حماقت، دولت و غربت اور دُکھ سکھ سب حقیقت سے خالی اور فانی چیزیں ہیں۔ جب انسان مرجاتا ہے تو اس کی کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔ اس لیے یہ سب کچھ حماقت ہے"۔

گوتم بُدھ کا قول ہے کہ "اس بات سے آگاہ ہوتے ہوئے کہ آزار، کمزوری، بڑھاپا اور موت لازمی و یقینی ہیں زندہ رہنا نہایت دشوار امر ہے اس لیے ہم کو چاہیے کہ اپنے آپ کو ہر ممکن حیات سے آزاد کرلیں"۔

ان زبردست دماغوں کے اقوال کو لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں نے سوچا اور سمجھا اور یہی میں نے بھی سوچا اور سمجھا ہے۔

کوئی شخص خود اپنے کو فریب نہیں دے سکتا۔ یہ سب تکبر ہے۔ اس لیے جو پیدا نہیں ہوا وہی خوش قسمت ہے۔ زندگی سے موت بہتر ہے اور ہر شخص کو چاہیے کہ اپنے کو زندگی سے پاک کرلے۔

پھر میں نے اپنے ہم مشرب لوگوں کی حیات کا جائزہ لینا شروع کیا اور میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ ذیل کی چار حالتوں میں سے کسی ایک سے ضرور اُن کو بھی سابقہ پڑا ہوگا۔

پہلی حالت نادانی کی ہے۔ کچھ لوگ جن میں بیشتر حصہ عورتوں یا بہت چھوٹے بچوں یا پھر بہت ہی کودن لوگوں کا ہے جنہوں نے ابھی تک زندگی کے اہم مسئلہ کو اچھی طرح سمجھا ہی نہیں ہے لیکن میں اس کو سمجھتے ہوئے دوبارہ اپنی آنکھیں بند نہیں کرسکتا۔

دوسرا طریقہ شکم پروروں کا ہے جس کو سلیمان نے یہ کہتے ہوئے واضح کیا ہے کہ "تب میں نے خوشی شادمانی کی اجازت دی کیونکہ اس دنیا میں کسی شخص کے لئے کھانے پینے اور خوش ہونے سے زیادہ بہتر دوسری چیز نہیں ہے"

یہی ایک ایسی چیز ہے جس سے ہمارے بہت سے ساتھی زندگی کو اپنے لائق بنا لیتے ہیں۔ ان کے اطوار اور واقعات ان کے لیے بجائے مصیبت و محنت کے آرام و آسائش مہیا کردیتے ہیں۔ اور ان کی اخلاقی کمزوریاں ان کے لیے یہ ممکن کردیتی ہیں کہ وہ اس بات کو فراموش کردیں کہ اُن کی موجودہ بہتری اتفاقیہ امر ہے۔ ان لوگوں کی دماغی کمزوریاں ان کے دلوں سے ان تمام باتوں کو فراموش کرادیتی ہیں جن کی وجہ سے گوتم بُدھ تمام عمر روحانی ہیجان و اضطراب میں مبتلا رہے۔ وہ چیزیں مرض، بڑھاپا اور موت تھیں جو ایک نہ ایک دن ان تمام عیش و آرام کا ایک دم خاتمہ کردینگی لیکن میں اُن لوگوں کی طرح نہیں کرسکتا تھا کیونکہ میرے پاس ان کی جیسی دماغی کمزوری نہ تھی اور نہ میں خود مصنوعی طور سے پیدا کرسکتا تھا۔

تیسرا ذریعہ جوش و قوت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ زندگی ایک عذاب اور جہالت ہے،

اور اس کا برباد ہو جانا ہی اچھا ہے یہ صرف وہی چند لوگ کر سکتے ہیں جن کے دلوں میں استحکام اور قوت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب سے بہترین ذریعہ ہے۔ یہی طریقہ میں بھی اختیار کرنا چاہتا ہوں۔

چوتھا چھٹکارا پانے کا ذریعہ کمزوری ہے۔ اس سے یہ مُراد ہے کہ حقیقت و اصلیت سے واقف ہوتے ہوئے بھی زندگی ہی کو پسند کرنا۔ گویا کسی کو اب بھی اس سے کچھ اُمید ہے اور میں اپنے کو اسی ذیل میں پاتا ہوں۔ سلیمان و شوپنہار کی طرح زندگی بسر کرنا، یہ جانتے ہوئے کہ زندگی ایک تلخ مذاق ہے جو کہ ہم سے کیا گیا ہے اس پر زندگی ہی کو ترجیح دینا غسل کرنا، کپڑے بدلنا، کھانا، باتیں کرنا اور یہاں تک کہ کتابیں بھی لکھنا میرے لئے ایک نفرت انگیز اور تکلیف دہ چیز تھی لیکن میں اسی حالت پہ قائم رہا۔

اب میں محسوس کرتا ہوں کہ اگر میں نے اپنے کو ہلاک نہیں کیا تو اس کی وجہ میرے تخیل کی انفرادیت کا ہلکا سا احساس تھا اور اب میں دلیل کرنے کے بجائے یہ محسوس کرنے لگا کہ "میں اور میری دلیل نے زندگی کو غیر مدلل تسلیم کر لیا ہے۔ اگر کوئی اعلیٰ دلیل نہیں ہے (جو کہ حقیقۃً نہیں ہے اور نہ کوئی چیز یہ ثابت کر سکتی ہے کہ کوئی ایسی دلیل ہے) تب تو دلیل ہی نے میرے لیے زندگی پیدا کر دی ہے۔ اگر کوئی اعلیٰ دلیل نہیں ہے تو پھر میری زندگی بھی نہ ہوگی۔ دلائل زندگی سے کس طرح منکر ہو سکتے ہیں جبکہ وہی زندگی پیدا کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر اگر زندگی نہ ہوتی تو میرے دلائل کا وجود بھی نہ ہوتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ دلیل زندگی کی اولاد ہے۔ بس پھر زندگی ہی زندگی ہے۔ دلیل اس کا پھل ہے پھر بھی دلیل خود زندگی سے منکر ہے میں نے محسوس کیا تھا کہ یہیں پر کوئی غلطی ہے خودکشی سے زندگی کا خاتمہ کرنے سے کوئی چیز باز نہیں رکھ سکتی بس پھر اپنے کو ہلاک کر کے اس بحث کا خاتمہ ہی کر دینا چاہیے۔ اگر زندگی تکلیف دہ معلوم ہو تو اپنے کو ہلاک کر دو۔ جب تم زندہ رہ کر بھی زندگی کا راز نہیں سمجھ سکتے تو اس کا خاتمہ ہی کر دینا اچھا ہے اور جو تم نہیں سمجھتے لکھ کر یا پرچار کر کے اس زندگی میں اپنے کو بیوقوف مت بناؤ۔ تم کو اچھی جماعت مل گئی جہاں ہر شخص قانع ہے اور اپنے فعل کو بہتر سمجھتا ہے۔ اگر تم کو یہ غیر دلچسپ اور نفرت انگیز معلوم ہوتا ہو تو یہاں سے چلے جاؤ۔

حقیقۃً ہماری کیا حیثیت ہی جو اس بات کو تو مانتے ہیں کہ خودکشی لازمی ہے لیکن اس پر عمل نہیں کرتے لیکن سب سے کمزور، سب سے زیادہ نالائق، واضح الفاظ میں سب سے زیادہ احمق انسان خود اپنی

حماقت کا ڈھنڈورا اسی طرح پیٹتا پھرتا ہے جس طرح ایک بیوقوف ایک بیہودہ مسخرہ کے ساتھ شور مچاتا پھرتا ہے۔

میں نے اپنے دل میں سوچا کہ "کچھ گڑبڑ ضرور ہے" لیکن یہ گڑبڑ کیا تھی میں کسی طرح سے بھی معلوم نہ کر سکتا تھا۔ میں نے اس دُھند کے صاف ہونے سے پہلے ہی اپنی حالت کو درست کرنا شروع کر دیا تھا۔ مجھ کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تعلیم یافتہ اور آرام طلب لوگوں کا جن میں میرا بھی شمار تھا ایک مختصر سا دائرہ ہے جس نے "انسانیت" میں ایک "خلا" پیدا کر رکھا ہے اور لاکھوں انسان جو گذر چکے ہیں یا موجود ہیں وہ اصل میں انسان نہیں بلکہ حیوان ہیں۔ یہ حالت اُس وقت تھی جب کہ میرے دل میں سوال پیدا نہ ہوا تھا کہ "وہ لاکھوں انسان جن کو ہم "عوام الناس" کہتے ہیں ان موجودہ اور گذشتہ لوگوں کے بارے میں کیا خیال کرتے ہونگے؟"

ایک عرصہ تک میں اسی جنون کی حالت میں رہا جو کہ صرف الفاظ میں نہیں بلکہ حقیقت میں خصوصاً ہم ہی جیسے آزادمنش اور تعلیمیافتہ لوگوں کا تمغۂ امتیاز ہے لیکن پھر یا تو وہ میرا مزدوروں کے لیے ذاتی خلوص تھا جس نے مجھے یہ سمجھنے پر مجبور کیا کہ وہ لوگ اتنے بے وقوف اور احمق نہیں ہیں جتنا کہ ہم اُنہیں تصور کرتے ہیں یا پھر اس کی وجہ میرا وہ سچّا اعتقاد تھا کہ میں سوائے اس کے اور کچھ بھی نہیں جان سکتا کہ اپنے کو رسی میں لٹکا کر ہلاک کر ڈالوں۔ بہر حال میں نے از خود یہ محسوس کیا کہ اگر میں زندہ رہ کر زندگی کا مقصد و راز سمجھنا چاہتا ہوں تو مجھے اس کو ان لوگوں میں نہ تلاش کرنا چاہیے جو اس کو کھو چکے ہیں اور اب اپنے کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ ماضی و حال کے ان لاکھوں انسانوں میں تلاش کرنا چاہیے جو اس کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور جو کہ اپنی اور ہماری زندگی کا بار اپنے شانوں پر خندہ پیشانی سے اُٹھاتے ہیں۔

تجربہ سے بھی ثابت ہوا کہ عام مخلوق جو کہ کروڑوں کی تعداد میں ہے ان کو ہمیشہ زندگی کی حقیقت کا علم رہا ہے اور اب بھی اچھی طرح اس سے واقف ہیں لیکن یہ علم خود اُن کا اعتقاد ہے جس کو میں سوائے رد کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ میں نے اپنے دل میں کہا "یہ خدا ہے، ایک اور تین، چھ دن میں دنیا کی آفرینش، شیطان اور فرشتے، اور تمام وہ لغویات جن کو میں اس وقت تک ہرگز نہیں مان سکتا جب تک کہ مجھ میں دلائل و براہین موجود ہیں"۔

میری حالت نہایت خطرناک تھی میں سمجھتا تھا کہ مدلل علم کی راہ میں سوائے زندگی کے انکار کے اور کوئی دوسری شے حائل نہیں ہوسکتی۔ اور اعتقاد کے لیے صرف دلائل اور براہین کا منکر ہونا ضروری ہے یہ میرے لیے زندگی سے منکر ہونے سے زیادہ دشوار اور ناممکنات میں سے تھا۔

آخرکار مجھے اس بات کا احساس ہوگیا کہ یہ میری غلطی ہے کہ زندگی کا مقصد واضح کرنے کے لیے میں ہمیشہ کسی خاص محدود چیز کی جستجو میں رہتا ہوں خاص چیز کے بھی عام چیز کے علاوہ اور کوئی دوسرے معنی نہیں ہوتے قبل اس کے کہ مسئلہ حیات کا حل معلوم کیا جائے۔ ان دونوں کو ایک ہی رشتہ میں منسلک کر دینا چاہیے۔

اس مسئلہ کے متعلق شوپنہار کا جواب ہے کہ زندگی کی کوئی اصلیت نہیں ہے بلکہ یہ تو سراسر عذاب ہے لیکن غور کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ جواب اثبات میں نہیں ہے لیکن اس جواب کی جس کو برہمن شوپنہار اور سلیمان نے بیان کیا ہے۔ اس کے سوائے ایک مہمل، لامحدود اور بحرسی بات کے اور کچھ بھی حقیقت نہیں ہے پھر تو میں سمجھ گیا کہ اعتقاد کے جوابات چاہے کتنے ہی غیر مدلل اور بحر کیوں نہ ہوں لیکن اُن سے یہ فائدہ تو ضرور ہوتا ہے کہ وہ ہر جواب میں محدود اور لامحدود کا رشتہ یا تعلق ضرور قائم کر دیتے ہیں جس نسبت کے بغیر جواب دینا ناممکن ہے۔

سوال کو چاہے میں کسی صورت میں پیش کرتا لیکن وہ تعلق ضرور رونما ہوتا تھا۔ مجھے کس طرح زندگی بسر کرنا چاہیے؟ فطری اصول کے مطابق میری زندگی سے کون سا اہم نتیجہ برآمد ہوگا ــــ دائمی ثواب یا دائمی عذاب اس حیات کی کیا حقیقت ہے جس کو موت بھی برباد نہیں کرسکتی؟ ــــ اس خدا کا وصال (دیدار) جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہیگا یعنی بہشت کی اصلیت ــــ

اعتقاد مجھ کو ہمیشہ اسی طرح غیر ناطق معلوم دیا جیسے پہلے معلوم ہوتا تھا لیکن میرے لیے سوائے یہ تسلیم کرنے کے چارہ نہ تھا کہ صرف یہی ایک چیز ہے جو کہ مسئلہ حیات کا انسان کو تھوڑا بہت جواب دیسکتی ہے۔ اور اسی سے زندگی ممکن معلوم ہوتی ہے۔

جہاں کہیں بھی حیات و زندگی ہے وہاں جب سے انسان رہنے لگا ہے اعتقاد نے اس کے لیے

زندگی کو آسان و ممکن بنا دیا ہے اور اس اعتقاد کا خاکہ ہمیشہ ہر جگہ وہی اور ایک ہی سا ہوتا ہے جیسا کہ عام لوگوں کا خیال ہے اعتقاد کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جو کسی نے کہا ہے اُس کو مان لیا جائے۔ اعتقاد انسانی زندگی کے راز کے اس علم کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے انسان اپنے کو ہلاک کرنے کے بجائے زندہ رہنا پسند کرتا ہے۔ اعتقاد زندگی کا "قوت بازو" ہے۔ اگر کوئی شخص زندہ رہتا ہے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ اُس کو کسی بات کا یقین ہے۔ اگر وہ فانی شے کو نہ دیکھتا ہے اور نہ پہچانتا ہے کہ اس کی حقیقت کیا ہے تو وہ اس پر ضرور یقین رکھتا ہے اگر وہ فانی شے کی تخیلی فطرت کو پہچانتا ہے تب تو اس کو غیر فانی پر اعتقاد رکھنا چاہیے۔ بغیر اعتقاد کے وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔

میں کیا ہوں؟ اسی غیر فانی شے کا جز۔ ان ہی چند الفاظ میں زندگی کا راز مضمر ہے۔

میں تھوڑا تھوڑا یہ محسوس کرنے لگا کہ اعتقاد کے دیئے ہوئے جوابوں میں انسانی عقل کا زبردست خزانہ پوشیدہ ہے۔

یہ تو میں سمجھ گیا لیکن اس نے میرے لیے کوئی بہتر صورت پیدا نہ کی۔

اب میں ہر اس اعتقاد کو قبول کرنے پر تیار ہو گیا تھا جس میں براہ راست دلائل سے انکار نہ کرنا پڑے، جو کہ سراسر غلطی ہے اور میں نے کتابوں سے بدھ مذہب اور اسلام کا مطالعہ کیا اور خصوصًا میں نے مذہب مسیحی کی کتابوں سے اور لوگوں سے بہت کچھ سیکھا۔

فطرتًا اوّل میں اپنے ہی گروہ کا ایک ایماندار شخص بن گیا تھا میں علماء کا معتقد تھا۔ گرجا گھر کے پادریوں کا، درویشوں کا، اور جدید خیالات کے پادریوں کا اور میں ان انجیلی اصحاب کا بھی معتقد تھا جو اپنی تقاریر انجیل کے مطابق کرتے تھے اور جنہیں حضرت مسیح کے کفارہ پر اعتقاد رکھنے سے نجات کا یقین ہوتا ہے میں ایسے ہی معتقد اصحاب کے پاس پہنچکر ان کے اعتقادات کے متعلق، اور یہ کہ وہ زندگی کا ماحصل کیا سمجھتے ہیں سوالات کیا کرتا تھا۔

لیکن باوجود اس کے کہ میں ہر قسم کی رعایت و لحاظ کرنے کے لیے تیار تھا۔ پھر بھی میں نے یہ دیکھا کہ جو کچھ بھی اُنہوں نے اپنے اعتقاد کے متعلق بتایا اس نے زندگی کے مسئلہ کو واضح کرنے کے بجائے

اور دقیق و نافہم کر دیا۔

اس اُمید کے بعد جو کہ مجھ کو ان لوگوں سے تھی اپنی سابق مایوسانہ حالت میں جانے کا روح فرسا خوف پھر میرے دل و دماغ میں چکر لگانے لگا۔

جتنے واضح طور سے اُنھوں نے مجھ سے اپنے اصول بتلائے اتنے ہی صاف طریقہ سے میں ان کی غلطیاں محسوس کرنے لگا۔ جن باتوں نے مجھ کو متنفر کیا وہ یہ نہ تھیں کہ اُنھوں نے بہت سی لایعنی اور غیر ضروری باتیں ان مسیحی صداقتوں میں ٹھونس دی تھیں جن کا میں ہمیشہ سے معتقد تھا۔ اس حقیقت نے مجھ کو متنفر بنا دیا کہ ان کی زندگیاں بھی میری ہی زندگی کی مانند ہیں۔ جس میں صرف یہ فرق ہے کہ ان کی زندگی کا ان کے ان اصولوں سے کوئی تعلق نہ تھا جن کا وہ اپنی تعلیم کی طرح پرچار کیا کرتے تھے۔

ان کے اعتقادات کی صداقت کی کوئی دلیل مجھے قائل نہ کر سکی۔ صرف ان کے افعال سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ زندگی کے ماحصل کو سمجھتے ہیں۔ جس میں وہی ساری باتیں تھیں جن سے میں اس قدر خائف تھا۔ یعنی غربت، آزار اور موت جو کہ ان کے لیے کوئی خوف کی بات نہ تھی۔ یہ ساری باتیں مجھے قائل نہ کر سکیں ہمارے ہی گروہ میں بہت سے ایسے لوگ تھے جن میں ایسے افعال نہ پاتا تھا۔ اس کے برخلاف ایسے افعال میں نے اپنے گروہ کے ان لوگوں کو کرتے ہوئے دیکھا جو کہ قطعی منکر اور غیر معتقد تھے لیکن جو ہمارے گروہ کے معتقد ہیں اُنھوں نے کبھی ایسے کام نہیں کیے۔

میں یہ سمجھ گیا کہ ان لوگوں کا یقین وہ اعتقاد نہ تھا جس کی مجھے تلاش تھی اور میں یہ بھی سمجھ گیا کہ ان کا اعتقاد کوئی حقیقی اعتقاد نہیں ہے بلکہ یہ صرف ایک ڈھونگ ہے۔

تب پھر میں ان معتقد لوگوں کی طرف رجوع ہونے لگا جو غریب، سادہ لوح اور جاہل تھے جو کہ یاترا کرنے والے، درویش، زاہد اور کاشتکار تھے ان میں بھی میں نے یہ دیکھا کہ مسیحی مذہب کی صداقتوں میں بہت سے باطل خیالات و اعتقادات شامل ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ باطل ان کی زندگی کا ایک لازمی اور فطری جزو ہے .... اور میں ان لوگوں کی زندگی اور اعتقاد کو اچھا سمجھنے لگا اور جتنا ہی میں نے اس پر غور کیا اتنا ہی میں اس بات کا قائل ہوا کہ ان کا اعتقاد درست ہے جو اُن کے لیے

ایک نہایت ضروری چیز ہے۔ اور جو اُن کی زندگی کو کارآمد اور رہنے کے قابل بناتا ہے۔ برخلاف اپنے گروہ کے جس کی ساری زندگی سستی و کاہلی، عیش و عشرت، شراب و کباب، حرص و ہوس اور بے اطمینانی میں گذرتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اُن لوگوں کی تمام زندگی محنت و مشقت، دُکھ اور تکلیف اور رنج وغم میں گذرتی تھی پھر بھی وہ لوگ مطمئن اور قانع تھے جب کہ ہم اس بات سے خائف ہیں کہ ہم کو بھی دُکھ اور تکلیف برداشت کرنا ہے اور مرنا ہے یہ لوگ زندہ رہتے ہیں تکلیفیں جھیلتے ہیں مصیبتیں اُٹھاتے ہیں لیکن پھر بھی نہایت اطمینان اور خاموشی سے مر بھی جاتے ہیں۔ بلکہ اکثر ایسے ہوتے ہیں جو خوشی سے جان دیتے ہیں۔

مجھے ان لوگوں سے اُنس ہو گیا۔ جتنا زیادہ میں ان کی زندگی سے واقف ہوتا گیا اُسی قدر زیادہ میں اُن کو چاہنے لگا اور اتنا ہی میرے لیے زندگی بسر کرنا آسان ہو گیا۔ اسی طرح میرے دو برس گذر گئے۔ اور مجھ میں ایک تغیر رونما ہوا جو کہ پہلے ہی سے تیار رکھا اور جس کی میں ہمیشہ اُمید کرتا تھا۔

ہمارے گروہ یعنی دولتمند اور تعلیمیافتہ جماعت کی زندگی میرے نزدیک صرف بے لطف ہی نہیں بلکہ بے معنی اور بیکار بھی تھی۔ جب کہ ان تمام مزدور پیشہ لوگوں کی زندگی یعنی ان تمام انسانوں کی زندگی جنہوں نے زندگی کو واقعی زندگی بنایا اپنی حقیقت و اصلیت کے ساتھ مجھ پر ظاہر ہوئی۔ میں سمجھ گیا کہ یہی اصلی زندگی ہے اور اس زندگی کے جو معنی بتلائے جاتے ہیں وہ درست و بجا ہیں اور یہ میں نے بھی قبول کرلیا۔

تب میں یہ سمجھ گیا کہ جس وقت میں زندگی کو محض "عذاب" خیال کرتا تھا اس وقت میرا یہ سوال کہ "زندگی کیا ہے؟" بجا و درست تھا۔ صرف غلطی اس میں یہ تھی کہ اس کا جواب میری خود اپنی زندگی تھی نہ کہ عام لوگوں کی زندگی۔ میری زندگی جو کہ محض عیش پرستی، اور خواہشات کی زندگی کے مرادف تھی حقیقۃً لایعنی اور عذاب تھی۔ اور میں اس حقیقت سے واقف ہو گیا جو میں نے بعد میں تخیلی تعلیم میں پائی یعنی انسان بہ نسبت روشنی کے تاریکی اس لیے پسند کرتا ہے کہ اس کے افعال سراسر جرم و گناہ ہوتے ہیں اور یہ کہ حسب معمول چیزوں اور واقعات کو دیکھ کر ہر شخص کو چاہیے کہ وہ انسانی زندگی کے متعلق سوچے اور رکھے۔ بجائے

اس کے کہ وہ اُن لوگوں کا ذکر کرے جن کی زندگی کا دارومدار خود دوسروں کی زندگی پر ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ایک چڑیا اس طرح زندگی بسر کرتی ہے کہ وہ خود ہی اُڑتی ہے، گھونسلا بناتی ہے اور غذا مہیا کرتی ہے اور جب میں اس چڑیا کو ایسا کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو اس کی خوشی سے مجھے بھی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح بکری، خرگوش اور بھیڑیا اپنی ضروریات زندگی خود مہیا کرتے ہیں اور اپنی نسل بڑھاتے ہیں اور اپنے بال بچوں کی پرورش کرتے ہیں۔ جب میں ان کو ایسا کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے کامل یقین ہو جاتا ہے کہ وہ بہت خوش ہیں اور اُن کی حیات ایک مدلل بامعنی زندگی ہے اور ہاں! میں نے اپنی گذشتہ تیس سال کی باہوش زندگی میں کیا کیا؟ میں نے صرف سب کے ہی لیے نہیں بلکہ خود اپنے لیے بھی ضروریات مہیا کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ میں نے اپنی زندگی ان لوگوں کی طرح بسر کی تھی جن کی زندگی کا بار دوسروں کے شانوں پر ہوتا ہے اور جب میرے دل میں خود یہ سوال پیدا ہوا کہ میری زندگی کس کام کی ہے یعنی میری زندگی کا مصرف کیا ہے تو میں نے محسوس کیا کہ میری زندگی بیکار رہے۔ اگر انسانی زندگی کے یہ معنی ہیں کہ اس کو عروج دیا جائے تو بھلا میری زندگی کس کام کی ہو سکتی تھی جبکہ میں نے تیس سال کی عمر میں اس کو ترقی دینے کے بجائے میں خود اپنی ہی نہیں بلکہ دوسروں کی بھی زندگی برباد کرتا رہا تو پھر میں اپنی زندگی کو حماقت و عذاب کے سوا دوسری چیز کس طرح سمجھ سکتا تھا۔ وہ بالکل حماقت و عذاب تھی۔

اس پر اعتقاد کیسے ہو سکتا تھا کہ زندگی کا علم زندہ رہنے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ خود مجھے اپنی ہی زندگی کی خوبیوں پہ شبہ ہونے لگا تھا۔ اس سال جب کہ میں ہر وقت اپنے دل میں یہی خیال کرتا تھا کہ آیا مجھے اپنی زندگی کا خاتمہ رسّی کے پھندے سے یا بندوق کی گولی سے کر دینا چاہیے۔ اس زمانہ میں ہمیشہ میرے خیالات اور تجربات جن کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے میرے دل میں ایک درد کی طرح محسوس ہوتے تھے اور میرا دل کپڑا پکڑا سا معلوم ہوتا تھا جس کو میں اب صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ خدا کے معلوم کرنے کا جذبہ تھا۔

میرے ذہن میں شوپنہار اور کانٹ کے دلائل چکر لگاتے تھے جن سے خدا کا وجود ثابت کرنا ناممکن تھا اور میں ان کو رد کرتا تھا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ "سبب کوئی ایسی چیز نہیں ہے جیسی کہ "وقت" اور "فاصلہ" (وسعت)۔ اگر میرا وجود ہے تو اس کا کچھ سبب ضرور ہونا چاہیے اور "سببوں" کا بھی ایک "سبب" لازم ہے اور سارے

اسباب کاایک سبب وہی ہوسکتا ہے جس کو انسان" خدا" کہتا ہے۔ اور جوں ہی یہ میں نے تسلیم کرلیا کہ میں ایک زبردست قوت کے قبضہ میں ہوں۔ مجھ کو فوراً ایسا معلوم ہوا کہ اب میں زندہ رہ سکتا ہوں لیکن میں نے دل میں سوال کیا کہ وہ سبب اور قوت کیا ہے؟ میں اس کا کس طرح خیال کرسکتا ہوں ؟میرے اس ہستی سے کیا تعلقات ہیں جس کو کہ میں" خدا" کہتا ہوں؟ صرف مجھے یہ معمولی وآسان سا جواب ملا کہ" وہ خالق ومحافظ ہے" اس جواب سے مجھے تشفی نہیں ہوئی اور ایسا معلوم ہوا کہ میرے ہاتھ سے وہ شے نکلی جارہی ہے جس کی میری زندگی کو سخت ضرورت ہے۔ میں خوفزدہ اور ہراساں ہو کر جس کی مجھے تلاش تھی اس سے دعا کرنے لگا کہ ایسی حالت میں اُس کو چاہیے کہ میری مدد کرے۔ لیکن جتنی زیادہ میں نے دعائیں کیں اتنا ہی مجھ پر یہ روشن ہوتا گیا کہ وہ میری ایک بھی نہیں سنتا اور کوئی بھی ایسی ہستی نہیں ہے جس کو میں خود مخاطب کروں۔ دل میں۔ دل میں اس بات سے مایوس ہوتے ہوئے کہ خدا کا وجود بالکل ہی نہیں ہے، میں نے کہا" اے مالک رحم کر، مجھے بچا، آقا مجھ کو کچھ بتلا"۔ لیکن مجھ پر کسی نے بھی رحم نہ کیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میری زندگی کا خاتمہ ہونے والا ہے۔

لیکن بار بار میں پھر اسی بات کی طرف رجوع کرتا کہ بلا سبب، وجہ یا مطلب کے میں ہرگز اس دنیا میں نہیں آسکتا تھا۔ میں ہرگز اس آشیانہ میں ایسا بے بال و پر نہیں ہو سکتا جیسا کہ میں خیال کرتا تھا۔ یا پھر گھاس پر لیٹ کر میں نے یہ فرض کرلیا کہ میں ایسا ہی تھا (چونکہ میں اس بات سے واقف ہوں اس لیے میں نے کہا) کہ ماں نے مجھ کو اپنے بطن سے پیدا کیا ہے، میری حفاظت کی ہے آرام پہنچایا ہے، مجھے کھانے کو دیا اور مجھ سے محبت کی ہے۔ اب وہ میری ماں کہاں ہے۔ اگر مجھ کو میری ماں نے چھوڑ دیا ہے تو پھر کس نے ایسا کیا ہے۔ میں اپنے سے اس بات کو پوشیدہ نہیں رکھ سکتا تھا کہ میں کسی کے زیر پرورش تھا جو مجھ سے محبت بھی کرتا تھا۔ وہ کونسی ہستی تھی۔ پھر وہی جواب ملا کہ" خدا"

میں نے اپنے دل میں کہا" اس کا وجود ہے" اک آن واحد کے لیے میں نے اس بات کو تسلیم کیا تھا کہ یکبارگی زندگی کی لہر مجھ میں دوڑ گئی اور مجھے زندہ رہنے کے امکانات اور خوشی محسوس ہوئی۔ خدا کے وجود کو تسلیم کرنے کے بعد میں پھر اس کے اور اپنے تعلقات معلوم کرنے لگا، اور پھر میں نے خیال کیا کہ وہ خدا ــــ ہمارا خالق ہے جس نے اپنے بیٹے کو بھیجا جو نجات دہندہ ہے۔ اور پھر وہی خدا جو مجھ سے اور ساری دنیا سے الگ ہے

برف کے ایک تودے کی طرح پگھل جاتا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے ہی پگھل جاتا ہے اور کوئی چیز باقی نہیں رہتی اور پھر میرا چشمۂ حیات خشک ہو جاتا ہے اور میں مایوس ہو جاتا ہوں اور اپنے کو ہلاک کرنے کے علاوہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا لیکن سب سے بدترین بات یہ تھی کہ میں سمجھتا تھا کہ میں یہ بھی نہیں کرسکتا۔

دو یا تین مرتبہ ہی نہیں بلکہ صدہا دفعہ ایسا ہوا کہ میں ان حالتوں تک پہنچا اول خوشی و زندگی کی اُمید پھر مایوسی اور زندگی کے ناممکنات کا احساس۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ موسم بہار کا آغاز تھا جب کہ میں جنگل میں تن تنہا اُس کے نغمات سے محظوظ ہو رہا تھا جس کے لیے میں مسلسل تین سال ضائع کر چکا تھا۔ میں پھر خدا کو تلاش کر رہا تھا۔

میں نے اپنے دل میں کہا "اچھا تو خدا نہیں ہے۔ کوئی ایسا نہیں ہے جو میرے تخیل میں نہ ہو بلکہ اس کی حقیقت میری زندگی کی طرح ہو۔ اس کا وجود نہیں اور معجزے بھی اس کے وجود کو ثابت نہیں کرسکتے کیونکہ معجزے غیر ناطق ہونے کے علاوہ خود میری سمجھ کے نتیجے ہونگے۔ میں نے خود اپنے ذہن سے دریافت کیا کہ "لیکن میرا خدا کا ادراک، میرا اس ہستی کا ادراک جس کی مجھے جستجو ہے، آخر یہ ادراک کہاں سے آیا" اسی خیال پر میری رگ رگ میں زندگی و مسرت کی لہریں دوڑ گئیں۔ میرے آس پاس کی سب چیزوں میں جان آگئی اور وہ بامعنی اور کارآمد نظر آنے لگیں۔ لیکن میری مسرت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ میرے دماغ نے پھر اپنا کام شروع کر دیا

میں نے دل میں سوچا کہ "خدا کا ادراک تو خدا نہیں ہو سکتا اور مجھے تو صرف ادراک ہی ہوتا ہے خدا کے ادراک کا ظاہر کرنا یا ظاہر کرنے سے باز رہنا میرے اختیار میں ہے لیکن مجھے اس کی تلاش نہیں ہے۔ مجھے تو اس شے یا ہستی کی تلاش ہے جس کے بغیر زندگی بیکار بلکہ ناممکن ہے۔ اور پھر میرے آس پاس کی چیزیں فنا ہونے لگیں اور پھر میں نے اپنے کو ہلاک کرنا چاہا۔

لیکن اب میں نے خود اپنے اوپر توجہ کی اور جو میرے دل میں ہو رہا تھا اس پر غور کیا اور میں نے یاد کیا کہ میری زندگی صرف انہی اوقات میں تھی جب کہ مجھے خدا کا یقین تھا۔ جیسی حالت پیشتر تھی وہی حالت اب بھی تھی زندہ رہنے کے لیے مجھے صرف خدا کی معرفت درکار تھی اور مجھے اپنی ہلاکت کے لیے اس کی فراموشی اور بداعتقادی کی ضرورت تھی۔ کسی نے میرے دل میں یہ سوال پیدا کیا کہ "تم اور کیا تلاش کرتے ہو؟ یہی تو اس کا

وجود ہے۔ اس کی ایسی ہستی ہے جس کے بغیر کوئی زندہ نہیں رہ سکتا۔ زندہ رہنا اور خدا کو ماننا ایک ہی بات ہے۔ خدا زندگی ہے۔ تمام زندگی بھر خدا کو تلاش کرتے رہو تب بھی تم کبھی بغیر خدا کے نہیں رہو گے۔" میرے ارد گرد کی تمام چیزیں پیشتر سے زیادہ منور و تاباں ہوگئیں اور پھر یہ روشنی کبھی ضائع نہیں ہوئی۔

میں ہلاکت سے بچ گیا اور مجھے یہ کہتے ہوئے تعجب معلوم ہوتا ہے کہ قوت حیات جو مجھ کو اب ملی تھی وہ کوئی نئی چیز نہ تھی بلکہ بہت ہی پرانی و فرسودہ میرے بچپن کی چیز تھی جو کہ میرے ایام طفلی میں موجود تھی۔

میں اسی حالت پر واپس آگیا جس کا تعلق میری طفلی و شباب سے ہے۔ مجھے اس قوت کا احساس ہوگیا جس نے مجھے پیدا کیا تھا اور جو مجھ سے کسی بات کی طالب تھی۔ اب میرا یہی اعتقاد تھا کہ میرا مقصدِ حیات صرف یہ ہے کہ اپنے کو بہتر بناؤں یعنی اس ہستی کے منشاء کے مطابق زندگی بسر کروں۔ اب مجھے اس بات کا یقین ہوگیا کہ میں اس قوت کے احساس کو الفاظ میں ادا کر سکتا ہوں یعنی مجھے خدا پر، اخلاقی تکمیل پر اور ان احادیث اور روایات پر اعتقاد ہے جن سے زندگی کا مطلب و مقصد واضح ہوتا ہے۔

میں اپنے گروہ کی زندگی سے منحرف ہوگیا، میں نے یہ تسلیم کر لیا کہ کوئی زندگی نہیں بلکہ "فریبِ زندگی" ہے اور میں یہ بھی سمجھ گیا کہ جس افراط و تفریط میں ہم زندگی بسر کرتے ہیں وہ ہم کو زندگی کے سمجھنے سے باز رکھتے ہیں۔ میرے چاروں طرف بیچارے روس کے مزدور تھے۔ میں نے ان کی جانب توجہ کی اور جو زندگی کو معنی وہ پہناتے تھے میں نے اس پر غور کیا۔ اگر اس معنی کو کوئی الفاظ میں ادا کر سکتا تھا تو وہ یہ ہے:

"ہر شخص اس دنیا میں خدا کی مرضی سے پیدا ہوا ہے اور خدا نے ہر ایک کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ یا تو اپنی روح کو برباد کر دے یا پھر اس کو محفوظ رکھے۔ انسان کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنی روح کو بچائے۔ اور روح کو محفوظ رکھنے کے لیے لازم ہے کہ وہ "اچھی طرح" زندگی بسر کرے اور "اچھی طرح" رہنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے عیش و عشرت کو لات مار کر محنت و مشقت اختیار کرے، عجز و انکسار سے کام لے، تکالیف جھیلے، مصیبتیں اٹھائے اور رحمدل رہے" یہ معنی بہت صاف تھے اور میرے دل کو پسند بھی تھے، ہمارے فرقہ سے الگ جن میں میرا بھی شمار تھا، لوگوں کے عام اعتقاد کے اس مفہوم کے

ساتھ ہی کچھ چیزیں ایسی شامل تھیں جو علیحدہ نہ کی جاسکتی تھیں اور جنہوں نے مجھ کو باغی بنا دیا تھا اور جو میری سمجھ میں خاک بھی نہ آئی تھیں۔ زہد وتقویٰ عبادت وریاضت، روزہ وزیارت اور بتوں کی تعظیم و احترام نہ تو لوگ ان کو ایک دوسرے سے الگ کر سکتے تھے اور نہ خود میں ہی کر سکتا تھا۔ اور جتنی ہی مجھ کو ان سے حیرت تھی اتنا ہی میں ان کو مانتا تھا۔ صبح وشام عبادت کے لیے سر جھکاتا، روزہ رکھتا اور "مقدس عشائے ربانی" حاصل کرنے کے لیے تیار تھا۔ پہلے پہل میری دلیل نے کسی بات کو رد نہیں کیا جو مجھ کو بیشتر ناممکن نظر آتا تھا اب اس نے میرے لیے کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کی۔ دوئم میں نے یہ سمجھ لیا کہ ہر اعتقاد کا جوہر یہ ہے کہ زندگی کو ایسے معنی پہنانے چاہئیں جو موت سے بھی مٹائے نہ جاسکیں فطرتاً اعتقاد کو ان سوالات کا جواب دینے کے لیے عیش وعشرت میں بادشاہ کا مرنا، کام کی زیادتی سے ایک ضعیف وناتواں غلام کا دکھ سہنا اور ہر قسم کے لوگوں کے بارے میں خواہ وہ بوڑھے ہوں یا جوان، دانا ہوں یا نادان اس کے جواب لازمی طور سے مختلف پیرایہ کے ہونے چاہئیں لیکن یہ دلیل جو کہ میری نظروں میں مذہب کے شرعی پہلو کی اجنبیت کو دور کر رہی ہے۔ زندگی کے ایک بڑے معرکہ — مذہب — میں مجھ سے وہ افعال کرانے کے لیے جن کو میں قابل اعتراض سمجھتا ہوں تیار کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ میری یہ دلی تمنا تھی کہ میں سب لوگوں سے مل جل کر رہوں ان کے مذہب کے شرعی پہلو کی تعمیل کرتا رہوں لیکن میں یہ نہ کر سکا میں نے محسوس کیا کہ اگر مجھے ایسا کرنا ہی ہے تو مجھے اپنے کو فریب دینا ہوگا اور مجھے ان باتوں کا مضحکہ اڑانا پڑیگا۔ جن کو میں قابل احترام سمجھتا تھا۔ بہرحال اس موقع پر ہمارے نئے مذہبی روسی مصنفوں نے میری بڑی مدد کی۔

ان علماء کی تشریح کے بموجب ہمارے اعتقاد کی اصلی تعلیم یہ ہے کہ "چرچ" (جماعت) بے عیب ہے اس اصول کو تسلیم کرتے ہی ان تمام عقائد کو ماننا پڑتا ہے جن کا کہ "چرچ" (جماعت) پرچار کرتا ہے اب میرا یہ اعتقاد ہوگا کہ جماعت اور سچے معتقدوں کا ایک گروہ ہے جو کہ رشتۂ محبت میں منسلک ہیں اس لیے جو وہ فرماتے ہیں بجا و درست ہے۔ میں نے سوچا کہ اصلی حقیقت کسی خاص شخص کے حصہ میں نہیں آئی بلکہ یہ اس پورے گروہ پر روشن ہے کہ وہ سب محبت میں منسلک ہیں۔ اصلیت معلوم کرنے کے لیے کسی کو جدا

نہیں ہونا چاہیے اور جُدا نہ ہونے کے لیے یہ لازمی ہے کہ محبت کی جائے اور وہ باتیں برداشت کی جائیں جن کو کہ وہ ماننے کے لیے تیار نہ ہو۔

حقیقت خود محبت میں ظاہر ہوتی ہے اگر تم جماعت کے اصولوں کے آگے سرِتسلیم خم نہیں کرتے تو سمجھ لو کہ تم محبت کی حد سے باہر ہو جاتے ہو اور محبت کی حد سے باہر ہونے کے یہ معنی ہیں کہ تم خود اپنے کو حقیقت کے پہچاننے سے قاصر رکھتے ہو۔ تب میں نے اس دلیل میں کوئی کج بحثی تصور نہیں کی میں نے یہ نہیں محسوس کیا کہ محبت میں وصال سب سے زیادہ محبت پیدا کر سکتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ نیسین کریڈ (Nicene Creed) کے الفاظ میں اصلی حقیقت کا انکشاف نہیں ہو سکتا میں یہ بھی نہ سمجھ سکا کہ محبت خود کوئی ایسا اظہار نہیں کر سکتی جس میں احسانمندانہ وصال کی کیفیت ہو۔ میں نے اس دلیل میں یہ غلطیاں نہیں دیکھی تھیں اور شکر ہے کہ میں بلا سمجھے بوجھے پکی ایماندار جماعت کے اصول ماننے لگا تھا اور اُن پر عمل بھی کرنے لگا تھا۔

جب جماعت کے اصولوں کی تعمیل کرنے میں میں نے اپنی دلیلوں کو اہمیت نہ دی، اور احادیث وروایات کا معتقد ہو گیا اور اپنے آبا و اجداد کی پیروی کرنے لگا تو مجھ کو ماں، باپ، دادا، دادی اور نانا و نانی سے محبت ہو گئی اور میں ان لاکھوں آدمیوں سے بھی محبت کرنے لگا، جن کی میں عزت و وقعت کرتا تھا جب میں علی الصباح عبادت کے لیے اُٹھتا تھا تو میں یہ خیال کرتا تھا کہ میں بڑا ہی نیک کام کر رہا ہوں کیونکہ میں اپنے دماغی تکبر کو مٹانے کے لیے جسمانی آسائش کا ایثار کرتا تھا اور یہ سب اس لیے کہ میں زندگی کا مفہوم سمجھنے کے لیے بیقرار تھا۔ چاہے یہ ایثار کتنے ہی معمولی ہوں لیکن میں ان کو بہتری کے حاصل کرنے کے لیے کرتا تھا میں روزہ رکھتا، جماعت کے لیے تیار ہوتا، اور مکان و گرجا گھر دونوں جگھوں کی عبادت کے اوقات کا بہت ہی لحاظ رکھتا تھا۔ گرجا گھر کی عبادت کے درمیان میں ہر لفظ پر اچھی طرح توجہ دیتا اور جہاں کہیں ہو سکتا تھا میں اُن کو معنی پہناتا۔

لیکن ان اصولوں سے بھی معنی کے اخذ کرنے کی حد تھی۔ اگر میں نے طسار اور اس کے عزیز و اقارب کے بار بار اعادہ کی خود اپنے لیے اس طرح تشریح کی کہ وہ بہ نسبت دوسروں کے آزمائش کے جلد شکار ہو جانیوالوں

میں سے تھے اس لیے وہ لوگ دعا کے زیادہ مستحق تھے اور دعا یہ تھی کہ "اس کے مخالف و دشمن سب کو شکست ہو" (حالانکہ کسی نے یہ کہنے کی بھی جرأت کی ہے کہ وہ دشمن جس کی شکست کی دعا کی جاتی ہے وہ گناہ ہے)۔ اور ایسی ہی بہت سی نافہم دعائیں تھیں تقریباً تمام عبادت کا دو تہائی حصہ ایسا ہی تھا۔ یا تو یہ بالکل میری سمجھ سے باہر تھا یا پھر جب میں ان کی تشریح کرنے کی کوشش کرتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں اور اس طرح سے میں اپنے سارے تعلقات کو جو کہ خدا سے تھے برباد کر رہا تھا اور اپنے اعتقاد کو کمزور کر رہا تھا

میں اس تکلیف دہ احساس کا تجربہ جو مجھے اس دن ہوا جبکہ میں نے سالہا سال کے بعد پہلی مرتبہ عشائے ربانی اپنے ہاتھوں میں لیا تھا کبھی نہیں بھول سکتا۔ عبادت، اقبال اور دعائیں بالکل قابل فہم تھیں اور مجھ میں ایک زبردست خوشی کا یہ احساس پیدا کر دیا کہ مجھ پر آج زندگی کے مفہوم کا انکشاف ہو رہا ہے۔ اتحاد و یکجہتی کو میں حضرت مسیحؑ کی یاد میں ایک کام سمجھتا تھا اور وہ اس بات کی سند تھی کہ تزکیہ نفس اور گناہوں سے رستگاری ہو گئی ہے اور حضرت مسیح کی مکمل تعلیم کا اقرار بھی یہی ہے۔ اگر یہ تشریح مصنوعی تھی تو میں نے اس کی مصنوعیت پہ توجہ نہیں دی۔ گرجا گھر کے پادری کے سامنے عاجزی اور انکساری کرنے میں مجھ کو بڑی مسرت حاصل ہوتی تھی وہ نہایت ہی سیدھا سادہ اور کمزور طبیعت کا دیہاتی پادری تھا۔ اپنے گناہوں کا اقرار کر کے تمام آلائشوں سے روح کو پاک کرنے میں اور دعائیں لکھنے والے "باپوں" کی انکساری کے خیال میں محو ہوجانے میں مجھ کو دلی مسرت ہوتی تھی۔ جو ایمان لا چکے تھے اور جو اب ایمان لا رہے تھے ان سب سے مل کر اتنی خوشی حاصل ہوتی تھی کہ میں اپنی تشریح کی بناوٹ پر غور نہ کر سکا لیکن جب میں "قربان گاہ" کے پھاٹک پر پہنچتا تھا اور پادری مجھ سے یہ کہلاتا تھا کہ میں یقین کرتا ہوں کہ جو کچھ میں نگلنے والا تھا وہ حقیقۃً گوشت اور خون تھا اور اس وقت میرے دل کو سخت کوفت ہوتی کیونکہ وہ صرف غلط ہی نہ تھا بلکہ یہ ان لوگوں سے سخت مطالبہ تھا جو کہ ظاہر اعتقاد سے قطعی ناواقف تھے۔

میں اب اپنے کو یہ کہنے کی اجازت دیتا ہوں کہ وہ ایک سخت مطالبہ تھا لیکن اس وقت میں نے ایسا خیال نہ کیا تھا مگر وہ ایک غیر مرئی شے کی طرح میرے لیے سوہان روح تھا۔ اس وقت میں نے اپنی روح میں ایک احساس پایا جس نے یہ برداشت کرنے میں مجھے مدد دی۔ یہ ذاتی عاجزی و انکساری

تھی۔ میں اپنے کو کمتر و حقیر سمجھتا تھا اور بلا کلمۂ کفر کہے ہوئے "گوشت و خون" کھاتا تھا۔ اور یہ کام بڑے ہی حسنِ اعتقاد سے کرتا تھا۔ لیکن صدمہ پہنچ چکا تھا اور یہ جانتے ہوئے کہ میرا کیا انجام ہونے والا ہے میں ایسی حرکت دوبارہ نہ کر سکا۔

میں برابر مذہبی اصولوں کی تعمیل کرتا رہا اور اب تک یہی یقین کرتا رہا کہ جن حقائق پر میں عمل پیرا ہوں اُن ہی میں صداقت ہے، جب مجھ پر یہ واقعہ گذرا جس کو میں اب خوب اچھی طرح سمجھ گیا ہوں لیکن اس وقت صرف حیرت انگیز اور باعث تعجب معلوم ہوتا تھا۔

میں ایک جاہل کاشتکار اور حاجی کی گفتگو سن رہا تھا جس کے موضوع خدا، اعتقاد، زندگی اور نجات تھے۔ اسی وقت خود مجھ پر علم عقیدہ کا انکشاف ہوا۔ میں ان لوگوں کے نزدیک آگیا۔ زندگی اور عقیدہ کے متعلق ان کی گفتگو سن کر میں حقیقت کو سمجھ گیا یہی حال اُس وقت ہوا جبکہ میں نے ایماندار لوگوں کی سوانح عمریاں پڑھیں۔ ان ہی کتابوں سے مجھ کو دلچسپی بھی تھی۔ معجزات کو نظر انداز کرتے ہوئے اور اُن کو محض خیالات ظاہر کرنے والی کہانیوں سے زیادہ وقعت نہ دیتے ہوئے بھی اس مطالعہ سے زندگی کا مفہوم صاف ظاہر ہوگیا۔ اس میں میکاریس اعظم، طساریوتیج جوسفا کی سوانح حیات تھیں۔ گوتم بدھ کی کہانی تھی اور اُس کنویں والے مسافر اور اُس فقیر کی بھی کہانیاں تھیں جس نے سونا پایا تھا۔ اس میں شہیدوں کے قصے تھے ان سب سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ موت سے زندگی الگ نہیں ہے اور ان میں جاہلوں اور نادانوں کی بھی کہانیاں تھیں اور کچھ ایسے لوگوں کے بھی قصے تھے جو کہ مسیحؑ کی مذہبی تعلیم سے قطعی ناواقف تھے لیکن پھر بھی بچ گئے تھے۔

لیکن جیسے ہی میں پڑھے لکھے قابل معتقدوں سے ملا اور میں نے ان کی کتابوں کا مطالعہ کیا تو میں خود شبہ، بے اطمینانی اور پریشان کن بحث میں مبتلا ہوگیا۔ میں نے محسوس کیا کہ جتنی زیادہ میں ان لوگوں کی تقاریر کے معنی سمجھنے کی کوشش کرتا تھا اتنا ہی میں حقیقت سے دور ہوتا جاتا تھا۔ اور ایک عمیق غار کے قریب پہنچ گیا تھا۔ مجھ کو اکثر کسانوں پر اور اُن کی جہالت اور لاعلمی پر رشک ہوتا تھا۔ مذہب کے وہ اصول جو میرے نزدیک فضول و لچر تھے ان کے لیے اس میں شک و شبہ کی بھی گنجائش نہ تھی میں جو کہ ایک افسردہ انسان تھا

یہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ کذب و صداقت نہایت ہی خوبصورتی کے ساتھ ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور یہ کہ میں اس حالت کو کسی صورت سے بھی ماننے کے لیے تیار نہ ہو سکتا تھا۔

اسی کشمکش و پیچ میں میرے تین سال گذر گئے۔ پہلے پہل جب کہ میں کچھ بھی نہ سمجھتا تھا میں یہ کہا کرتا تھا کہ "یہ میرا ہی قصور ہے، میں خود گنہگار ہوں" لیکن میں نے حقیقت کی جتنی تحقیق کی اتنی ہی یہ بات واضح ہو گئی کہ میں بہت سی باتیں محض اس لیے نہ سمجھ سکا کہ میں اُن کے سمجھنے کے قابل نہ تھا اور جو بغیر خود سے جھوٹ بولے سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔

شکوک اور مصیبتیں ہونے کے باوجود میں پکا ایماندار ہی بنا رہا لیکن زندگی کے متعلق سوالات برابر پیدا ہوتے رہے جن کو طے کرنا ضروری تھا اور ان سوالات کے جواب جو مذہب سے ملتے تھے وہ میرے ان اعتقادات کے بالکل برعکس تھے جن پر میرا دارومدار تھا۔ انہوں نے مجھے اس بات پر مجبور کر دیا کہ میں اس بات کا قائل ہو جاؤں کہ پکی ایمانداری قطعی ناممکن ہے۔ یہ سوالات یوں تھے۔ پہلا سوال مشرقی کٹر جماعت کا تعلق دوسری جماعتوں سے اور کیتھولک کا تعلق فرقہ وارانہ جماعت سے۔ اس وقت مذہبی دلچسپی کی وجہ سے مجھے مختلف قسم کے معتقد لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا مثلاً کیتھولک، پروٹسٹنٹ اور پرانے معتقد وغیرہ دوسرے لوگ، اور میں بہت سے ایسے لوگوں سے ملا جن کا اخلاق نہایت ہی اعلیٰ و وسیع تھا اور وہ صحیح معنوں میں مذہبی تھے۔ میں اُن کا بھائی بن کر رہنا چاہتا تھا لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ تعلیم جس نے اس بات کا وعدہ بلکہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ سب کو ایک اعتقاد کا پیرو اور محبت کا شیدا بنا دیگی اس کے بہترین پیروکاروں کی وہی تعلیم مجھے یہ تبلاتی تھی کہ یہ سب ایک بے معنی اور بے لطف زندگی بسر کر رہے ہیں، یہ ایک شیطانی وسوسہ ہے اور ہم میں خود اصلی صداقت موجود ہے۔ اور میں نے معلوم کیا کہ جن لوگوں کے اعتقاد اس قسم کے نہ تھے ان کو کٹر مذہبی لوگ کافر و مرتد تصور کرتے تھے بالکل اسی طرح جس طرح کیتھولک مذہب والے کٹر ایمانداروں کو کافر و گمراہ خیال کرتے ہیں۔ اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ کٹر مذہبی لوگ (جو اس بات کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں) ان لوگوں کو بری بلکہ مخالفانہ نظر سے دیکھتے ہیں جو اپنے اعتقاد ان کی طرح ظاہری الفاظ و استعاروں میں ظاہر نہ کرتے ہوں اور یہ فطری بات ہے کہ سب سے پہلے اس بات کا یقین

ہی کہ دوسرا غلطی پر ہے، ہیں صحیح راستہ پر ہوں سب سے زیادہ تکلیف دہ بات ہے جو کہ ایک شخص کسی دوسرے کے بارے میں کہہ سکتا ہے اور دوسرے یہ کہ وہ شخص جو اپنے بچوں اور بھائیوں سے محبت کرتا ہے وہ ان لوگوں کا مخالف ہو جائیگا جو کہ اس کے بچوں اور بھائیوں کے اعتقاد کو متزلزل کرینگے۔ اور میرے نزدیک جس کا نظریہ یہ تھا کہ حقیقت محبت ہی ہیں ہے اعتقاد خود اسی چیز کو ضائع و برباد کر رہا ہے جو کہ اس کو پیدا کرنا چاہیے۔

جس طرح مختلف مذاہب کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ ایسا ہی نفرت انگیز اور خود اعتمادی کی طرح کا برتاؤ کرتے ہیں اس قسم کے طور طریق کی غلطی صاف ظاہر تھی میں نے اس مسئلہ پر بڑا ہی غور کیا اور اس کے متعلق جو کچھ مجھے مل سکا میں نے سب پڑھا اور جس جس سے ہو سکا میں نے اُس سے مشورہ بھی کیا اور اس کی رائے بھی لی لیکن کسی نے بھی اس کو واضح نہ کیا۔ اور نہ کسی کے جواب سے مجھے تسکین ہوئی۔ میں ان بزرگوں اور درویشوں کے پاس جو کہ سخت قسم کے دستوروں کے پابند تھے گیا اور ان سے دریافت کیا لیکن کسی نے بھی اس مسئلہ کو مجھے سمجھانے کی کوشش نہیں کی سوائے ایک شخص کے جس نے اس کو اچھی طرح واضح کر دیا اور اس کو اس طرح واضح کیا کہ پھر مجھے کبھی کسی سے اس کے متعلق اور زیادہ معلوم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

میں نے ان سے دریافت کیا کہ ہم کو ان خاص اصولوں پر کیوں نہ متحد ہونا چاہیے۔ جن کو ہم سب تسلیم کر سکتے ہیں اور باقی کو ہر ایک کے لیے چھوڑ دیں کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق جیسا چاہے طے کرے۔ میرا معلم روحانی میرا ہم خیال ہو گیا لیکن اس نے مجھ سے کہا کہ ایسے مراعات روحانی حاکموں کے لیے باعث بدنامی ہونگے کہ وہ آباو اجداد کے اصولوں کو ترک کر دیں اور اس سے تفرقہ پڑجانے کا خوف ہے اس لیے روحانی حاکم کا یہ فرض ہے کہ وہ اس کی اصلیت یعنی روسی و یونانی پکّے مذہبی عقیدہ کی حفاظت کریں جس کو ہم نے اپنے ابا و اجداد سے حاصل کیا ہے۔

میں یہ بھی سمجھ گیا کہ مجھے اعتقاد یعنی قوت حیات کی جستجو ہے اور ان کو ایسے اعلیٰ و بہترین طریقہ کی تلاش ہے جس سے وہ لوگوں کے سامنے انسانی احسانات کو پورا کر سکیں اور میں دیکھتا تھا کہ مذہب کے پردہ میں کیا کیا کیا جا رہا ہے اور اس سے خائف تھا اور میں پکّی ایمانداری سے تقریباً بالکل منحرف ہو گیا۔

مذہبی جماعت کا زندگی کے سوال سے دوسرا تعلق جنگ و قتل کے متعلق تھا۔

اس وقت روس میں جنگ ہو رہی تھی اور روسی مذہبی محبت کے جوش میں اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کرنے لگے۔ یہ غیر ممکن تھا کہ اس کا خیال نہ کیا جاتا اور یہ نہ سمجھا جاتا کہ جان لینا بُرا ہے کیونکہ یہ ہر اعتقاد کے اولین اصولوں ہی کے خلاف ہے اس پر بھی گرجا گھروں میں اپنی فتح و کامرانی کی دعائیں مانگتے تھے مذہب کے اصولوں کا پرچار کرنے والے اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ جان لینا بھی اعتقاد ہی کا نتیجہ ہے میں نے جنگ کے دوران کے علاوہ جنگ کے بعد کی گڑبڑی کے دوران میں بھی قتل و خون دیکھا اور میں نے یہ دیکھا کہ مذہب کی ارفع و اعلیٰ ہستیاں معلم اور معمولی و اعلیٰ اصولوں پر عمل کرنے والے درویش، مجبور اور بے قصور و بیگناہ نوجوانوں کے قتل کو بہتر تصور کرتے تھے اور میں نے ان تمام باتوں پر غور کیا جو مسیحی مذہب کے شیدائیوں نے کی تھیں اور میں اُن سے خائف تھا۔

میرے شکوک رفع ہو گئے اور مجھے کامل یقین ہو گیا کہ جس مذہب میں میں داخل ہوا ہوں اُس کی ہر ایک بات درست نہ تھی۔ پہلے تو مجھ کو یہی کہنا چاہیے کہ وہ سب جھوٹ تھا لیکن ابھی میں ایسا نہ کہہ سکتا تھا کیونکہ مجھے ان حقائق کا احساس تھا جن کی وجہ سے میں اب تک زندہ رہا لیکن میرے لیے اس میں تو شک و شبہ کی گنجائش نہ رہی کہ اس کا بیشتر حصہ غلط ہے۔ حالانکہ کسانوں میں ان لغویات کی کمی تھی جن سے مجھے نفرت تھی پھر بھی میں دیکھتا تھا کہ ان کے اعتقاد میں بھی کذب و صداقت ملے ہوئے ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کذب و صداقت آئے کہاں سے؟ جھوٹ اور سچ دونوں احادیث اور صحیح روایات انجیل میں پائے جاتے ہیں۔ جھوٹ اور سچ دونوں ہم کو مذہب سے ملے ہیں۔

چاہے مجھ کو یہ پسند ہو یا ناپسند لیکن میں ان روایات اور کتابوں کے مطالعہ اور تحقیق کرنے پر مجبور تھا۔ جن کی جانچ کرنے سے میں ابھی تک ڈرتا تھا۔

اب میں اس علم الٰہی کی جانچ کرنے پر تلا ہوا تھا جس کو میں نے کبھی نفرت سے رد کر دیا تھا جس پر مذہبی اصولوں کی بنیاد ہے یا کم از کم زندگی کے مفہوم کا وہ علم جو میں نے معلوم کیا تھا اسی سے وابستہ ہے مجھے ہر بات کی تشریح و تفسیر نہیں معلوم کرنا چاہیے۔ میں جانتا ہوں کہ ہر ایک چیز کی تشریح اس کے آغاز کی طرح بے پایانی میں مضمر ہے لیکن میں یہاں تک معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آخر کار مجھ کو ایسی شے معلوم ہو جس کی تشریح

ہی نہ ہو سکتی ہو۔ ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔ اس لیے نہیں کہ میرے دلائل کے مطالبے غلط ہیں (وہ ٹھیک ہیں اوران کے علاوہ میں کوئی دوسری بات سمجھ ہی نہ سکتا تھا) بلکہ اس لیے کہ میں اپنے ذہن کی رسائی جانتا ہوں میں اس طرح سمجھنا چاہتا ہوں کہ جو بات غیر مشرح ہو وہ میرے سامنے بالکل صاف ہو جائے کہ ناقعی وہ غیر مشرح ہے وہ اس طرح ظاہر نہ ہو کہ میں ظاہری تکلف میں اس پر یقین کرنے لگوں۔ مجھے حقیقت و مجاز میں تمیز ہونی چاہیے تاکہ میں ان کو ایک دوسرے سے الگ کر سکوں میں یہ کام شروع کرنے والا ہوں کہ یہ معلوم کروں کہ اس تعلیم میں کتنا کذب اور کتنی صداقت ہے اور دیکھنا یہ ہے کہ میں پھر کن نتائج پر پہنچتا ہوں۔ یہ سب اس کام کے جز ہونگے اگر ان کی کوئی قدر و قیمت ہے اور اگر کوئی شخص ان کو معلوم کرنا چاہتا ہے تو کسی نہ کسی دن ان کی ضرور اشاعت کی جائیگی"۔

جگر پارے

(از حضرتِ جگر مرادآبادی)

پھرتے ہیں دور دور بہت شادماں سی کیا
واقف نہیں ابھی وہ غمِ ناگہاں سی کیا

جب تم نہیں تو فائدہ آہ و فغاں سی کیا
روئیں لپٹ لپٹ کے دلِ ناتواں سی کیا

پردہ نہیں تو لطفِ غمِ جاوداں سی کیا
پردہ اُٹھائے دستِ طلب درمیاں سی کیا

دل ہی نہیں تو کامِ غمِ جاوداں سی کیا
غم ہی نہیں تو واسطہ عمرِ رواں سی کیا

غم کیا ملا کہ دولتِ کونین مل گئی
ہٹتے ہیں اب یہ ہاتھ دلِ ناتواں سی کیا

بنجاؤ فرق تا بقدم اپنی خود صدا
شرح و بیانِ عشق نگاہ و زباں سے کیا

چہرہ بھی زرد زرد نظر بھی اُداس اُداس
یہ حال ہو تو فائدہ ضبطِ فغاں سی کیا

سر دادگانِ عشق کہاں دردِ سر کہاں
سر ہی نہیں تو کام سرِ آستاں سی کیا

صیاد و برق ہی کی توجہ نہیں تو پھر
مجھ کو حصول خار و خسِ آشیاں سی کیا

پیشِ نگاہِ شوق ہے خود حُسن بے جہت
اب جی لگائیں جلوۂ حسنِ بتاں سی کیا

جان و جہاں نثار کر از اول قدم
اے بوالہوس معاملہ جان و جہاں سی کیا

مانا غرورِ حُسن بھی اک چیز ہے مگر
اتنے بھی دور دور ترے آستاں سے کیا

غم شاد شاد حُسن سراپا حزیں حزیں
اب یہ نظر ملے نظرِ عاشقاں سی کیا

سُن سُن کے طعن بے اثری ہر نفس کے ساتھ
کھائیں فریب لذتِ دردِ نہاں سے کیا

یہ کوچۂ حبیب ہے۔ دیر و حرم نہیں
لیجائے کوئی جان سلامت یہاں سی کیا

جس سے ہے جو معاملہ وہ خود ہی جان لے
مجھ کو غرض حسابِ دلِ دوستاں سی کیا

لذت کشِ جفائے ستمہائے دوست ہوں
دل سیر ہو سکے ستمِ دو جہاں سی کیا

خود حُسن کی زبان ہو اور داستانِ عشق
اپنا بیان درد، خود اپنی زباں سی کیا

پوچھے یہ کوئی اُس بُت ظاہر فریب سے
مجھ سے نہیں تو اُنس مری داستاں سی کیا

پابندگانِ عشق ہیں آزادگانِ عشق
نسبت ہی اُن کو واسطۂ درمیاں سی کیا

مُطرب مزاج دانِ محبت نہیں جگر
نغمہ یہ اُس نے چھیڑ دیا درمیاں سی کیا

(غیر مطبوعہ)

اِسلامی نِظام

(۲)

اپریل کے رسالہ جامعہ میں عنوان بالا سے میرا جو مضمون شائع ہوا ہے اُس کے متعلق بعض لوگوں نے زبانی اور بعض لوگوں نے بذریعہ تحریر.. مختلف قسم کے سوالات کیے۔ جن سے میں نے اندازہ کیا کہ وہ توضیح طلب ہے۔ اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ اُن میں سے معقول سوالات کو چُن کر ترتیب کے ساتھ مع اُن کے جوابات کے لکھوں تاکہ مسئلہ کی حقیقت واضح ہو جائے۔

(۱)

س۔ تم کہتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں تھیں۔ ایک پیغمبری جس کے ذریعے سے قرآن ملا۔ دوسری امامت یعنی ملّت کی مرکزیت جو آپ کی ذات سے قائم ہوئی۔ اتباع قرآن کی شرعی حیثیت مسلم ہے گر مرکز تو ایک دنیاوی ادارہ ہے۔ اگر نہ ہو جیسا کہ آج کل ہے تو اس سے مسلمانوں کے اسلام میں کیا خرابی آتی ہے۔

ج۔ بلا مرکز کے ملّت کے مقاصد متعین نہیں ہوتے اور نہ اس میں اجتماعی عمل صالح کی حرکت پیدا ہوتی۔ بلکہ وہ بیابان کے ریگ کے ذروں کی طرح منتشر رہتی ہے جو ہر ہوا اور آندھی کے ساتھ جدھر کی بھی ہو اُڑتی رہتی ہے۔ قرآن امت کا ایمان ہے اور مرکز اس کا اجتماعی عمل۔

قرآن میں اللہ و رسول و اولوالامر کی اطاعت کے احکام جو مسلمانوں کو دیے گیے ہیں وہ اس بات کی دلیل ہیں کہ مرکز کی حیثیت بھی شرعی ہے اور وہ محض دنیاوی ادارہ نہیں ہے۔ ملّت امام کے بغیر ایسی ہی ہے جیسے جسم سر کے بغیر جس کا انجام ہلاکت ہے۔

(۲)

س۔ اللہ و رسول و اولوالامر کی اطاعت بلا مرکز کے بھی اس طرح ہو سکتی ہے کہ قرآن و سنت و علماء کی اطاعت کی جائے جیسی کہ آج کل ہم کر رہے ہیں۔

ج۔ اور اس کی سزا بھی بھگت رہے ہیں کہ باوجود اپنی کثرت تعداد کے اور باوجود عالم میں اپنی زبردست جغرافی حیثیت کے اور باوجود اس کے کہ اسلام میں تمام تر بہادر اور جنگ آور قومیں داخل ہیں جن کے پس پشت عظیم الشان تاریخیں ہیں پھر بھی دوسروں سے کمزور اور ذلیل و خوار ہیں بلکہ اُمت کا بیشتر حصہ شرک اور کفر کا محکوم اور غلام ہے جو اسلام کا جزو صالح نہیں کہا جا سکتا۔ یہ نتیجہ ہے زندہ مرکز نہ ہونے کا۔ اللہ و رسول کی اطاعت کے لیے قرآن و حدیث کو لے لیا کہ جس طرح چاہیں اُن پر عمل کریں یا نہ بھی عمل کریں تو اطاعت کا مطالبہ کرنے والا کون ہے۔ رہے علماء تو اُن کا حلقۂ اثر محدود ہوتا ہے جس سے مرکزیت نہیں پیدا ہو سکتی۔ علاوہ بریں وہ خود اکثر آپس کی مخالفتوں کی وجہ سے ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق میں مبتلا رہتے ہیں اور اُمت میں اور زیادہ تفریق و انتشار کا موجب ہوتے ہیں۔ اللہ و رسول کی اطاعت صرف زندہ امام ہی کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے جو ضروریات زمانہ کا لحاظ رکھتے ہوئے قرآن کی روشنی میں اُمت کو اجتماعی مقاصد کی طرف لے چلے۔

(۳)

س۔ تم نے اللہ و رسول کا مفہوم امام وقت ثابت کیا ہے لیکن علماء اس کے معنے کتاب و سنت کے سمجھتے ہیں۔ کیا اللہ کے لیے یہ آسان نہ تھا کہ وہ ان دو لفظوں کے بجائے صرف ایک لفظ امام کہہ دیتا تاکہ یہ غلط فہمی نہ ہوتی۔

ج۔ قرآنی الفاظ مقصود کے مطابق ہوتے ہیں۔ صرف امام کا لفظ کہنے سے اسلامی مرکز کا صحیح مفہوم نہیں ادا ہو سکتا تھا۔ کیونکہ امام کہتے ہیں پیشرو اور راہبر کو خواہ کسی قسم کا ہو۔ لغوی معنی کے لحاظ سے آج ہٹلر بھی جرمن قوم کا امام ہے لیکن اللہ کو بیان کرنا مقصود ہے اس امام کا جو قرآنی احکام کو نافذ کرنے والا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب امامت کا چلانے والا ہو۔ یہ مفہوم صرف اللہ و رسول ہی کے لفظ سے ادا ہو سکتا تھا جس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اسی کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔

(۴)

س۔ پھر بھی یہ بات حل طلب رہی کہ علماء نے اللہ و رسول سے مرکز ملت کیوں نہ سمجھا۔

ج ۔ میں نے اپنے مضمون میں ایسے مفسروں کے نام لکھے ہیں جنھوں نے اللہ ورسول سے امام وقت ہی سمجھا ہے بے شک عرصۂ دراز سے استبداد کے تسلط اور جامد تقلید نے علماء کے زاویہائے نگاہ بدل دیے ہیں ۔ وہ دین اسی کو سمجھتے ہیں کہ کتاب وسنت بلکہ ائمہ کی فقہ پر عمل کرتے رہیں ۔ حالانکہ اس سے اجتماعی زندگی نہیں پیدا ہوسکتی ۔ حیات ملی کے لیے قرآن کے ساتھ زندہ امام کی اطاعت بھی ضروری ہے ۔

(۵)

ایک سُنّی مولانا نے کہا کہ کیا ضمانت ہے کہ امام وقت غلطی نہ کریگا ۔

ج ۔ کیا آپ کے عقیدہ کے مطابق حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما معصوم تھے ؟ اگر نہیں تھے تو ان کو خلیفۂ رسول بناتے وقت یہ سوال اُمت نے کیوں نہیں اُٹھایا ؟

گر یہ جواب الزامی ہے ۔ تحقیقی جواب یہ ہے کہ غلط اور صحیح کے جو معنی عرف عام میں ہیں کہ جو حقیقت کے خلاف ہو وہ غلط ہے اور جو حقیقت کے مطابق ہو وہ صحیح ہے وہ نظام حکومت اور قانون عدالت میں نہیں ہیں ۔ یہاں غلط وہ ہے جو بے ضابطہ ہو اور صحیح وہ ہے جو باضابطہ ہو ۔ ہمارے اصولیین نے بھی یہی لکھا ہے کہ قاضی اگر کسی مقدمہ کا فیصلہ اسلامی توانین وضوابط کے مطابق کردے تو چاہے وہ حقیقت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو شرعاً نافذ ہوگا ۔ بلکہ بعض نے تو کہا ہے کہ "القضاء نافذ شرعاً و دیانۃً" یعنی نہ صرف شرعاً بلکہ اللہ کے نزدیک بھی ۔

ظاہر ہے کہ امام امت کا قابل ترین فرد یا بہترین شخصوں میں سے ایک ہوگا جس کے ساتھ قرآن کی روشنی اور مشورہ کے لیے منتخب جماعت بھی ہوگی ۔ پھر ساری اُمت کے ارباب علم وعقل بھی اصلاح کا خیال رکھینگے ۔ ان سب کے بعد بے ضابطگی تو ہو ہی نہیں سکتی اور عرفی غلطی کا بھی خطرہ کم رہ جاتا ہے ۔

علاوہ بریں غلطی سے اس قدر خوف کیوں ہے ۔ فطرت نے اس کو انسان کی سرشت میں اس واسطے رکھا ہے کہ وہ زیادہ چوکنا ہوشیار اور خبردار رہے ۔ اس لیے وہ انسان کی ترقی میں معاون ہے اور قصداً نہ ہو تو اس سے جس قدر نقصان ہوجاتا ہے بعض حالتوں میں اس سے زیادہ نفع پہنچتا ہے ۔ اور غلطیاں کرکر کے ہی لوگ بہت کچھ سیکھتے ہیں ۔

(۶)

ایک شیعہ بزرگ نے فرمایا کہ مسئلہ امامت میں تم اسی نقطہ پر آ گئے جو ہماری جماعت کا ہے۔ مگر یہ واضح نہیں ہوا کہ امام منصوص ہونا چاہیے جیسا کہ شیعہ کا عقیدہ ہے یا جمہوری جیسا کہ سُنی کہتے ہیں۔

ج۔ میں کسی فرقہ بندی کا قائل نہیں۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے بلا خیال شیعہ یا سُنّی کے خالص قرآنی تعلیم کو لکھا ہے۔ میں یہی سمجھ سکا ہوں کہ قرآن جو تمام مسلمانوں کی دینی کتاب ہے اور سب کے سب بلا استثناء اس پر ایمان رکھتے ہیں اس کی روشنی میں حسب اقتضائے زمانہ وضرورت ملّت کو چلائے اور ان سے اطاعت لینے کے لیے زندہ امام ناگزیر ہے۔ اور بلا اس کے امت کی اجتماعی زندگی کی کوئی صورت نہیں۔

رہا امام منصوص کا عقیدہ تو اس کا ثبوت قرآن سے نہیں ملتا۔ اس لیے میں امام متفق علیہ کا قائل ہوں یعنی جس پر جمہور امت اتفاق کرلے۔ شرط یہی ہے کہ وہ قرآن کا تابع ہو اور شوریٰ سے کام کرے۔

(۷)

اُنہوں نے پھر سوال کیا کہ متغلب بھی امام ہو سکتا ہے؟ اور خلفاء بنی اُمیہ کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟

ج۔ میں کہہ چکا ہوں کہ امام وہ ہے کہ جو قرآن اور اُمت کے شوریٰ کے مطابق کام کرے۔ تغلب بھی اُمت کی شرکت ہی سے ہوتا ہے۔ اس لیے متغلب بھی امام ہو سکتا ہے بشرطیکہ ملّت کا اس پر اتفاق ہو جائے

خلفاء بنی اُمیہ میں استبداد تھا اور وہ مسلمانوں کے بیت المال کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھتے تھے اس لیے وہ دنیاوی بادشاہ تھے نہ کہ امام۔ بجز حضرت عمر بن عبدالعزیز کے۔

(۸)

س۔ کیا ایک زمانہ میں کئی امام ہو سکتے ہیں؟

ج۔ ہرگز نہیں۔ کیونکہ یہ قرآن کے خلاف ہے نیز اس سے ملّت کی وحدت فنا ہو جائیگی۔ ہاں امام وقت کے ماتحت مختلف اقوام وممالک میں ہزاروں امام بیک وقت ہو سکتے ہیں۔ یہ قرآنی اصطلاح کے مطابق اولوالامر کہے جائینگے۔

(۹)

س۔ موجودہ زمانہ میں امامت نصب کرنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

ج - آج کل ملت کا صرف ۱/۱۰ حصہ آزاد ہے اور ۹/۱۰ غیروں کا محکوم ۔نصب امام آزاد مسلم قوموں کا فریضہ ہے اور خوشی کی بات ہے کہ ان کا رُخ بھی اس طرف معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرکز قائم کریں ۔

(۱۰)

س -ہم ہندوستانی مسلمانوں کو اس صیغہ میں کیا کرنا چاہیے ۔اور امام نہ رکھنے کی وجہ سے تم ہم کو مسلمان بھی سمجھتے ہو یا نہیں ؟

ج - یہ تو ظاہر ہے کہ ہم محکوم ہیں اور ہمارے اوپر وہ قوانین نافذ ہیں جو حکمراں قوم نے بنائے ہیں ۔ایسی حالت میں ہم یہی کر سکتے ہیں کہ باہمی اختلافات کو چھوڑ کر قرآن کی طرف آئیں اور وحدت عمل پیدا کریں ۔ اور چاہے ہم میں کتنی ہی جماعتیں اور جمعیتیں ہوں لیکن ایک مرکزی انجمن جو آئین کے ماتحت ہو متفقہ طور پر تمام ملت کے لیے ضروری ہے جس کا رکن ہر ہندی مسلم کو ہونا چاہیے ۔ملت کے اس باہمی ربط سے آئندہ کے لیے راستے کھلینگے ۔

باقی رہا ہندوستان کے مسلمانوں کے اسلام یا کفر کا سوال تو میں اس قسم کے فتوؤں کو ناروا جرأت سمجھتا ہوں ۔میرے نزدیک یہاں جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہے وہ مسلمان ہے اور جو نہ کہے وہ نہیں ہے میں خود بھی ہندوستان ہی کی اپنے آپ کو مسلمان کہنے والی جماعت کا فرد ہوں ۔جو سب کا حال ہو وہی میرا حال ہے ۔

وَمَا اَنَا اِلَّا مِنْ غَزِیَّۃ ۔اِنْ غَوَتْ
غَوَیْتُ ۔وَاِنْ تَرْشُدْ غَزِیَّۃُ اَرْشُدِ

روزِ جزا

(ایک ڈرامہ)

پہلا ایکٹ

[عدالتِ عالیہ کا اجلاس ہو رہا ہے۔ ڈائس پر پانچوں جج ہیں۔ بیچ میں ولورا ہے۔ اس کے دائیں طرف سانکو اور ترزادا ہیں اور بائیں طرف مورسی اور سلاترسکی۔ ڈائس کے دائیں جانب سرکاری وکیل ولف گینگ بھوری اور اُس کے نائب مالینو اور ایک کلرک ہے۔ بائیں جانب ملزم اور اُن کے وکیل ہیں۔ پہلی قطار میں ستامبلو، مینچ اور بستاطی ہیں۔ دوسری قطار میں جارج خینو، لاڈیاکمان۔ ان کے دونوں طرف سنتری کھڑے ہیں۔ تیسری قطار میں دو سنتریوں کے درمیان کرٹ شنڈر ہے۔ کمرہ کے ہر دروازہ پر ایک مسلح سپاہی کھڑا ہے۔ کرسیوں پر گواہ اور تماشائی بیٹھے ہیں۔

پردہ اُٹھنے پر عدالت میں ہلچل سی دکھائی دیتی ہے۔ جارج کھڑا چلا رہا ہے۔ اس کا وکیل ستامبلو کھڑے ہو کر اس کو بٹھانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ رشمیر اور گھیریا دونوں سنتری بھی اسے خاموش کرا رہے ہیں۔ جج ولورا کھڑا ہو کر بار بار گھنٹی بجا رہا ہے۔ ادھر سرکاری وکیل مطالبہ کر رہا ہے کہ جارج کو چپ کرایا جائے۔ باقی لوگ جج، گواہ اور تماشائی ـــ حیرت اور دلچسپی کے ملے جلے جذبات سے یہ تماشا دیکھ رہے ہیں۔ صرف شنڈر ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اور گردن نیچی کیے خاموش بیٹھا ہے]

جارج :- میں مطالبہ کرتا ہوں کہ میری بات سُنی جائے۔ میں مطالبہ کرتا ہوں۔ اپنی بات سُنانے پر مجھے اصرار ہے۔ یہ میرا حق ہے اور میں اس کا مطالبہ کرتا ہوں۔ اگر میرے اس حق کو تسلیم نہ کیا گیا تو بھی اپنی بات بہرحال سُنا کر رہونگا۔ تم مجھے خاموش نہیں کر سکتے۔ سُنتے ہو خاموش نہیں کر سکتے۔ میں خاموش رہنے سے انکار کرتا ہوں۔

ستاملبو:۔ (ایک ساتھ) خبیثو چپ رہو۔ خدا کے لیے چپ رہو۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ بیٹھ جاؤ۔ اس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ تم اپنے آپ کو نقصان پہنچا رہے ہو اور کچھ نہیں۔ اچھا اب ایک عقلمند آدمی کی طرح بیٹھ جاؤ خدا کے لیے میری نصیحت پر عمل کرو۔

رشمیر:۔ (ایک ساتھ) چپ رہو، سُنتے ہو چُپ رہو اور بیٹھ جاؤ، خاموش۔

گھیرا:۔ (ایک ساتھ) اب بیٹھ بھی جاؤ۔ بیٹھو بھی۔ تم رخنہ اندازی پیدا کر رہے ہو۔

سرکاری وکیل:۔ (ایک ساتھ) یہ ناقابل برداشت ہے۔ میں مطالبہ کرتا ہوں کہ اسے یہاں سے ہٹا دیا جائے یہ عدالت کی توہین ہے۔

جج ولورا:۔ (ایک ساتھ اور گھنٹی بجا کر) میں حکم دیتا ہوں کہ بیٹھ جاؤ۔ ہم اس قسم کی حرکت کو برداشت نہیں کر سکتے سمجھتے ہو، اگر تم فوراً ان حرکات سے باز نہیں آؤ گے تو تمہیں عدالت سے باہر جانا پڑیگا۔ بٹھاؤ اس کو۔

(مگر شور وغل کے علاوہ کوئی لفظ ٹھیک سنائی نہیں دیتا۔ آخر جج ولورا اشاروں میں سنتریوں سے کہتا ہے کہ وہ قوت استعمال کریں۔ جارج کی کشمکش کے باوجود وہ اُسے بٹھا دیتے ہیں۔

جارج:۔ (ہانپتے ہوئے) کیا سمجھتے ہو تم نے مجھے خاموش کر دیا ہے۔ صرف بندوق مجھے خاموش کرا سکتی ہے یا وکورا سکی کے پستول کی گولی۔

سرکاری وکیل۔ (چلا کر) یور لارڈشپس۔ یہ ایک حملہ ہے۔ میں مطالبہ کرتا ہوں کہ اس کو تمیز سکھائی جائے

(اس وقت جج سلونزسکی، جج ولورا سے جواب بیٹھ گیا ہے آہستہ آہستہ کچھ کہتا ہے۔

ستاملبو بھی جارج کے کان میں کچھ کہہ رہا ہے)

جج ولورا:۔ (سرکاری وکیل سے) ایک منٹ، براہ مہربانی

(وہ دوسرے ججوں سے جلدی جلدی کچھ باتیں کرتا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ آپس میں کچھ اختلاف ہے۔ آخر کار جج ولورا کسی فیصلہ پر پہنچ کر گھنٹی بجاتا ہے۔ تماشائی خاموش ہو جاتے ہیں)

جج ولورا:۔ (جارج سے) خبیثو اگر تم کوئی بیان دینا چاہتے ہو تو عدالت سننے کے لیے تیار ہے۔

سرکاری وکیل :- یور لارڈشپ ! میں اس کے خلاف احتجاج ــــــ

(جج ولورا گھنٹی بجاتا ہے۔ سرکاری وکیل خاموش ہو جاتا ہے)

جج ولورا :- (جارج سے) مگر یاد رکھو کہ تمیز سے بیان دینا ہوگا۔ اپنی ہر حرکت میں ادب اور تہذیب ملحوظ رکھو۔

جارج :- میں ایسا ہی کرونگا، یور لارڈشپ۔

جج ولورا :- اچھا شروع کرو

جارج :- یور آنریبل لارڈشپس۔ ایک مرتبہ میں پھر کہتا ہوں کہ اس تمام کارروائی کو ختم کیجیے۔

جج ولورا :- یہ سوال تو پیدا ہی نہیں ہوتا۔ تم پر ایک بڑا خطرناک الزام ہے۔ عدالت عالیہ کا فرض ہے کہ شہادت سننے کے بعد فیصلہ کرے کہ تم مجرم ہو یا نہیں۔

جارج :- شہادت کوئی نہیں۔ سوائے اس کے ــــــ

جج ولورا :- (جلدی سے) بس۔ کیا تم کچھ اور کہنا چاہتے ہو۔

جارج :- جی ہاں یور لارڈشپ۔ مجھے اس عدالت کی ہیئت ترکیبی پر اعتراض ہے۔

جج ولورا :- اس بات کی بھی اجازت نہیں ہے۔ یہ کہیں قاعدہ نہیں کہ ملزم اپنے مقدمہ میں خود ججوں کا انتخاب کریں۔

جارج :- مگر ملزم کو یہ حق ہے کہ وہ جج اس کا انصاف کریں جو بے تعصب ہوں۔

جج ولورا :- کیا تم اس عدالت کی بے تعصبی کو معرض بحث میں لانے کی جرأت کرتے ہو۔ خیال تو جو تم کہہ رہے ہو سوچ سمجھ کے کہو۔

جارج :- مجھے ڈاکٹر سانکو پر اعتراض ہے۔

جج سانکو :- (غصہ سے) میں اس قسم کی۔

جج ولورا :- (اس کا ہاتھ پکڑ کر) براہ مہربانی (جارج سے) ڈاکٹر سانکو کو سپریم کونسل نے عدالت عالیہ کا جج مقرر کیا ہے۔ ان پر اعتراض کرنے میں تمہارے کیا وجوہ ہیں۔

جج سانکو:۔ نہیں میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔

جج ولورا:۔ اس کو بولنے دیجیے۔

جارج:۔ کیا یہ کافی نہیں کہ یہ وہی آدمی ہے جس نے الگزنڈر کمان کو موت کی سزا دی تھی۔

جج ولورا:۔ اس مقدمہ اور الگزنڈر کمان کے مقدمہ میں کوئی تعلق نہیں۔

جارج:۔ معاف کیجیے یور لارڈ شپ۔ وہی قوتیں جنہوں نے الگزنڈر کمان کو تباہ کیا ہے مجھے بھی برباد کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اسی لیے ڈاکٹر سانکو کو جج مقرر کیا گیا ہے۔ وہ قومی حکومت کا آلۂ کار ہے۔ جلاد ہے جج نہیں۔

(لوگ تعجب سے بڑبڑاتے ہیں)

جج سانکو:۔ (اُٹھتے ہوئے) یہ ہے، لے جاؤ اس کو۔

سرکاری وکیل:۔ (غصہ سے) یور لارڈ شپ اب اس سے زیادہ ——

جج ولورا:۔ (جارج سے) یہ ناقابل برداشت ہے۔ یا تو اپنے الفاظ واپس لے لو ورنہ میں تمہارے یہاں سے لیجانے کا حکم دیتا ہوں۔

جارج:۔ میں نے سچی بات کہہ دی ہے۔ میں الفاظ واپس نہیں لیتا۔

جج ولورا:۔ لے جاؤ اس کو۔

(رشمیر اور گھیرا جارج کو اس کی جگہ سے کھینچتے ہیں اور بائیں طرف سے بزور باہر لے جاتے ہیں)

جارج۔ (دروازہ کے پاس سے چلاکر) خونی سانکو۔ لوگ اسی نام سے تمہیں پکارتے ہیں۔ سانکو جلّاد تم جلاد ہو جج نہیں۔

ستاملبو:۔ (کھڑے ہوکر) یور لارڈ شپ ——

(جج ایک دوسرے سے کچھ کہہ رہے ہیں اور اس کی طرف توجہ نہیں کرتے)

ستاملبو:۔ اگر یور لارڈ شپ ——

جج ولورا:۔ ڈاکٹر ستاملبو آپ بھی کوئی بیان دینا چاہتے ہیں۔ میں یہ تنبیہ کر دوں کہ ہم اس قسم کے اعتراضات سننے کے لیے ہرگز تیار نہیں

ستاملبو:۔ نہیں نہیں یور لارڈشپ بلکہ بالکل اس کے برعکس اگر مجھے کہنے کی اجازت ہو تو اس عدالت کی بے تعصبی اور انصاف مسلم ہے۔ میں تو یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یور لارڈشپس خینو کی اس بیہودہ حرکت کو نظر انداز کر کے ــــــ

لاڈیا:۔ (نفرت سے) کیا آپ اس کی طرف سے معافی مانگتے ہیں۔

ستاملبو:۔ ذرا ــــــ

لاڈیا:۔ اگر یور لارڈشپ مجھے اجازت دیں۔

جج ولورا:۔ بہت اچھا میڈم کمان لیکن یاد رکھو کہ ایسی باتیں۔

لاڈیا:۔ جی ہاں میں سمجھتی ہوں، میں جانتی ہوں کہ ہم ججوں کا انتخاب نہیں کر سکتے لیکن ہمیں اپنے وکیل منتخب کرنے کا تو حق ہے۔

جج ولورا:۔ تو کیا تمہیں ڈاکٹر ستاملبو پر اعتراض ہے۔ وہ ایک قابل ترین قانون داں ہیں۔

شاملبو:۔ شکریہ یور لارڈشپ

لاڈیا:۔ میں اس سے انکار نہیں کرتی۔ میں صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ ہم نے انہیں انتخاب نہیں۔

جج مورسی:۔ تمہیں اجازت دی گئی تھی کہ اپنا وکیل مقرر کر لو لیکن کوئی تمہاری پیروی کرنے پر راضی نہ ہوا۔

لاڈیا:۔ یور لارڈشپ، اس کے بہت سے سبب ہیں

جج مورسی: سبب۔ ہاں ہر چیز کے سبب ہوتے ہیں۔

(داد کے لیے اِدھر اُدھر دیکھتا ہے۔ بہت سے لوگ ہنستے ہیں۔ گھبرایا واپس آکر شنڈر کے پاس کھڑا ہو جاتا ہے)

لاڈیا:۔ ہم نے یور لارڈشپ کی خدمت میں درخواست دی تھی کہ ــــــ

جج ولورا:۔ ہاں میں اسی طرف آرہا تھا۔ درخواست میرے سامنے ہے۔ تم چاہتی ہو تمہارے بھائی

کو اجازت دی جائے کہ ——

لاڈیا:۔ جی ہاں یور لارڈشپ

جج ولورا:۔ کیا وہ یہاں موجود ہے

کنارڈ:۔ (کھڑے ہوکر) جی ہاں یور لارڈشپ۔

جج ولورا:۔ آگے آؤ۔

(کنارڈ آگے جاتا ہے)

جج ولورا: تمہارا نام ہے۔

کنارڈ:۔ کنارڈ نولی

جج ولورا:۔ تم لاڈیا کمان کے بھائی ہو۔

کنارڈ:۔ جی ہاں یور لارڈشپ۔

جج ولورا:۔ تم کہاں رہتے ہو۔

کنارڈ: سپرنگ فیلڈ

جج ولورا: کیا یہ امریکہ میں ہے۔

کنارڈ: جی ہاں یور لارڈشپ۔

جج ترزاوا: شمالی یا جنوبی امریکہ میں۔

کنارڈ: شمالی امریکہ میں، ریاستہائے متحدہ میں۔ یور لارڈشپ۔

جج ترزاوا: تمہیں صحیح اور مکمل جواب دینا چاہیے۔

کنارڈ: میں یور لارڈشپ سے معافی مانگتا ہوں۔

جج ولورا: تمہیں امریکہ میں رہتے کتنا عرصہ ہو گیا ہے۔

کنارڈ:۔ بارہ سال یور لارڈشپ۔ سولہ برس کی عمر میں اپنے والدین کے ساتھ وہاں چلا گیا تھا۔

جج ولورا: کیا تمہیں ریاستہائے متحدہ کے شہری حقوق حاصل ہیں۔

کنارڈ: (پروانہ راہداری دکھاتے ہوئے) جی ہاں یور لارڈشپ

جج سانکو: کیا تم نے اپنے وطن کو چھوڑ دیا ہے۔

کنارڈ: چھوڑ نہیں دیا۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں وکالت کرنے کے لیے۔

جج ولورا: تم وکیل ہو۔

کنارڈ: جی ہاں یور لارڈشپ۔ یونیورسٹی آف الی نوس اسکول کا گریجویٹ اور وہاں کے بار کا رکن

جج ترزاوا: کیا وہاں لوگوں کو درختوں کی شاخوں سے لٹکا دیتے ہیں جیسے کہ نیویارک کی گلیوں میں ہوتا ہے

کنارڈ۔ نیویارک میں نہیں یور لارڈشپ، صرف ——

جج ترزاوا: تردید مت کرو۔ میں تصویریں دیکھ چکا ہوں۔

جج ولورا:۔ کیا آپ اپنی بہن کی درخواست پر آئے ہیں۔

کنارڈ:۔ نہیں یور لارڈشپ، میں ——

لاڈیا :۔ ہمیں ایک دوسرے سے خط و کتابت کی اجازت ہی نہیں تھی۔

جج ولورا: ہماری گفتگو میں مداخلت نہ کرو۔

کنارڈ: دو ہفتے ہوئے میں نے شکاگو ٹریبون میں یہ خبر پڑھی تھی کہ اُسے گرفتار کر لیا گیا ہے اور اس پر مقدمہ چلیگا۔ مجھ سے جتنی جلدی ہو سکتا تھا یہاں پہنچا۔ میں کل رات آیا ہوں

جج مورسی: کیا آپ سمجھتے ہیں ہمارے یہاں وکیلوں کا قحط ہے؟

(قہقہہ)

کنارڈ:۔ جی نہیں یور لارڈشپ۔ میں جانتا ہوں کہ یہاں ایسے وکیل نہیں جو مجھ سے کہیں زیادہ قابل ہیں۔ میں اس لیے آیا ہوں کہ اپنی بہن کے قریب رہنا چاہتا تھا۔

جج ولورا: اور کیا آپ اس کی طرف سے پیروی بھی کرنا چاہتے ہیں۔

کنارڈ: جی ہاں اگر یور لارڈشپ اس کی اجازت دیں۔

جج ولورا: ڈاکٹر ستابو آپ کو کچھ اعتراض تو نہیں۔

ستاملبو: بالکل نہیں یور لارڈشپ مجھے بڑی مسرت ہے کہ اس نازک ذمہ داری میں میرا کوئی ساتھی بھی ہے۔

سرکاری وکیل:۔ یور لارڈشپ مجھے اعتراض ہے۔

جج ولورا: اور اس اعتراض کی وجہ کیا ہے ڈاکٹر تھوری؟

سرکاری وکیل: یہ حضرت غیر ملکی ہیں۔ ان کی یہاں کوئی حیثیت نہیں اس لیے کوئی حق نہیں کہ ان کی بات سُنی جائے۔

جج ولورا: ہم اس مسئلہ پر اچھی طرح سے بحث کر چکے ہیں اور فیصلہ کر چکے ہیں کہ ڈاکٹر نوبلی کو ملزموں کی طرف سے پیش ہونے کی اجازت دی جائے۔ ہم ملزموں کو پورا موقع دینا چاہتے ہیں کہ اس جرم سے اپنے آپ کو بری ثابت کر دیں۔ کوئی بدگمانی، تعصب اور ناانصافی نہیں ہونی چاہیے۔

کنارڈ: شکریہ یور لارڈشپ

جج سانکو: آپ نے ابھی کہا تھا کہ آپ نے اس مقدمہ کا حال امریکہ کے کسی اخبار میں پڑھا تھا۔

کنارڈ: جی ہاں یور لارڈشپ۔ اس مقدمہ کا امریکہ کے اخباروں میں بڑا چرچا ہے

جج سلوترسکی: ہاں ہمیں یہ بات معلوم ہے۔

جج سانکو: ہمارے معاملات میں بیرونی مداخلت پہلے ہی کافی ہو چکی ہے۔ کیا آپ جمہوری جماعت یا ایسی ہی کسی ترقی یافتہ جماعت کے رکن ہیں۔

کنارڈ:۔ جی نہیں یور لارڈشپ۔ میں کسی سیاسی جماعت کا رکن نہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کسی سیاسی مقصد کے لیے ــــــ

جج سانکو: یہ بات بھول نہ جائیگا کہ ہم خوش قسمتی سے اور خدا کے فضل و کرم سے اپنے عظیم قائد گریگوری دمینک کے ماتحت ہیں۔

(سنتری دائیں ہاتھ آگے بڑھا کر فوجی سلامی دیتے ہیں، حاضرین زندہ باد کہتے ہیں)

جج ولورا:۔ آپ کو اس امر میں محدود رہنا پڑیگا کہ ملزم واقعی اس جرم کے مرتکب ہیں یا نہیں جو ان پر

لگایا گیا ہے۔

کنارڈ: یور لارڈشپ میں سمجھتا ہوں۔

جج ولورا:۔ بہت اچھا۔

(کنارڈ ڈاکٹر ستاملبو کے قریب کرسی پر بیٹھنے کو ہے جو اس کے کلرک لشاطی نے خالی کی ہے)

سرکاری وکیل:۔ میں ان صاحب کو متنبہ کر دینا چاہتا ہوں کہ اُنھوں نے اپنی ذمہ داری پر ان قاتلوں کی حمایت کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ ہمارے یہاں کے لوگ بیرونی مداخلت کو گوارا نہیں کرتے۔ قومی حکومت قدرتاً ان صاحب کی حفاظت کریگی لیکن عوام کے غم و غصہ پر البتہ اسے کوئی اختیار نہیں۔

لاڈیا: اگر انھوں نے بھائی کو نقصان پہنچانے کی جرأت کی تو۔

کنارڈ:۔ (بہن کو اشارہ سے خاموش کرتے ہوئے، بھوری سے) جی ہاں میں نے اپنی ذمہ داری پر اس کام کو ہاتھ میں لیا ہے۔ آج صبح ہی امریکہ کے سفیر نے مجھے شرف ملاقات بخشا ہے اور یقین دلایا ہے کہ امریکن شہری ہونے کی حیثیت سے میں اپنے ملکی جھنڈے کی حفاظت میں ہوں۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ دو بڑے ملکوں کی زیر حفاظت ہوتے ہوئے مجھے کوئی خطرہ نہیں

جج مورسی۔ آپ یہاں شکاگو کی گلیوں سے زیادہ محفوظ ہیں۔

(داد کے لیے ادھر اُدھر دیکھتا ہے۔ لوگ مسکراتے ہیں کنارڈ ستاملبو کے قریب بیٹھ جاتا ہے)

ستاملبو:۔ (کھڑے ہو کر) یور لارڈشپ۔

جج ولورا:۔ ہاں

ستاملبو: ہم درخواست کرتے ہیں کہ جارج کو یہاں آنے کی اجازت دی جائے اسے اپنے خلاف شہادت سُننے کا حق ہے۔

سرکاری وکیل۔ قاتل کا کوئی حق نہیں ہوتا۔

کنارڈ:۔ امریکہ میں قیدی اُس وقت بے گناہ سمجھا جاتا ہے جب تک اس پر جرم ثابت نہیں ہو جاتا۔

جج سانکو:۔ جمہوری فلسفہ کے جذبات تک سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں۔

سرکاری وکیل: یہ ہمارے لیے کوئی نئی بات نہیں کہ امریکہ کے لوگ حکومت کے فن سے ناواقف ہیں

(کچھ لوگ تائیداً سر ہلاتے ہیں)

جج ولورا: ہم نہیں چاہتے کہ عدالت کی منظم کارروائی میں کسی قسم کی مداخلت ——

تاملبو: یور لارڈ شپ۔ اگر جارج کو آنے کی اجازت دی جائے تو ہم ذمہ لیتے ہیں کہ وہ ہرگز ——

جج ولورا:۔ بہت اچھا اس شرط پر (سنتریوں سے) اس کو اندر لے آؤ۔

گھیرا:۔ (سلام کرتے ہوئے) بہت خوب یور لارڈ شپ۔ (باہر چلا جاتا ہے)

جج ولورا: کیا شنڈر اُس وکیل سے مطمئن ہے جو اُس کی طرف سے پیروی کریگا۔

(معلوم ہوتا ہے شنڈر نے سُنا نہیں۔ سنتری گلو کا اُس کو ہلاتا ہے اور کھڑا کر دیتا ہے)

شنڈر کیا تم اپنے وکیل ڈاکٹر منچ سے مطمئن ہو۔

شنڈر:۔ (دیوانہ پن سے) کیا؟

(اس کا لب و لہجہ جرمنوں جیسا ہے۔ منچ اُٹھ کر اس کے پاس جاتا ہے)

منچ:۔ کرٹ کیا تمہاری طرف سے پیروی کرنے میں مجھ پر تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔

شنڈر:۔ اعتراض نہیں۔ کوئی اعتراض نہیں۔ (یہ کہہ کر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

جج ولورا:۔ اس کو کیا تکلیف ہے۔ کیا بیمار ہے۔

منچ: میرا خیال ہے کہ نشہ آور چیز کا اثر ہے۔ یور لارڈ شپ مجھے خوف ہے کہ —— (اپنا ماتھا کھجلاتا ہے)

جج ولورا:۔ کیا ڈاکٹروں نے اس کا معائنہ کیا ہے۔

منچ:۔ جی ہاں یور لارڈ شپ۔ طبی لحاظ سے تو اس میں کوئی خرابی نہیں۔ یہ کوئی نفسیاتی بات ہی۔

(رشمیرا اور گھیرا جارج کو عدالت میں لاتے ہیں اور منچ بیٹھ جاتا ہے)

جج ولورا:۔ خیتو کیا تم اس شرط سے واقف ہو جس کی بنا پر تمہیں عدالت میں آنے کی اجازت دی گئی ہے

جارج :- جی ہاں لارڈ شپ - جس طریقہ سے میں نے باتیں کی تھیں وہ درست نہیں تھا - آدمی کو قوانین کے مطابق کھیل کھیلنا چاہیے -

جج موسی - کیا تم اس کارروائی کو کھیل سمجھتے ہو -

جارج :- میں نے مثالاً عرض کیا ہے، یور لارڈ شپ -

جج ولورا :- تم کسی کھیل میں مصروف نہیں ہو خیتو - تم پر قتل کا مقدمہ چل رہا ہے - یہ بڑا نازک معاملہ ہے اور ہم تمہیں پیروی کا پورا موقع دے رہے ہیں - مگر اس کارروائی کا احترام اور عزت ضروری ہے،

جارج :- میں اس کی تائید کرتا ہوں یور لارڈ شپ -

جج ولورا :- ملزم کو اُس کی جگہ پر بٹھا دو - اب ڈاکٹر تھوری آپ شروع کر سکتے ہیں -

(جارج اور سنتری بیٹھ جاتے ہیں - کنارڈ اپنا تعارف جارج سے کراتا ہے - دونوں آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہیں -)

سرکاری وکیل :- یور لارڈ شپس - ہم یہاں اس وقت ملزمین جارج خیتو، لاڈیا کمان اور کرٹ شنڈر کی موت کا مطالبہ کرتے ہیں - ان کا جرم ہر ایک کو معلوم ہے - اوّل تو یہ لوگ جمہوری جماعت کے سرگرم رکن ہیں جسے دو سال ہوئے ہمارے قائد مسٹر پریزیڈنٹ گریگوری وینک کے ایک حکم سے خلاف قانون قرار دے دیا گیا ہے - جمہوری جماعت جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں ہمارے وطن عزیز کے دشمنوں پر مشتمل ہے -

کنارڈ :- میرا خیال تھا کہ سیاسی سوالات ——

جج ولورا :- براہ کرم خاموش رہیے - اچھا

سرکاری وکیل :- جناب امریکن شہری صاحب ہم یہاں مناظرہ کے لیے جمع نہیں ہوئے ہیں - ہم یہاں انصاف کا مطالبہ کرنے کے لیے آئے ہیں - ملزموں نے خوفناک سیاسی جرائم کا ارتکاب کیا ہے - یہ عورت کمان بدمعاش الگزنڈر کمان کی بیوی ہے جس کو بغاوت اور غداری کے الزام میں موت کی سزا ہو چکی ہے - الگزنڈر کمان کی خوفناک تجویزوں میں خیتو اس کا ساتھی رہا ہے اور اس کی بجائے جمہوری

جماعت کا سرغنہ مقرر ہوا ہے۔ شنڈر کرایہ کا ٹٹو اوران کا آلہ کار ہے۔ اِن تینوں نے تمہارے نیکدل قائد گریگوری ومنیک کے قتل کی سازش کی۔ انہیں کوئی ذاتی انتقام نہیں لینا تھا۔ بلکہ قومی حکومت کو کمزور اور بغاوت کا اشارہ کرنے کے لیے ایسا کیا گیا۔ اگران کی یہ سازش ناکام رہی ہے تو اس کی وجہ رعایا کی وفاداری اور اطاعت اور خدائے تعالیٰ کا فضل وکرم ہے جس نے قاتلوں کی گولی کا رُخ پھیر دیا اور ہمارے قائد کی جان بچالی یہفتوں تک مسٹر پریزیڈنٹ موت وحیات کے درمیان رہے ہیں۔ ان کے ڈاکٹر کا تازہ ترین بلیٹن یہ ہے :۔ (پڑھتا ہے)

"اگرچہ مسٹر پریزیڈنٹ کی حالت روبہ اصلاح ہے لیکن یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ خطرہ سے باہر ہیں۔ مگر خدا کے فضل سے ہمیں اُمید ہے کہ ہم اُنہیں وفاشعار اور متحدہ قوم کی سرپرستی کے لیے بچا سکینگے" نامراد قاتلوں کے لیے جن پر یہ ساری ذمہ داری ہے مدت کے علاوہ اور کوئی فیصلہ ہی نہیں ہو سکتا۔ ان پر مقدمہ چلانا ایک ایسی رعایت ہے جس کی اس فعل کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے ضرورت ہی نہ تھی لیکن ہماری مہذب اور منصف مزاج قومی حکومت بغیر مقدمہ کے ان کو کوئی سزا نہیں دیگی۔ اب ہم گواہوں کو پیش کرتے ہیں اور ہمیں کامل اعتماد ہے کہ اس خوفناک جرم کا انتقام لیا جائیگا۔ اور انصاف کا تقاضا جلد از جلد اور قلیل عرصہ میں پورا ہوگا۔

(پرجوش نعرہ ہائے تحسین)

جج ولورا:۔ کیا وکیل صفائی جواب دینا چاہتے ہیں۔

ستاملبو:۔ یور لارڈشپ ہم جواب کا حق کسی آئندہ موقع کے لیے محفوظ رکھتے ہیں۔

جج ولورا:۔ (سرکاری وکیل سے) گواہوں کو بلائیے۔

سرکاری وکیل :۔ ڈاکٹر کانسٹنٹائن پروان۔

(پروان پستہ قد، عمر چالیس سے زائد، صبح کے لباس میں ملبوس گواہوں کے کٹھرے میں داخل ہوتا ہے)

جج ولورا :۔ کیا تم حلف اُٹھانا چاہتے ہو۔

پروان :- جی ہاں یور لارڈ شپ۔

کلرک :- (اس کو صلیب دیتے ہوئے) کیا تم

پروان :- آمین ۔ (صلیب کا نشان بناتا ہے)

سرکاری وکیل :- براہِ کرم بتائیے آپ کون ہیں

پروان :- میں ڈاکٹر کانسٹنٹائن پروان ہوں۔ مسٹر پریزیڈنٹ گرگوری دمنک کا پرائیویٹ سکرٹری

سرکاری وکیل :- کیا قاتلانہ حملہ آپ کا چشم دید واقعہ ہے۔

پروان : جی ہاں۔

سرکاری وکیل : واقعات بیان کیجیے۔

پروان :- جمعرات کے دن ، ۷ مارچ کو ـــــ

سرکاری وکیل :- یعنی جرم سے چار دن قبل ؟

پروان :- جی۔ جمعرات کو یہ عورت میرے دفتر میں آئی اور کہا کہ وہ باغی الگزنڈر کمان کی بیوی لاڈیا کمان ہے۔

لاڈیا :- وہ ہرگز باغی نہیں ہیں۔

جج ولورا :- اچھا پھر۔

پروان :- اُس نے کہا کہ اُسے مسٹر پریزیڈنٹ سے ملاقات کی اجازت دی جائے اس لیے کہ وہ اپنے شوہر کے لیے جس کی موت پر سپریم کونسل نے بھی مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے رحم کی درخواست کرنا چاہتی ہے۔ میں نے جواب دیا کہ وہ کل آئے اور میں دیکھونگا کہ ملاقات کا وقت مقرر بھی ہو سکتا ہے یا نہیں۔ دوسری صبح ـــــ

لاڈیا :- اس نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ ملاقات کا انتظام زیادہ آسانی سے ہو سکتا ہے اگر میں وہ رات اس کے ساتھ بسر کروں۔

پروان :- (اطمینان سے) یہ تجویز خود میڈم کمان نے پیش کی تھی ، یور لارڈ شپ۔

لاڈیا :- اچھا!

پروان :- میں نے محض مسئلہ کی نزاکت کے سبب اس طرف اشارہ نہیں کیا تھا۔

لاڈیا :- سنو اس مکار کی بات -

جج مورسی :- یہ سب ذاتی معاملات ہیں جو ہم سے متعلق نہیں اگرچہ وہ کسی قدر دلچسپ ہی کیوں نہ ہوں

(ادھر اُدھر دیکھتا ہے، لوگ مُسکراتے ہیں)

جج ولورا :- (پروان سے) اپنا بیان جاری رکھو۔

پروان :- دوسرے دن یعنی جمعہ کی صبح کو وہ پھر آئی اور میں نے اُسے مطلع کیا کہ مسٹر پریذیڈنٹ نے ازراہِ عنایت ۱۱۔ تاریخ کو پیر کے دن گیارہ بجے اُسے ملنے کا اعزاز بخشا ہے۔

جج ترزاوا :- اور کیا تم ـــ یعنی ـــ تم اور وہ۔

پروان :- جی نہیں یور لارڈشپ۔ میں کبھی اپنی ذاتی دلچسپیوں کو اپنے فرائض کے ساتھ نہیں ملاتا۔

جج ترزاوا :- خوب، یہ بہت اچھا اصول ہے۔

جج ولورا :- جاری رکھو۔

پروان :- اُس نے مجھ سے پوچھا کہ اپنی درخواست کی حمایت کرنے کے لیے وہ اپنے ساتھ کسی اور کو لاسکتی ہے۔ میں نے کہا ہاں لیکن ایک آدمی سے زائد نہیں۔

لاڈیا :- مگر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا تھا۔

جج ولورا :- خاموش تمہیں بعد میں موقع دیا جائیگا۔ بیان جاری رکھو۔

پروان :- ۱۱۔ تاریخ کو پیر کے دن میں وقت مقررہ پر مسٹر پریذیڈنٹ کے ساتھ ان کے ذاتی کمرہ میں تھا۔ کلرک نے آکر مجھ سے کہا کہ کمان کی بیوی آئی ہے۔ ایک ساتھی کو لے کر۔

لاڈیا :- میں تنہا آئی تھی۔

پروان :- مسٹر پریذیڈنٹ نے حکم دیا کہ انہیں اندر لایا جائے۔ اور ایک لمحہ کے بعد وہ اس آدمی شنڈر کے ساتھ داخل ہوئی۔

لاڈیا :۔ جھوٹ میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔

جج ولورا :۔ خاموش ۔ (پروان سے) کیا تم ملزم شنڈر کو جو میڈم کمان کے ساتھ آیا تھا پہچانتے ہو۔

پروان :۔ جی ہاں، اچھی طرح

جج ولورا :۔ اچھا پھر۔

پروان ۔ کمان نے کہا کہ اس کے شوہر کی زندگی ــــ

جج سلوترسکی :۔ کیا کوئی اور بھی موجود تھا۔

پروان :۔ جی نہیں یور لارڈشپ ۔ صرف مسٹر پریزیڈنٹ ،ہیں اور دونوں قاتل۔

جج سلوترسکی :۔ جاری رکھو۔

پروان :۔ اس نے سکون سے گفتگو شروع کی مگر جلد ہی غیظ وغضب نے اس پر قابو پالیا اور اس کے اشارے زیادہ سخت ــــ

سرکاری وکیل :۔ اور ہمارے قائد نے کس طرح جواب دیا۔

پروان :۔ ہمیشہ کی طرح وہ اٹل تھے منطقی اور فصیح و بلیغ ۔ انہوں نے الگزنڈر کمان کے جرائم کا حال بیان کیا۔ اُنہوں نے جمہوری جماعت کو باغیوں اور غداروں کی جماعت ٹھہرایا جو ہماری پُر عظمت قومی حکومت کی جڑیں اُکھاڑنا چاہتے ہیں اور لوگوں کو تباہی و بربادی کے راستہ پر لیجانے کے خواہشمند ہیں۔

(تماشائی خوشی کا اظہار کرتے ہیں)

الغرض اُنہوں نے کمان کی سزائے موت پر نظر ثانی سے انکار کر دیا اور تنبیہ کی کہ اس کے سب ساتھیوں کا یہی حشر ہوگا۔ (زندہ باد اور تحسین کے نعرے)

جارج :۔ چلاؤ گیدڑو چلاؤ ۔ ابھی ہم مرے نہیں ہیں۔

سرکاری وکیل :۔ (غصہ سے جارج کی طرف دیکھتے ہوئے) ابھی نہیں ۔ مگر تلوار تیز کی جا رہی ہے۔

جارج : بعض اوقات تلوار کی دُو دھاریں ہوتی ہیں۔

جج ولورا: ۔(گھنٹی بجا کر) خیتو میں تمہیں تنبیہ کرتا ہوں (پروان سے) تم بیان جاری رکھو۔

پروان: ۔مسٹر پریزیڈنٹ کے پُر جذبات الفاظ کے خاتمہ پر اُس کی آنکھیں قاتلانہ آگ سے چمکنے لگیں وہ شنڈر کی طرف مڑی اور کہا ـــــ

لاڈیا: ۔ نہیں ۔

(کنارڈ اور رستالمبو اسے خاموش رہنے کو کہتے ہیں)۔

پروان: ۔ ان الفاظ پر شنڈر نے جیب میں سے پستول نکالا میں چلّایا مگر وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اُس نے دو گولیاں چلائیں اور وہ ہمارے قائد کے سینے اور کندھے میں لگیں۔ ان میں سے ایک ان کے جسم میں سے گزر کر اُس آئینہ پر جا لگی جو پیچھے دیوار میں لگا تھا۔ وہ فرش پر گر گیا۔ میں نے شنڈر کا ہاتھ پکڑ کر اُس سے پستول چھین لیا۔ لوگ کمرہ میں دوڑے ہوئے آئے اور قاتلوں کو گرفتار کر لیا۔ بس یہ تھا سارا واقعہ۔

سرکاری وکیل: ۔ ڈاکٹر پروان اب میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ بہت سی چیزوں کی شناخت کریں۔

پروان: یقیناً۔

سرکاری وکیل: ۔ (اپنے نائب مالینو سے) سب سے پہلے قمیص۔

(مالینو ایک بڑے ڈبہ میں سے ایک سبز قمیص نکال کر سرکاری وکیل کو دیتا ہے)

(قمیص کو ہاتھ میں لے کر) ڈاکٹر پروان کیا آپ اس قمیص کو پہچانتے ہیں جس کے سینہ میں دائیں طرف اور دائیں کاندھے میں گولیوں کے نشان ہیں۔ کیا مسٹر پریزیڈنٹ نے اس حادثہ کے وقت یہی قمیص پہن رکھی تھی۔

پروان: ۔ جی ہاں۔

سرکاری وکیل: ۔ آئینہ لاؤ۔ (سرکاری وکیل کا کلرک ایک چھوٹا سا دیواری آئینہ سامنے لاتا ہے جس کا شیشہ چور چور ہے) اور کیا یہ وہی آئینہ ہے جو گولی سے چکنا چور ہو گیا تھا جو مسٹر پریزیڈنٹ کے جسم سے

ہو کر اس میں جا لگی تھی۔

پروان :- جی ہاں۔

سرکاری وکیل :- میرے پاس مسٹر پریزیڈنٹ کے ذاتی ڈاکٹر پروفیسر گلامچی کی تحریری رپورٹ بھی ہے جس میں زخموں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ہر روز کے بلیٹن بھی موجود ہیں۔

(جارج کنارڈ اور ستا ملبو کے کان میں کچھ کہتا ہے)

جج ولورا :- ہم ان کو دیکھ چکے ہیں۔

شا ملبو :- ملزموں کا مطالبہ ہے کہ ڈاکٹر گلامچی کو تصدیق کے لیے عدالت میں بلایا جائے۔

جج موریسی :- کس مقصد کے لئے ؟

سرکاری وکیل :- پیچیدگی پیدا کرنے اور وقت ضائع کرنے کے لیے یور لارڈشپس آپ یقین فرمائیے۔

جج ولورا :- ہمارے پاس مفصل تحریری رپورٹ موجود ہے۔

کنارڈ :- ہم اُن سے کچھ سوالات پوچھنا چاہتے ہیں۔

سرکاری وکیل :- (طنزاً) کیا آپ علم طب سے بھی واقف ہیں۔

ستا ملبو :- پروفیسر گلامچی کی قابلیت کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یور لارڈشپس۔

جارج :- اور نہ اس امر کا کہ وہ ڈمینک کا بہنوئی ہے۔

جج سانکو :- کیا تم اس بات کی ضرورت محسوس کرتے ہو۔

کنارڈ :- (پیشتر اس کے کہ جارج جواب دے سکے) ہم ڈاکٹر موصوف سے کچھ سوالات پوچھنا چاہتے ہیں

جج ولورا :- ہم اس درخواست پر غور کرینگے۔ اس کے بعد ؟

سرکاری وکیل :- (مالینو سے) پستول۔ (مالینو پستول نکال کر دیتا ہے) کیا یہ وہی پستول ہے جس سے شنڈر نے گولی چلائی تھی اور آپ نے اس سے چھین لیا تھا۔

پروان :- جی ہاں۔

جج ترزاوا :- (اپنا ہاتھ بڑھا کر) ذرا مجھے دکھائیے۔

سرکاری وکیل :- ضرور یور لارڈشپ (دیتا ہے اور جج باری باری اُسے دیکھتے ہیں) بہت سے گواہ ایسے ہیں جو اس امر کو ثابت کرینگے کہ اس پستول کا مالک جارج خینتو ہے۔

جارج : اپنے نکمے گواہوں کو بلا کر اس تماشہ کو طوالت دینے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ پستول میرا ہے۔

جج سانکو :- تم تسلیم کرتے ہو؟

جارج :- یقیناً۔ یہ میرے کمرہ سے چُرایا گیا تھا۔

جج مورسی :- چوری کس نے کی تھی؟

جارج :- یور لارڈشپ۔ یہ مجھے معلوم نہیں۔ چور نے جو یقیناً کوئی ہشیار آدمی ہے میری موجودگی میں اسے نہیں چُرایا۔

جج سلوترسکی :- کیا تمہارے پاس اس بات کا کوئی ثبوت ہے کہ یہ چوری گیا تھا۔

جارج :- صرف یہ کہ جب میں اتوار کی صبح کو یعنی اس واقعہ سے ایک دن قبل کمرہ سے روانہ ہوا تو یہ پستول میز پر موجود تھا۔ جب میں رات کو واپس آیا تو اُس کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

جج مورسی :- چوری کا یہ کوئی ثبوت نہیں

سرکاری وکیل :- ہم ثابت کردینگے کہ یہی پستول اُسی اتوار کی شام کو خینتو نے شنڈر کو دیا تھا۔

جارج :- اگر تم اس کو ثابت کردو تو ہر بات کو ثابت کر سکتے ہو۔

جج ولورا :- (جارج سے) بیٹھ جاؤ۔ (پروان سے) کیا شنڈر نے بھی الگزنڈر کمان کے لیے رحم کی التجا کی تھی۔

پروان :- جی نہیں اُس نے کچھ نہیں کیا۔

سرکاری وکیل :- وہ بولنے کے لیے نہیں بلکہ عمل کرنے کے لیے آیا تھا۔

شناملبو :- کیا آپ کو معلوم تھا، شنڈر کون ہے؟ کیا آپ نے اِسے پہلے بھی دیکھا تھا۔

پروان :- کبھی نہیں۔

ستالمبو:۔ کیا میڈم کمان نے اس کا تعارف مسٹر پریزیڈنٹ سے کرایا تھا؟

پروان: نہیں اُس نے رحم و کرم کے لیے تقریر شروع کر دی جو معلوم ہوتا تھا خوب رٹی ہوئی ہے۔

لاڈیا:۔ بالکل نہیں، مجھے جو کچھ کہنا تھا برجستہ اور فی البدیہہ کہا تھا۔

کنارڈ:۔ نہ آپ نے اور نہ مسٹر پریزیڈنٹ نے پوچھا کہ شنڈر کون ہے اور وہاں کیوں آیا ہے۔

پروان:۔ نہیں اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔ قدرتاً ہم سمجھے کہ یہ کمان کا کوئی رشتہ دار یا دوست ہے، اس نے ایک ساتھی کو لانے کی اجازت حاصل کر لی تھی۔

ستالمبو:۔ کیا کمرہ میں اور کوئی موجود نہیں تھا؟ کوئی سکرٹری، کوئی سنتری۔

پروان:۔ کوئی نہیں۔ صرف مسٹر پریزیڈنٹ اور میں۔

شالمبو:۔ لیکن کیا مسٹر پریزیڈنٹ اس طریقہ سے ملاقات کیا کرتے ہیں۔

پروان:۔ کیوں نہیں۔ انہیں اپنی رعایا کی اطاعت اور فرمانبرداری پر فخر و ناز ہے۔

(تحسین و مرحبا کی آوازیں)

کیا انہیں معلوم تھا کہ اس عورت سے مہربانی کا جو سلوک کیا گیا ہے اس کا بدلہ قاتلانہ حملہ سے دیا جائیگا۔

سرکاری وکیل:۔ ڈاکٹر ستالمبو کا خیال یہ ہے کہ ہمارے قائد کو اس طرح آزاد اور بے خوف ملاقاتوں پر بُرا بھلا کہا جائے۔

ستالمبو:۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ براہ کرم غلط فہمی نہ پیدا کیجیے۔ میں تو یہ مشورہ دینے والا تھا کہ ان کی ذات کی حفاظت کے لیے زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔

پروان:۔ جی ہاں، ہمیں سبق مل گیا ہے۔ ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ آئندہ ایسے دشمنوں سے کس طرح پیش آنا چاہیے۔

جارج: کیا اس کے لیے تمہارے پاس کافی فوجی دستے ہیں؟

جج سانکو:۔ بس ان غدارانہ حملوں کو ختم کرو۔

سرکاری وکیل:۔ یور لارڈشپ، کیا ان دھمکیوں کی اجازت ہے۔

جج ولورا:۔ ہمیں ان دھمکیوں سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم یہاں شہادت سننے کے لیے جمع ہیں (جارج سی)

تم اپنا مقدمہ خود خراب کر رہے ہو۔ کیا اور سوالات باقی ہیں!

سرکاری وکیل: نہیں یور لارڈ شپ۔

جج ولورا:۔ کیا وکیل صفائی کچھ دریافت کرنا چاہتے ہیں؟

سا ملبو:۔ نہیں یور لارڈ شپ۔

جج ولورا:۔ تم جا سکتے ہو ڈاکٹر پروان۔

پروان: شکریہ یور لارڈ شپ۔ میں اپنی شہادت اس اُمید کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ ہمارے محترم قائد کی زندگی پر جو قاتلانہ حملہ کیا گیا ہے اور جس نے قوم میں رنج و غم اور غیظ و غضب کی ایک لہر دوڑا دی ہے، اس کا بدلہ جلد سے جلد لیا جائیگا۔

(داد و مرحبا کے ساتھ عدالت کے سامنے جھک کر وہ اپنی جگہ پر جا بیٹھتا ہے)

مالینو:۔ (ارد گرد دیکھ کر) دوسرا گواہ باسربا ہے۔

باسربا:۔ (کھڑے ہو کر) حاضر ہوں جناب، یہاں

مالینو:۔ آگے آؤ۔

باسربا:۔ جی ہاں آ رہا ہوں۔

(آگے بڑھتا ہے، گھبرا کر اور ڈر کر)

سرکاری وکیل:۔ کیا اس سے بھی حلف لیا جائیگا، یور لارڈ شپس

جج سانکو: کیا تم قومی جماعت کے رکن ہو؟

باسربا:۔ جی ہاں یور لارڈ شپس۔ جی ہاں۔ یقیناً، سات برس سے ہوں۔ اور ماں باپ دونوں کی طرف سے خالص سلاونک۔ یور لارڈ شپس۔ مجھ میں لاطینی، صہوانی، رومن کیتھولک، نیگرو اور جرمن خون کا ایک قطرہ بھی نہیں۔

(باقی)

دُنیا

شب تار ہے اور ہر طرف تاریکی، روشنی کا نام و نشان تک نہیں کالی رات بادلوں کے کالے کمبل اوڑھے دنیا پر چھائی ہے، کبھی کبھی بجلی چمک جاتی ہے اور راہ گیر دو قدم راستہ دیکھ لیتے ہیں۔ اس وقت چند مسافر وادیوں اور پہاڑوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں، برق کی چشمک زنی پر چشم اُمید لگائے چلے جا رہے ہیں چشم زدن کو اُجالا ہوا۔ راستہ نظر آیا اور پھر اندھیرا چھا گیا۔ راستہ ٹٹولتے قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے راہ بھولتے پھر ڈگر پر آتے اٹکل کے تیر تُکّے لگاتے چلے جاتے ہیں۔ جو بھاگ چلتا ہے پھسل پڑتا ہے، آہستہ خرام چند گام آگے نکل جاتا ہے۔ منزلِ مقصود سب کی ایک ہے پھر راہیں الگ الگ۔

کہیں پیش رفتگاں کے نقش پا پر نظر پڑی دل کو ڈھارس بندھی۔ قدم پر قدم رکھنا تھا کہ پاؤں پھنس کر رہ گئے۔ صراط مستقیم سے پیر ڈگمگایا اور دلدل میں گیا۔ صراط مستقیم لاپتہ و ناپیدا۔ دلدل کچھ اس قیامت کی ہے کہ اُس سے رہائی معلوم۔ پر اللہ رے ہمت اس کیچڑ میں بھی گوہر مقصود کی تلاش ہاتھ سے نہیں دیتے اور ہاتھ پیر مارے جاتے ہیں۔

بوادیِ کہ دراں خضر را عصا خفت است　　　　بسینہ می سپرم رہ اگرچہ پا خفت است

سب کی منزل ایک ہے پر راہیں الگ الگ، طریق جُدا جُدا۔ دل میں تجسس، دماغوں پر ایک کیف طاری۔ آنکھیں روشنی کی متلاشی۔ دل اندھیرے سے گھبراتا ہے۔ دماغ شمع ہدایت روشن کرتا ہے ہوا کا ایک جھونکا آتا ہے۔ شمع بجھ جاتا ہے اور پھر وہی اندھیرا چھا جاتا ہے۔

سنو کچھ آواز آ رہی ہے۔

آواز :۔ نہ ہستی تھی نہ غیر ہستی۔ نہ فضا تھی نہ اُس پر آسمان۔ کیا چیز سب کو محیط کیے تھی۔ وہ کہاں تھی۔ کیا صرف پانی کی نامعلوم تاریک گہرائیاں اور ناپیدا کنار وسعت تھی۔

کس کو معلوم، کون بتا سکتا ہے۔ یہ دنیا کس چیز سے اور کیونکر پیدا ہوئی۔ ہستیِ حقیقی اس سے پہلے

تھی یا نہیں ۔ کون جانے یہ دنیا کس چیز سے اور کیونکر عالم وجود میں آئی ۔

کس شے سے دنیا پیدا ہوئی ۔ مخلوق ہے یا اس کا کوئی خالق نہیں ۔ وہ ہی جانتا ہے جو آسمان پر سے حکومت کر رہا ہے ۔ سب کچھ دیکھنے والا مالک حقیقی ، یا وہ بھی نہیں جانتا ۔ (رگوید)

اس آواز نے مسافروں کو چونکا دیا پست ہمت کمربستہ ہو گئے ہوا سرسرائی بادل چھٹے آسمان پہ ایک تارا نمودار ہوا ۔ چشم تلاش اس پر جم کر رہ گئی دل نے کہا یہ ہی ہے ۔ اتنے میں ماہتاب بہ آب و تاب نمودار ہوا ، آنکھیں خیرہ ہو گئیں ۔ ستاروں کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور کچھ نظروں سے غائب ہو گئے ، دل نے کہا چھپ جانے والا ہمارا خدا نہیں ہو سکتا اور قلب پرستار ستاروں کا دامن چھوڑ ماہِ کامل کے سامنے سر بسجود ہوا ۔ تاجدار مشرق نکلا اور چاند ماند پڑ گیا ۔ دلوں نے کہا یہ سب سے بڑا ہے بیشک یہ ہمارا رب ہے ۔ رات نے سورج کو مات دی اور پھر بساط انجم آسمان پر تھی طبع متجسس زچ ہو گئی اور کہا اگر نہ ہدایت کرے مجھ کو میرا رب میں ہو جاؤں گا بھٹکے ہوئے گروہ میں ۔ (قرآن مجید)

قلب خدا پرست نے کہا میں کس کو سجدہ کروں ۔ من بولا کس کے چرن لوں ، ہردے نے کہا کس کے مندر پر بھینٹ چڑھاؤں ۔

اوّل اوّل سنہری روشنی *Hiranyagarbha* پیدا ہوئی اور وہ موجودات کا واحد خالق تھا ۔ اس نے آسمان و زمین پیدا کیا ۔ میں کس مندر پر بھینٹ چڑھاؤں ۔

وہ جو زندگی بخشتا ہے ، جو قدرت عطا فرماتا ہے ۔ چاند اور سورج جس کے مطیع ہیں جو فانی اور غیر فانی ہر شے میں ساری و جاری ہے ۔ میں کس کے آگے سر ٹیکوں ۔

دل کے اس استفسار پر عقل سلیم نے جواب دیا ۔

ادپر جاپتی تو ہی اس کارخانۂ عالم کے بندھن کو باندھے ہوئے ہے ۔

عقلا اس واحد ہستی کو مختلف ناموں سے پکارتے ہیں ۔ اگنی ۔ یاما ۔ ماتاسون (رگوید)

وہ نفس واحد غیر متنفس طریقہ پر موجود تھا اور اس کے سوا کچھ نہ تھا ۔ (رگ وید)

اندریں خانہ چراغیست کہ از پرتو او　　ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

یہ تمام مسافر اس سوال وجواب کے گورکھ دھندے میں غلطاں وپیچاں ایک دریا کے کنارے جا نکلے۔ عرفان کی آگ سلگا کنڈل بنا اُس کے گرد ہو بیٹھے۔

کچھ دیر نہ گذری تھی کہ ایک آواز آئی۔

آواز: یہ سارا سنسار کیونکر بنا؟

کنڈل میں سے ایک شخص اُٹھا اور بولا: ایشور نے جب چاہا پانی، آگ اور ہوا سے یہ سنسار بنا کھڑا کیا، اور جب چاہتا ہے اس کو نیست ونابود کردیتا ہے اور پھر تمام چیزیں آگ، پانی اور ہوا میں تبدیل ہوجاتی ہیں۔

دوسرا بولا:۔ ایشور بنا کر بگاڑتا کیوں ہے۔

پہلا سادھو جس نے یہ سلسلہ شروع کیا تھا بولا: ایشور جب دنیا والوں کو چین دینا چاہتا ہے تو اس کشمکش کے کارخانے کو مٹا دیتا ہے۔

اس گروہ میں سے ایک شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا: کام کے لیے خواہش ضروری ہے اور خواہش انسان سے متعلق ہے، ایشور اس سے بالاتر ہے۔

دوسرے نے جواب دیا:۔ بیشک اِچھا (خواہش) ایشور کا کام نہیں یہ سنسار ایشور نے اِچھا سے نہیں بنایا یہ تو اُس کی لیلا ہے۔ ایشور ایک سرور کے عالم میں ناچ رہے تھے اس کیفیت میں کوئی حرکت ایسی ہوئی کہ یہ دنیا بن گئی، پھر کسی وقت بیک جنبش ابرو یہ سب درہم برہم ہوجائیگی اور پھر اسی طرح بن جائیگی، یہ سب ان کی لیلا ہے۔

اس محفل میں ایک اور عقلمند کھڑا ہوا اور بولا سب مادہ ہی مادہ ہے جو شکل چاہتا ہے اختیار کرلیتا ہے۔ ایشور کو اس میں کچھ دخل نہیں۔

دوسرے نے جواب دیا:۔ اس نظام عالم کو چلانے کے واسطے کوئی منتظم ہونا چاہیے۔

ایک بولا:۔ ایشور عناصر میں تشکیل کی خواہش پیدا کرا لگ ہوجاتا ہے اور باقی تمام کام بہ ہمہ

کے حوالے کر دیتا ہے۔ ایشور نے سنسار کسی ذاتی مطلب سے نہیں پیدا کیا بلکہ سب کی بہتری کے لیے بنایا ہے۔ حتیٰ کہ غم و رنج بھی مکتی کا راستہ دکھاتے ہیں۔

ایک مست مادہ پرست کھڑا ہوا اور کہا:۔ دنیا سے کیا لیجانا۔ کھانا پینا مر جانا، دنیا ہی دنیا ہے نہ اس سے پہلے کچھ تھا نہ اس کے بعد کچھ ہے، مادہ ہے جو شکلیں بدل رہا ہے۔ کھاؤ پیو اور مزے کرو، نہ عقبیٰ ہے نہ عقوبت ایشور اور سارے دیوتا برہمنوں کے من گھڑت ہیں جو دنیا کو بیوقوف بنا کر اپنے حلوے مانڈے کی فکر میں ہیں۔ حقیقت میں چار عناصر لافانی ہیں۔ دھرتی، پانی، اگنی اور پون اور انہی کے ارتباط سے عقل پیدا ہوتی ہے۔ روح اور جسم ایک ہی ہیں الگ الگ نہیں۔

جب تک دم میں دم ہے مزے اڑاؤ۔ موت کے چنگل سے رستگاری نہیں۔ جب ہمارا جسم نذرِ آتش کر دینگے تو واپس کہاں سے آئیگا۔

لذات ترک کر دیں کہ ان میں رنج کی آمیزش ہے یہ بے وقوفوں کا مسلک ہے۔ کونسا دانا چاول پھینک دیگا کہ اس کے ساتھ بھس بھی ہے۔

نہ سُرگ ہے نہ مکتی نہ دوسری دنیا نہ اعمال کی جزا و سزا۔ اگنی ہترا اور تینوں وید جاہلوں اور نامردوں کا سہارا ہیں۔

اگر یوتش تومہ پر جو جانور بھینٹ چڑھایا جائے وہ سیدھا بیکنٹھ کو چلا جاتا ہے تو اپنے باپوں کو کیوں نہیں قربان کرتے اُنکی مکتی ہو جائیگی۔

جب تک سانس ہے عیش و عشرت میں بسر کرو۔ گھی کھاؤ چاہے قرض لے کر ہی کھاؤ۔

اب یونان کے فلاسفہ کی باری آئی۔ ان کا نمائندہ کھڑا ہوا اور کہنے لگا: دنیا آگ پانی اور ہوا سے بنی ہے۔

اس کا ایک اور ہم وطن اُٹھا اور بولا:۔ دنیا ایٹمز سے بنی ہے اور ایٹمز تمام و کمال ایک قسم کے ہوتے ہیں۔

دوسرا بولا:۔ دنیا ایٹمز سے ضرور بنی ہے، پر وہ سب ایک قسم کے نہیں ہوتے۔

یونان کے تمام فلاسفہ اس پر متفق تھے کہ دنیا خود بنی ہے اس کا بنانے والا کوئی نہیں۔

اب افلاطون نے جلسہ کو مخاطب کیا اور کہا۔ ایک دنیائے مجاز ہے ایک عالم حقیقت۔ آخرالذکر کون و مکاں سے مستغنی ہے۔ دنیائے مجاز کا عرفان تجربہ اور احساسات سے ہوتا ہے۔ عالم حقیقت میں ہر شے بحد کمال موجود ہے۔ عالم مجاز اس حقیقت کا پرتو ہے نامکمل اور ناقص۔

ایک بزرگ کھڑے ہوئے اور کہا وہ ذاتِ واحد اول و آخر ہے جس نے کن کہا (ہو جا) اور ایک روح دوڑ گئی اور اس عالم اسباب کی تشکیل شروع ہوئی (فیکون ...)

وہ خالق مطلق اپنی مخلوق کی طرف سے بے خبر نہیں۔

سزا و جزا مقرر ہے اور ہدایت کرنے والے من جانب اللہ وقتاً فوقتاً آتے رہتے ہیں۔

وہ ذاتِ لایزال بعلم ہر شے میں پرتو فگن ہے۔ کوئی چیز اُس سے خالی نہیں دیکھنے کو چشم بصیرت اور عرفان سلیم درکار ہے۔

واقف نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا ورنہ یہاں جو پردہ ہے پردہ ہے ساز کا

ان بزرگ نے اپنی تقریر ختم کی تھی کہ ایک صوفی صافی کھڑے ہوئے اور کہا۔ ہمہ اوست

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے حیران ہوں پر مشاہدہ ہے کس حساب میں

حقیقت وہ ہی ہے اس کے ماسوا سب دھوکہ ہی دھوکہ ہے۔

اب ایک مادہ پرست کھڑا ہوا اور بولا:۔ دنیا ایک کرۂ آتش تھی، آگ کا دہکتا ہوا الاؤ۔ یہ الاؤ برسوں سُلگتا رہا۔ ہر طرف آگ ہی آگ تھی۔ ذرا آنچ دھیمی پڑی اور دوسری طرف سے شعلے دوڑ پڑے۔ آتش افسردہ کو پھر بھڑکا دیا۔ اگنی کا راج تھا۔ آتش کا دور دورہ۔ ایک عرصہ تک یہ جلا جل کا بازار گرم رہا اور پھر ابر اُٹھنے شروع ہوئے۔ بادل برسے اور دل کھول کر برسے۔ پہلے تو آگ چھینٹا پاکر بھڑک اُٹھی۔ سمندِ ناز پر اک اور تازیانہ ہوا۔ پھر آخر کار ابر بہار نے آتش سوزاں کو افسردہ کر دیا آسمان برسے دڑ بڑے پڑے، موسلا دھار بارش ہوئی۔ ایک برجاتا تھا ایک آتا تھا۔ آگ پر پانی پڑ گیا شعلوں کی گرما گرمی سرد مہری سے بدل گئی۔ زبانِ آتش سرد ہوگئی، آگ بجھ کر رہ گئی۔ مینہ برسے اور برسوں برسے

زمینِ تشنہ کام نے پانی پیا اور سیر ہو کر پیا۔

اب ابر کھُلا اور سورج کی کرن نمودار ہوئی۔ عالم روشن ہو گیا۔ چشم بینا نے دیکھا تو کہیں بستیاں تھیں کہیں بلندیاں۔ سر بفلک پہاڑوں کے پہلو میں وادیاں پانی سے بھری تھیں جن میں سرافراز خاکی اپنا عکس رُخ دیکھ رہے تھے، کہ اچانک

موت میں حیات پیدا ہوئی اور سکون میں حرکت۔ بے جان میں جان پڑی۔ پہلا ذرۂ حیات سطحِ آب پر تیرتا نظر آیا۔ لاکھوں برس آغوشِ فنا میں یہ ذرۂ حیات پرورش پاتا رہا۔ اسی دور میں کچھ عادتیں پیدا کرلیں جو جنگِ حیات میں اس کے کام آنے والی تھیں۔ کبھی چشموں اور نہروں کی تاریک گہرائیوں میں روپوش ہو گیا۔ جائے امن پائی جڑ پکڑ لی اور نباتِ آبی بن گیا۔ گاہے بہ خانہ بدوش دوشِ امواجِ فنا پر نظر آیا کہ (جلی فش) بن گیا تھا۔

نباتِ آبی نے جب تہِ آب جگہ نہ پائی تو دامنِ کوہ کی دلدلیں آباد کیں۔ دن میں دو دفعہ ہم آغوشیٔ آب انہیں سیراب کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ پانی کی مفارقت میں زندگی گزارنے کی عادت پڑ گئی۔ یہ پودے بڑھے اور گلہائے خوش رنگ و خوشبو سے بارور ہوئے۔ بڑی بڑی مکھیوں اور پرندوں نے بیج جہاں تہاں پھیلا دیئے۔ دنیا سرسبز ہو گئی۔

کچھ عرصہ بعد حیاتِ آبی خشکی کی طرف متوجہ ہوئی اور آہستہ آہستہ پانی اور خشکی دونوں میں زندہ رہنے کی صلاحیت پیدا کرلی اس قسم کی مخلوق کا نام Amphibious ہے۔ خشکی کی آب و ہوا کچھ ایسی راس آئی کہ اکثر نے پر پُرزے نکالے پرند بن گئے اور زمین کی لاانتہا پیداوار کھا کھا کر موٹے ہونے شروع ہوئے۔ آخرکار ایک ایسی ہوا چلی کہ یہ سب فنا ہو گئے۔ خیال ہے کہ اکثر مُٹاپے سے پھٹ گئے اور باقی فاقوں مر گئے۔ بغیر ہاتھ پیر ہلائے پیٹ پلنا ناممکن اور مُٹاپا ہلنے نہ دیتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ مخلوق نیست و نابود ہو گئی۔

آب حیات ایک اور جانور کی جون میں آئی اور اس کا نام Mammals تھا Mammals اپنے بچوں کی حفاظت اور پرورش کرتے اور دودھ پلا کر پالتے تھے۔ یہ صنف مفقود نہ ہوئی اور اب تک ہماری شریکِ حیات ہے۔

(باقی)

قطعۂ تاریخ وفات علامہ اقبال مرحوم

لطفِ مجلس کیا رہا جب میرِ مجلس اُٹھ گیا

وائے ناکامی کہ بزمِ اہلِ دل برہم ہے آج

تھا جہاں کل نغمۂ مستانہ کا جوش و خروش

ہے وہاں آہ مسلسل۔ نالۂ پیہم ہے آج

سینۂ مُسلِم کہ تھا گنجینۂ شوق و اُمید

ہے وفورِ یاس اس میں اور ہجومِ غم ہے آج

فکر کی جب سالِ رحلت کی تو دل نے دی صدا

ملتِ اسلام میں اقبال کا ماتم ہے آج

۱۳۵۷ ھ

تنقید و تبصرہ

الکتاب الوحید ترجمہ مفتاح التجوید۔ اصل کتاب شیخ عبداللہ بن ابراہیم حمدوہ مکی کی ہے جو فن قرأت و تجوید میں مبتدیوں کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس کا اردو ترجمہ قاری محمد اسماعیل صاحب مجددی مدنی نے جو ریاست رامپور کے مدرسۂ عالیہ میں قرأت کے اُستاد ہیں کیا ہے۔ آخر میں چند فصلوں میں اس فن کے متعلق بعض فوائد کا اضافہ بھی کیا ہے۔ لکھائی چھپائی اچھی ہے۔ ضخامت ۲۰×۲۶/۸ کی تقطیع پر، ۷ جز اور قیمت ۸ ر ہے۔

ملنے کا پتہ:- قاری محمد اسماعیل صاحب مجددی۔ خانقاہ معصومی متصل بازار نصر اللہ خاں ریاست رامپور

شمس معنوی۔ مصنفہ غلام دستگیر صاحب رشید ایم اے استاذ فارسی نظام کالج حیدر آباد دکن۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ تقطیع ۲۰×۲۶/۸ ضخامت ۸۰ صفحات۔ قیمت درج نہیں ہے۔ ملنے کا پتہ معارف پریس اعظم گڈھ

اہل ادب میں یہ امر تحقیق طلب ہے کہ شمس تبریزی کے نام سے غزلیات کا جو دیوان چھپا ہے وہ خود حضرت شمس تبریزی کا ہے یا مولانا روم کا۔ مصنف نے اس پر تاریخی دلائل سے روشنی ڈالتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ دراصل یہ دیوان خود مولانا روم علیہ الرحمہ کا ہے۔ بیرونی شہادتوں سے بھی اور اندرونی شہادتوں سے بھی۔ پھر مولانائے موصوف کی شاعری پر تنقیدی بحث کی ہے جو نہایت طویل الذیل ہے۔ یہ بحث جس قدر دلچسپ ہونی چاہیے تھی اُس قدر دلچسپ نہیں ہے۔ کیونکہ تنقید کسی اصول کے ماتحت نہیں کی گئی ہے بلکہ طالب علمانہ طریقہ سے جس قسم کے محاسن یا معائب سمجھ میں آئے اُن کو لکھنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ جو باتیں بیان کی گئی ہیں وہ عموماً ہر شاعر کے کلام میں دکھائی جا سکتی ہیں۔ بے شک بعض خصوصیات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ کاش انہی خصوصیات ممیزہ کو اچھی طرح دکھانے کی کوشش کی جاتی اور عام باتیں نظر انداز کر دی جاتیں تو کتاب میں کچھ جان پیدا ہو جاتی۔ جہاں تک تاریخی معلومات فراہم کرنے کا تعلق ہے مؤلف کی کوشش قابل داد ہے۔

صحیفۃ التکوین۔ مصنفہ ہز ہائینس محمد ناصر الملک والی چترال۔ کتابت و طباعت و کاغذ اعلیٰ درجہ کا۔

ضخامت تقریباً ۷۰ جزو مجلد قیمت ۱۲؎ ملنے کا پتہ۔ محمد نصیر ہمایوں۔ بی اے قومی کتب خانہ۔ ریلوے روڈ لاہور

یہ کتاب فارسی نظم میں ہے۔ ہز ہائینس نے اس میں عالم کی تکوین اور تخلیق کی داستان بیان کی ہے۔ پہلے حصہ میں علم ہیأۃ جدیدہ کے مطابق آسمانوں اور اجرام سماوی کا بیان ہے۔ اس میں سیاروں کے بُعد مکانی اور فاصلوں کو بھی اشعار ہی میں بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے حصہ میں مسئلہ ارتقا اور تخلیق انسان کے متعلق مفصل بحث ہے۔ اور یہ بھی نظم ہی میں ہے۔ ہرچند کہ یہ مسائل نظم میں نہیں سما سکتے مگر ہز ہائینس نے نہایت سادگی اور خوبی کے ساتھ ان کو بیان کر لیا ہے۔ مسئلہ ارتقا کے متعلق ان کے سامنے علامہ مشرقی کا تذکرہ تھا جنھوں نے پہلی بار اُردو میں قرآن کی روشنی میں اس مسئلہ کی تفصیل کی ہے۔ وہی رنگ اس نظم میں بھی ہے۔ یہ کتاب اپنے انداز اور اسلوب میں بہت انوکھی ہے۔ شاعرانہ خوبیاں ان علمی اہم مسائل کے بیان میں تلاش کرنا عبث ہے۔ مگر اسی کے ساتھ کلام کی سادگی پر حرف گیری بھی نہیں کی جا سکتی۔

تفسیر سورۂ والعصر۔ مولفہ ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ مترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی۔

دائرۂ حمیدیہ، قرآن کی خدمت اور ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ کی تفسیر کے غیر مطبوعہ اجزاء کو اردو میں منتقل کرنے کی غرض سے قائم ہوا ہے۔ اس نے اب تک متعدد مفید اور اہم کتابیں شائع کی ہیں یہ کتاب بھی اس سلسلہ کی ایک کتاب ہے۔

یہ مختصر رسالہ بھی مولانا کی اُنہی خصوصیات کا حامل ہے جو اور رسالوں میں پائی جاتی ہیں۔ اس میں زمانہ کی قسم کھانے کی وجہ بیان کی گئی ہے، لفظ "تواصوا" سے خلافت کا وجوب ثابت کیا گیا ہے اور "حق" و "صبر" کی تشریح اور ان کا باہمی تعلق دکھایا گیا ہے۔ غرض اس چھوٹی سی سورہ کی تفسیر اس قدر حکیمانہ انداز میں کی گئی ہے کہ پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ترجمہ نہایت شستہ اور سلیس ہے۔ کاغذ اور طباعت و کتابت عمدہ ضخامت ۶۱ قیمت ۶؎ منیجر دائرہ حمیدہ، سرائے میر، اعظم گڈھ کے پتہ سے منگائی جا سکتی ہے۔

محبوب خدا۔ از چودھری افضل حق صاحب تقطیع درمیانی ضخامت ۲۰۰ صفحات کتابت و طباعت اور کاغذ اوسط جلد خوشنما قیمت ۸؎ ملنے کا پتہ تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور۔

آں حضرتؐ کی سیرت پر اُردو میں لاتعداد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ بڑوں کے لیے بھی بچوں کے لیے بھی اور کیوں

نہ ہو ع ہو المسک ماکررتہ یتضوع - خاکہ ایک ہی ہے مگر رنگ بھرنے والے اپنے اپنے ذوق کے مطابق اس میں رنگ بھرتے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب چودھری افضل حق صاحب کے زمانہ اسیری کا کارنامہ ہے۔ شروع میں اُنھوں نے عرب کے جغرافیے، تاریخ، ادب وانشا اور عربوں کے عادات وخصائل پر مختصر سی نظر ڈالی ہے۔ پھر آنحضرتؐ کی سیرت ہے۔ پیدائش سے لے کر وفات تک۔ انداز بیان دلکش ہے لفظ لفظ سے والہانہ عقیدت ٹپکتی ہے کہیں کہیں زبان وبیان کی خامیاں ہیں لیکن نظر انداز کر دینے کے قابل۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں میں بہت مقبول ہوگی۔ ظاہری خوشنمائی کا بھی خاصا اہتمام کیا گیا ہے۔

ایمانِ سخن - یعنی شیر محمد خاں ایمان دکنی کے کلام کا انتخاب - مرتبہ مولوی سید محمد صاحب ایم اے سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ صفحات ۱۲۰ - قیمت ۱۲ ار ملنے کا پتہ: - مکتبہ جامعہ دہلی۔

یہ بات اب پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اُردو شاعری یا دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اُردو زبان کی ابتدا دکن سے ہوئی تھی۔ اس کے بعد جب اورنگ زیب کے حملے کے بعد دکن کے شعرا دہلی اور دہلی کے شعرا دکن آنے جانے لگے تو شعرائے دہلی نے بھی فارسی کے ساتھ ساتھ اُردو میں بھی کہنا شروع کیا۔ اس وقت تک دکن کے شعرا دکنی ماحول سے متاثر تھے اور دکنی زبان میں شعر کہتے تھے لیکن شعرائے دہلی سے اختلاط کے بعد وہ بھی دلّی کی زبان اور محاورات کے پیرو ہو گئے۔ وؔلی کا تعلق اس عبوری دور سے اور ایماؔن کا تعلق ارتقائی دور سے ہے۔

دکن نے اُردو زبان اور اُردو شاعری کی جو خدمات انجام دیں اور اُس کی تخلیق وارتقا میں اس کا جو حصہ ہے اُسے اُجاگر کرنے کے لیے دکن کے بعض اہلِ ذوق حضرات نے یہ طے کیا ہے کہ "دورِ آصفیہ کے بارہ شاعروں کے ایسے انتخابات شائع کیے جائیں جو اُردو ادب میں اضافہ کا باعث ہوں اور جن کے مطالعہ سے اُردو کا ذوق رکھنے والے نوجوان اپنے ذوقِ سخن میں ترقی کر سکیں" اس سلسلہ میں اب تک عزیزؔ، مائلؔ، کیفیؔ سراؔج اورنگ آبادی اور فیضؔ کے انتخابات شائع ہو چکے ہیں اور زیرِ نظر انتخاب اس کی چھٹی کڑی ہے جسے سید محمد صاحب ایم اے نے ایک مقدمہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس مقدمہ میں دکن کی اُردو شاعری پر عموماً

اور ایمانؔ کی شاعری پر خصوصاً مفصل نظر ڈالی گئی ہے۔

"ایمانؔ بڑے قادر الکلام شاعر تھے۔ انہوں نے ہر صنفِ سخن میں اپنی طبیعت کے جوہر دکھائے ہیں"۔ غزلوں کے علاوہ ان کے زیرِ نظر انتخاب میں دس قصیدے، تین مثنویاں، بیس رباعیاں، سات مخمس، ایک ایک قطعہ، مثلث اور مسدس شامل ہیں۔ ایمانؔ۔ میرؔ و سوداؔ کے ہم عصر تھے اور اسی دور کی زبان سے متاثر۔ ان کے کلام کی خصوصیات" الفاظ کی دروبست اور بندش کی چستی کے ساتھ محاکات۔ روانی و سلاست اور سادگی وصفائی ہیں" نمونہ ملاحظہ ہو۔

میں وہ غمزدہ ہوں کہ مانندِ شمع طرب کی بھی مجلس میں روتا رہوں

سیرِ گلشن کی نہ دو تکلیف مجھ کو دوستو گردِ باد آسا مجھے صحرا نوردی چاہیے

سنتے ہی ایک خلق کے آنسو ٹپک پڑے لیکن کیا نہ آہ نے اپنے اثر تجھے

بلبل کے قید کرنے سے فصلِ بہار میں صیاد کیا ملیگا بجز زشتی پر تجھے

زندگی شکل خواب کی سی ہے موج گویا سراب کی سی ہے

کبھو حرم میں کبھو دیر میں مجھے پیارے کہاں کہاں نہ لیے تیری چاہ پھرتی ہے

ہم جب آئے ہیں تری بزم میں اے رشکِ چمن نہ کیا غور کسو نے کہ کدھر بیٹھ گئے ہم

بہرحال اُردو شاعری کے ارتقائی مدارج کا مطالعہ کرنے والے حضرات کے لیے ایمانؔ کا یہ انتخاب دیکھنا ازبس ضروری ہے۔ اُمید کہ اہل ذوق اس سے استفادہ کرینگے اور قابل مرتب کی کوششوں کی داد دینگے۔

ممالکِ غیر

مثل مشہور ہے، نیکی کر اور دریا میں ڈال۔ برطانیہ کی حکومت نے سولینی کو اپنے خلوص کا یقین دلانے کے لیے ایک بے گناہ وزیر خارجہ کو برطرف کیا، تقریر اور تحریر میں ۱۹۳۵ء سے اب تک اٹلی کے ظلم زیادتی اور غاصبانہ رویے کے بارے میں جو کچھ کہا گیا تھا اُسے جھٹلا کر لیگ کے دربار عام میں بکری کو مجرم اور بھیڑیے کو حق بجانب ثابت کرنے کا بیڑا اُٹھایا، تجارتی نقصان فلسطین اور عرب میں دخل درمعقولات اور باری ریڈیو اسٹیشن کی دروغ گوئیاں معاف کردیں۔ اور اس کا اجر کیا ملا؟ مسولینی کی ایک تقریر کہ جس میں اُس نے کہا کہ انگلستان کو اب اٹلی کی طاقت کا اندازہ ہوگیا ہے، اطالوی حکومت معاہدے کا پورا لحاظ تو بے شک کرےگی مگر وہ اس زمانے کو نہیں بھولی ہے جب کہ برطانیہ اور فرانس کی تحریک سے اٹلی پر پابندیاں عائد کی گئی تھیں، اور اصول کے معاملہ میں فاشسٹ قومیں ایک دوسرے کے آڑے آئینگی۔ برطانیہ کے جھکنے اور دوستی کے لیے ہاتھ بڑھانے کے جواب میں آخر اس طرح اکڑنے، ملاقات کے بعد اس طرح پیچھے سے لات مارنے کے کیا معنی؟ کیا ہٹلر مسولینی کے کان میں کچھ پھونک گیا ہے؟ کیا مسولینی کو خیال ہے برطانیہ کا صبر ابھی اور آزمایا جا سکتا ہے، نیک نیتی اور شرافت سے ابھی اور فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے؟

ویسے دیکھئے تو برطانیہ نے حبش پر اٹلی کا قبضہ تسلیم ہی نہیں کرایا بلکہ ایک کمزور دعوے کو دوستی کی خاطر حق ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ حبش کا شہنشاہ بے شک سلطنت چھوڑ کر یورپ میں راست بازی اور حق پرستی کے گُر سیکھ رہا ہے، لیکن حبش پر اٹلی کا قبضہ نہیں ہوا ہے۔ پیرس کے شیطانوں نے ایک راز کے خط کو جو حبش کے وائسرائے ڈیوک اوُستا (Aosta) نے مسولینی کو حال ہی میں لکھا تھا بیچ میں کہیں اُڑا لیا اور حبش پر اطالوی حکومت کی قلعی کھول دی، وائسرائے لکھتا ہے:

ہماری حالت واقعی بہت خراب ہے۔ اٹلی کا اثر وہیں تک ہے جہاں تک بندوق کی گولیاں پہنچتی ہیں، اس کے آگے کچھ نہیں۔ یہاں کی ساٹھ لاکھ آبادی ساری کی ساری ہماری کٹر دشمن ہے۔ ہر اطالوی چھاؤنی

کے گرد کوئی ساٹھ میل کا حلقہ چھوڑ کر باہر ہر جگہ حبشی سردار جنگ سے پہلے کی طرح حکومت کر رہے ہیں..... ہمارے پاس ہر چیز کی کمی ہے۔ حبشی ہمارے ہاتھ کچھ بیچتے نہیں۔ اس لیے کہ انہیں ہمارے کاغذی سکّے پر اب اعتبار نہیں رہا ہے.... نتیجہ یہ ہے کہ حبشی ان بازاروں اور منڈیوں میں آتے ہی نہیں جہاں اطالوی ہوتے ہیں، اور ان کو پولیس بھیج کر پکڑ بلوانے میں خرچ بھی ہے اور خطرہ بھی۔ اٹلی کے سرمایہ داروں نے (ال دوچے یعنی مسولینی کے دباؤ ڈالنے پر بھی یہاں صرف پندرہ کروڑ فرینک لگائے ہیں، جو کہ بالکل ناکافی ہے۔ اس سے بہت زیادہ چاہیے اور فوراً چاہیے۔ اس حالت کو دیکھ کر بہت سے سیاہ قمیص والے، یعنی فاشسٹ جنہوں نے یہاں آباد ہو جانے کا ارادہ کیا تھا طے کر چکے ہیں کہ اٹلی واپس چلے جائینگے، اور وہاں وہ ابھی سے اپنے والدین اور دوستوں میں اشتعال انگیز افواہیں پھیلاتے ہیں.... اگر یورپ میں جنگ شروع ہوئی تو ہم حبش سے چند ہفتوں کے اندر نکال باہر کیے جائینگے۔

مسولینی کی احسان فراموشی کا یہ عالم ہے کہ ایسے ملک پر جہاں ابھی تک اٹلی والوں کی جان مال آبرو بھی کچھ خطرے میں ہے اُسے سچ مچ قبضہ کرنے اور قبضے سے تجارتی فائدہ اُٹھانے کا موقع دیا جا رہا ہے مگر وہ ہے کہ پچھاڑیں کھا رہا ہے دوسری طرف جو کچھ طے ہوا تھا اُسے بھی وہ شبہے میں ڈال رہا ہے۔ حبش مل جانے سے اس کی ہوس پوری ہوتی نہیں معلوم ہوتی، وہ چاہتا ہے کہ ہسپانیہ پر بھی قبضہ جمائے، اور سب طرف یہ خیال پھیل گیا ہے کہ انگلستان اور اٹلی کے معاہدہ کا امتحان اسی وقت ہو گا جب کہ فرینکو ہسپانیہ میں بالکل کامیاب ہو جائے، یہ بھی ایک دوست اور خیر خواہ کو دھوکا دینا ہے، کیونکہ جب فرینکو اور جرمنی اور ساری دنیا پر ظاہر ہو گیا کہ انگلستان اور اٹلی کی دوستی پر اعتبار نہیں تو اس وقت اٹلی سے جو معاہدہ ہوا ہے اس سے انگلستان کو بھلا کیوں کوئی فائدہ پہنچ سکیگا۔ برطانوی مدبروں کو شاید سب سے زیادہ شکایت اس بات کی ہو گی کہ مسولینی نے تقریر کے لیے خاص وہ موقع منتخب کیا جب لیگ کے اجلاس میں برطانوی اور فرانسیسی نمائندوں کی تقریریں ہو چکی تھیں اور وہ دکھا چکے تھے کہ حبش کے معاملے میں وہ اٹلی کی خاطر اور سب کو خفا کرنے اور حق کو مصلحت پر قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اب اٹلی کے یہ دونوں خیر خواہ پیچھے ہٹیں تو کس منہ سے اور آگے بڑھیں تو کدھر۔

اٹلی سے دوستی ہوجاتی اور مسولینی اس کا احسان مانتا تو اس کی امید کی جاسکتی تھی کہ اٹلی اور جرمنی کی ساز باز اور ہٹلر کے رویے سے یورپ بھر میں جو بےچینی ہے وہ دور ہوجائیگی، ہٹلر یہ دیکھ کر کہ مسولینی کی راہ رسم اور لوگوں سے بھی ہے بالکل بے باک نہ ہوجائیگا، اور جو دباؤ اس پر لیگ اور انگلستان اور فرانس کی قوت نہیں ڈال سکی تھی وہ شاید ایک چوکھا اتحاد ڈال سکتا۔ چار برس ہوئے مسولینی نے اٹلی، فرانس اور انگلستان کے ایک اتحاد کے ذریعہ جو سٹریزا (stresa) کا محاذ کہلاتا ہے ہٹلر کے لنگڑی لگائی تھی، لیکن انسانی طبیعت کی خباثت دیکھیے کہ اس وقت وہی مسولینی انگلستان سے دوستانہ معاہدہ کرنے کے باوجود کہہ رہا ہے کہ وہ دن گئے جب سٹریزا میں ہم، برطانیہ اور فرانس ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلتے تھے۔ یہ شوخ اگر کسی طرح ہتھے چڑھتا تو بہتیروں کا کام بن جاتا، لیکن اس کا تو مزاج نہیں ملتا اور بیمار یورپ کی حالت روز بروز نازک ہوتی جاتی ہے۔

مسولینی نہ مانا تو ہٹلر کو کون منا سکتا ہے اور وسطی یورپ کو اس کے چنگل سے کون بچا سکتا ہے؟ چکوسلوواکیا کے جرمن دو تین مہینے سے بگڑتے چلے جا رہے ہیں اور معلوم یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی کے سمجھائے سمجھینگے نہیں۔ ان کے لیڈر ہر ہنلائن نے ابھی پراگ میں ایک تقریر کی تھی اور اپنی قوم کے مطالبے پیش کیے تھے وہ چاہتے ہیں کہ چکوسلوواکیا کا جرمن علاقہ الگ کر دیا جائے، اس کی حد بندی کر دی جائے، اور اُس کو سوراج کے پورے اختیارات دیدیے جائیں۔ دوسری طرف وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ چکوسلوواکیا اپنی خارجی پالیسی بدلے یعنی لیگ سے قطع تعلق کرلے، رومانیہ اور یوگوسلاویہ سے اس کا جو اتحاد ہے اُسے توڑ دے، روس کا ساتھ چھوڑ دے اور انگلستان اور فرانس سے جو دوستی ہے اُسے بھی بھلا دے۔ اس کے معنی جو ہیں وہ ظاہر ہیں۔ چکوسلوواکیا کی حکومت اپنی جرمن آبادی کو کسی طرح راضی نہیں کر سکتی، سوا اس کے کہ خودکشی کرلے۔ اور خودکشی پر نہ اس کے دشمن اسے راضی کر سکینگے نہ اس کے دوست، اگرچہ معلوم ہوتا ہے کہ دوست اسے جان کے سوا سب کچھ جرمنی کے حوالے کر دینے کا مشورہ دے رہے ہیں۔

ہٹلر نے جیسا کہ چاہیے خاموشی اختیار کی ہے۔ ہر ہنلائن کچھ دن ہوئے برلن گئے تھے، جہاں سے وہ شاید یہ نیا مطالبہ لے کر آئے کہ چکوسلوواکیا کو اپنی خارجی پالیسی بدلنا چاہیے حال ہی میں وہ انگلستان بھی ہو آئے

اور اس سفر کا مقصد سوا اس کے کیا ہوگا کہ انگلستان کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اس کی طاقت اور اندرونی کیفیت کا اندازہ کریں۔ غالباً انہوں نے یہ رائے قائم کی ہوگی کہ ہمت والے کے لیے میدان صاف ہے، کیونکہ انگلستان کی آزاد جمہوری حکومت، جہاں اعتراض اور تنقید کی پوری آزادی ہے، اکثر لوگوں کو غلط فہمی میں ڈال دیتی ہے۔ اگر ہر ہٹلائن انگلستان کے کمزور یا چکوسلوواکیا کے انجام سے بے پروا ہونے کا خیال اپنے دل میں لے کر گئے ہیں تو حال میں ہوائی قوت کے محکمے پر پریس اور پارلیمنٹ میں جو اعتراض کیے گئے ہیں اور ہوائی جہازوں کے بنانے اور خریدنے میں جو دشواریاں پیش آرہی ہیں ان سے ان کی غلط فہمی اور بڑھیگی اور کوئی تعجب نہیں اگر وہ ایسی آتشبازی چھوڑیں جس سے وسطی یورپ کے بارود خانے میں آگ لگ جائے۔

لیکن چکوسلوواکیا ہی ایک ملک نہیں ہے جس میں جرمن سیاست خاموشی سے اپنا کام کر رہی ہے جنوب مشرقی یورپ میں وہ برسوں سے اپنا اثر بڑھانے کے لیے طرح طرح کی چالیں چل رہی ہے، لیکن اب آسٹریا مل جانے سے اس کے کاروبار کی نوعیت بہت بدل گئی ہے۔ وہ ملکوں سے تجارتی معاملات ہی نہیں کرتی بلکہ قبضہ جمانے کی تدبیریں بھی کر رہی ہے۔ مثلاً ڈینیا سے بحر ایڈریاٹک کی بندرگاہ ٹریسٹ (Trieste) تک جو سڑکیں ہیں اُن کے گرد زمین نازی روپیے سے خریدی جا رہی ہے۔ یہ علاقہ یوگوسلاویہ میں شامل ہے، لیکن یہاں کے کسان بہت غریب ہیں اور روپیے کی صورت دیکھ کر ان کے مُنہ میں پانی آجاتا ہے۔ یہاں تھوڑی سی جرمن آبادی بھی ہے جو نازیوں کی طرح سے مدد کر رہی ہے اور اب تک یوگوسلاویہ کی حکومت کوئی ایسی قانونی تدبیر نہیں کر سکی ہے جو اس زمین کی خریداری کو بند کر سکے۔

یہ سب کچھ تو ہے، لیکن اندازہ یہ ہوتا ہے کہ یورپی سیاست جرمنی کی پیش قدمیوں کے سبب سے نہیں بلکہ ہسپانیہ کی خانہ جنگی کے ختم ہونے پر پلٹا کھائیگی۔ اس وقت جو قومیں امن کی محافظ ہیں وہ وسطی اور جنوب مشرقی یورپ پر جرمنی کے تسلط کو گوارا کر لینگی لیکن ہسپانیہ اور بحر روم کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دینگی۔ اٹلی نے دوستانہ برتاؤ کیا اور ہٹلر کی سمجھ میں یہ نکتہ آگیا کہ مغربی یورپ کے بدلے وسطی اور جنوب مشرقی یورپ حاصل کیا جا سکتا ہے تو خیر، ورنہ جنگ کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہیگا۔

مشرق بعید میں البتہ جو طوفان اُٹھا تھا وہ چاہے چینیوں پر آگ برسا رہا ہو لیکن اس سے مغربی قوموں

کو اب کوئی خاص اندیشہ نہیں رہا ہے۔ جاپان نے اپنی سیاست اور فوج کی ساری کمائی ایک داؤں پر لگا دی ہے۔ اگر یہ داؤں چل گیا، یعنی لنگھائی ریلوے پر اس کا قبضہ ہو گیا تو اس کی آبرو بچ جائیگی اور قوم سی یہ کہنے کو ہو جائیگا کہ چین میں فتوحات کا سلسلہ شہنشاہ کے اقبال سے برابر جاری ہے۔ لیکن یہ داؤں نہ چلا تو چینی جاپانی فوجوں کو کچا کھا جائینگے۔ انہوں نے ابھی سے قزاقانہ جنگ کر کے جاپانیوں کو جان سے بیزار کر دیا ہے، جنوب میں شانگھائی کو اس طرح گھیرے ہوئے ہیں کہ وہاں کی جاپانی فوج ہٹا کر کہیں اور نہیں بھیجی جا سکتی، پائی پنگ اور ٹی ان ٹسن (Tientsin) میں بھی قریب قریب یہی حال ہے اور ان دو مرکزوں سے جو شہر ذرا دور ہیں وہاں چینی جاپانی فوجوں کا پورا محاصرہ کیے ہوئے ہیں۔ جاپان نے جن ریلوے لائنوں پر قبضہ کیا ہے وہ آمد و رفت اور فوجی سامان پہنچانے کے لیے بیکار ہیں، کیونکہ چینی قزاق انہیں جگہ جگہ سے توڑتے رہتے ہیں اور ان کی محافظ فوجوں پر موقع ملا تو حملہ کرنے سے نہیں چوکتے۔ چینیوں نے یہ بھی دکھا دیا ہے کہ سپاہی سپاہی کا مقابلہ ہو تو وہ جاپانیوں سے کسی طرح ہیٹے نہیں، اور پہلے جو خیال تھا کہ چینی حکومت قلیوں اور مزدوروں کو وردی پہنا کر جاپانی فوجوں کو دیکھ کر بھاگنے کے لیے بھیجدیگی وہ غلط اور اس قدر غلط ثابت ہوا ہے کہ جاپانی خود پچھتا رہے ہیں۔

یورپی قوموں کو اسی لیے اور اطمینان ہے کہ جاپانی مدتوں تک چین میں اُلجھے رہینگے۔ اگر اُنہوں نے سوچاؤ پر قبضہ کر لیا، جس پر اس وقت ان کی فوجیں تین طرف سے بڑھ رہی ہیں تو لنگھائی ریلوے چینیوں کے ہاتھ سے نکل جائیگی اور پھر ان کا کسی بڑی فوج کو ایک جگہ جمع کرنا اور اس کے لیے جنگ کا سامان فراہم کرنا قریب قریب ناممکن ہو جائیگا، لیکن میدان میں تو چینی صرف اپنی ضد پوری کرنے کے لیے مقابلہ کرتے ہیں، ان کا اصل بھروسا قزاقانہ جنگ پر ہے، اور وہ جاری رہیگی۔ جب تک چینیوں کے جسم میں جان ہے، جاپان کی شکست اسی قزاقانہ جنگ کے جاری رہنے میں ہے، کیونکہ یہ اس کی نوبت نہیں آنے دیگی کہ وہ ملک کو اپنا کہہ سکیں، یہ قومیت کے جذبے کو اس طرح بھڑکاتی رہیگی کہ بڑے شہروں میں بھی جو چینی جاپانی حکومت کی مدد کریں گے وہ اپنی جان پر کھیل کر کرینگے اور حکومت کو اتنا اطمینان نہ ہوگا کہ قبضے سے فائدہ اُٹھانے کے لیے ملک میں سرمایہ لگا سکے۔ اگر جاپانی اس کو اس کوشش میں تمام خطروں اور رکاوٹوں کے

باوجود لگے رہے تو وہ اور کسی طرف توجہ نہ کرسکیں گے، اور اگر وہ ناکامیاب ہوئے تو اس سے ان کی سیاست اور تجارت کو ایسا صدمہ پہنچیگا کہ وہ تمام منڈیاں جہاں سے انہوں نے یورپی تجارت کو بیدخل کیا ہے پھر
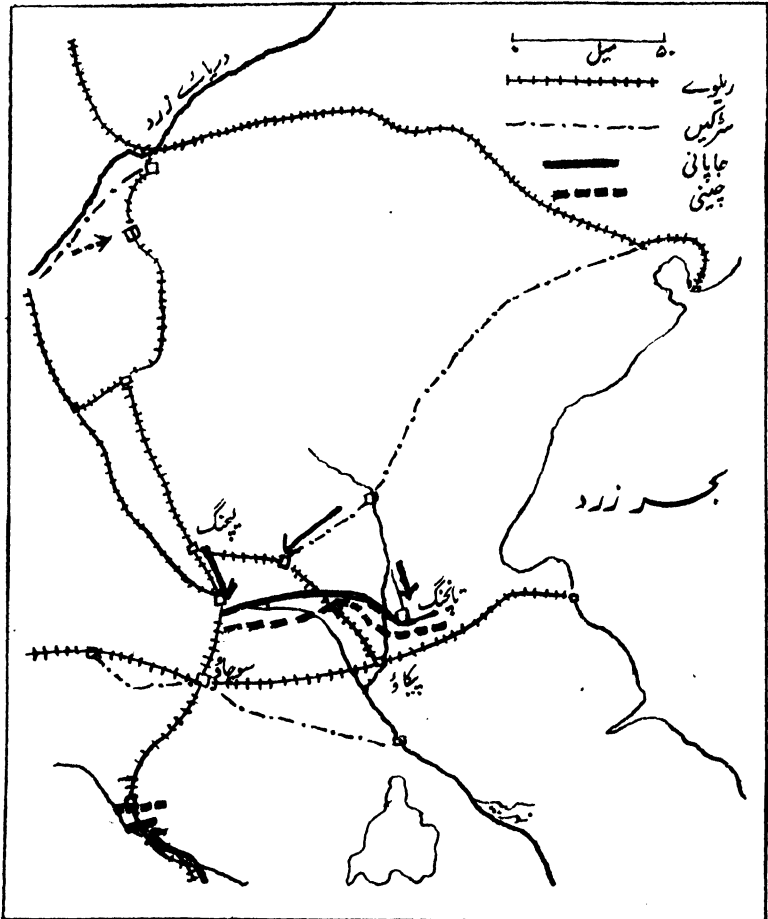
یورپی سرمایہ داروں کے ہاتھ آجائینگی اور شاید یہ کساد بازاری اور ان عداوتوں کو جو منڈیوں کی کمی سے پیدا ہوئی ہیں ایک عرصہ کے لیے مٹادے لیکن جب امکانات سے بحث ہے تو ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے بہت سے بھوکوں کے سامنے بہت سا کھانا رکھ دیا جائے تو وہ چپکے سے اس کو کھا نہیں لیتے آپس

ہیں لڑنے بھی لگتے ہیں۔ بیچارہ پیٹ تو ذرا میں بھر جاتا ہے، یہ تو آدمی کی نیت ہے کہ جس نے اپنے اوپر سیری حرام کرلی ہے۔

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے آکسن، مطبوعہ محبوب المطابع برقی پریس دہلی

سالانہ پانچ روپیے فی پرچہ ۸ر